قائدِ اعظم جناح

ایک قوم کی سرگزشت

مصنّف

جی۔ الانا

مترجم

رئیس امروہوی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

قائدِ اعظم جناح

ایک قوم کی سرگزشت

مصنّف

جی۔ الانا

مترجم

رئیس امروہوی

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور راولپنڈی کراچی

تیسری بار ۱۹۷۶
قیمت

مطبوعہ فیروز سنز لمیٹڈ لاہور • باہتمام عبدالحمید خان پرنٹر و پبلشر

اُن

نامعلوم شہیدوں کے نام

جنھوں نے پاکستان کی جنگِ آزادی میں

اپنی جان قربان کر دی

اور

قوم کے اُن مُخلص و ایثار پیشہ کارکنوں کے نام

جنھوں نے حصُولِ پاکستان کی جد و جہد میں

بے شمار مُصیبتیں جھیلیں۔

ترتیب

پیش لفظ

کسی بھی سیاسی نظریے کو لے لیجیے ۔ اگر آپ اس کی ابتدا کا سُراغ لگانے بیٹھیں تو معلوم ہو گا کہ وہ کسی ایسی سرزمین سے اُبھرا ہے جسے سیاسی اختلافات اور تصادم نے جُھلس کر رکھ دیا تھا۔ مسلمانانِ ہند کے دو قومی نظریے کے بارے میں اس حقیقت کا اعتراف کرنا ناگزیر ہے۔ یہی وہ نظریہ تھا جس کے نتیجے میں پاکستان وجود میں آیا۔

جب ایک قوم کی تاریخ کے کسی دور پر مایوسی اور ناامیدی کے بادل چھا جاتے ہیں تو اس میں ایک مردِ دانا پیدا ہوتا ہے جس کا اپنی ذات پر اعتماد اور اپنے نصب العین پر یقین کامل، ایک لافانی کارنامے کی مضبوط و مربوط اساس بن جاتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کے لیے بیسویں صدی کا پہلا نصف حصّہ ایک ایسا ہی دَور تھا۔ مسلمان جس سیاسی محاذ پر ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنے وجود کو تسلیم کرانے کی جنگ میں مصروف تھے وہاں قائدِ اعظم محمد علی جناح ان کے سپہ سالار تھے۔

قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں مردِ دانا کا کام اپنی قوم کی اصل خواہشات اور اُمنگوں کو نمایاں صورت میں پیش کرنا ہوتا ہے۔ قوم کے لیے اپنے رہنما کے الفاظ اور اعمال، خود اپنے خواب کی عملی تعبیر ہوتے ہیں۔ رہنما کے ہر لفظ اور ہر فعل میں اسے اپنی اُمنگوں اور خواہشات کے عکس نظر آتے ہیں۔ قائدِ اعظم اور مسلمان قوم کے درمیان یہی مربوط تعلق تھا جس نے قوم کی کڑی آزمائش کے وقت اس کا شیرازہ منتشر نہ ہونے دیا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ دَور، ہماری قومی تاریخ کا خطرناک ترین دور بھی تھا۔

قائدِاعظم کا لافانی کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے ہماری قوم کی رہنمائی کی اور اُسے منزلِ مراد تک پہنچایا اور ان کے اسی کارنامے کی بنا پر قوم نے بجا طور پر انھیں بابائے قوم کا خطاب دیا۔ جناح اور پاکستان —— ان دو الفاظ میں اتنا گہرا اور قریبی تعلق ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصوّر بھی محال ہے۔ بنا بریں حیاتِ قائدِاعظم درحقیقت قیامِ پاکستان کی داستان ہے۔

قائدِاعظم کی سوانح حیات پیش کرتے وقت مجھے اپنی کم مائیگی کا احساس ہے لیکن حصولِ آزادی اور قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں ایک ادنیٰ کارکن اور عقیدت مند کی حیثیت سے مجھے قائدِاعظم سے قریب رہنے کے کچھ مواقع ملے۔ میرے نزدیک میری جوانی کے زمانے میں قائدِاعظم ایک مضبوط و بلند و بالا چٹان تھے۔ وقت کے قافلے گزر جانے کے باوجود اس تشبیہ میں کوئی فرق نہ آسکا۔

اگر یہ کتاب اُن پاکستانی باشندوں پر، جو جناح کو زمانۂ ماضی کی شخصیت سمجھتے ہیں، یہ واضح کر سکے کہ ان کی قیادت کے بغیر قیامِ پاکستان امرِ محال تھا تو میں سمجھوں گا کہ میں نے یہ سوانح مرتب کرنے میں دو سال کا جو عرصہ گزارا ہے وہ رائیگاں نہیں گیا۔

اس سوانح کو مرتب کرنے میں میں نے تقریباً دو سو کتب سے مدد لی ہے۔ ان میں سے کچھ اب نایاب ہیں۔ میں ان تمام کتب کے مصنفین کا شکر گزار ہوں۔ ان سب کی فہرست تیار کرنا میرے لیے خاصا مشکل ہے۔ تاہم میں نے کتاب کے آخر میں اُن تمام کتب و مطبوعات کی فہرست درج کی ہے جن کے اقتباسات اس سوانح میں پیش کیے گئے ہیں۔

جی۔ الانا

البرکات
۲۰۷۔ گارڈن ویسٹ کراچی

بچپن تعلیم شادی

انیسویں صدی کے دوسرے نصف دور میں، ہندوستان میں برطانوی راج کا سُورج نصف النہار پر چمک رہا تھا۔ انگریز، جو اس برصغیر میں سوداگر بن کر آئے تھے اور جنھوں نے یہاں کے حکمرانوں سے، دوستی اور مراعات کی بھیک مانگی تھی، آخرکار اس ملک کے حاکم بن بیٹھے اور انھوں نے یہاں اپنی سلطنت قائم کرلی۔ یہ سلطنت تاجِ برطانیہ کا ایسا بیش بہا گوہر تھا کہ اس کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی تھی۔ غیر ملکی حکمران یہ یقین کر بیٹھے تھے کہ اُنھوں نے "نیٹو" کو تہذیب و تمدُّن سے آشنا کرکے ان کی برہمی کو دِھیما کر دیا ہے اور ان کی امن و امان قائم رکھنے کی پالیسی سے مقامی باشندوں کی مزاحمت و سرکشی کی سُلگتی ہُوئی آگ ٹھنڈی ہوگئی ہے۔ سطح پر بہ ظاہر ہر طرف امن و سکون تھا۔ لیکن ان غیر ملکی حاکموں کی نظروں سے نفرت کا وہ لاوا اوجھل رہا جو ان کے اقتدار کے خلاف ہندوستانیوں کے دِل میں اندر ہی اندر پک رہا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں ایک ننھی سی چنگاری نے بھڑک کر بغاوت کے خوفناک شُعلے کی شکل اختیار کرلی۔ یہ بغاوت غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندوستان کی طویل و مُشکل جدوجہد آزادی کی داستان کے پہلے باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ ہماری تاریخ کا طوفانی دور تھا، آزادی کی اس جنگ میں سینکڑوں مُحبِ وطن افراد نے اپنی جان قربان کردی اور ملک کی آزادی کی راہ میں شہید کا مرتبہ پایا۔ اگرچہ یہ بغاوت ناکام ہوگئی تاہم اہلِ ہند کے ذہن پر اس کے پائیدار نقوش مُرتسم ہوگئے اور اس کے

سارے وقت کے ساتھ ساتھ، سارے مُلک پر پھیلتے چلے گئے۔

مگر ہندوستان میں کچھ ایسے علاقے بھی تھے جن پر ارد گرد کے سیاسی انتشار کا کوئی اثر نہ پڑا۔ کاٹھیاواڑ کی ریاست گونڈل ان ہی علاقوں میں شامل تھی۔ برطانوی حکومت کی غیر متزلزل وفاداری کے صلے میں ٹھاکر صاحب گونڈل اپنی تمام تر شان و شوکت کے ساتھ بدستور ریاست پر حکومت کرتے رہے۔ اُنھوں نے بغاوت کے ہنگاموں کو جو عام طور پر متعدی ہوتے ہیں، اپنی ریاست کی حدود تک نہ پہنچنے دیا۔ ویسے بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ریاست پر ان کے مسلّمہ اقتدار کی تابندگی و درخشانی میں کوئی فرق آئے یا اس کو کوئی خطرہ لاحق ہو۔ ٹھاکر صاحب کے زیر سایہ ریاست کے باشندوں کے معمولاتِ زندگی میں کوئی فرق نہ آیا اور اُن پر اس زبردست سیاسی انتشار کا کوئی اثر نہ پڑا جس نے قریب قریب تمام ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

صدر مقام گونڈل، ریاست کا سب سے بڑا شہر تھا مگر بیشتر آبادی دُور دُور تک پھیلے ہُوئے دیہات میں آباد تھی اور انتہائی سادہ زندگی بسر کرتی تھی۔ اُن کی دنیا محدود تھی اور بیل گاڑیوں کے اس زمانے میں ان کے لیے اہم ترین بات صرف گونڈل کی وسعت ہی تھی۔

ان دیہات میں سے ایک گاؤں پانیلی تھا۔ اس وقت جب کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت، بڑے پیمانے پر انگریزوں کی سیاسی مخالفت کا رُوپ دھار رہی تھی، پانیلی کی آبادی ایک ہزار سے بھی کم تھی۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں پُونجا بھائی نامی ایک جفاکش شخص رہتا تھا۔ پُونجا بھائی سے پہلے ان کے باپ دادا بھی اسی گاؤں میں زندگی گزار چکے تھے۔ پُونجا بھائی پانیلی کے اُن چند افراد میں سے تھے جن کا پیشہ کھیتی باڑی نہ تھا۔ ان کی چند کھڈیاں تھیں جن پر وہ رات گئے تک کپڑا بُنتے رہتے۔ اپنی مدد کے لیے اُنھوں نے کچھ ملازم رکھ چھوڑے تھے۔ ان کھڈیوں پر معمولی قسم

کا کپڑا بُنا جاتا جس کی فروخت سے انھیں اتنی رقم مل جاتی کہ پانیلی کے کھاتے پیتے گھرانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔

پُونجا بھائی کے تین بیٹے ولجی بھائی، نتھو بھائی، جناح بھائی اور ایک بیٹی من بائی تھیں۔ جناح بھائی سب سے چھوٹے تھے، وہ ہندوستان کی پہلی بغاوت سے چند سال پہلے ۱۸۵۰ء کے لگ بھگ پیدا ہوئے تھے اور اپنے دونوں بھائیوں سے زیادہ فعال اور حوصلہ مند تھے۔ ان کی نوجوان اُمنگوں اور حوصلے کے لیے پانیلی کی بستی ناکافی تھی جہاں زندگی کی تمام تر گردش ایک معمولی سے بازار کے گرد محدود تھی۔ جہاں اُبھرنے اور آگے بڑھنے کا کوئی موقع نہ تھا اور گاؤں کے کنویں پر بے بنیاد افواہیں اور قیاس آرائیاں ہی لوگوں کی تفریح کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں۔ اُنھوں نے سنا تھا کہ گونڈل بہت بڑا شہر ہے۔ وہاں کی زندگی ہنگاموں سے پُر ہے اور وہاں بڑے بڑے تاجر رہتے ہیں۔ اُنھوں نے سوچا کہ وہ پانیلی میں اپنی زندگی کیوں برباد کرتے رہیں۔ اپنے بھائیوں اور خاندان کے ساتھ ان دستی کرگھوں کے تانوں بانوں میں اُلجھے رہیں۔ یہ تو بڑی چھوٹی سی دُنیا ہے جس میں کوئی عظیم شے حاصل نہیں ہو سکتی۔ وہ گونڈل جیسے بڑے شہر جا کر کوئی بڑا کام کرنا چاہتے تھے۔

جناح بھائی تجزیاتی ذہن کے مالک تھے۔ وہ جذباتی اعتبار سے بڑے متوازن واقع ہوئے تھے اور جلد بازی سے کسی تجارت میں ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پاس اتنی رقم نہ تھی کہ اسے برباد کر سکیں۔ کافی غور و خوض کے بعد اُنھوں نے فیصلہ کیا کہ کیوں نہ ایسا کاروبار کیا جائے جس میں رقم جلد واپس مل سکے۔ ان کی قابلیت اور محنت کے سبب تجارت خُوب چل نکلی۔ چند مہینے بعد وہ گونڈل سے پانیلی واپس آئے تو اُن کے باپ کو یہ سُن کر خوشی ہوتی کہ بیٹے نے شہر میں خاصا منافع کما لیا ہے۔ زندگی کی پرانی قدروں کے مطابق اُن کی خواہش تھی کہ بیٹے نے اتنے مختصر سے عرصے

ہیں تجارت کے میدان میں جو کامیابی حاصل کی ہے، وہ اس پر پوری توجہ دیتا رہے۔ اس کے علاوہ ماں باپ چونکہ ضعیف ہو گئے تھے اور دونوں بیٹوں اور بیٹی کی شادی کے گرانبار فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کی اب صرف یہ خواہش تھی، کہ سب سے چھوٹے بیٹے کی شادی بھی، ان کی اپنی یعنی اسماعیلی خوجہ برادری کے کسی معزز خاندان میں ہو جائے۔

ماں باپ نے بہو کی تلاش شروع کر دی تاکہ جناح بھائی کے گونڈل واپس جانے سے پہلے ہی ان کی شادی کر دی جائے۔ اس تلاش میں وہ ادھر ادھر بھی گئے، اور آخرکار پانیلی سے تقریباً دس میل دور ڈھرفا نامی گاؤں میں ایک کھاتے پیتے خوجہ اسمٰعیلی خاندان کی لڑکی مٹھی بائی، انھیں پسند آگئی۔ مٹھی بائی کے والدین نے یہ رشتہ منظور کر لیا اور ۱۸۷۴ء کے لگ بھگ ڈھرفا میں جناح بھائی اور مٹھی بائی رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

گونڈل میں جناح بھائی کی تجارت خوب چمکی۔ اُن تھک محنت اور کام کی لگن ان کی نس نس میں سمائی ہوئی تھی۔ ان کا یقین تھا کہ کوئی بھی فیصلہ کرنے کے بعد پوری تندہی سے مقصد کے حصول کے لیے کام کرنا چاہیئے۔ اُنھیں آرام طلبی اور کاہلی سے چڑھ تھی اور ان کا عقیدہ تھا کہ خلوصِ مقصد اور جانفشانی، زندگی میں کامیابی کے لیے ضروری عناصر ہیں۔ جلد ہی گونڈل بھی ان جیسے جواں ہمت اور اولوالعزم شخص کے لیے سکڑ کر چھوٹا سا شہر بن گیا۔

اُنھوں نے بمبئی کے بارے میں سنا کہ وہاں ہُن برستا ہے اور تجارت پیشہ

لہ جناح بھائی پونجا کے خاندان کے متعلق مندرجہ بالا تفصیلات ان اطلاعات پر مبنی ہیں جو مُصنّف کو نجاں جی نہاتھے میرجی پانیلی والا (عمر تقریباً ۹۰ سال) اور ان کی اہلیہ نے فراہم کی ہیں۔

لوگ وہاں خوب روپیہ کما رہے ہیں۔ بمبئی کے علاوہ انھوں نے کراچی کے متعلق بھی بہت سی باتیں سنیں جو ایک اہم بندرگاہ تھا اور تجارتی مرکز بنتا جا رہا تھا۔ انھوں نے گونڈل چھوڑ کر بمبئی یا کراچی میں کاروبار کرنے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ اکثر وہ بمبئی میں کاروبار کے متعلق سوچتے تاہم قسمت انھیں، خاندان سمیت کراچی لے آئی اور جناح بھائی کا خاندان کراچی میں آباد ہو گیا۔

انھوں نے کراچی جیسا عظیم شہر، جس کی آبادی اس وقت تقریباً پچاس ہزار تھی، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس زمانے میں کراچی کی قابل ذکر بستی کھڈہ تھی جہاں کھُلے سمندر میں قسمت آزمائی کرنے والے ماہی گیر دھوپ میں مچھلی خشک کرتے جسے بعد میں سمندر کے کنارے قطار در قطار گوداموں میں جمع کر لیا جاتا۔ دوسری بستی کھارادر تھی جہاں کچے مکانوں کی افراط تھی اور گلیوں میں بحیرہ عرب کا نمکین اور بدبودار پانی جمع رہتا تھا۔ کراچی کی دوسری بستیاں میٹھادر اور صدر تھیں میٹھادر میں لیاری اور ملیر ندی کے قرب کی وجہ سے دو چار ہاتھ گہرے کنوئیں کھودنے پر میٹھا پانی نکل آتا۔ صدر میں برطانوی فوج کی بارکیں تھیں اور صدر کے آس پاس چھاؤنی کا علاقہ تھا۔ جناح بھائی نے نیو نہام روڈ کھارادر کی ایک بلڈنگ کا ایک حصّہ کرائے پر لے لیا جس میں دو کمرے تھے۔ اس بلڈنگ میں اور بھی تاجر رہتے تھے۔ ان میں سے کچھ گجرات، کاٹھیاواڑ اور کچھ کے رہنے والے تھے۔ یہ بلڈنگ پتھر اور چونے کی بنی ہوئی تھی اور اس میں لکڑی کے تختوں کا فرش اور چھت تھی۔ جناح بھائی پہلی منزل میں رہتے تھے۔ ان کے کمروں کے سامنے لوہے اور لکڑی کے تختوں کی ایک بالکونی بھی تھی جہاں رات کو چارپائی بچھائی جا سکتی تھی۔ اور دن میں اس جگہ بیٹھ کر تازہ ہوا کا لطف اٹھایا جا سکتا تھا۔ ان کمروں اور بالکونی کا رُخ مغرب کی جانب تھا جو کراچی میں سمندر کی خنک ہوا کا لطف اٹھانے

کے لیے بہترین سمت ہے۔

نوجوان و نوعمر جناح بھائی پونجا بھائی کو ابتدا میں مناسب اور موزوں کاروبار کی تلاش میں خاصی دقت ہوئی۔ وہ مختلف کاروبار کرتے رہے اور اس طرح ان کی جمع پونجی میں رفتہ رفتہ اضافہ ہوتا گیا۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالتے، کامیاب ہوتے۔ اس وقت کراچی میں چند ادارے جن کے مالک انگریز تھے، شہر کی مصنوعات یورپ اور مشرق بعید کو برآمد کرتے اور انگلستان سے اشیائے صرف درآمد کرتے۔ ان میں سے ایک فرم گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی تھی۔ اگرچہ جناح بھائی نے اسکول میں انگریزی کی باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی تاہم اپنی ذہانت اور خداداد صلاحیت کے سبب جلد انھوں نے انگریزی زبان سیکھ لی۔ یہ بہت بڑی بات تھی۔ کراچی میں چند تاجر ہی انگریزی میں بات چیت کر سکتے تھے۔ خیال ہے کہ انگریزی دانی کے سبب ہی ان کے گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی کے جنرل مینجر فریڈرک لیہہ کروفٹ سے مراسم ہو گئے اور یہ بات ان کی تجارت کی ترقی میں بڑی معاون ثابت ہوئی۔

گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی سے تجارتی رابطے کے سبب جناح بھائی نے اپنے کاروبار کے علاوہ گوند کتیرہ وغیرہ بھی برآمد کرنا شروع کر دیا۔ ان کے کئی ملکوں کے تاجروں کے ساتھ کاروباری تعلقات تھے۔ ان ملکوں میں خاص طور سے ان کا مال انگلستان اور ہانگ کانگ جاتا تھا۔ چونکہ ان تاجروں سے انگریزی میں خط و کتابت ہوتی تھی، اس لیے جناح بھائی نے انگریزی لکھنا پڑھنا بھی سیکھ لیا۔

اس زمانے میں کھارادر کے کچھ بیوپاری بینکاری کا کام بھی کرتے تھے۔ سندھ، بلوچستان اور پنجاب کا تمام تجارتی مال کراچی کی بندرگاہ سے باہر جاتا تھا اور

بنکاری کی مناسب سہولتیں نہ ہونے کی وجہ سے انہی تاجروں کے ذریعے روپیہ پیسہ کا لین دین ہوتا تھا۔ بہت سے لوگ ان تاجروں کے پاس اپنی رقم جمع کرادیتے تھے اور یہ تاجر موجودہ زمانے کے بینکوں کی طرح کاروبار کرتے تھے اگرچہ اس وقت جدید بنکاری کے اصولوں کا وجود نہ تھا تاہم یہ لوگ بڑے دیانت دار تھے اور ان کی زبان ہی پہ سارا کاروبار چلتا۔ جناح بھائی پونجا بھائی کی فرم بھی اسی قسم کی ایک فرم تھی اور کراچی خصوصاً کھارادر کے لوگ اور تاجران پر بہت اعتماد کرتے تھے۔

مٹھی بائی کا ان دنوں پیر بھاری تھا۔ جناح بھائی اپنی نوعمر بیوی کی ہر طرح دیکھ بھال کررہے تھے۔ دونوں کو اس مبارک ساعت کا انتہائی بے چینی کے ساتھ انتظار تھا۔ جب ان کے گھر میں کسی معصوم بچے کی کلکاریوں کی آواز گونجے گی۔ کراچی میں اس زمانے میں کوئی میٹرنٹی ہوم نہ تھا اور اچھی اور تجربہ کار دائیاں بھی بہت کم تھیں۔ کھارادر میں چونکہ بڑے بڑے تاجر رہتے تھے لہٰذا وہاں چند دائیاں بھی آباد ہو گئی تھیں جو اپنے پیشے میں مشاق تھیں۔ انہی دائیوں میں سے ایک دائی کی خدمات جناح بھائی پونجا بھائی نے حاصل کیں اور اتوار کے دن ــــ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو ان کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا۔

یہ بچہ بہت کمزور تھا۔ دبلا پتلا جسم، لمبے لمبے ہاتھ، لمبوترا سر۔ والدین بچے کی صحت کے بارے میں کافی پریشان تھے۔ ڈاکٹروں کا کہنا تھا کہ کمزوری کے سوا بچے میں کوئی جسمانی نقص نہیں ہے لہٰذا تشویش کی کوئی بات نہیں مگر ڈاکٹر کے کہنے سے ماں کی تشویش اور اندیشے تو کم نہیں ہوتے۔

اب بچے کا نام رکھنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ اب تک اس خاندان میں جو کاٹھیاواڑ میں رہتا تھا، بیشتر مردوں کے نام ہندو ناموں سے ملتے جلتے تھے۔ لیکن سندھ مسلمانوں کا صوبہ تھا، مزید براں ہمسایوں کے بچوں کے اسلامی نام تھے۔ آخر میاں بیوی نے طے

کیا کہ ان کے پہلوٹھی کے بچّے کا نام محمد علی ہو گا۔

مٹھی بائی کو محمد علی سے بہت محبت تھی۔ اگرچہ ان کے چھ بچے اور ہوئے تاہم وہ زندگی بھر محمد علی سے بے پناہ محبّت کرتی رہیں۔ ان کے دوسرے بچے رحمت، مریم، فاطمہ، شیریں، احمد علی اور بندے علی تھے۔ یعنی چار لڑکیاں اور تین لڑکے۔

جناح بھائی پونجا بھائی کو اپنے کاروبار پر کافی توجّہ دینی پڑتی اور اکثر وہ رات گئے تک کام میں مصروف رہتے۔ مٹھی بائی کا اصرار تھا کہ وہ بچّے کے عقیقے کے لیے اُسے حسن پیر کی درگاہ پر لے کر چلیں جو پانیلی سے تقریباً دس میل دُور گینوڈ نامی گاؤں میں تھی۔ انھوں نے حسن پیر کی کرامات کے متعلق بہت کچھ سنا تھا۔ ماں کی حیثیت سے اُنھوں نے محسوس کر لیا ہو گا کہ محمد علی مستقبل کا ایک عظیم انسان ہو گا۔ لہٰذا وہ حسن پیر کی درگاہ تک جانے پر مُصر تھیں جہاں مخصوص روایتی انداز میں بچّے کا سر مُونڈا جاتا تھا اور اس دعا مانگتی تھی۔ پہلے تو جناح بھائی نے اپنی مصروفیات کا سہارا لے کر ٹالنا چاہا مگر بعد میں اُنھوں نے ہتھیار ڈال دیے اور دونوں میاں بیوی چند ماہ کے بچّے کو ساتھ لے کر بادبانی کشتی کے ذریعے کراچی سے کاٹھیاواڑ کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ویراول روانہ ہو گئے۔

ویراول پہنچ کر اُنھوں نے گینوڈ جانے کے لیے ایک بیل گاڑی کی اور بے شمار صعوبتیں اُٹھانے کے بعد آخر وہ حسن پیر کی درگاہ تک پہنچ ہی گئے جہاں محمد علی کا عقیقہ ہونا تھا۔[1]

حسن پیر کی زندگی کے متعلق حقائق اور ان کے پیروؤں کے عقائد آپس میں کچھ

---

[1] قائد اعظم کی ابتدائی زندگی کے متعلق واقعات فاطمہ بائی گنگ جی داؤدجی نے مصنف کو بتائے ہیں۔

اس طرح گڈمڈ ہو کر رہ گئے ہیں کہ ان میں امتیاز کرنا ممکن نہیں رہا۔ تاہم یہ ثابت ہو چکا ہے کہ حسن پیر اسمٰعیلی مبلغ کی حیثیت سے، بلوچستان کے راستے، ایران سے آئے تھے اور انھوں نے کچھ عرصے ملتان میں قیام کیا تھا۔ ان کی سادہ اور پاکباز زندگی نے نہ صرف مسلمانوں کو ان کا گرویدہ بنا لیا بلکہ بہت سے غیر مسلم بھی ان کے دست حق پرست پر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ اس کے بعد انھوں نے سندھ کے طول و عرض میں تبلیغ اسلام کی اور پھر کچھ سے گزر کر آخر پاٹن کے قریب ایک مقام پر ڈیرا ڈال دیا۔

کہا جاتا ہے کہ وہ مافوق الفطرت طاقتوں کے مالک تھے۔ ان سے کئی کرشمے اور کمالات منسوب کیے جاتے ہیں۔ ایسے بزرگوں کے متعلق جن کی خدمات اور کارنامے تاریخی اور دستاویزی شواہد کی صورت میں موجود نہیں ہوتے عام طور پر ایسی باتیں مشہور ہو جاتی ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ حسن پیر ان ملاں صوفیا کے مسلک کے پیرو تھے جن کی زندگی قرآن پاک اور اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ و ترویج اور معبود حقیقی کے عشق میں گزرتی۔ وہ رات کو جلد سو جاتے اور دو بجے اٹھ کر فجر کی نماز تک دریائے بھدر کے کنارے اپنے خیمے میں یاد الٰہی میں مشغول رہتے۔ ایک رات وہ حسب معمول ذکر الٰہی میں مدہوش تھے کہ پانی کی ایک زبردست لہر انھیں بہا کر لے گئی۔ وہ اس عالم میں بھی ان کی محویت ختم نہ ہوئی۔ اس طرح دریا میں ڈوب جانے سے ان کا وصال ہو گیا۔ ان کی نعش بہتی ہوئی پاٹن سے دور گینوڈ نامی گاؤں کے قریب پہنچ گئی۔ گینوڈ کی بیشتر آبادی رباری ذات کے غیر مسلموں پر مشتمل تھی جن کا پیشہ مویشیوں کی نسل کشی تھا۔

صبح سویرے کچھ رباری باشندے دریائے بھدر کے کنارے پہنچے تو انھیں کنارے پر ایک لاش نظر آئی۔ چونکہ حسن پیر کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی اس

سے لیے ان لوگوں نے لاش کی شناخت کرلی۔ بزرگوں کے مشورے سے گینوڈ کے باشندوں نے طے کیا کہ حسن پیر کی تجہیز و تکفین کی جائے اور ان کا مقبرہ تعمیر کیا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ حسن پیر کی درگاہ سے گاؤں خوشحال ہو جائے گا۔

اس طرح حسن پیر کو گینوڈ میں دفن کر دیا گیا۔ سالہا سال گزر جانے کے باوجود ریاست گونڈل کے لوگوں کی عقیدت آج بھی اسی طرح موجود ہے اور ہر سال ان کی درگاہ پر عرس ہوتا ہے جس میں ان کے ہندو اور مسلمان عقیدت مند جوق در جوق شرکت کرتے ہیں[1]۔

عقیقہ کے بعد ماں باپ بچّے کو لے کر اپنے گاؤں پانیلی آئے اور اس مرتبہ بھی اُنھوں نے بیل گاڑی کے ذریعے سفر کیا۔ پانیلی اور گونڈل میں چند ہفتے قیام کے بعد وہ کراچی واپس آگئے۔ جہاں جناح بھائی پھر اپنی کاروباری مصروفیات میں کھو گئے مگر ماں نے اپنی تمام تر توجّہ اور محبّت بچّے کے لیے مخصوص کر دی تھی۔

جناح بھائی پونجا بڑے کفایت شعار تھے وہ روپیہ پیسہ احتیاط سے صرف کرتے۔ نئے شہر میں کاروبار جمانے کے لیے اُنھیں پائی پائی کو سنبھال کر رکھنا پڑ رہا تھا۔ دولت کی دیوی عجیب و غریب مزاج رکھتی ہے یہ آج آپ پر مہربان ہو سکتی ہے لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ کل اس کا مزاج کیا ہوگا۔

محمد علی چھ سال کے ہُوئے تو ان کو گھر پر گجراتی کی تعلیم دینے کے لیے ایک اُستاد کا انتظام کیا گیا۔ والدین کا خیال تھا کہ بچّے کی عمر ابھی کم ہے۔ اسے اسکول میں داخل کرانا مناسب نہیں۔ علاوہ ازیں نزدیک ترین اسکول بھی گھر سے خاصا دُور

---

[1] گجراتی کی ایک کتاب "خوجوں کی تاریخ" مصنفہ دینا نانجیانی اسسٹنٹ ریونیو کمشنر کچھ، صفحہ ۲۲۰، مطبوعہ ۱۸۹۲ء سے ماخوذ۔

تھا اور بچّے کے لیے پیدل اسکول آنا جانا مشکل ہوتا۔ محمد علی فطرتاً چاق و چوبند اور ذہین تھے۔ انھیں گھر پر بیٹھے سبق یاد کرتے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ وہ زیادہ وقت آس پاس کے ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل کود میں گزارتے۔ ہمجولیوں میں وہ بہترین کھلاڑی مشہور تھے۔ دوسرے لڑکے محمد علی کو اپنا استاد سمجھتے اور وہ بھی خود کو ایک طرح دوسرے ساتھیوں سے ممتاز گردانتے۔ جب محمد علی نو سال کی عمر کو پہنچے تو انھیں ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا گیا۔[1]

ایک سال بعد جناح بھائی نے سوچا کہ محمد علی کو گھر سے دور کسی اسکول میں داخل کرنا بہتر ہوگا کیونکہ کھارادر کے بچوں کی صحبت کا محمد علی کی تعلیم پر بُرا اثر پڑ رہا تھا۔ یہ بچّے ان کو لکھنے پڑھنے کی بجائے گولیاں، گُلی ڈنڈا اور کرکٹ کھیلنے کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے۔ باپ نے فیصلہ کیا کہ محمد علی کو سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرا دیا جائے۔ یہ ایک ہائی اسکول تھا اور نیونہام روڈ پر ان کے مکان سے تقریباً ایک میل دُور واقع تھا۔ سندھ کے مسلمانوں کے عظیم تعلیمی رہنما، خان بہادر حسن علی آفندی نے یہ اسکول قائم کیا تھا۔ تاہم اسکول کی تبدیلی سے محمد علی کے رویّہ پر کوئی اثر نہ پڑا اور وہ تعلیم سے زیادہ کھیل کود ہی میں دلچسپی لیتے رہے۔

سندھ مدرسۃ الاسلام کے انگریزی شعبے میں داخل ہونے والے طالب علموں کے جنرل رجسٹر سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی کو اس اسکول میں ۴ جولائی ۱۸۸۷ء کو داخل کیا گیا تھا اور وہ ایک سو چودھویں طالب علم تھے۔ دوسرے اندراجات کے مطابق اُن کا نام محمد علی جناح اور جائے پیدائش کراچی تھی۔ یوم پیدائش درج نہ تھا۔ عمر ۱۴ سال،

---

[1] قائدِ اعظم کی بچپن کی زندگی سے متعلق یہ امور ان اطلاعات پر مبنی ہیں جو مصنف کو فاطمہ بائی جی جی دیجی پونجا سے دستیاب ہوئی ہیں۔

فرقہ خوجہ۔ سابقہ تعلیم اسٹینڈرڈ چہارم گجراتی، فیس معاف ہے یا ادا کی جاتے گی، ادا کی جائے گی اور جماعت جس میں داخلہ مطلوب ہے، اسٹینڈرڈ اوّل ہے۔ اسکول کے رجسٹر کے اندراجات کے مطابق وہ سندھ مدرسہ چھوڑ کر بمبئی چلے گئے لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ انھوں نے سندھ مدرسہ کب چھوڑا؟ دوسرا اندراج جس کا نمبر شمار ۱۰۰ ہے یہ ظاہر کرتا ہے کہ ۲۳ دسمبر ۱۸۸۷ء کو محمد علی جناح کو سندھ مدرسہ میں دوبارہ داخل کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی جانے کے تقریباً ساڑھے پانچ مہینے بعد وہ سندھ مدرسہ میں دوبارہ داخل کیے گئے۔ ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء اور سابقہ تعلیم کے خانے میں انجمن اسلام بمبئی اسٹینڈرڈ اوّل درج ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے انجمن اسلام بمبئی میں چند مہینے تعلیم حاصل کی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان کے والدین نے انھیں بمبئی کیوں بھیجا اور چند مہینے بعد ہی دوبارہ کراچی کیوں بلا لیا؟ لیکن سندھ مدرسہ کے اندراج نمبر ۱۰۰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خوجہ فرقہ کے ایک اور لڑکے کریم جعفر کو بھی اسی دن سندھ مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ کریم جعفر کی سابقہ تعلیم بھی اسٹینڈرڈ اوّل انجمن اسلام بمبئی اور جائے پیدائش بمبئی درج ہے۔ کریم جعفر نے ۱۸ مئی ۱۸۸۸ء کو سندھ مدرسہ چھوڑ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ داخلے کے پانچ مہینے بعد انھوں نے یہ اسکول چھوڑا اور اس کا سبب رجسٹر کے اندراجات کے مطابق بمبئی روانگی ہے۔ ایک ہی تاریخ کے ان دو اندراجات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض اتفاقی امر نہ تھا بلکہ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ محمد علی جناح اور کریم جعفر رشتہ دار تھے۔ بمبئی میں محمد علی جناح نے کریم جعفر کے ہاں قیام کیا تھا۔ بمبئی سے دونوں ساتھ ساتھ کراچی آئے اور یہ کہ کریم جعفر کراچی میں جناح بھائی پونجا کے ہاں تقریباً پانچ مہینے رہے اور بعد ازیں بمبئی روانہ ہو گئے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ دونوں خاندانوں میں کیا رشتہ تھا۔

محمد علی اسٹینڈرڈ چہارم میں تھے کہ ۵ جنوری ۱۸۹۱ء کو انھوں نے سندھ مدرسہ چھوڑ دیا۔ اس کا سبب رجسٹر کے اندراجات کے مطابق طویل غیر حاضری ہے۔ سندھ مدرسہ کے زمانۂ طالب علمی کے متعلق ایک شہادت، اسکول کے رجسٹر کا اندراج نمبر ۲۰۴ ہے۔ ۹ فروری ۱۸۹۱ء کے ذیل میں جو کوائف بیان کیے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

نام محمد علی جناح بھائی۔ جائے پیدائش کراچی۔ تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء۔ فرقہ خوجہ۔ سابقہ تعلیم۔ اسٹینڈرڈ چہارم۔ فیس ادا کی گئی کہ نہیں، ادا کی گئی۔ جس جماعت یا اسٹینڈرڈ میں داخلہ مطلوب ہے، چہارم۔ اسکول چھوڑنے کی تاریخ، ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء۔ جس سٹینڈرڈ سے سکول چھوڑا، اسٹینڈرڈ پنجم۔ اسکول چھوڑنے کا سبب، شادی کے لیے کچھ روانگی۔

ان کوائف سے ظاہر ہوتا ہے کہ محمد علی جناح نے گجراتی کے اسٹینڈرڈ چہارم میں کامیاب ہونے کے بعد ۴ جولائی ۱۸۸۷ء سے ۳۰ جنوری ۱۸۹۲ء، یعنی تقریباً ساڑھے چار سال تک سندھ مدرسہ میں تعلیم حاصل کی۔ اس میں ان کا انجمن اسلام بمبئی میں طالب علمی کا مختصر زمانہ بھی شامل ہے۔ وہ اسٹینڈرڈ اول میں داخل ہوئے (۱۸۸۷ء) اور (۱۸۹۲ء) میں اسکول چھوڑتے وقت وہ اسٹینڈرڈ پنجم میں تھے۔ اس سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ حاضری کے بارے میں سنجیدہ نہ ہونے کے باوجود وہ ہر سال کامیاب ہوتے رہے۔

دو مختلف اندراجات کے مطابق ان کی تاریخ پیدائش ۲۰ اکتوبر ۱۸۷۵ء ہے، جس سے ان کی سرکاری تاریخ پیدائش ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کی صحت کے بارے میں شبہ ہوتا ہے، لیکن اس امر سے زیادہ مستند کیا بات ہو سکتی ہے کہ قائداعظم نے ہمیشہ اپنی سالگرہ ۲۵ دسمبر کو منائی۔ سندھ مدرسے کے رجسٹر کے اندراجات کے مطابق اس اسکول میں طالب علمی کے دوران میں ان کے نام کی ہجے دو مرتبہ تبدیل ہوئی۔ اس کے بعد بھی اس میں تبدیلیاں

ہوئیں تا آنکہ ان کا نام محمد علی جناح ہو گیا۔

دس سال کی عمر کے بعد محمد علی کو گھڑسواری سے دلچسپی ہو گئی۔ ان کے والد کے پاس کئی بگھیاں تھیں جو اس زمانے میں امارت کی نشانی سمجھی جاتی تھیں۔ اصطبل میں کئی عمدہ گھوڑے تھے۔ محمد علی نے جلد ہی شہسواری سیکھ لی اور انھیں ہمیشہ اس سے شغف رہا۔ اسکول میں ان کا ایک دوست کریم قاسم نامی تھا۔ جو کھارادر کے ایک تاجر کا بیٹا تھا۔ دونوں دوست روزانہ گھوڑوں پر سوار ہو کر دور نکل جاتے تھے۔[1]

انھیں اپنے گھوڑوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ قوت و اعتماد کے مظہر یہ جانور سینہ تانے اور سر اٹھائے انھیں بہت بھلے لگتے تھے۔ انھیں تناور اور سربلند مظاہر فطرت نے ہمیشہ متاثر کیا۔ گھوڑے اپنا سر بلند رکھتے ہیں اور درخت اور پھول بھی۔ انسان بھی پرندوں اور درندوں کی طرح تن کر چلتا ہے۔ یہی حال میناروں اور گنبدوں کا ہے جن کی عظمت، آسمان کی بلندیوں سے باتیں کرتی نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنی زندگی کا یہ اصول وضع کر لیا کہ وہ نہ صرف مستقبل پر نظر رکھیں بلکہ ان کا سر بھی ہمیشہ بلند رہے گا۔ وہ مشکلات کے سامنے جھکنے کے بجائے ان کا مقابلہ کریں گے اور ان پر غالب آئیں گے۔ جیسے کہ عظیم اور تناور درخت کی طرح جسے طوفان اکھاڑ تو سکتا ہے، جھکا نہیں سکتا۔ محمد علی دن کو اسکول میں وقت گزارتے اور شام کے وقت گھڑسواری سے دل بہلاتے۔

وہ سولہ برس کے سن کو پہنچ گئے تھے مگر ابھی تک اسٹینڈرڈ پنجم ہی میں تھے۔ انھیں تعلیم سے زیادہ کھیل کود سے دلچسپی تھی۔ ان کے والدان کی اس روش سے متفکر تھے مگر والدہ کو یقین تھا کہ بیٹے کا مستقبل تابناک ہے۔ جناح بھائی

---

[1] کریم قاسم نے مصنف کو یہ اطلاع فراہم کی ہے

کی تجارت خوب چمک اُٹھی تھی اور ان کا شمار کراچی کے ممتاز تاجروں میں ہونے لگا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بیٹا جلد ہی کسی قابل ہو جائے تاکہ ان کی ذمہ داریوں کا بوجھ کچھ کم ہو سکے ——— گراہمس شپنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی کی معرفت ان کا کاروبار خاصا بڑھ گیا تھا۔ اس جہازران کمپنی کے ذریعے ان کا مال یورپ اور مشرق بعید کو برآمد کیا جاتا تھا۔ کاروبار کے سلسلے میں وہ اکثر اس فرم کے جنرل مینیجر فریڈرک لیہہ کرونٹ سے ملتے۔ محمد علی کے مستقبل کے بارے میں بھی گفتگو کرتے۔ کرونٹ نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ محمد علی کو لندن بھیج دیں۔ کچھ ردّوکد کے بعد باپ نے بیٹے کو اس خیال سے لندن بھیجنے کی ہامی بھرلی کہ شاید اس طرح اس کی زندگی میں کوئی راہِ عمل متعین ہو جائے۔

مٹھی بائی کو اپنے بیٹے سے بہت محبّت تھی اور لندن کافی دُور تھا۔ جہاں سے بیٹے کی واپسی دو تین سال میں ہونے کی توقع تھی۔ بیٹے کے بغیر اتنا طویل عرصہ ماں کی مامتا کس طرح گزار سکتی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوری ۱۸۹۲ء میں محمد علی نے یورپ جانے کے لیے سندھ مدرسہ چھوڑا تھا اور اسکول کے رجسٹر میں یہ اندراج کہ "شادی کے لیے گئے ہیں"۔ یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کے والدین نے انگلستان روانگی سے قبل ان کی شادی کر دینے کا فیصلہ کیا تھا۔

والدین نے شادی کا فیصلہ تو کر لیا مگر بہو کسے بنائیں؟

ماں نے اس سوال کا جواب تلاش کر رکھا تھا۔ پانیلی کے ایک اسمٰعیلی خوجہ خاندان سے ان کی دُور کی قرابت داری تھی اور اس خاندان میں ایک لڑکی موجود تھی ایمی بائی۔ اس زمانے میں اولاد کی شادی کا بندوبست کرنا والدین کی ذمہ داری تھی اور لڑکے یا لڑکی کو اس سلسلے میں کچھ کہنے سننے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ انھیں

اپنے والدین کے تدبّر پر اعتماد کرنا ہوتا۔ والدین بھی اپنی اولاد کے بُرے بھلے کو خوب سمجھتے تھے۔[1]

غالباً قائداعظم کی زندگی میں صرف یہی ایک اہم فیصلہ ہے جو ان کے علاوہ کسی اور شخص نے کیا۔ انھیں دنیاوی معاملات میں اپنے والد کی دانش مندی اور تدبر پر اعتماد تھا کہ وہ ان کی جانب سے کسی غلطی کا خیال تک دل میں نہ لا سکتے تھے۔ انھوں نے سعادت مند بیٹے کی طرح والدین کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا اور اس طرح پانیلی کی ایمی بائی سے ان کی منگنی ہوگئی۔

انھیں زندگی کے میدان میں خود آگے بڑھنے اور تجربہ حاصل کرنے کا انتہائی شوق تھا۔ بنابریں انھیں یہ بات ناپسند تھی کہ دوسرے لوگ انھیں یہ بتائیں کہ کیا کرنا چاہیئے اور کیا نہیں۔ یا کیا بات ان کے حق میں ہے اور کیا ان کے خلاف بچپن کی یہ عادت ہی آئندہ ہنگامہ خیز زندگی میں ان کی رہنمائی۔ مگر بیوی کے انتخاب کے سلسلے میں انھوں نے ایک سعادت مند اور اطاعت گزار بیٹے کی طرح والدین کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا۔

ماں باپ اور بیٹا کراچی سے کشتی میں ویراول روانہ ہوئے۔ وہاں سے بارات بیل گاڑیوں کے ذریعے پانیلی پہنچی۔ پانیلی کے لوگوں کو یقین تھا کہ جناح بھائی کراچی جیسے بڑے شہر میں لکھ پتی بن گئے ہیں۔ ان کا سامان تجارت بڑے بڑے سمندری جہازوں کے ذریعے دساور جاتا ہے۔ ان کے پاس بگھیاں، گھوڑے اور عالی شان مکانات ہیں۔ گاؤں کے سیدھے سادے باشندے جناح بھائی کے متعلق اسی قسم کی باتیں کرتے۔ پونجا خاندان کو ان پر فخر تھا۔

---

[1] یہ بلا واقعات ان اطلاعات پر مبنی ہیں جو مصنف کو کریم قاسم سے دستیاب ہوئی ہیں۔

جناح بھائی اپنے خاندان اور گاؤں کے لوگوں کو نہیں بھولے تھے۔ وہ رشتے داروں، دوستوں اور بزرگوں کے لیے بہت سے تحائف لے کر آئے تھے۔ شادی کے موقع پر خاصا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہر طرف پٹاخوں کی گھن گرج تھی اور دُور دُور تک آتش بازی کی روشنی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ نقاروں کی آواز، پورے گاؤں ہی میں نہیں، آس پاس تک گُونج رہی تھی۔

یہ معمولی سا گاؤں خُوب سجایا گیا تھا اور دعوت میں گاؤں کے تمام لوگ مدعو تھے جناح بھائی نے روپیہ پانی کی طرح بہایا۔ آخر یہ ان کے بڑے بیٹے کی شادی تھی خدا جانے دوسرے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادی کراچی میں ہو یا بمبئی میں۔

ان ہنگاموں میں دُولہا کے جو کچھ خیالات تھے ان کا اندازہ لگانا آسان نہیں۔ وہ ابھی سولہ سال کا بھی نہ تھا کہ زندگی کی یہ بھاری ذمہ داری اس کے شانوں پر رکھ دی گئی۔ اس نے اپنی رفیقۂ حیات کا چہرہ اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اور نہ کبھی اس سے ایک لفظ کہنے سننے کا موقع ملا تھا۔ اُسے بس اتنا خیال تھا کہ اس نے اپنی زندگی کی راہیں خود استوار کرنے کے لیے جو راستہ اختیار کیا تھا اسے اس سے ہٹ کر چلنا پڑا ہے۔ وہ مقدر کے سامنے بےبس تھا جس نے اس کی ماں کے رُوپ میں یہ فیصلہ کر دیا تھا کہ ایمی بائی سے اس کی شادی ہونی چاہیے۔

محمد علی سر سے پاؤں تک پھولوں میں چھپے ہوئے بارات کے ساتھ اپنے دادا کے مکان سے سسر کے مکان تک گئے۔ جہاں چودہ سالہ ایمی بائی دُلہن بنی بیٹھی تھیں۔ زرق برق لباس میں ملبوس، زیورات سے لدی پھندی، عطر میں بسی ہوئی۔ نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ قرآن پاک کی آیات پڑھی گئیں اور دُولہا دُلہن رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔[1]

---

[1] یہ حالات ان اطلاعات پر مبنی ہیں جو مصنف کو جان جی بھائی پیرجی پانیلی والا اور ان کی اہلیہ سے دستیاب ہوئی ہیں۔

بارات کراچی واپس آئی۔ محمد علی اور ان کی بیوی ایمی بائی نیو ہنام روڈ پر جناح بھائی کے مکان میں قیام پذیر ہوئے۔ ان کی روانگی کی تاریخ قریب آ رہی تھی اور وہ اس طویل سفر کی تیاری کر رہے تھے جس کی منزل ایک اجنبی اور نامانوس دیس تھا۔

قائد اعظم اور محترمہ فاطمہ جناح

میں بیرسٹر بنوں گا

جہاز انگلستان کی طرف رواں دواں تھا اور محمد علی جناح کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات کا طوفان برپا تھا۔ وہ ایک اجنبی، دور دراز دیس کو جا رہے تھے۔ اُن دنوں انگلستان کا سفر ایک عام ہندوستانی کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا۔ اس لیے اس سولہ سالہ نوجوان کو تنِ تنہا جاتے دیکھ کر دوسرے مسافروں کو یقیناً تعجب ہُوا ہوگا۔

محمد علی لندن پہنچے تو سردی اپنے شباب پر تھی اور چونکہ وہ اس موسم کے عادی نہ تھے اس لیے وہاں کی زندگی انھیں بڑی خشک اور بے جان محسوس ہوئی۔ کئی سال بعد انھوں نے اس کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا: میرے سامنے ایک اجنبی دیس اور نامانوس ماحول تھا۔ میں لندن میں کسی شخص سے واقف نہ تھا۔ پھر اور سردی نے بھی مجھے خاصا پریشان کیا مگر جلد ہی یہ وحشت ختم ہوگئی اور میں ہنسی خوشی رہنے لگا۔[1]

انھیں لندن میں خاصی مدت قیام کرنا تھا اور ہوٹل میں چونکہ کافی خرچ آتا تھا لہٰذا وہاں ٹھہرنا مناسب نہ تھا۔ وہ روزانہ اخباروں کے اشتہار دیکھتے اور چند ایسے خاندانوں کے پتے نوٹ کر لیتے جو کرائے پر کمرے دینے کے ساتھ کھانے کی ذمہ داری بھی لیتے

---

[1] دی امورٹل ایرز۔ سر ایولین رینچ۔ صفحہ ۱۳۲۔ ہچن سن۔ لندن مطبوعہ ۱۹۴۵ء

کو تیار تھے۔ آخر انھیں موجودہ اولمپیا کے بالمقابل ۳۵ رسل روڈ کینسنگٹن میں، رہائش کے لیے جگہ مل گئی (اولمپیا کی موجودہ عمارت ۱۸۹۲ء کے خاصے عرصے بعد تعمیر ہوئی تھی) اب بھی رسل روڈ لندن کا خاصا معقول رہائشی علاقہ ہے جس کے آس پاس زیرِ زمین دور تک ریل کی پٹڑیاں نظر آتی ہیں۔ لندن کاؤنٹی کونسل نے چند سال پہلے نمبر ۳۵ رسل روڈ پر ایک تختی لگا دی تھی جس پہ تحریر ہے۔ "بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح (۱۸۷۶-۱۹۴۸ء) نے اس مکان میں ۱۸۹۵ء میں قیام کیا۔"

ان دنوں جبکہ برطانیہ میں لبرل ازم کی تحریک مقبول ہو رہی تھی وہ انگلستان کے قیام سے مستفید ہونے کے خواہش مند تھے۔ انھوں نے انگریزوں کی اس مخصوص عادت کو اپنا لیا تھا کہ صبح سویرے بیدار ہوتے ہی اخبار کا مطالعہ کریں اور ناشتا ختم کرنے سے پہلے مطالعہ مکمل کر لیں۔ وہ برطانیہ کے بڑے بڑے سیاسی لیڈروں کے کارناموں اور پارلیمنٹ اور دیگر اجتماعات میں ان کی تقریروں کا بڑے شوق سے مطالعہ کرتے۔ وہ جہاں بھی جاتے، ان سیاسی لیڈروں کے خیالات کے بارے میں لوگوں کو جوش و خروش سے تبادلۂ خیالات کرتے سنتے۔ ان لیڈروں کو تاریخ کے ان ہنگامہ خیز ایام میں برطانیہ کی کشتی کا کھیون ہار سمجھا جاتا تھا۔ اگر وہ کراچی واپس آکر اپنے والد کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتے تو ممکن ہے کہ وہ خود بھی بڑے تاجر بن جاتے اور سونے چاندی میں کھیلتے۔ یہ درست ہے کہ دولت زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہے مگر اس دولت کے سہارے وہ ایک عوامی رہنما اور اپنی قوم کے ہیرو نہیں بن سکتے تھے۔ انگلستان کے اخبارات کے صفحے سیاسی لیڈروں کی تعریف و تحسین سے پُر ہوتے تھے شاید انھیں یہ علم ہو گیا تھا کہ ان میں سے بیشتر لیڈر بیرسٹر رہ چکے تھے اور قانون سے واقفیت ہی کی بدولت وہ عوامی زندگی میں اتنے کامیاب تھے۔

محمد علی جناح ۱۸۹۲ء کے آغاز میں کراچی سے یورپ روانہ ہوئے تھے۔ اس وقت

وہ سندھ مدرسہ کے اسٹینڈرڈ پنجم میں تھے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ کس مقصد سے انگلستان گئے تھے؟ حتمی طور پر اس سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا مگر یہ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بچپن میں ایک بار کسی وکیل کو سیاہ چغہ میں دیکھ کر کہا تھا کہ میں بیرسٹر بنوں گا۔[1] ان کی یہ خواہش جو بچپن سے ان کے دل و دماغ میں پرورش پا رہی تھی لندن جاکر اور پختہ ہوگئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا یہ فیصلہ زندگی کا ایک اہم ترین فیصلہ تھا اور اس نے ان کی زندگی کا رُخ ہی بدل دیا۔ انھوں نے اپنے نصب العین کے تعین کے بعد اپنا تمام وقت اور توانائی اس مقصد کے حصول کی راہ میں صرف کردی تاکہ انھیں اپنے ملک میں ایک نمایاں مقام حاصل ہوسکے۔ انھوں نے اپنے فیصلے کے بعد ۱۸۹۲ء میں لنکن ان میں داخلہ لیا اور قانون کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔

۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان سے قبل کراچی بار ایسوسی ایشن کے سپاس نامے کے جواب میں انھوں نے اس امر کی وضاحت کی تھی کہ انھوں نے قانون کی تعلیم کے لیے کسی دوسرے ادارے کے بجائے لنکن ان میں داخلہ کیوں لیا تھا؟ انھوں نے فرمایا تھا کہ ایک مسلمان کی حیثیت سے میرے دل میں رسول اکرمؐ کی، جن کا شمار دنیا کے عظیم ترین مدبروں میں ہوتا ہے، بہت عزت تھی۔ ایک دن اتفاقاً میں لنکن ان گیا اور میں نے اس کے دروازے پر پیغمبر اسلام کا اسم مبارک کندہ دیکھا۔ میں نے لنکن ان میں داخلہ لے لیا کیونکہ اس کے دروازے پر کندہ دنیا کے عظیم قانون سازوں کی فہرست میں آنحضرتؐ کا اسم مبارک بھی شامل تھا۔

---

[1] دی امپیریل پریس بیسر یونین بورنج، صفحات ۱۲۲/۳، اکتوبر ۱۹۴۵ء، بین سن لندن۔

قائداعظم کو لندن گئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ان کی اہلیہ ایمی بائی کا انتقال ہوگیا۔ وہ اپنی کم سن اہلیہ کے ساتھ، جن سے انھوں نے والدین کے اصرار پر شادی کی تھی، زیادہ وقت نہ گزار سکے تھے۔ مگر لنکن اِن میں طالب علمی کے دوران میں جب انھیں یہ خبر ملی کہ زچگی میں ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا ہے تو انھیں انتہائی صدمہ ہُوا۔ انھیں دُنیا میں سب سے زیادہ اپنی ماں سے محبّت تھی۔ وہ بڑے زُود حس تھے اور اس زود حسی کے سبب اکثر انھیں اذیّت اُٹھانی پڑتی۔ انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ وہ آخری ایّام میں والدہ کا دیدار بھی نہ کر سکے۔

والدہ کے انتقال کے بعد ان کے والد کو تجارت میں پے درپے نقصان ہونے لگا۔ جناح بھائی پُونجا بہت پریشان تھے۔ چھ بچّوں کی نگہداشت کا بار ان کے کاندھوں پر آپڑا تھا۔ ان حالات میں صرف محمد علی ہی ان کا ہاتھ بٹا سکتے تھے مگر وہ کوسوں دُور لندن میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔

جب قائدِ اعظم کی اہلیہ اور والدہ کا انتقال ہُوا تو اس وقت ان کی عمر ۱۸ سال تھی۔ گھر سے موصول ہونے والے خطوط سے انھیں معلوم ہُوا کہ باپ نے شب و روز محنت سے جو کاروبار جمایا تھا اس کی حالت انتہائی زبوں ہے۔ مصیبتیں اور پریشانیاں بعض لوگوں میں ایک پوشیدہ قوت اور جذبے کو بیدار کر دیتی ہیں۔ قائداعظم نے انتہائی صبر و ضبط کے ساتھ ان پریشانیوں کا مقابلہ کیا اور طے کر لیا کہ ہر صورت میں کامیابی حاصل کر کے خاندان کے نام کو روشن کریں گے۔

لنکن اِن میں زمانۂ طالب علمی کے دوران میں انھوں نے اپنا نام مختصر کر کے ایم اے جناح رکھ لیا تھا۔ ان کی دلچسپیاں متنوع تھیں۔ انھوں نے برٹش میوزیم لائبریری میں مطالعہ کرنے کی اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا اور اپنا بیشتر وقت مطالعے میں صرف کرتے۔ بسا اوقات اتوار کو وہ ہائڈ پارک چلے جاتے اور دنیا کی اس مشہور جلسہ گاہ

ہیں حکومت پر غیر ذمہ دار لوگوں کی کڑی تنقیدیں سنا کرتے۔ وہ پابندی کے ساتھ دارالعوام جاتے اور گلیڈ اسٹون، لارڈ مورلے، جوزف چیمبرلین، بالفور، ٹی پی او کنور وغیرہ جیسے آزاد خیال مدبروں کی تقریریں سنتے۔ دارالعوام کے مباحث سننے کے سبب وہ پارلیمانی آداب سے بخوبی واقف ہو گئے اور آئندہ زندگی میں اس سے انھیں کافی فائدہ پہنچا۔

انتہائی محنت اور جانفشانی کے سبب انھوں نے امتحانات میں دو سال کے قلیل عرصے میں کامیابی حاصل کرلی۔ وہ پہلے ہندوستانی طالب علم تھے جس نے ۱۸ سال کی عمر میں بیرسٹری کی تعلیم مکمل کرلی۔ مگر ابھی انھیں انگلستان میں کچھ عرصہ مزید قیام کرنا تھا تاکہ رسمی دعوتوں کی مخصوص تعداد مکمل کرنے کے بعد بیرسٹر کی ٹوپی اور چغہ حاصل کرسکیں۔ ایک دفعہ ان کے سیکرٹری ایم۔ ایچ سید نے ان سے لنکن ان میں تعلیم کے متعلق دریافت کیا تو انھوں نے مزاحاً فرمایا "تعلیم کا مشکل مرحلہ صرف یہ تھا کہ ان کے چند بڑے اراکین یا دیگر ممتاز وکلا کے اعزاز میں تقریباً بائیس ڈنر دیے جائیں"[1]۔ وہ امتحان میں کامیابی کے لیے محض کتابی کیڑا بن جانے کے قائل نہ تھے۔

انھوں نے لندن میں زیرِ تعلیم ہندوستانی طالب علموں کے مسائل سے دلچسپی لینی شروع کر دی۔ قائداعظم کے انگلستان وارد ہونے کے پہلے سال کے دوران میں ہندوستانی طالب علموں میں خاصی گہما گہمی پائی جاتی تھی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ بمبئی کے ایک ممتاز پارسی لیڈر دادا بھائی نوروجی، جو کئی سال سے تاجر کی حیثیت سے لندن میں مقیم تھے، سنٹرل فنس بری کے حلقے سے دارالعوام کا انتخاب لڑ رہے تھے۔ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے برطانوی انتخابات میں حصہ لینے کی جرأت کی تھی اور یہ قدرتی امر تھا کہ ہندوستانی طلبہ ان کے حق میں جوش و خروش سے کام کرتے۔ قائداعظم نے بھی خود کو اس انتخابی مہم

---

[1] محمد علی جناح۔ مطلوب حسن سید۔ صفحہ ۳۔ مطبوعہ ۱۹۴۵ء شیخ محمد اشرف لاہور۔

کے لیے وقف کر دیا اور یوں انھیں ہندوستان کے اس عظیم فرزند سے قریب ہونے کا موقع ملا۔

انگلستان کی چند ممتاز سیاسی شخصیتیں دادا بھائی کے امیدوار ہونے سے سخت جز بز تھیں اور انھوں نے اس انتخاب کو نسلی رنگ دے دیا تھا۔ انگلستان کے وزیراعظم لارڈ سالسبری نے ایک تقریر کے دوران میں ہندوستانی امیدوار کو کالا آدمی کہہ دیا جس سے ہندوستانی طالب علموں کے قوم پرستانہ جذبات کو ٹھیس پہنچی۔ ان طلبہ میں محمد علی جناح ورسی آر داس آگے آگے تھے۔ اس سے دادا بھائی کو ایک فائدہ بھی ہُوا وہ یہ کہ اس طرح انھیں اپنے حلقۂ انتخاب کے آزاد خیال ووٹروں کی ہمدردی حاصل ہوگئی۔ بی سی رے کا بیان ہے کہ "یوں یہ مقابلہ نہ صرف ذاتی مقابلہ تھا بلکہ نسلی گھمنڈ کا بھی اظہار بن گیا تھا۔ اس سے سنٹرل فنس بری کے ووٹروں میں انتہائی جوش پیدا ہوگیا۔ اور نوروجی بآسانی دارالعوام کے رکن منتخب ہوگئے"[۱]

قائداعظم دادا بھائی نوروجی سے بہت متاثر تھے اور ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ان کی آئندہ سیاسی شخصیت کی تشکیل میں دادا بھائی نوروجی کا بڑا ہاتھ تھا۔ اگرچہ دونوں کی عمروں میں بہت فرق تھا تاہم ان میں انتہائی مخلصانہ تعلقات تھے اور ان دونوں نے آل انڈیا کانگریس کے قیام کے ابتدائی عرصے میں بے مثال خدمات انجام دیں۔ برطانوی عوامی زندگی پر جس آزاد خیالی کی چھاپ پڑ رہی تھی، نوجوان محمد علی جناح اس کے مشاہدے سے اپنی سیاسی زندگی کا پہلا سبق حاصل کر رہے تھے۔ انھیں بخوبی اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندوستان کو اپنی آزادی کے لیے زبردست جدوجہد کرنی پڑے گی اور اس جدوجہد آزادی میں وہ ایک اہم کردار ادا کرنا چاہتے تھے۔

۱۔ لائف اینڈ ٹائمز آف سی آر داس۔ پی سی رے۔

چند سال بعد اُنھوں نے جو بیان دیا اس میں ان کے اس احساس کی جھلک نمایاں تھی۔ اُنھوں نے فرمایا "بمبئی دوسرا بوسٹن بن جائے گا۔ اس مرتبہ سمندر میں چائے کی پیٹیاں نہیں پھینکی جائیں گی بلکہ انگریزوں سے لدی ہوئی گاڑیاں سمندر کی نذر کی جائیں گی۔" ایک اور موقع پر ہندوستان کے لیے آزادی کی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے اور برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے لیے دادا بھائی کی خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں جناح صاحب نے فرمایا "میری خواہش ہے کہ لندن میں قیام کروں دپارلیمنٹ کا رکن بن جاؤں اس طرح میں کچھ اثر ورسوخ پیدا کر سکوں گا۔ وہاں میں برطانوی مدبّروں سے برابر کی حیثیت سے ملوں گا۔ ان تک میری پہنچ ہوگی، ان معنوں میں نہیں کہ میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگوں گا اور ان سے ملاقات کرنے کی کوشش کروں گا بلکہ اس لیے کہ انھیں میری ضرورت محسوس ہوگی اور مجھے ان کی۔"[1]

انگلستان میں قیام کے دوران اُنھوں نے محسوس کیا کہ ہندوستانی طلبہ میں کوئی رابطہ اور اشتراک عمل موجود نہیں ہے اور اس رابطے کے فقدان کی صورت میں وہ مؤثر طور پر اپنے یا اپنے ملک کے مقاصد کے سلسلے میں کوئی خدمت انجام نہیں دے سکتے۔ انھوں نے سوچا کہ ہندوستانی طلبہ اگر اپنی کوئی انجمن بنالیں تو انھیں ملنے جلنے اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہونے کا موقع ملے گا اور اس سے انھیں خاصا فائدہ پہنچے گا۔ اُنھوں نے اس مسئلے پر کئی طالب علموں سے بات چیت کی مگر ہر طرف سے ان کو مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ان جیسے نوجوان اور ناتجربہ کار طالب علم کے لیے یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے تاہم یہ خیال ان کے ذہن میں موجود رہا اور ۱۹۱۲ء میں جب وہ ایک ممتاز ہندوستانی لیڈر کی حیثیت سے

---

[1] لیڈرس آف انڈیا۔ چاتھم ملوا۔ صفحہ ۶۵۔ مطبوعہ ۱۹۴۲ء ٹھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی۔

انگلستان گئے تو ہندوستانی طلبہ نے انھیں گھیر لیا۔ لندن کے کیکسٹن ہال میں ہندوستانی طلبہ کے ایک جلسے کا انتظام کیا گیا اور قائداعظم کو اس جلسے سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ انھوں نے ہندوستانی طلبہ کو نصیحت کی کہ وہ انگلستان اور ہندوستان کے سیاسی مسائل میں اور زیادہ دلچسپی لیں لیکن سیاست میں عملی حصّہ نہ لیں بلکہ پہلے اپنی تعلیم مکمل کریں۔ انھیں صرف تعلیمی سیاسی مفکّر ہونا چاہیئے تاکہ جب وہ عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھیں تو روشن خیالی اور ترقّی کے مبلّغ کی حیثیت سے کام کر سکیں۔ آپ نے فرمایا کہ طالب علم کی زندگی ایک مسلسل تجسّس کا نام ہے اور آپ محسوس کریں گے کہ تجربات میں اضافے کے ساتھ آپ کے خیالات بھی متنوع ہو جائیں گے۔ آپ کسی خیال کو اس وقت تک قطعی اور آخری نہ سمجھیں جب تک زندگی کے حقیقی میدان میں داخل نہ ہو جائیں اور اپنے عقائد کو عملی سیاست کی کسوٹی پر نہ پرکھ لیں۔ انھوں نے ہندوستانی طلبہ سے اپیل کی کہ ایک منظّم جماعت کی صورت میں اپنی تنظیم کریں۔ اس طرح لندن میں ہندوستانی طلبہ کی مرکزی تنظیم وجود میں آئی۔

نوع بنوع مطالعے کے سبب انھیں انگریزی زبان کے کئی ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے مطالعہ کا موقع ملا۔ زندگی کے آخری دنوں میں بھی وہ ان میں سے بہت سے ادیبوں کی نگارشات کا مطالعہ کرتے رہے۔ لیکن شیکسپیئر نے انھیں بہت متاثر کیا انھیں لندن تھیٹر جانے کا بہت شوق تھا مگر اپنی گوناگون مصروفیات کے سبب وہ تھیٹر سے زیادہ لطف اندوز نہ ہو سکے۔ کتابیں خریدنے اور لنکن اِن کے اخراجات کے پیش نظر وہ تھیٹر نہیں جا سکتے تھے۔ تاہم اکثر وہ شیکسپیئر کے ڈرامے دیکھنے کے لیے اولڈ وِک جاتے اور ان ڈراموں کے اہم اداکاروں نے انھیں بہت متاثر کیا کچھ عرصے تک ان کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں رہا کہ تھیٹر میں کام کیا جائے مگر شیکسپیرین ڈرامٹک کلب کی جانب سے انھیں ایک معمولی سا کردار پیش گیا تو انھوں نے تھیٹر

میں کام کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

چار سال کے اس عرصے میں انھوں نے کئی اہم فیصلے کیے جن کا ان کی زندگی پر خاص اثر پڑا۔ قدرت نے انھیں بہت سی صلاحیتیں ودیعت کی تھیں اور وہ ان صلاحیتوں کو رائگاں جانے دینے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ وہ شہرت اور اعلیٰ مقام حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ اگرچہ وہ سٹیج پر کام کرنا چاہتے تھے لیکن جب انھیں باقاعدہ ملازمت کی پیشکش کی گئی تو انھوں نے یہ پیشکش مسترد کر دی۔ اسٹیج کے اداکار کو تماش بینوں کی ایک محدود تعداد ہی کی جانب سے داد و تحسین مل سکتی ہے۔ قائداعظم ایک ایسے وسیع پلیٹ فارم پر پہنچنے کے خواہش مند تھے جہاں لاکھوں آدمی انھیں اپنا محبوب لیڈر گردانیں۔

لنکنز ان میں دعوتوں کی رسومات پوری ہونے کے بعد قائداعظم کراچی واپس آنے کی تیاریاں کرنے لگے۔ انگلستان میں چار سال قیام کے بعد اپنے خاندان سے ملنے کا تصور بڑا خوش آئند تھا۔

وہ بحری جہاز سے وطن روانہ ہوئے جو تین ہفتوں میں انگلستان سے ہندوستان آتا تھا۔ انھیں ان پریشانیوں اور مصائب کا خیال ستا رہا تھا جو ان کے والد کو درپیش تھیں۔ ان کے والد کو امید تھی کہ بڑے بیٹے کی حیثیت سے جناح ان کا بوجھ ہلکا کر سکیں گے۔ جہاز کراچی کی بندرگاہ میں لنگر انداز ہوا اور انھوں نے لوگوں کے ہجوم میں اپنے والد، بھائیوں، بہنوں اور چند رشتہ داروں کو دیکھا تو ان کی نگاہیں والدہ کو تلاش کرنے لگیں۔ وقت نے ان کے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا تھا! کاش وہ اس وقت زندہ ہوتیں تو اس بات سے انھیں کتنی مسرت ہوتی کہ بیٹا بیرسٹر بن کر انگلستان سے واپس آیا ہے اور اس کا مستقبل روشن تر ہو گیا ہے۔

گھر پہنچ کر والد نے محمد علی کو بتایا کہ انھیں تجارت میں کس قدر خسارہ ہوا ہے

اور یہ کہ انھیں کچھ تاجروں کو بھاری رقمیں ادا کرنا ہیں جن میں سے چند نے عدالت میں مقدمے تک دائر کر رکھے ہیں۔

جناح صاحب کے والد کا خیال تھا کہ وہ کراچی کے کسی ممتاز وکیل کے پاس کام کرنے لگیں اور اس سلسلے میں انھوں نے دو فرموں ہرچند رائے وشن داس اینڈ کمپنی اور لال چند اینڈ کمپنی سے بات چیت کی جو ان کی قانونی مشیر تھیں۔ دونوں فرموں کے سربراہ اس نوجوان مسلمان بیرسٹر کو ملازمت دینے پر آمادہ تھے۔ اس زمانہ میں صُوبہ سندھ میں گنے چنے مسلمان بیرسٹر تھے اور ان لوگوں کو یقین تھا کہ نوجوان محمد علی کو ملازم رکھنے سے انھیں کافی فائدہ ہوگا۔ لیکن محمد علی تو کچھ اور ہی سوچ رہے تھے۔ کراچی میں پریکٹس کرنے کے بجائے انھوں نے بمبئی میں قسمت آزمانے کا فیصلہ کیا۔ ان کا خیال تھا کہ بمبئی جیسے بڑے شہر میں محنتی اور جفاکش لوگوں کے لیے کہیں زیادہ مواقع موجود ہیں۔ والد کی دلی خواہش تھی کہ بیٹا کراچی میں وکالت کرے جہاں ان کے کئی خاندانوں کے ساتھ انتہائی دوستانہ مراسم تھے۔ کراچی چھوڑ کر بمبئی میں وکالت کرنے کا خیال انھیں پسند نہ آیا۔ انھوں نے اپنے دوست اور پڑوسی رام جی بھائی ہیٹھا بھائی سے کہا کہ وہ محمد علی کو اس ارادے سے باز رکھیں۔ رام جی بھائی کی ہر ممکن کوشش کے باوجود محمد علی اپنا ارادہ بدلنے پر آمادہ نہ ہوسکے۔ وہ ایک فیصلہ کر چکے تھے۔ انھوں نے طے کر لیا تھا کہ میں اپنی راہ خود بناؤں گا۔ وہ زندگی کے آلام کو اپنے تجربے کی اساس بنانے کے خواہاں تھے[۲]۔

سروجنی نائیڈو قائدِ اعظم کی ابتدائی زندگی کے ان ایام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں "یہ قسمت کا دھنی جو اچانک غیر متوقع غربت کا شکار ہو گیا تھا محض اپنی پُرکشش جوانی، جرأت اور اولوالعزمی کے بل بوتے پر دنیا کو مسخر کرنے نکل کھڑا ہوا[۳]۔"

---

[۲] مندرجہ بالا واقعہ کی بنیاد ان حالات پر ہے جو کریم قاسم نے مصنف کو بتائے ہیں۔

[۳] محمد علی جناح۔ مسلم یونٹی از سروجنی نائیڈو صفحہ ۴ مطبوعہ ۱۹۱۸ء گنیش اینڈ کمپنی مدراس

انھیں اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ بمبئی منتقل ہو جانے کا فیصلہ ان کی زندگی کا
ایک اہم سنگ میل ثابت ہوگا اور اس فیصلے کا ان کی آئندہ زندگی پر دور رس اثر
پڑے گا۔ وہ اپنے والد، بھائیوں اور بہنوں سے رخصت ہو کر بمبئی روانہ ہو گئے۔
بمبئی کے ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے کر انھوں نے بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا
نام درج کرا لیا۔ یہ محض آغاز تھا اور اس سلسلے میں انھیں کوئی دشواری پیش نہ آئی حقیقی
معنوں میں مشکل تو دفتر لے کر بیٹھنا اور با اعتماد بیرسٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کرنا
تھی۔ اس سلسلے میں انھیں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ مشکلات کسی ڈھلوان اور
دشوار گزار پہاڑی کو سر کرنے سے کم نہ تھیں۔ یہ نوجوان جس کی آنکھوں میں ذہانت اور
عزم کی چمک تھی۔ عدالتوں میں گھومتا پھرتا نظر آتا تو لوگ سمجھتے کہ یہ بھی کوئی بہت بڑا
وکیل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسے کام شروع کرنے کے لیے کسی مقدمے کی ضرورت
تھی۔ وہ اپنی تخلیق کردہ دنیا میں شاہانہ انداز سے زندگی گزار رہا تھا۔ اس سے کم
صلاحیت کے افراد کے دفتروں میں ہجوم در ہجوم لوگ آتے اور منہ مانگی فیس ادا کرتے
اور وہ فورٹ ایریا میں واقع اپنے چھوٹے سے دفتر میں قانونی کتب کے انبار پر جھکا
کسی موکل کا انتظار کر رہا ہوتا۔

بمبئی ہائی کورٹ میں بیرسٹر کی حیثیت سے نام درج کرانا، روزانہ عدالتوں کے
چکر لگانا اور شام کو خالی ہاتھ تھکے ہارے ہوٹل واپس آجانا بڑا صبر آزما کام تھا۔ کبھی
کبھار کوئی معمولی مقدمہ مل جاتا اور پھر انتظار کا یہی دور شروع ہو جاتا۔ اس طرح تین
سال گزر گئے۔ انھیں اب خاصی کوفت ہونے لگی تھی۔ علاوہ ازیں کراچی میں ان کے
خاندان کو طرح طرح کی دشواریاں درپیش تھیں اور کسی نہ کسی مقدمے کے سبب ان
کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جا رہے تھے۔ جناح صاحب یہ سوچ کر بمبئی
تشریف لائے تھے کہ یہاں رہ کر اپنے لیے مستقبل کی تعمیر کر سکیں گے مگر ان کی توقعات

پوری نہ ہو سکی تھیں اور وہ اپنے خاندان کی کوئی خاص مدد نہ کر سکے تھے۔ ناامیدی اور پریشانی کے باوجود وہ ہر شخص سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے اور کسی کو اپنے احساسات کی ہوا نہ لگنے دیتے۔ جواشم ایلوا نے ان کی اس خوبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے: "وہ ہر تکلیف برداشت کرتے لیکن منہ سے اُف تک نہ کرتے اور نہ کسی سے اپنا دکھ بیان کرتے۔"[1]

ان دشوار حالات کے باوجود انھوں نے اپنے سماجی تعلقات قائم رکھے۔ وہ اکثر و بیشتر بمبئی کے کلبوں میں جاتے اور بمبئی کے ممتاز افراد کے ہاں دعوتوں میں بھی شریک ہوتے۔ جوانی میں وہ انتہائی پرکشش شخصیت کے مالک تھے، موہ لینے والی شخصیت کے مالک۔ دراز قد، دل میں کھب جانے والی آنکھیں جن سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ لمبا چہرہ اور عوام کے دلوں پر حکمرانی کرنے والے افراد کی طرح غیر معمولی طور پر لمبے لمبے ہاتھ۔ نفیس ملبوسات میں وہ ہمیشہ دوسروں سے ممتاز نظر آتے۔ انھیں نفاست اور جامہ زیبی سے ہمیشہ لگاؤ رہا اور زندگی کے آخری سانسوں تک ان کی یہ عادت اسی طرح قائم رہی۔ لارڈ ہارڈنگ، لارڈ چیمسفورڈ اور لارڈ ریڈنگ وغیرہ کئی وائسرائے کا کہنا ہے کہ ہمیں ہندوستان میں ان جیسا جامہ زیب اور نفاست پسند شخص دکھائی نہ دیا۔ قدرت نے انھیں شخصیت کا جادو بخشا تھا مگر معاشرہ انھیں وہ سہولتیں فراہم کرنے سے گریزاں تھا جن کے سبب وہ شایانِ شان زندگی گزار سکیں۔ ان کے ملاقاتی تو یہی سمجھتے کہ اس نوجوان کا مستقبل انتہائی تابناک ہے مگر انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کتنے صبر آزما حالات سے دوچار ہیں۔

آخر کار ان کا میل ملاپ کام آیا۔ ان کے ایک دوست نے جوان کی صلاحیت و ذہانت کا معترف تھا، بمبئی کے قائم مقام ایڈوکیٹ جنرل میک فیرسن سے ان کا تعارف

---

[1] لیڈرز آف انڈیا۔ جواشم ایلوا۔ صفحہ ۹۴

کرایا۔ بیک فرسن اس نوجوان بیرسٹر سے بڑا متاثر ہُوا اور اس نے جناح صاحب کو اپنے ساتھ کام کرنے اور اپنی لائبریری میں مطالعہ کرنے کی دعوت دی۔ قائداعظم بیک فرسن کی اس فراخدلی کو کبھی فراموش نہ کر سکے۔ خاص طور سے اس لیے کہ اس زمانے میں کسی ہندوستانی بیرسٹر کے لیے ایک انگریز کی جانب سے ان جذبات کا اظہار غیر معمولی بات تھی۔

بیک فرسن نے محسوس کیا کہ یہ نوجوان انتہائی پُرکشش شخصیت، ذہانت اور قابلیت کا مالک ہے اور انتہائی فرض شناس بھی ہے۔ اس نے اپنے چند مقدمات محمد علی جناح کو سونپ دیے۔ اس زمانے میں قائداعظم سرکاری ملازمت کے بارے میں سوچ رہے تھے تاکہ وکالت کے میدان میں کامیابی کے غیر یقینی احساس کے پیشِ نظر آمدنی کی کوئی مستقل صورت نکل سکے۔ جب اُنھوں نے بیک فرسن سے اس ارادے کا اظہار کیا تو اس نے محکمہ قانون کے ممبر سر چارلس اولی وینٹ سے ان کی پُرزور سفارش کی اور چند ہفتوں میں ایم اے جناح کو عارضی پریذیڈنسی مجسٹریٹ مقرر کر دیا گیا۔

اُنھوں نے محسوس کیا کہ کامیابی، جو اب تک ان سے گریزاں رہی تھی، جیسے ان کی دسترس میں ہے۔ اُنھوں نے پریذیڈنسی مجسٹریٹ کی حیثیت سے جو مثالی خدمات انجام دیں افسرانِ اعلیٰ نے ان کو سراہا اور جب اس عارضی اسامی کی مدت ختم ہوئی تو سر چارلس اولی وینٹ نے انھیں پندرہ سو روپے ماہوار مشاہرہ کی جو اس زمانے میں بڑی بات تھی، ملازمت کی پیشکش کی۔ قائداعظم نے اس پر سر چارلس کا شکریہ ادا کرتے ہُوئے یہ پیشکش مسترد کر دی اور فرمایا "میں اتنی رقم تو ایک دن میں کمانا چاہتا ہوں۔"

اس واقعے کے بعد سر چارلس اولی وینٹ طویل رخصت پر انگلستان چلے گئے اور چند سال بعد ہندوستان واپس آئے۔ قائداعظم نے اپنے سیکرٹری ایم ایچ سید

سے سر چارلس کے ساتھ ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا۔ انگلستان میں چھٹیاں گزارنے کے بعد جب سر چارلس ہندوستان آئے تو انھیں بمبئی کے اورینٹ کلب میں مدعو کیا گیا۔ میں بھی اس کلب کا ممبر تھا اور اس موقع پر موجود تھا۔ سر چارلس میرے پاس آئے اور میری وکالت کا حال پوچھنے لگے۔ جب میں نے بتایا کہ میں دو ہزار روپے ماہانہ سے زیادہ کما رہا ہوں تو مجھے مبارکباد دی اور میرے عزم و ہمت کی تعریف کی۔ کہنے لگے تم نے میری پیشکش مسترد کرکے بڑا اچھا کیا۔"

ایک اور انگریز بیرسٹر جس نے ابتدائی دنوں میں قائد اعظم کی مدد کی تھی، سر جارج لاؤنڈیس تھے۔ سر جارج لاؤنڈیس کے متعلق قائد اعظم نے ایک مرتبہ فرمایا۔ "میں انھیں اپنے باپ کی برابر سمجھتا تھا اور وہ بھی مجھ سے بیٹے کا سا سلوک کرتے تھے۔ جب وہ حکومت ہند کے لا ممبر کی حیثیت سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں شامل کیے گئے تو میں نے ان کی شدید مخالفت کی۔ بایں ہمہ ہماری دوستی آج تک قائم ہے۔ پنڈت موتی لال اور میں لیجسلیٹو اسمبلی میں خونخوار بلیوں کی طرح لڑتے تھے مگر اس گرما گرمی کے بعد اسی شام کو وہ میری بیوی اور میری جانب سے رات کے کھانے پر مدعو ہوتے۔ گزشتہ واقعات کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا کہ سیاسی اختلافات کے باوجود میرے دل میں کسی کے لیے بغض و کینہ نہ تھا۔"[1]

قائد اعظم نے قائم مقام پریذیڈنسی مجسٹریٹ کے عہدے سے استعفا دیا تو بہت سے آدمی اپنے مقدمات لے کر ان کے پاس آئے۔ اب انھوں نے ایک ایسی عمارت میں اپنا دفتر کھول لیا جہاں ممتاز وکیلوں کے دفاتر تھے۔ انھوں نے اپنے دفتر کو خوب صورت اور پرکشش بنانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ ان کے قدم، اب کامیابی

---

[1] لیڈرز آف انڈیا، جواہر لال، صفحہ ۶۹، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

کی منزل کے قریب تھے۔ انھوں نے اپنے والد کو خط اور تار بھیجے کہ وہ خاندان سمیت ان کے پاس بمبئی آجائیں۔

جناح بھائی کی نئی زندگی ان کا ساتھ چھوڑ چکی تھیں، اور ان کی یہ توقع بھی ختم ہو چکی تھی کہ ان کا کاروبار ان کے بیٹوں کے جھگڑے میں آئے گا لہذا کراچی میں "تلخ یادوں کے سوا ان کے لیے اور کچھ نہ تھا۔ انھوں نے سوچا کہ بمبئی جانا ہی بہتر ہوگا۔ یہ سوچ کر جناح بھائی اپنے خاندان سمیت بمبئی آگئے اور کھاڈک کے خوجہ محلے میں ایک چھوٹے سے دو کمرے کے مکان میں رہنے لگے۔

اس صبر آزما اور جانگسل جدوجہد سے قائداعظم کی خوداعتمادی ذرا بھی متاثر نہ ہوئی تھی اور ان کے اس عزم میں کوئی فرق نہ آیا تھا کہ مکمل آزادانہ زندگی گزاری جائے جس میں اپنے سے اعلیٰ اور برتر لوگوں کے سامنے جھکنے کا شائبہ بھی نہ ہو۔ سر چمن لال سیتل واد نے اس سلسلے میں لکھا ہے: "جناح اپنی ابتدائی زندگی میں آزاد روی اور عزم و حوصلہ کے مالک تھے۔ وہ کبھی کسی جج یا فریق مخالف کے وکیل کو خاطر میں نہ لاتے [1]"

اسٹیر نگ مین نامی ایک انگریز بمبئی کا کافی معزز اور سینئر وکیل تھا۔ ایک مقدمے میں اسٹیر نگ مین اور ایم اے جناح سے مشورہ لیا گیا اور اس سلسلے میں میں ایک مرتبہ جناح صاحب کو اسٹیر نگ مین کے دفتر جانا پڑا۔ اس زمانے میں ہندوستانی ساتھیوں کے ساتھ سرپرستانہ انداز میں پیش آنا کسی انگریز کے لیے غیر معمولی بات نہ تھی۔ اسٹیر نگ مین نے قائداعظم سے جس لہجے اور انداز میں بات کی وہ انتہائی توہین آمیز تھا۔ اس دن کے بعد انھوں نے اسٹیر نگ مین کے دفتر میں قدم نہ رکھا بلکہ

---

[1] ری کلکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ سر چمن لال سیتل واد۔ صفحہ ۶۶۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء

عدالت یا عدالت سے باہر اس کی مزاج پرسی بھی نہ کی۔

انھیں بمبئی ہائی کورٹ میں اپنا نام درج کرائے کچھ روز ہی ہوئے تھے کہ ایک مقدمے کے سلسلے میں وہ جسٹس مرزا کی عدالت میں پیش ہوئے۔ فریقِ مخالف کے وکیل سر چمن لال سیتل واد تھے۔ قائداعظم دلائل پیش کر رہے تھے کہ جسٹس مرزا نے انھیں ٹوک دیا۔ قائداعظم نے اس پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور کچھ اس طرح جسٹس مرزا کو مخاطب کیا جو ان کے خیال میں توہین آمیز تھا۔ جج نے قائداعظم سے کہا "آپ کا لہجہ اور الفاظ توہینِ عدالت کے زمرے میں آسکتے ہیں۔" اور سیتل واد کو مخاطب کر کے کہا۔ "مسٹر سیتل واد، آپ کو مجھ سے اتفاق ہے؟" سر چمن لال سیتل واد نے اپنی کتاب میں اس واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "جج کا مجھ سے یہ پوچھنا انتہائی حماقت تھی۔ میں نے جواب دیا۔ میرا کام یہ طے کرنا نہیں ہے کہ مسٹر جناح توہینِ عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں کہ نہیں۔ آپ خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ تاہم میں مسٹر جناح سے واقف ہوں اور میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ عدالت کی توہین کریں۔[1]"

اپنی اولوالعزمی اور قابلیت کے سبب جلد ہی انھوں نے بمبئی کی عدالتوں میں شہرت حاصل کر لی اور اس بات سے سب کو اتفاق تھا کہ بیرسٹر کی حیثیت سے وہ انتہائی بلند و بالا مقام حاصل کریں گے۔ وکیلوں کی نشستوں میں ان کے مؤثر اور مدلل اندازِ خطابت کے چرچے ہوتے۔ وہ جس انداز میں جرح کرتے، ٹھوس دلائل پیش کرتے اور قانونی کتابوں اور مقدمات کے حوالے دیتے اس پر عدالت میں موجود ہر شخص، جج اور وکیل عش عش کر اٹھتا۔ مشکل ترین حالات کے باوجود ان کا سر ہمیشہ

---

[1] ریکلیکشنز اینڈ ریفلیکشنز۔ سر چمن لال سیتل واد۔ صفحہ ۷۰۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء

بلند رہتا۔ وہ جو کچھ کہہ دیتے پتھر کی لکیر بن جاتا۔ جج تک انھیں چکمہ نہ دے پاتے۔
ان کی ذہانت اور فراست نے انھیں ہر طبقہ میں مقبول بنا دیا اور دُور دُور تک ان کا
نام مشہور ہو گیا۔[1]

ایک اور جج جس نے ان کی توہین کی اور اسے جان چھڑانی مشکل ہو گئی۔ سر
ایڈورڈ مارشل ہال تھے۔ جواشم ایلوا نے قائدِ اعظم کی اس خصوصیت پر مثالیں دے
کر روشنی ڈالی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے۔ "مقدمے کے فریقین اور وکیلوں کے نزدیک جناح
کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے مثال فراست اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے غیر متزلزل عزم
کے مالک ہیں۔"[2]

ابتدائی زمانے میں بھی ان کی آزاد روی اور جرأت بے مثال تھی۔ حکومت ہند
کے ہوم ممبر سر ولیم ونسن نے انتہائی تلخ انداز میں اس پر انھیں یوں خراج تحسین پیش
کیا۔ "آپ ہمیشہ ہم آئی سی ایس افسروں پر نکتہ چینی کرتے ہیں کہ ہم درشتی سے پیش آتے ہیں۔
مجھے ایک بھی آئی سی ایس افسر دکھا دیجیے جو درشتی، جنگجوئی اور توہین آمیز رویہ میں
مسٹر جناح کا مقابلہ کر سکے۔"

وکیلوں کے اجتماعات اور عدالتوں میں محمد علی جناح کی شہرت بڑھتی جا رہی تھی۔
اور جب وہ عدالتوں کے برآمدوں میں آتے جاتے دکھائی دیتے تو وکیل اور دوسرے
لوگ انھیں استحسان کی نظر سے دیکھتے اور کہتے "یہ ہیں مسٹر ایم اے جناح" وہ سوچتے
یہ نوجوان اور نیا بیرسٹر کتنا عجیب شخص ہے جو عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے
اور جس نے خود اپنی ذاتی صلاحیت کی بنیاد پر اوپر چڑھنے یا نیچے گرنے کا تہیہ کر رکھا
ہے۔ بیرسٹر کی حیثیت سے جس زمانے میں انھیں مشکلات کا سامنا تھا اس وقت بھی

---

[1] لیڈرز آف انڈیا۔ جواشم ایلوا۔ صفحہ ۹۰۔ [2] لیڈرز آف انڈیا۔ صفحہ ۹۰۔

انھوں نے کسی کی مدد یا سرپرستی قبول نہ کی۔ وکیل اور موکل ہی ان کے پاس آتے۔ وہ کسی کے پاس نہ جاتے تھے۔ جواشم ایلوا نے ایک بیرسٹر کی حیثیت سے ان کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے "وہ دولت کے پجاری نہیں ہیں۔ وہ اپنی محنت کے معاوضے سے ایک پیسہ بھی زیادہ نہیں لیتے ——— وکیل کی حیثیت سے جناح نے بڑی مستحکم پوزیشن حاصل کرلی ہے ——— وہ اعلیٰ درجے کے وکیل ہیں۔"[1] قائداعظم نے اپنی دیانت داری، فرض شناسی اور بے باکی کے بارے میں اپنی شہرت برقرار رکھی۔ اور یہی سبب ہے کہ پورے برِصغیر میں وہ ہندوستانی بار کے لارڈ سائمن کے نام سے مشہور تھے۔

جناح صاحب کامیابی کے زینے تک پہنچ گئے تھے اور لوگ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ نہ صرف بار کے ایک عظیم اور اہم ستون بن جائیں گے بلکہ ہندوستان کی سیاست میں بھی ان کا کوئی مدِمقابل نہ ہوگا۔ سروجنی نائیڈو نے ان الفاظ میں ان کا نقشہ کھینچا ہے۔ "دراز قد اور شاہانہ انداز اور عادتوں کے مالک محمد علی جناح غیر معمولی جرأت و ہمت اور تحمل کے انسان ہیں۔ وہ سب سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں۔ ان کا صبر و سکون اور لوگوں سے بے تعلقی ان کے شناساؤں کے نزدیک ایک نقاب ہے۔ ان کے ملنے جلنے والے بخوبی واقف ہیں کہ وہ انتہائی مخلص اور ملنسار فرد ہیں اور ان کا دل انسانیت کے جذبے سے پُر ہے۔ کوئی عورت بھی ان کی طرح نرم دل نہ ہوگی۔ جب وہ گفتگو کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے ان کے منہ سے موتی جھڑ رہے ہیں۔ ان کی ہر بات انتہائی معقول اور شائستہ ہوتی ہے۔ وہ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے انسان نہیں ہیں۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو جس پردے میں چھپا رکھا ہے۔

---

[1] لیڈرز آف انڈیا۔ جواشم ایلوا صفحہ ۱۸

اس سے جھانک کر دیکھا جاتے تو معلوم ہوگا کہ وہ انسان کامل کے درجے پر فائز ہیں۔[1]

اب محمد علی جناح سیاست میں زیادہ سے زیادہ حصہ لینے لگے اور جن لوگوں نے متنوع مسائل پر عام جلسوں میں ان کی تقاریر سنیں۔ وہ ان سے بہت متاثر ہوئے۔ اپنی پرکشش شخصیت اور خلوص مقصد کے نشے میں سرشار انداز بیان کے سبب وہ اس ابتدائی زمانے میں بھی عوام کے ذہن دلبے باک ترجمان سمجھے جاتے تھے۔ مقرر کی حیثیت سے ان کے مؤثر ہتھیار مدلل انداز بیان، روانی اور شعلہ بیانی، تدبر اور دلوں میں اتر جانے والے الفاظ تھے۔ جو لوگ عام جلسوں میں ان کی تقاریر سنتے، بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھتے۔ سروجنی نائیڈو نے پیش گوئی کی کہ "اتفاق ہے:۔ مستقبل کی کتاب میں لکھا جا چکا ہے کہ وہ شخص جس کا نصب العین مسلمانوں کو کھٹے بنانا ہے، ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری قومی جدوجہد کے کسی شاندار اور خطرناک مرحلے پر ہندوستان کی آزادی کا مزنی بن جائے اور یوں زندہ باد بد ہو جائے۔"[2]

---

[1] این ایمبیسڈر آف یونٹی، سروجنی نائیڈو، صفحہ ۲، گنیش اینڈ کمپنی مدراس، جنوری ۱۹۱۸ء
[2] متذکرہ بالا، صفحہ ۲۰

ہندوستانی مسلمان — ایک تاریخی پس منظر

کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ تاریخ عوامی بہروں سے اپنا راستہ متعیّن نہیں کرتی بلکہ نقل سکونت کرنے والے یہ لوگ تو محض ایک ایسے ماحول کو تشکیل دیتے ہیں جس میں ایک ہیرو ابھرتا اور عوام کی خواہشوں اور امنگوں کا رُخ ایک ایسی منزل کی طرف موڑ دیتا ہے جہاں وہ کامیابی اور سرخروئی سے ہمکنار ہو سکیں۔

تاریخ میں ہیرو صرف ایک علامت اور معاشی و تاریخی قوتوں کے ایک مظہر کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ وہ اپنے پیروؤں کو اپنے انقلابی نصب العین کا طاقت ور آلۂ کار بنا کر تاریخ کا رُخ موڑ دیتا ہے۔ یہ کامیابی انفرادی نہیں بلکہ درحقیقت اجتماعی کامیابی ہے۔ لہٰذا قائد اعظم کی عظمت کا اظہار صرف اس طرح ممکن نہیں کہ ان کی ذاتی صلاحیتوں اور کارناموں کی ایک مخصوص تصویر پیش کر دی جائے بلکہ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ جس معاشرے اور ماحول میں انھوں نے آنکھ کھولی تھی اس کا سماجی نقطۂ نظر سے جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ اس وقت کے سیاسی حالات کیا تھے؟ اس سلسلے میں انیسویں صدی کے آخر تک ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی تناظر کا ایک مختصر سا خاکہ پیش کرنا ناگزیر ہے۔

ہر ملک کی تاریخ، اس کی جغرافیائی حیثیت، مذہبی رجحانات، سماجی تصورات، اور تہذیبی عناصر سے اثر پذیر ہوتی ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وقت کے سیاسی افکار اور اجتماعی زندگی کے ادارے تہذیبی قوتوں کی چھاؤں میں پلتے بڑھتے ہیں۔

قائدِ اعظم اور نواب زادہ لیاقت علی خان

جہاں تک ہندوستان کے طبعی حالات کا تعلق ہے تو یہ زمین کا ایک مثلث قطعہ ہے
جس کے شمال مغرب سے شمال مشرق تک دشوار گزار پہاڑوں کے برف پوش سلسلے،
گھرے گنجان تاریک جنگل اور نم ناک یخ بستہ علاقے واقع ہیں۔ مغرب، جنوب اور مشرق
میں ناپیدا کنار سمندر ہیں جنہیں بحیرۂ عرب، بحرِ ہند اور خلیج بنگال کہا جاتا ہے ــــ
یہ ہے ہندوستان کا طبعی محلِ وقوع ــــ اس برِّ صغیر کے جغرافیہ پر ایک نظر ڈالنے سے
ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قدرت نے اس خطۂ ارضی کو دوسرے جغرافیائی علاقوں سے علیحدہ
کر رکھا ہے۔ البتہ شمال میں کوہستان ہمالیہ اور ہندوکش کے درّے، پُر پیچ گزرگاہیں
اور مشرقی اور مغربی گھاٹ کی آبی شاہراہیں ایک طرف تو ہندوستان کے عوام کے لیے
بیرونی دنیا سے تعلقات قائم کرنے کے لیے مناسب راستے فراہم کرتی ہیں اور دوسری طرف
غیر ملکیوں کو اس خطۂ ارضی میں داخل ہونے کا موقع بھی دیتی رہی ہیں۔ اس کا نتیجہ
یہ ہُوا کہ اس برِّصغیر میں مختلف نسلیں، تہذیبیں، مذاہب اور زبانیں ایک دوسرے
پر اثر انداز ہوئیں اور اس طرح نسلی، تہذیبی اور مذہبی اختلاط کا عظیم الشان تاریخی عمل
وجود میں آیا۔ آریوں، سیتھیوں (تورانیوں)، منگولوں اور دراوڑوں کے جو قبیلے یکے بعد
دیگرے اس سرزمین پر وارد ہوئے انھیں مختلف حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ کبھی تو وہ
یہاں کے باشندوں میں گھل مل گئے اور کبھی الگ تھلگ رہنے پر مجبور ہوئے۔ بتدریج
میں ان اقوام نے نقلِ وطن کی شکل میں یا حملہ آورانہ روپ میں جتنی یلغاریں کیں ان
میں ہر یلغار کے ساتھ ہر قوم اپنی اپنی دیو مالا، توہمات اور فلسفہ کے ساتھ اس اجنبی
اور انوکھے دیس میں وارد ہوتی۔ چونکہ اس وقت ایک عالمگیر انسانی نسل مفقود تھی،
اس لیے قومی دائروں میں اجتماعیت کے بجائے انفرادیت کا اور نسلی ہم آہنگی کے بجائے
نسلی علیحدگی کا رجحان کارفرما تھا۔ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں جب قائداعظم نے
ہندوستانی سیاست کے پُرشور میدان میں قدم رکھا تو ملک کے سیاسی حالات کیا تھے؟

اس کا جائزہ لینے سے قبل، نسلی ہم آہنگی کے متعلق برصغیر کی تاریخ کے چند اہم ترین ادوار کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہندوستان کی قدرتی دولت، شمالی علاقوں کی صحت بخش آب و ہوا اور اس سرزمین کی زرخیزی (جس کے نتیجے میں بہتر زندگی اور بے مشقت بود و باش بہت حد تک آسان تھی) غیر ملکی حملہ آوروں اور اولوالعزم تاجروں کے لیے زبردست ذریعۂ ترغیب ثابت ہوئی ہے۔ عجیب سانحہ ہے کہ جس وقت یہ غیر ملکی عناصر اس اجنبی سرزمین میں اپنی جڑیں مضبوط کر رہے تھے، خود ہندوستانی لوگ جو دور از کار افکار میں مبتلا تھے اور داخلی طور پر مختلف ذاتوں اور فرقوں میں بٹے ہوئے تھے، اس قابل نہ تھے کہ کوئی ایسی مشترکہ پناہ گاہ بنا سکیں جس کے زیر سایہ وہ ایک برادری کی طرح باہم مل جل کر رہ سکیں۔ مشترکہ مذہبی رشتوں کی عدم موجودگی میں فرد کو معاشرے میں اپنی جگہ حاصل کرنے کے لیے فرسودہ تہذیبی روایات کے دامن سے وابستہ رہنا پڑتا تھا یہی وجہ ہے کہ جو غیر ملکی باشندے ہندوستان میں آباد ہوئے وہ اپنی روایات، عقائد اور تہذیب کو ایک ایسی سرزمین میں محفوظ رکھنے میں کامیاب ہو گئے جہاں ہر شخص کی پیشانی نسلی برتری کے نشان سے داغدار تھی۔

مسیح سے تین سو تائیس سال قبل یونانیوں کی یلغار سے ہندوستان میں غیر ملکی اثر و نفوذ کی ابتدا ہوتی ہے مگر یہ اس کہانی کا آغاز نہیں ہے۔ ہندوستان سے دوسری قوموں کے میل جول کی کہانی اس سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستان پر یونانیوں کی یلغار سے پہلے ہی ہومر کو ہندوستان کے سامان تجارت کے بارے میں علم تھا۔ یہی نہیں بلکہ عبرانی زبان کی انجیل مقدس میں ہندوستان کی چند مصنوعات کا ذکر ملتا ہے مگر تاریخی صداقت یہ ہے کہ یہ یونانی مورخین تھے جنھوں نے اپنی تصانیف کے ذریعے دنیا سے ہندوستان اور اس کے باشندوں کا پہلا تعارف کرایا۔ پہلے یونانی مورخ

جن کی کتابوں میں یہ ذکر ملتا ہے ملطا کا باشندہ ہیکا تائی اوس (HEKATAIOS) (۵۵۰ قبل مسیح) اور ہیروڈوٹوس (HERODOTUS) (۴۵۰ قبل مسیح) ہیں یونانی طبیب کتیاسیاس (KTESIAS) (۴۰۰ قبل مسیح) نے ایران سے ہندوستانی جڑی بوٹیوں، رنگ، پارچہ جات، طوطوں اور بندروں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تاہم دریائے سندھ کے مشرق میں واقع علاقے کا علم، جسے ہندوستان کہا جاتا تھا، یونان کے تاریخ دانوں اور طبیبوں کو اس وقت ہوا جب وہ ۳۲۷ قبل مسیح میں سکندرِ اعظم کے ساتھ یہاں آئے۔

سکندرِ اعظم نے اٹک سے گزر کر دریائے سندھ کو پار کیا اور ٹیکسلا کی طرف بڑھا۔ یونانی فاتح اعظم ایک نظر میں بھانپ گیا کہ پنجاب میں سیاسی اعتبار سے زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں۔ پنجاب مختلف حریف ریاستوں اور رجواڑوں کی خانہ جنگیوں، نسلی تنازعوں اور درباری سازشوں کی وجہ سے کمزور ہو چکا تھا۔ سکندر اور اس کی فتح مند فوج بڑھتی رہی تاآنکہ جس جگہ دریائے جہلم اپنا رخ موڑتا ہے وہاں پنجاب کے ایک راجہ پورس نے حملہ آور فوج کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی لیکن یونانیوں کی اعلیٰ فوجی قوت کے ہاتھوں پورس کو عبرتناک شکست اٹھانی پڑی۔ پورس نے فاتح کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے اور باج دینا قبول کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکندر نے اس کی ریاست بحال کر دی۔ اس کے بعد پورس سکندرِ اعظم کا بااعتماد دوست بن گیا۔[۱]

سکندر نے پورس کو مغلوب کر لیا مگر پنجاب کی شدید گرمی اور جنوب مغرب کے طوفانی جھکڑوں نے اس کے عظیم الشان لشکر کے آہنی عزم کو پارہ پارہ کر دیا اور یہ بدیسی صوبے کو عبور کرنے سے پہلے ہی وہ بادل نخواستہ ہندوستان کو فتح کرنے کے ارادے

---

[۱] اے بریف ہسٹری آف دی انڈین پیپلز۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ۱۹۰۱ء صفحہ ۷۰ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

دست بردار ہوگیا۔ سکندر چاہتا بھی تو فوجی پیش قدمی ممکن نہ تھی کیونکہ یونان کی تھکی ہاری فوج ان پُراسرار علاقوں میں درانہ گھسنے پر تیار نہ تھی۔ مجبور ہو کر سکندر نے فوج کا کچھ حصّہ دریائے جہلم کے راستے سندھ روانہ کیا اور کچھ فوج خشکی کے راستے واپس آ گئی۔ یونانی فوج نے ملتان پر حملہ کیا۔ ملتان اس زمانے میں سندھ کا دارالحکومت تھا۔ اگرچہ سکندر نے اس معرکے میں فتح حاصل کر لی لیکن وہ خود سخت زخمی ہوگیا۔ لڑائی کے بعد اس نے یہاں ایک نیا شہر تعمیر کرایا جسے ایگزینڈریا یا اسکندریہ کا نام دیا گیا۔ اسے اب اُوچ کہتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یونانی دستوں نے آس پاس کے علاقے بھی فتح کر لیے۔ آخر مقدونیہ کا یہ عظیم الشان فاتح ایک یونانی گورنر کو سندھ میں اپنے جانشین کے طور پر چھوڑ کر دریائے سندھ کے راستے جنوب کی طرف روانہ ہوا اور پٹالا (موجودہ حیدرآباد) پہنچا۔ اس کی فوج کا کچھ حصہ ایک یونانی جنرل نیارکسس (NEARCHUS) کی سرکردگی میں خلیج فارس کو روانہ ہوا اور باقی فوج خود سکندرِ اعظم کی رہنمائی میں جنوبی بلوچستان اور ایران سے گزر کر سُوسا (SUSA) پہنچی۔

یہ ہے مختصر لفظوں میں ہندوستان پر پہلے غیر ملکی حملے کی رُوداد۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر لکھتا ہے "یونانیوں نے سلطنتیں قائم نہیں کیں۔ انھوں نے ہندوستان میں اپنے جو نشانات چھوڑے وہ علم ہیئت، سنگ تراشی اور سکّے ہیں۔"[1]

اس کے کم و بیش دو سو سال بعد ہندوستان پر سیتھیوں نے یلغار کی۔ سیتھی وسط ایشیا سے آئے تھے اور کچھ مورخین کا خیال ہے کہ مہاتما بدھ بھی سیتھی تھے۔ ۱۲۶ قبل مسیح کے لگ بھگ سیتھیوں نے ہمالیہ کی شمال مغربی مملکت باختریہ سے یونانیوں کو دھکیل دیا۔ وہ یونانیوں کو جنوب کی طرف پسپا کرتے کرتے پنجاب میں داخل ہوگئے اور یہاں انھوں نے

---

[1] بریف ہسٹری آف دی انڈین پیپلز۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر ۱۹۰۱ء صفحہ ۸۹۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

ہوٹی چھوٹی بستیاں قائم کرلیں حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے وقت تک سیتھیوں نے
سے پنجاب پر اپنی حکومت جمالی تھی۔ سیتھی خاندان کا سب سے مشہور حکمران کنشک
ا ہے جس نے اپنی مملکت کی حدود کو کشمیر، آگرہ اور سندھ تک اور ہمالیہ کے شمال میں
ہند اور کوہ قند تک وسیع کرلیا تھا۔ شمالی ہند کے سیتھی فرمانرواؤں نے ہندوستان میں
ل کے جانشینوں سے تعلقات قائم کیے۔ اشوک کے یہ جانشین بودھ مذہب کے پیرو
ے۔ ان تعلقات کے نتیجے میں سیتھیوں نے بودھ مذہب اختیار کرلیا۔ مگر کچھ ردو بدل
ساتھ۔ بعض محققین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ راجپوتوں کے کچھ قبیلے دراصل
تھی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس دعوے میں کوئی صداقت ہو تاہم یہ
ت واضح ہے کہ پہلی صدی قبل مسیح سے پانچویں صدی عیسوی کی درمیانی مدت میں
ہدوستان پر سیتھیوں نے کئی یلغاریں کیں۔[1]

ہندوستانی ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے تھے جس میں نسلی
یاز کو مذہبی عقائد کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔ انجام کار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اگر وہ
ندر پار جاتے رہے تو اس کی قیمت انھیں نسلی امتیاز اور مذہب سے دستبرداری کی شکل
ں ادا کرنی پڑے گی۔ یہی وہ خوف تھا جس کی بنا پر رفتہ رفتہ انھوں نے سمندر کے ذریعے
فر ترک کر دیا۔ نتیجہ ظاہر ہے، سمندر کے راستے دوسرے ملکوں سے ہندوستان کی تجارت
ا سلسلہ ختم ہو گیا۔

تقریباً چودہ سو سال پہلے آغازِ اسلام کے ساتھ اس کرۂ ارض پر ایک نئی عالم گیر
وت اُبھری۔ بہت جلد اس کے اثرات نمایاں ہونے لگے اور قلیل ترین مدت میں اس
ی قوت نے تاریخ کا رُخ موڑ دیا۔ اپنی انقلابی تعلیمات کی بنا پر اسلام نے نہایت تیزی

[1] اے بریف ہسٹری آف دی انڈین پیپلز۔ مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر مطبوعہ ۱۹۰۱ء صفحہ ۹۱۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔

کے ساتھ کرۂ ارض کے بہت بڑے حصّے پر اپنا اثر و نفوذ قائم کر لیا اور جزیرہ نمائے عرب، جو اسلام کا مولد تھا، کی حدود سے نکل کر یہ نیا طاقتور مذہب دنیا کے کئی ملکوں اور برّاعظموں میں پھیل گیا۔ آٹھویں صدی کے آغاز میں عرب خشکی اور سمندر کے راستوں سے دنیا کے بیشتر ملکوں سے تجارتی تعلقات قائم کر چکے تھے اس وقت کی متمدن دنیا میں عربوں کے سامانِ تجارت کی دو منڈیاں قابلِ ذکر ہیں۔ ایک طرف مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید کے ممالک تھے جن کے درمیان ہندوستان ایک اہم حیثیت رکھتا تھا اور دوسری طرف لنکا کو اہم تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل تھی، جہاں عرب کے تجارتی بیڑے اپنا سامان تجارت فروخت کرنے کے لیے لنگر انداز ہو سکتے اور لنکا کا مال دوسرے ملکوں میں فروخت کرنے کے لیے خرید سکتے۔ گورنر عراق حجاج، لنکا سے تعلقات کو مضبوط تر بنانے کا خواہش مند تھا، لنکا کے راجہ کو بہت سے قیمتی تحفے اور نوادرات بھیجے جس جواب میں لنکا کے راجہ نے بھی دوستی اور خلوص کی علامت کے طور پر خلیفہ کی خدمت میں بیش قیمت تحفے ارسال کیے۔ اگر یہ کہا جائے کہ تاریخ کے اکثر اہم واقعات، اتفاقات کے سہارے وجود میں آئے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ جن جہازوں میں لنکا کے راجہ کے ارسال کردہ تحفے عراق جا رہے تھے، ٹھٹھہ کے قریب سندھ کے ساحل کے آس پاس سمندری قزاقوں نے ان کو لوٹ لیا۔ اس ایک حادثے کا جو نتیجہ برآمد ہوا اس نے برِّصغیر ہند و پاکستان کی تاریخ ہی بدل دی۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ سندھ کے ساحل کے قریب عربوں کے جہازوں کو لوٹا گیا۔ اس سے پہلے بھی ایسے حادثے ہو چکے تھے۔ چنانچہ اس بین الاقوامی قزاقی کو روکنے کے لیے خلافت کی طرف سے ایک نوجوان عرب جرنل محمد بن قاسم کو مقرر کیا گیا تاکہ وہ اس آبی گزرگاہ کو تجارتی مقاصد کے لیے محفوظ بنا دے۔ محمد بن قاسم نے اپنی بے مثال فوجی حکمتِ عملی سے سندھ میں دشمنوں کو عبرتناک شکست دی۔ وہ پہلا مسلمان فاتح تھا جس نے برِّصغیر ہند و پاکستان کا کچھ حصّہ بغداد کی حکومت میں شامل کیا۔ اس طرح تاریخی اعتبار سے مسلمانوں کی یہ کامیابی ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کا

آغاز بھی۔

نئے مفتوحہ علاقوں کے اندر فاتح اور مفتوحین کے تعلقات کے سلسلے میں عربوں کو کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ انھوں نے مفتوحین کی سلامتی اور تحفظ کی ذمہ داری لی۔ انھیں مذہبی مراعات دیں اور سرکاری عہدوں پر کام کرتے رہنے کی آزادی دی۔ اس فیاضانہ حکمت عملی سے عربوں کی وہ نرم مزاجی ظاہر ہوتی ہے جس سے کام لے کر انھوں نے برصغیر میں اپنے عظیم الشان سیاسی اور تمدنی اقتدار کا آغاز کیا۔

تقریباً تین سو سال بعد مسلمانوں نے ہندوستان پر پھر حملہ کیا۔ اس وقت جے پال نامی ہندو راجہ، ہندوستان کے شمالی علاقے پر حکمران تھا۔ اس ہندو ریاست کے پڑوس میں سبکتگین کی غزنوی مملکت واقع تھی۔ دونوں حکومتوں کی مسلح افواج میں کئی بار جھڑپیں ہوئیں ——— سبکتگین کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے محمود غزنوی نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ بادشاہت کے ساتھ ساتھ اسے ہندوستان کے راجہ جے پال کی دشمنی بھی ورثے میں ملی۔ غزنی کی حکومت سنبھالنے کے بعد محمود کو اپنی مملکت کو بیرونی جارحیت سے محفوظ رکھنے کے لیے دشمن کے علاقے میں جنگ لڑنی پڑی۔ اس نے نہ صرف جے پال کے علاقے کو بلکہ پورے پنجاب کو تسخیر کر لیا اور اس طرح دوسرے ہمسایوں کے دلوں پر بھی اپنی قوت اور جوانمردی کی دھاک بٹھا دی۔ محمود غزنوی کے عہد میں پنجاب مسلمان حکمرانوں کے حلقۂ اثر میں آگیا۔ پنجاب اور سندھ کے ہمسایہ صوبوں میں نہ صرف حکومت بلکہ ثقافت، زبان اور ادب کے شعبوں میں بھی اسلامی اثر و نفوذ در آیا۔ عرب، بحیرۂ عرب کے اس پار سے اور اہل فارس شمال مغرب کی جانب سے سندھ اور پنجاب میں اپنے اعلیٰ افکار، تہذیب و تمدن، زبان اور ادب لائے۔ ناگزیر تھا کہ اس کا اثر اہل ہند کی زبان پر پڑے۔ ان بیرونی اثرات کے ساتھ مقامی اثرات کی ہم آہنگی نے

ایک نئے تمدّن کو جنم دیا جو اہل سندھ و پنجاب کا طرّۂ امتیاز بن گیا اور جلد ہی ان دونوں صوبوں کی حدود سے گزر کر برصغیر کے تمام علاقوں میں پہنچ گیا۔

یہ چیز ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ اپنے مفتوحہ علاقوں میں اگرچہ مسلمان ملک کی سیاسی زندگی اور اقتصادی جدوجہد میں سرگرمی کے ساتھ حصّہ لیتے تھے تاہم ان کی کوشش ہمیشہ یہی رہتی کہ وہ اپنے آپ کو ایک علیحدہ اور ممتاز ثقافتی گروپ کی حیثیت سے محفوظ رکھیں۔ امتیازی حیثیت کا یہی جذبہ، جو ان کے شعور میں ہمیشہ بیدار رہا، آئندہ لاشعوری طور پر اس تصوّر کی بنیاد بن گیا کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں۔

غزنوی خاندان کا آخری حکمران خسرو ملک تھا۔ بارھویں صدی عیسوی میں شہاب الدین محمد غوری نے خسرو ملک کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا۔ یہ دور مسلمانوں کی تیز تر ترقی اور مملکت کی حدود کی توسیع کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اسی دور میں مسلمانوں کی حکومت کا سلسلہ بنگال تک جا پہنچا۔ اسی کے ساتھ ساتھ وسطی ایشیا اور دنیا کے کئی دوسرے خطوں میں بھی اسلام حیرت انگیز سرعت سے پھیل رہا تھا لیکن جلد ہی چنگیز خاں کی قیادت میں وحشی منگولوں کے غول ایک طوفان کی صورت میں اٹھے اور انھوں نے اسلامی سلطنت کے مشرقی حصّے کو پیروں تلے روند ڈالا۔ مسلمانوں نے ان ملکوں میں جس ثقافت، معاشرت اور معیشت کو پروان چڑھایا تھا منگولوں کی یلغار نے اسے تباہ کر کے رکھ دیا۔ منگولوں کی افواج شمال کے سلسلۂ کوہ کے راستے ہندوستان پر بھی حملہ آور ہوئیں لیکن دہلی کی اسلامی سلطنت نے کامیابی کے ساتھ انھیں پسپا کر دیا۔ وحشی منگولوں اور سلطنت دہلی کی افواج میں کچھ عرصے تک معرکہ آرائی ہوتی رہی مگر بہ وقت چوکسی کے سبب، ہندوستان میں مسلمان حکومت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔ اور اس نازک دور میں بھی یہاں ممتاز محقق، مدبّر اور سپاہی پیدا ہوتے رہے۔

جب وحشی تاتاریوں کے ہنگامے فرو ہوئے تو مسلمان محققین اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں میں لگ گئے، مسلمان صوفیا اور مفکرین نے اسلامی تصوّف کی ترقی میں نمایاں حصّہ لیا۔ دونوں زبانوں یعنی مقامی باشندوں کی بولی پراکرت اور مسلمانوں کی زبان فارسی کے اثرات ایک دوسرے پر مرتب ہونے لگے اور آخرکار ایک نئی مشترکہ زبان ۔ اُردو نے جنم لیا۔

اُردو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک مشترک رشتے کی حیثیت اختیار کرگئی اور بیسویں صدی کے آغاز تک اسے یہی امتیاز حاصل رہا تا اینکہ ہندوؤں نے اسے ایک غیر قوم اور حملہ آور تمدّن کی علامت قرار دے کر اس کی مخالفت شروع کردی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستی کے رشتے ٹوٹنے لگے۔ آئندہ چل کر برّکوچک کی دو بڑی سیاسی تنظیموں، آل انڈیا کانگریس اور آل انڈیا مسلم لیگ نے جب قوت و استحکام حاصل کیا تو اُردو اور ہندی کے سوال پر باہمی اختلافات گہرے ہوگئے اور ہندو مسلم کشیدگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔

مسلمان صوفیا کی کوشش یہ تھی کہ اسلام اور ہندومت کے درمیان نظریاتی خلیج کو پُر کردیا جائے۔ اُنھوں نے نہ صرف اسلام کے تصور کے مطابق اُخوّت و بھائی چارہ کی تبلیغ کی بلکہ اس بات کا بھی اعلان کیا کہ ہر ایک رُوح کا تعلق رُوحِ خالق سے ہے۔ اکثر مفکر اور شاعر صوفیا کے نظریات سے متاثر ہوئے۔ اس سلسلے میں کبیر، میرا بائی اور تلسی داس کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ صوفیا کی سبق آموز زندگی اور ان کے بے مثال کردار نے اسلام کی عظمت اور اس کی روحانی کشش میں نمایاں اضافہ کیا اور بہت سے ہندوؤں نے ان کے دستِ حق پرست پر اسلام قبول کیا۔

مغل خاندان کے سربرآرائے سلطنت ہونے کے بعد ہندوستان پر مسلمانوں کی یلغاروں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ مغل حکمرانوں نے خود کو مفتوحہ علاقوں اور وہاں کے عوام

کے مفادات کے سانچے میں پوری طرح ڈھال لیا تھا۔ اس طرح ہندوستان کی تاریخ میں ایک عظیم تہذیبی باب کا اضافہ ہُوا۔ مغل خاندان کی علم دوستی نے ہندوستان کے ثقافتی ورثے کو مالا مال کر دیا۔ اکبر نے ہندوستان کے دو بڑے مذاہب اسلام اور ہندومت کو یکجا کرنا چاہا جس کے نتیجے میں مذہبی رواداری کے ایک یادگار دور کا آغاز ہُوا۔ اکبر اور اس کے جانشینوں کی یہ کوشش تھی کہ عوام مذہبی اور سماجی نظام سے محفوظ ہو جائیں تاہم بعض کٹر مذہبی عناصر نے رواداری اور مذہبی سمجھوتے کی ان کوششوں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا۔ ان کا خیال تھا کہ مذہبی رواداری کے نتیجے میں اسلام کے عقائد و روایات سے انحراف کیا جا رہا ہے۔ تحریکِ مجدد کو اس سلسلے میں پیش رو کی حیثیت حاصل ہے۔ اس تحریک کا مقصد اسلام کی اُن بنیادی روایات کا احیا تھا جو خارجی دباؤ کی وجہ سے مُردہ ہو چکی تھیں۔ ان حالات کے نتیجے میں مسلمانوں کے درمیان ایک قسم کا ٹکراؤ شروع ہو گیا جس سے فائدہ اُٹھا کر جنگجو راجپوتوں اور مرہٹوں نے مغل حکومت کے خلاف اپنی باغیانہ سرگرمیوں کی رفتار کو تیز کر دیا۔ ابتدا میں تو یہ مقامی جھڑپیں تھیں لیکن جلد ہی اُنھوں نے بڑی جنگوں کی شکل اختیار کر لی اور مرہٹوں کی قوت میں اضافہ سے ہندوؤں کو یہ اُمید قائم کرنے کا موقع مِلا کہ اس طرح وہ ہندوستان میں ہندو راج قائم کر سکیں گے۔

اورنگ زیب کے انتقال کے بعد سلطنتِ دہلی کمزور ہوتی چلی گئی۔ مغل حکومت نازک صورتِ حال سے دوچار تھی۔ اس بات کا اندیشہ موجود تھا کہ تیموری اقتدار کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ ایک ایک کر کے مقبوضہ علاقے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔ پھر بھی آپس کی چپقلش اور خانہ جنگیاں ختم نہ ہوئیں۔ ضرورت تو یہ تھی کہ متحد ہو کر مشترکہ دشمن کا مقابلہ کیا جاتا لیکن کسی نے اس طرف توجہ نہ کی۔ تاہم احمد شاہ ابدالی کے حملے سے امید پیدا ہوئی کہ صورتِ حال کسی قدر سدھر جائے گی۔ پانی پت کی تیسری جنگ میں

مرہٹوں کو شکست فاش ہوئی۔ مگر اس جنگی کامیابی کو تاریخ کے وسیع پس منظر میں سیاسی کامیابی کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ سیاسی عدم استحکام کا نتیجہ یہ بھی تھا کہ سمندر پار کی طاقتوں یعنی برطانیہ، فرانس اور پرتگال کو برصغیر میں قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ البتہ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے اس تاریک دور میں عظمت کے چند روشن مینار اُبھرتے ہیں جنھیں بجا طور پر ہندوستانی مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں حیدر علی اور ٹیپو سلطان غیر فانی کردار کے مالک ہیں۔ یہ دونوں عظیم ہستیاں ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت و عظمت بحال کرنے اور ان کے سابقہ جاہ و جلال کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لیے بیرونی طاقتوں کے سامنے ایک مضبوط چٹان کی طرح جم گئے لیکن عمل و اقدام کی فیصلہ کن گھڑیاں بیت چکی تھیں۔ اس دور میں عظیم مذہبی مصلح اور رہنما بھی پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی تعلیمات سے مسلمان معاشرہ میں نئی روح پھونکنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں سید احمد شہید کا نام قابلِ ذکر ہے جنھوں نے اپنی تصنیفات سے مسلمانوں کے اذہان پر گہرا اثر ڈالا اور قلم کے ساتھ جہاد کے لیے تلوار بھی اٹھائی۔ انھوں نے شمال مغربی علاقوں میں مسلمانوں کا ایک مضبوط مرکز بنانے کی کوشش کی۔ ان کے دست راست مولانا اسمٰعیل شہید تھے۔ مولانا اسمٰعیل شہید کے بے لچک نظریات کی وجہ سے نہ صرف غیر مسلم بلکہ ان کے بہت سے ہم مذہب بھی ان کے مخالف ہو گئے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کے اختتام پر ان دیسی سپاہیوں میں بے اطمینانی پھیلنی شروع ہوئی جو انگریز افسروں کی کمان میں لڑنے کے لیے بھرتی کیے گئے تھے۔ برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں کی بے اطمینانی کی بنیاد یہ اندیشہ تھا کہ غیر ملکی آقا سازشوں اور گھٹیا طریقوں سے کام لے کر ان کا مذہب تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔ بالآخر یہ چنگاری سلگتے سلگتے ایک دن مہیب آتش فشاں میں تبدیل ہوگئی اور دلی کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ کے پرچم تلے متحد ہو کر دیسی سپاہیوں نے ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کی حکومت

کے خلاف بغاوت کردی ۔ اگرچہ باشعور مسلمانوں کو یہ احساس تھا کہ انگریزوں کی طاقت کے پیش نظر یہ جنگی کارروائی کامیاب نہیں ہوسکتی تاہم اُنھوں نے وطن پرست سپاہیوں کی ہر ممکن مدد کی۔

وطن پرستوں کو اس جنگِ آزادی کی ناکامی کی قیمت نہ صرف اپنی جان سے دینی پڑی بلکہ انجام کار پورے ہندوستان کے مسلمان انگریزوں کی حکومت کے عتاب کا ہدف بن گئے ۔ جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد بہت سے مسلمان خاندان دیکھتے دیکھتے کوڑی کوڑی کو محتاج ہوگئے تھے کیونکہ ان کی آبائی جاگیروں اور ملکیتوں پر غیر ملکی آقاؤں نے قبضہ جما لیا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت بدیسی حکمرانوں کی نظر میں ہر مسلمان ایک باغی اور بدخواہ کی حیثیت رکھتا تھا۔

کوئی غیر ملکی طاقت ، جب تک وہ مقامی عوام کے کم سے کم ایک طبقے کی حمایت حاصل نہ کرلے ، اپنے مقبوضہ علاقے میں اطمینان سے حکومت نہیں کرسکتی ۔ انگریزوں نے ہندوؤں کا اعتماد اور تعاون حاصل کرنے کے لیے اپنی تعلیمی اور انتظامی پالیسیوں میں تبدیلیاں شروع کردیں اور چونکہ وہ مسلمانوں سے بدظن تھے اس لیے اُنھوں نے مسلمانوں کو نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل کیا۔

اس سلسلے میں ایچ ٹی لیمبرک لکھتا ہے "مسلمانوں کو مسیحیت اور برطانیہ کا پیدائشی دشمن سمجھا جاتا تھا۔"[1] مسلمانوں کی دردناک حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر رقم طراز ہے: "آج بھی مسلمان وقتاً فوقتاً اپنی قومیت اور جنگجوئی کے احساس کا مظاہرہ کرتے ہیں لیکن دوسرے تمام پہلوؤں سے وہ ایک ایسی قوم ہیں جو انگریزی راج میں تباہ ہوچکی ہے۔"[2]

---

[1] سرچارلس نیپیر اینڈ سندھ ۔ ایچ ٹی لیمبرک صفحہ ۲۰ ۔ [2] اور انڈین مسلمان ۔ سرڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۱۴۹ ۔

اس زمانے میں عام طور پر سرکاری آسامیوں کے لیے جو اشتہارات دیے جاتے
ن میں صاف صاف درج ہوتا کہ یہ آسامیاں ہندوؤں کے لیے مخصوص ہیں۔ اس طرح
فتہ رفتہ انگریزی حکومت نے مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں سے بالکل خارج کر دیا۔
یہ تھا مسلم ہند کے شدید مصائب کا وہ صبر آزما عہد جس میں ایک دُور اندیش و بالغ نظر
ہما سر سید احمد خان نے جنم لیا۔ سر سید احمد خان نہ صرف جیّد عالم بلکہ عوامی رہنما بھی تھے۔
یاست کا میدان کسی خارزار سے کم نہیں، کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہاں نظریاتی اختلافات نہ
نے کب ایک خطرناک جوالا مُکھی کی حیثیت اختیار کر جائیں۔ سر سید احمد خان کو اپنے
م مذہبوں کی ابتر حالت کا شدید احساس تھا۔ ایک طرف اُنھوں نے اپنے مضبوط دلائل
سنجیدہ مباحث کے ذریعے مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ انگریز حکمرانوں کے خلاف جنگ نہ
یں تاکہ اُنھیں تباہ کن نتائج کا سامنا نہ کرنا پڑے، دوسری طرف متعصب اور مسلمان دشمن
یز حکمرانوں پر زور دیا کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ حقارت کے بجائے ہمدردی اور عزت
سلوک کریں۔ مسلم قوم کے لیے سر سید کا پیام یہ تھا کہ وہ پچھلے واقعات سے درسِ عبرت
ں اور پوری سرگرمی کے ساتھ مغربی علوم کے حصول کی طرف راغب ہو جائیں۔ کیونکہ
ف تعلیم جدید کے ذریعے ہی زندگی کی تیز رفتار جد و جہد میں ان کی قومی نجات و ترقی
نا ہے۔ اس عظیم الشان مسلم رہنما نے فقید المثال جذبے اور جوش کے ساتھ کام کیا اور
ں جد و جہد اور جانفشانی کے بعد وہ علی گڑھ کی سرزمین پر اینگلو محمڈن اورنٹیل کالج
ے نام سے ایک ادارہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ جس میں معزز اور سیاسی لحاظ سے
بلا دیکھے متوسط طبقے کے بچے جوق در جوق داخل ہونے لگے اور رفتہ رفتہ مغربی
ہم کے خلاف یہ اندیشہ کہ اس طرح مسلمان اپنے مذہب سے بیگانہ ہو کر مسیحیت کی
ف مائل ہو جائیں گے اپنی طبعی موت مر گیا۔
سر سید کی آواز پر جہاں روشن خیال مسلمانوں نے لبیک کہی وہاں رجعت پسند

مولوی اور قدامت پرست طبقے ان کے خلاف صف آرا ہو گئے اور انھوں نے ان کے خلاف اعتراضات کی بھرمار کردی۔ سرسید نے ان اعتراضات اور اس مخالفانہ تحریک کا جواب دینے کے لیے "تہذیب الاخلاق" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا اور اس کے ذریعے انھوں نے مسلمانوں کو ان سماجی، اقتصادی، سیاسی، تعلیمی اور مذہبی مسائل کے متعلق اپنے خیالات سے روشناس کرایا جو مسلمانوں کو درپیش تھے۔

جو لوگ سرسید کے خیالات سے اتفاق رکھتے تھے، علیگڈھ کالج نے ان کے لیے ایک مرکز کی حیثیت اختیار کرلی۔ یہ ادارہ آزاد خیالی اور ترقی کی ایک علامت تھا۔ سرسید نے یہ ضرورت محسوس کی کہ کالج کو ترقی دے کر مسلم یونیورسٹی بنا دیا جائے لیکن اس سے پہلے کہ اُن کا یہ خواب حقیقت میں تبدیل ہو، اس جلیل القدر مصلح کا انتقال ہو گیا۔ اب علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا بیڑا نواب محسن الملک اور ان کے بعد آغا خان نے اٹھایا۔ ان کی کوششیں آخر کار بارآور ہوئیں اور علیگڈھ مسلم یونیورسٹی وجود میں آگئی۔ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی تحریکوں کے آغاز کے لیے علیگڈھ کو نہ صرف ایک درس گاہ اور دانش گاہ کی حیثیت حاصل ہے بلکہ یہ بجائے خود ایک ایسی تحریک کا درجہ رکھتا ہے جس نے مسلمانوں میں یہ شعور بیدار کیا کہ انھیں زندگی کے تمام شعبوں میں خود کو منظم کر کے اپنے حقوق کا تحفظ کرنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ ادارہ مسلمانوں کے ممتاز سماجی، تعلیمی اور سیاسی رہنماؤں کا گہوارہ ثابت ہوا۔ سرسید نے منزلِ مقصود کی نشان دہی کر دی تھی جس کی طرف ان کے بعد آنے والے بے خوف و خطر گرمِ سفر ہو سکتے تھے اور اس طرح عام قومی فلاح و بہبود کے لیے مسلمانوں کے اجتماعی اداروں اور کانفرنسوں کی راہ ہموار ہوئی۔

اس سلسلے میں آغا خان لکھتے ہیں۔ "کسی قوم کی ذہنی اور روحانی نشاۃِ ثانیہ کے لیے متمدن دنیا کی تاریخ میں اکثر یونیورسٹیوں نے گہوارہ کا کام کیا ہے ——

عرب قومیت پر بیروت کی امریکن یونیورسٹی کے اثرات کا کون اندازہ لگا سکتا ہے؟ علیگڈھ یونیورسٹی بھی اس کُلیّہ سے مستثنیٰ نہیں ہے لیکن ہم فخر سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ علیگڈھ یونیورسٹی خود ہماری کوششوں کا نتیجہ تھی اور یقیناً یہ دعویٰ بھی کیا جا سکتا ہے کہ آزاد و خُود مختار پاکستانی قوم مسلم یونیورسٹی علیگڈھ میں پیدا ہوئی؛ ۵

علیگڈھ میں ایک قومی درس گاہ کے قیام کے بعد سرسیّد نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کی بنیاد ڈالی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان ہر سال اس کانگریس کے پلیٹ فارم پر جمع ہو کر اپنے تعلیمی مسائل اور ضرورتوں پر غور کیا کریں۔ محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے پہلے اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا۔ میں ان لوگوں سے متفق نہیں ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ ہم سیاسی مسائل پر غور و خوض کے ذریعے ترقی کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس مجھے یقین ہے کہ صرف تعلیم ہی ہماری قومی ترقی کا ذریعہ ثابت ہو سکتی ہے —— ہم مسلمانوں کو ایک قوم کہا جاتا ہے لیکن برصغیر کے ایک حصّے کے مسلمان، دوسرے حِصّے کے مسلمانوں کے حالات سے اتنے ہی بے خبر ہیں جتنے بیرونی ملکوں کے عوام۔ ۱۸۹۰ء میں کانگریس کے اجلاس الہ آباد میں یہ طے کیا گیا کہ اس کا نام بدل کر محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کر دیا جائے اور اس ادارے کے ذریعے مسلمانوں میں تعلیم عام کر کے ان میں سیاسی بیداری پیدا کی جائے۔

تعلیم یافتہ ہندوستانی باشندوں میں روزافزوں بیداری کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ انیسویں صدی کے دوسرے نصف حِصّے میں ہندوستان میں آزادی کی تحریک شروع ہو گئی جس نے بیسویں صدی کے پہلے نصف دور میں زبردست قوت حاصل کر لی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ مادرِ وطن پر انگریزوں کا

---

۵ دی میموائرز آف آغا خان۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء۔ صفحات ۳۵، ۳۶۔

تسلط ان کے احساس حبّ وطن کے لیے ایک کھلا چیلنج ہے اور اس حقیقت کی بھی نفی کرتا ہے کہ وہ ایک خود مختار قوم کی حیثیت سے اپنا وجود برقرار رکھ سکتے ہیں۔ بعد کو بدیسی حکومت اور برِ صغیر کے محکوم عوام کے درمیان جو کشمکش برپا ہوئی وہ ایک طویل جدوجہد کی حیثیت اختیار کر گئی جس میں ترقی پسند وطن دوست قوتوں کو آخر کار فتح نصیب ہوئی۔

۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں کو جن آلام و مصائب کا سامنا کرنا پڑا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا ہے "حقیقت تو یہ ہے کہ کلکتہ کا شاید ہی کوئی دفتر ایسا ہو جس میں کوئی مسلمان قُلی، ڈاکیہ اور چپراسی سے زیادہ اونچی نوکری کی امید کر سکتا ہو" [۱]

جنگِ آزادی کے بعد مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھائے گئے اور جس وحشیانہ انداز میں ان کا قتلِ عام کیا گیا، خود انگریز مورخین نے اس کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً کے (KAYE) اور میلیسن (MALLESON) نے لکھا ہے کہ: "پھانسی دینے والے رضاکار دستے اور غیر پیشہ ور جلاد بڑے مصروف تھے۔ ایک آدمی بڑے فخر کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے نہایت چابکدستی کے ساتھ اتنے آدمیوں کو ختم کیا ہے۔ لوگوں کو آم کے درختوں میں لٹکا کر پھانسی دی جاتی یا ہاتھی کے پیروں تلے کچل دیا جاتا۔ ہر طرف جنگل کے اس وحشیانہ قانون کے شکار نظر آتے تھے۔ جیسے اس قتل و غارت کا مقصد محض تفریح ہے اور بس" [۲]

ہومس نے اقرار کیا ہے کہ انگریز افسر عدالتیں جما کر بیٹھ گئے اور محض شک و شبہ کی بنیاد پر پھانسی کی سزا دی جانے لگی۔" افسروں نے فوجی عدالتوں میں بیٹھتے وقت یہ قسم کھائی کہ ہم اپنے قیدیوں کے جرم یا بے گناہی کا خیال کیے بغیر انھیں پھانسی کی

---

[۱] دی انڈین مسلمان۔ سر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر۔

[۲] ہسٹری آف دی انڈین میوٹنی۔ کے اینڈ میلیسن۔ جلد دوم صفحہ ۷۷۔

سزادیں گے۔ اگر کسی نے اس اندھا دھند ظلم و ستم کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت کی تو اس کے ساتھیوں نے آوازے کس کر اس کو خاموش کر دیا۔ قیدیوں کو سرسری سماعت کے بعد سزائے موت کا حکم سنایا گیا، انھیں ستایا گیا اور انھیں اذیتیں دی گئیں۔[1]

مجاہدین حریت پر انگریزوں کی فتح سے مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو گئیں لیکن ہندوؤں پر اس کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ مثلاً آل انڈیا کانگریس کے ایک لیڈر ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ نے لکھا ہے: "مسلمانوں کی عظمت و بلندی کا نام و نشان عملی طور پر مٹا دیا گیا اور کوئی ایسا شخص باقی نہ رہا جس کے گرد جمع ہو کر لوگ ۱۸۵۷ء کے واقعات دہرا سکیں۔ انگریزوں کی حکومت مقسوم و مقدر ہو چکی تھی اور ہندوستان میں پھر وہی امن و سکون قائم ہو گیا جو ہمارے قومی کردار کا خاصہ ہے۔"[2]

ہنری ہیرنگٹن نے ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا: "میں بیان کر چکا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت کی تحریک ہندوؤں نے شروع نہیں کی تھی۔ اب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کروں گا کہ یہ بغاوت مسلمانوں کی سازش کے نتیجے میں ہوئی تھی — مسلمان جن کے تحت ہمیں تباہ کر دینا چاہتے تھے۔ ان کی دشمنی کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ مسیحیت کے خلاف صدیوں سے مسلمانوں کے جذبات موجزن تھے — مسلمانوں نے اس بغاوت کی سازش تیار کی اور اس کی تنظیم کی۔"[3] ان تحریروں نے انگریزوں کے دل میں مسلم دشمنی کی چنگاریوں کو اور ہوا دی اور انھوں نے بے بس مسلمانوں پر سنگین مظالم ڈھائے۔ اے۔ عزیز کے الفاظ میں: "انگریز، جو مسلمانوں کی شجاعت سے نفرت کرتے تھے اب ان کے مذہب کے بھی دشمن ہو گئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے وجود کو برطانوی سامراج کے لیے ایک چیلنج تصور کیا۔ نسلی منافرت

---

[1] ہسٹری آف دی سپاہی وار۔ ہومز۔ صفحہ ۱۲۴۔ [2] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء صفحات ۸ و ۹۔ [3] اے پمفلٹ۔ ہنری ہیرنگٹن ۱۸۵۸ء

کا ایک طوفان اُمڈا۔ بربریت و خونریزی کا بازار گرم ہو گیا ۔ مسلمان مردوں اور عورتوں کا قتلِ عام ہونے لگا، بچوں اور بوڑھوں کی کوئی تخصیص روا نہ رکھی گئی اور انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا گیا۔[1]

۱۸۵۷ء کی بغاوت کے تقریباً بیس سال بعد لارڈ لٹن نے ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کی وہ محدود آزادیٔ تحریر بھی سلب کر لی جو اب تک انھیں حاصل تھی۔ اس نے قانونِ اسلحہ بھی منظور کیا جس کے مطابق ہندوستانی باشندے اپنے پاس ہتھیار نہ رکھ سکتے تھے۔ خاص طور سے اس قانون کا اثر ہزاروں مسلمان شُرفا اور اُمرا پر پڑا جنھیں صدیوں سے اسلحہ رکھنے کی رعایت حاصل تھی۔ کاشتکاروں کو انتہائی پریشان کُن حالات کا سامنا کرنا پڑا اور قحط اور اس سے پیدا شدہ فسادات نے ان پر مزید تباہ کن اثر ڈالا۔

جنگِ آزادی کے بعد انگریزوں نے اپنی پالیسی میں ڈرامائی تبدیلیاں کیں۔ اُنھوں نے ہندوؤں کی سرپرستی کی اور مسلمانوں کو جان بُوجھ کر کچلنے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ دونوں قوموں کو سماجی اور اقتصادی اعتبار سے ایک ہی سطح پر لایا جائے۔ اس کے بعد ایک قوم کو دوسری قوم کے خلاف اُبھارنے اور اُکسانے کی سازشیں وسیع پیمانے پر کی گئیں۔ مراد آباد کے کمانڈنٹ، لفٹننٹ کرنل جان کوک نے بغاوت کے بعد اپنے ایک مراسلے میں لکھا۔ ہماری کوشش یہ ہو گی کہ مختلف مذاہب اور فرقوں کی علیحدگی کو پوری قوت کے ساتھ برقرار رکھیں اور انھیں اس خلیج کو پاٹنے کا ہرگز موقع نہ دیں۔ ہندوستان میں ہماری حکومت کی پالیسی یہ ہونی چاہیے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو۔" بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن نے بھی اس خیال کی پوری پوری تائید و حمایت کی۔ اس نے ۱۴ مئی ۱۸۵۹ء کو اپنی کونسل کی کارروائی میں لکھا "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" قدیم رومی نعرہ تھا اور اب بھی ہمارا نعرہ ہونا چاہیے۔"

جس زمانے میں لارڈ ڈفرن ہندوستان کا وائسرائے تھا، پھوٹ ڈالنے اور

---

[1] ڈیموکریسی آف پاکستان۔ ایس۔ ایم۔ ضمیر، مطبوعہ ۱۹۶۴ء صفحہ ۲۰۵

حکومت کرنے کی یہ پالیسی انتہائی عروج پر تھی۔ لارڈ ڈفرن نے ۱۸۸۵ء میں ایک ریٹائرڈ سول افسر ایلین آکٹوین ہیوم کو آمادہ کیا کہ وہ تعلیم یافتہ ہندوستانی باشندوں کے تعاون سے انڈین نیشنل کانگریس کی تنظیم کرے۔ ۲۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ڈبلیو سی بنرجی کی صدارت میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ کانگریس کے پہلے صدر ڈبلیو سی بنرجی کے حوالے سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کانگریس کے قیام کے پس پشت انگریز حکمت عملی کا پوشیدہ ہاتھ کارفرما تھا: "شاید بہت سے لوگوں کو اب تک علم نہ ہو کہ انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد درحقیقت مارکوئیس آف ڈفرن اور ایوا (Ava) کے اشارے پر اس وقت ڈالی گئی تھی جب وہ ہندوستان کا گورنر جنرل تھا۔ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے وعدہ لے لیا تھا کہ جب تک وہ ہندوستان میں موجود ہے کانگریس کی تنظیم کے سلسلے میں اس کا نام درمیان میں نہیں لایا جائے گا۔ مسٹر ہیوم نے گورنر جنرل کی اس خواہش کا احترام کیا۔"[1] مختصر یہ کہ ہیوم کانگریس کے جھنڈے تلے ہندوستانی دانشوروں کو جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسری طرف وہ سرکاری افسروں، خاص طور پر انگریزوں، پر زور دیتا رہا کہ کانگریس کے نمائندوں کے اعزاز میں دعوتیں دی جائیں۔

حد تو یہ ہے کہ کیلاش چندر جیسے مسلمان دشمن نے بھی مسلمانوں کے خلاف اپنی رسوائے زمانہ کتاب میں تسلیم کیا ہے کہ "ہندوستان میں برطانوی حکومت نے غالباً یہ محسوس کر لیا تھا کہ ۱۸۵۷ء کی نام نہاد بغاوت (جسے قوم پرست ہندوستانی اپنی پہلی جنگ آزادی بھی کہتے ہیں) کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ انگریز حکام، ہندوستانی باشندوں کے خیالات، نظریات اور ان کی قومی اُمنگوں سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ اسی احساس کے زیر اثر انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی۔ اس وقت کا ہندوستان کا وائسرائے کانگریس کے پہلے

---

[1] این انٹروڈکشن ٹو انڈین پالیٹکس، ڈبلیو سی بنرجی ۱۸۹۸ء

اجلاس بمبئی کی صدارت کرنے والا تھا لیکن کسی اہم مصروفیت کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہو سکا اور بمبئی پریذیڈنسی کے گورنر نے صدارت کی۔ قیامِ کانگریس کے چند سال بعد تک سرکاری افسروں کو اس کی اجازت تھی (یا شاید انھیں ہدایت کی گئی تھی) کہ وہ آل انڈیا کانگریس سے رابطہ قائم رکھیں۔[1]"

ڈاکٹر پتابھی سیتارمیہ جیسے کٹر کانگریسی کو بھی اعتراف کرنا ہی پڑا کہ ابھی تک اس راز سے پردہ نہیں اُٹھ سکا کہ آل انڈیا کانگریس کا خیال کس کے ذہن کی پیداوار ہے۔[2]

ڈاکٹر سیتارمیہ نے ہندو قوم کے جذبات میں تحریک پیدا کرنے کے لیے ہندو نشاۃ ثانیہ کے اسباب کا تفصیلی تجزیہ کیا ہے تاکہ انھیں یہ محسوس کرایا جا سکے کہ انھیں ہندوستان پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر سیتارمیہ لکھتے ہیں "حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تمام تحریکیں ہندو قومیت کے شیرازے میں تانے بانے کی حیثیت رکھتی ہیں اور قوم کا فرض ہے کہ ایک ایسے نظریے کی تشکیل کی جائے جس سے تمام اوہام اور خام خیالیوں کا خاتمہ ہو سکے، نیز پرانے عقیدے (ہندو مت) کی تطہیر کر کے ویدانیت کو عروج دیا جائے اور اُسے نئے زمانے کی قومیت کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ انڈین نیشنل کانگریس اسی عظیم نصب العین کے حصول کے لیے قائم کی گئی تھی۔[3]"

یہ تھی قیامِ کانگریس کی غرض و غایت۔ اگرچہ اس مقصد پر پردہ ڈالنے کی بے شمار کوششیں کی گئیں تاہم تاریخ میں اس باب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

۱۸۹۲ء میں دستوری اصلاحات کے سلسلے میں کانگریس نے اپنا پہلا مطالبہ پیش کیا۔ اس نے مطالبہ کیا کہ مجالسِ قانون ساز کے لیے لوکل باڈیز کے بالواسطہ انتخاب کو

---

[1] ٹریجیڈی آف جناح۔ کیلاش چندر۔ شرما پبلشرز لاہور ۱۹۴۱ء۔ صفحہ ۲۰۲۔ [2] ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پتابھی سیتارمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۱۶۔ [3] کتاب محولہ بالا۔ صفحہ ۲۲۔

قطعی و آخری حیثیت حاصل ہونی چاہیئے اور حکومت کی منظوری یا نامنظوری کی شرط ختم ہوجانی چاہیئے۔ کانگریسی رہنماؤں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ۱۸۹۲ء کے قانون ہند میں عوام کو کونسلوں کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ برصغیر میں مجالس قانون ساز کے لیے براہِ راست انتخاب کے حق میں پہلی بار آواز بلند کی گئی۔

کانگریس کے سالانہ اجلاس ہر سال منعقد ہوتے رہے۔ یہ اجلاس ایک طرف تو ہندوستان کے سیاسی مفکرین کے لیے سیاسی مسائل پر غور و فکر کرنے کا موقع فراہم کرتے اور دوسری طرف غیر ملکی حکمرانوں کو یہ احساس دلاتے کہ ہندوستان کے سیاسی رجحانات کس سمت میں حرکت کر رہے ہیں۔ ۱۹۰۶ء میں کانگریس کے اجلاس میں اس وقت کے صدر دادا بھائی نوروجی نے جب یہ قرارداد منظور کرائی کہ ہندوستان کا سیاسی نصب العین سوراجیہ یا برطانوی حکومت کے زیر نگرانی داخلی حکومت کا حصول ہے تو ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں ایک نئے حوصلہ افزا اور ترقی پسندانہ باب کا اضافہ ہوا۔ کانگریس کے اس یادگار اجلاس میں قائداعظم دادا بھائی نوروجی کے اعزازی سیکرٹری کی حیثیت سے منظر سیاست پر نمودار ہوئے۔ مختلف کمیٹیوں کے اجلاس کے دوران مذاکرات، نجی صلاح مشوروں اور قراردادوں کے مسودے تیار کرنے میں انھوں نے اہم کردار ادا کیا تاہم کانگریس کے کسی عام اجلاس میں قائداعظم نے کوئی تقریر نہیں کی۔

۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۶ء کے دوران میں کانگریس نے دو مسلمانوں کو اپنا صدر منتخب کیا۔ ۱۸۸۷ء میں مسٹر بدرالدین طیب جی اور ۱۸۹۶ء میں مسٹر آر ایم سیانی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو جماعت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل کیا جائے۔ اس پر سر سید احمد خان نے متحدہ محبانِ ہند کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد ڈالی اور ۱۸۸۸ء میں جنرل گراہم کو لکھا۔ "اس جماعت کا مقصد یہ ہے کہ کانگریس کے سیاسی نظریات اور سرگرمیوں کی مخالفت کی جائے۔"

جب ۱۸۹۶ء میں مسٹر سیانی کلکتہ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے والے تھے تو سر سید نے عین اسی موقع پر کلکتہ میں مسلم ایجوکیشنل کانگریس کا جلسہ منعقد کیا تاکہ مسلمان انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس میں شرکت نہ کر سکیں۔

کانگریس میں مسٹر بی جی تلک کی شمولیت کے بعد نئے رجحانات رونما ہوئے۔ انھوں نے پورے ہندوستان میں گاؤ کشی کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر کے اور شیواجی کے اصولوں کا پرچار کر کے ہندو انتہا پسندی کا جھنڈا لہرایا۔ شیواجی کو ہندو قوم کا ہیرو قرار دیا گیا تاکہ اس سرزمین پر مسلمانوں کو ایک قوت کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے۔ اس طرح ہندو مسلم اختلافات کی جڑیں گہری ہوتی چلی گئیں۔ ادھر مسلمانوں نے بھی بدلی ہوئی صورتِ حال کا احساس کر کے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے معاملات کا جائزہ لینا شروع کیا۔ کانگریس سے مسلمانوں کی عام بے تعلقی کا ثبوت یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں کانگریس کے اجلاس بنارس میں ۷۵۶ نمائندوں میں سے صرف ۱۷ مسلمان تھے۔ سر سید احمد کے کارناموں اور ان کی بے لوث خدمات نے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی روح دوڑا دی تھی۔ سر سید کے جانشین نواب محسن الملک نے اس بات کا بیڑا اٹھایا کہ وہ مسلمانوں کے سیاسی وجود کو مستحکم کرنے کے لیے انھیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں گے۔ بمبئی میں محسن الملک نے ہندوستان بھر کے مسلم لیڈروں کا ایک اجلاس طلب کیا جس میں بانیٔ جلسہ کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ مسلم رہنماؤں کا ایک وفد تشکیل دیں اور اس کا لیڈر بھی نامزد کریں۔[۱] انھوں نے ہندوستان کے مختلف علاقوں سے مسلمانوں کے ۳۵ نمائندے چنے اور قائدِ وفد کے طور پر ہز ہائی نس آغا خان کا نام تجویز کیا۔ ہز ہائی نس چین روانہ ہو چکے تھے لیکن محسن الملک کی درخواست پر انھوں نے کولمبو میں اپنا سفر ملتوی کر دیا اور وفد کی قیادت کرنے کے لیے شملے واپس پہنچ گئے۔ اس وفد نے یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو وائسرائے سے ملاقات کی۔

---

[۱] انڈو پاکستان - تصنیف جمیل الدین احمد۔ مطبوعہ ۱۹۶۳ء۔ صفحہ ۳۰۔

وفد نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب منظور کیا جائے۔ یہ کوششیں بارآور ہوئیں اور دستوری اصلاحات کی ایک خاص دفعہ کے ذریعے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دے دیا گیا۔ یہ ایک اہم استحقاق تھا۔ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ جو رعایت ملے اسے نہ صرف پوری طرح استعمال کیا جائے بلکہ مستحکم بھی بنایا جائے۔ یہ صرف اسی طرح ممکن تھا کہ مستقل بنیادوں پر ایک سیاسی جماعت کی تشکیل کی جائے۔ کیونکہ یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ صرف ایک مضبوط و منظم تحریک کے ذریعے ہی مسلمانوں کے حقوق حاصل کیے جا سکتے ہیں اور ان کا تحفظ کیا جا سکتا ہے۔

اس خیال کے پیش نظر ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں ہندوستان کے ممتاز مسلمانوں کا ایک اجلاس طلب کیا گیا۔ یہی وہ اجلاس تھا جس میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد ڈالی گئی۔ قیام مسلم لیگ کے اغراض و مقاصد کیا تھے؟ ایک دفعہ کے ذریعے اس کی وضاحت اس طرح کی گئی تھی کہ لیگ "ہندوستان کے مسلمانوں کے سیاسی حقوق و مفادات کا تحفظ کرے گی" دفعہ مذکورہ میں اس امر کی وضاحت بھی کر دی گئی تھی کہ مسلم لیگ کی کوشش یہ بھی ہو گی کہ مسلمانوں میں دوسرے فرقوں کے متعلق کسی قسم کی منافرت یا تعصب کا جذبہ پیدا نہ ہو سکے۔ آغا خان کو مسلم لیگ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور وہ ۱۹۱۲ء تک لیگ کے صدر رہے۔

۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو پہلا تجارتی منشور ملا تھا۔ ۱۶۰۰ء سے ۱۹۰۶ء تک وقتاً فوقتاً جو اہم دستوری تبدیلیاں ہوئیں۔ اس موقع پر ان میں سے بعض کا تذکرہ ضروری ہے۔

ہندوستان کو اس دور میں تاریخ کے ایک فقید المثال حادثہ کا سامنا کرنا پڑا۔ غیر ملکی تجارتی کمپنی کے ملازموں نے قلم دوات کے بجائے بندوقیں اور توپیں سنبھال لیں اور اپنے ہم وطن حکمرانوں کو اس برصغیر کا حکمران بننے میں مدد دی۔ اس ضمن میں تاریخ کا

پہلا عجیب و غریب واقعہ ۱۷۵۸ء میں پیش آیا۔ اس موقع پر کمپنی نے، جو ۳۱ دسمبر ۱۶۰۰ء کو ایک منشور کے ذریعے قائم کی گئی تھی، ملکہ انگلستان کو تحفے کے طور پر ایک مملکت پیش کی اور اس تحفے پر پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے آئینی ملکیت اور قانونی جواز کی مہر ثبت کر دی۔ ۱۶۰۰ء کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا اہم آئینی قدم ۱۷۷۳ء کا قانون تھا۔ اس آئینی اقدام کا مقصد یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انتظام کو بہتر بنانے کے لیے چند ضابطے مقرر کیے جائیں۔ نئے قانون کے تحت ایک گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس کی مدد کے لیے چار کونسلر نامزد کیے گئے۔ گورنر جنرل اور اس کے مشیروں کو وسیع اختیارات حاصل تھے۔ اس طرح کمپنی کو جواب تک دہلی کے مغل شہنشاہ کی طرف سے محاصل وصول کرنے کا کام کرتی تھی، درحقیقت ہندوستان کا حاکم قرار دے دیا گیا اور آئندہ کے لیے اس سرزمین پر برطانوی سلطنت کی بنیاد رکھ دی گئی۔

وارن ہیسٹنگز پر جسے گورنر جنرل مقرر کیا گیا تھا، بعد میں نند کمار نے رشوت ستانی اور بدعنوانی کے الزامات لگائے اور یہ بھی دعویٰ کیا گیا کہ اس نے میر جعفر کی بیگم سے رشوت لی ہے۔ نند کمار کونسل سے وارن ہیسٹنگز کے خلاف فیصلہ کرانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کے بعد برطانوی پارلیمنٹ میں اس مقدمے کی صدائے بازگشت سنائی دی مگر دارالامراء نے گورنر جنرل کے خلاف تمام الزامات مسترد کر دیے۔ تاہم ان الزامات کے سلسلے میں نند کمار کو بڑی تکلیفوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی نادیدہ ہاتھ اس کا گلا دبوچنے کی فکر میں تھا۔ آخر کار بے غریب کو فریب دہی کے کسی فرسودہ مقدمے میں ماخوذ کر لیا گیا۔ کلکتہ کے ایک مارواڑی تاجر نے اس کے خلاف فریب دہی کا دعویٰ کیا تھا۔ اس زمانے میں فریب دہی کی سزا موت تھی اور نند کمار کو یہی سزا دی گئی۔ اس نے ہنسی خوشی یہ سزا قبول کر لی اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں شہید کا خطاب پایا۔ کسی سیاسی حریف کو، جو کسی اور طریقے سے قابو میں نہ آسکے نیست و نابود کرنے کا

اس سے زیادہ آسان طریقہ کیا ہو سکتا تھا؟

۱۷۸۴ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے پٹ انڈیا ایکٹ پاس کیا جس کی رُو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے علاقوں کا انتظام کرنے کے لیے ایک بورڈ آف کنٹرول قائم کیا گیا۔ دو سال بعد پارلیمنٹ کے ایک قانون کے ذریعے گورنر جنرل کے اختیارات بڑھا دیے گئے۔ اب وہ اپنی کونسل کا فیصلہ مسترد کر سکتا تھا۔ اس سال سے اٹھارویں صدی کے اختتام تک کے زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و رسوخ میں بڑی تیزی سے اضافہ ہُوا اور اس دوران میں وسیع علاقے اس کی عملداری میں شامل ہُوئے۔

۱۸۱۳ء کے چارٹر ایکٹ نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے اختیارات کافی حد تک کم کر دیے اور اسے اصلاً برطانوی پارلیمنٹ کی نگرانی اور کنٹرول میں دے دیا اور اگرچہ ۱۸۸۳ء میں کمپنی کے منشور کی تجدید کی گئی لیکن یہ بات اسی وقت واضح ہو گئی تھی کہ کمپنی کا انجام نزدیک ہے اور ہندوستان ایک نو آبادی کی حیثیت سے براہِ راست برطانوی تاج کے تحت آ جائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی کی ناکامی کے بعد ۱۸۵۸ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کر کے ہندوستان کو تاجِ برطانیہ کے تحت کر لیا۔ یکم جنوری ۱۸۷۷ء کو ملکہ وکٹوریہ نے دہلی میں شاہی دربار منعقد کیا جس میں ان کے قیصرۂ ہند ہونے کا فرمان جاری کیا گیا۔

۱۸۹۲ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعہ مجالس قانون ساز کے ممبروں کی تعداد میں اضافہ کر دیا جس میں غیر سرکاری عنصر بھی تھا۔ ۱۸۹۲ء کا سال اس لحاظ سے یادگار رہے گا کہ اسی سال پہلی بار قانون ساز کونسل کے نمائندوں کا انتخاب ہُوا۔ ۱۹۰۸ء تک فرقہ وارانہ بنیادوں پر نمائندگی نہیں دی جاتی تھی لیکن ۱۹۰۹ء میں پنجاب، برما، مشرقی بنگال اور آسام میں مجالس قانون قائم کی گئیں تو مسلم وفد کی خواہشات کے مطابق (یہ وفد ۱۹۰۶ء میں آغا خان کی زیرِ قیادت وائسرائے سے ملا

تھا) جداگانہ انتخاب کا اصول تسلیم کر لیا گیا اور اس کی رُو سے مسلمان اپنے نمائندے قانون ساز کونسلوں میں بھیجنے کے اہل ہو گئے۔ یہ سیاسی اصلاح بہت دُور رس اہمیت کی حامل تھی۔ ۱۹۰۹ء کے اسی قانون کے تحت بعد ازاں قائداعظم ایک مسلم حلقۂ انتخاب سے وائسرائے کی کونسل کے ممبر منتخب ہوئے۔

اتّحاد میں نجات ہے

بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ساتھ نوجوان، محنتی اور جفاکش بیرسٹر جناح
کے حالات میں تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ وکیل کی حیثیت سے دور دور تک
مشہور ہو جانے اور آمدنی میں اضافے کے بعد انھوں نے اپالو ہوٹل کی سکونت ترک کر
دی اور مالابار ہِل پر ایک شاندار فلیٹ کرائے پر لے لیا۔ انھوں نے فلیٹ کو بڑی
خوش ذوقی کے ساتھ آراستہ کیا اور اس کے لیے خاص قسم کا فرنیچر بنوایا۔ اس مکان
میں مسٹر جناح نے ایک ذاتی کتب خانہ بھی قائم کیا جس میں ہر موضوع پر بہترین کتابیں
جمع کی گئی تھیں۔

ان کے اس آراستہ مکان کو چند برسوں بعد بڑی اہمیت حاصل ہو گئی اور یہ
ایک طرح سے بمبئی کی شہری زندگی کا مرکز بن گیا۔

اُن کے باپ، بھائی اور بہنیں ابھی تک خوجہ محلّے میں رہتے تھے۔ جناح اکثر
بیشتر وہاں جاتے۔ ان کے والد بوڑھے ہو گئے تھے۔ کسی زمانے میں ان کی تجارت بھی
ہوتی تھی لیکن کاروباری خسارے کے سبب ان کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ بیرسٹر
جناح نے اپنے خاندان کی مالی معاونت میں پُرجوش حصّہ لیا اور اپنے بہن بھائیوں
کے تعلیمی اخراجات خود برداشت کیے اور ان کی تعلیم مکمل کرائی۔

اس زمانے میں ان کے والد تمام ہنگاموں سے بے نیاز پُرسکون زندگی گزار
رہے تھے اور اس لیے سب سے بڑے بیٹے کی حیثیت سے خاندان کی دیکھ بھال کا

فرض بھی جناح ہی کو انجام دینا تھا۔ جناح بھائی پونجا کے لیے سب سے بڑی بیٹی
رحمت بائی کی شادی کا سوال سب سے زیادہ پیچیدہ مسئلہ تھا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں شادیاں بزرگ طے کرتے ہیں بیوی کے انتقال
کے بعد شوہر کی ذمہ داریوں کا بوجھ اور بڑھ جاتا ہے اور یہاں صورتِ حال یہی تھی۔
جناح بھائی پونجا اپنی بیٹی کے مستقبل کی طرف سے ہر وقت بے چین اور متفکر رہتے تھے
ہیں ایسی کوئی خاتون موجود نہ تھیں جو رحمت بائی کے لیے بَر تلاش کریں۔ تاہم خلافِ امید
کلکتہ کے ایک نوجوان کا پیغام گویا مایوسی کے اس عالم میں امید کی کرن بن کر آیا۔ اس
لڑکے کے والد کلکتہ میں کاروبار کر رہے تھے اور اس کی ماں، اپنے بیٹے کے لیے دُلہن
تلاش کرنے بمبئی آئی ہوئی تھیں۔ رحمت بائی کو دیکھ کر انھوں نے یہ طے کر لیا کہ وہ ان
کے بیٹے کے معیار پر پوری اُترتی ہیں۔ آخر کچھ لوگوں کے ذریعے نسبت کی سلسلہ جنبانی کی
گئی۔ لیکن جوں ہی جناح بھائی کو معلوم ہوا کہ لڑکے کا خاندان اسمٰعیلی خوجہ نہیں بلکہ سُنّی
خوجہ ہے تو انھوں نے پیغام قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بات پکّی ہونے میں کوئی کسر نہیں
رہی تھی لیکن برادری سے باہر بیٹی کی شادی کرنے کے کیا نتائج ہوں گے؟ ان اندیشوں
کی بنا پر جناح بھائی پونجا نے لڑکے والوں کو صاف جواب دے دیا۔

مسٹر جناح گھر والوں سے ملنے آئے تو باپ کو غیر معمولی طور پر پریشان دیکھ کر انھوں
نے اس اضطراب و تشویش کا سبب پوچھا۔ انھیں پتہ چلا کہ کلکتہ کے جس لڑکے کی بات
آئی تھی وہ جمال خاندان سے تعلق رکھتا ہے گو اس خاندان سے شادی بیاہ میں کوئی
عیب نہیں تاہم انھیں ڈر ہے کہ رحمت بائی کی شادی اگر سُنّی خوجہ برادری میں ہو گئی
تو اسمٰعیلی خوجے انھیں اپنی برادری سے نکال دیں گے۔ نوجوان اور دور اندیش جناح نے
باپ کو تسلی دی اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا خود بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے لڑکے
کے مشاغل تعلیم اور کاروبار کے بارے میں ان خاتون سے معلومات حاصل کیں اور لڑکے

کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، پتہ چلا کہ کاروباری مصروفیات کی وجہ سے لڑکا خود تو مبئی نہیں آسکا البتہ اس سلسلے میں ماں کو تمام اختیارات حاصل ہیں۔ مسٹر جناح نے لڑکے کا فوٹو دیکھا تو انھیں پوری طرح اطمینان ہو گیا۔ رشتے کے خواہش مند نوجوان میں سب کچھ موجود تھا۔ تعلیم، صحت، دولت، عزت اور شرافت۔ اُنھوں نے اپنے والد کو آمادہ کرنے کی بہت کوشش کی لیکن برادری سے الگ کر دیے جانے کے خوف سے وہ نہ مانے۔ آغا خان اُس وقت اتفاق سے مبئی میں موجود تھے۔ جناح صاحب نے اسمٰعیلی رہنما سے ملاقات کی اور یہ معاملہ ان کے سامنے پیش کر دیا۔ آغا خان نے ان کے خیالات سے اتفاق کرتے ہُوئے یقین دلایا کہ اگر رحمت بائی کی شادی برادری سے باہر ہوئی تو ان کے بیرِ جناح بھائی پونجا کے خاندان کو برادری سے الگ نہیں کریں گے۔

مسٹر جناح نے واپس آکر اپنے والد کو یہ خوشخبری سنائی اور ان کے سر سے ایک بڑا بوجھ ہٹ گیا اور کچھ دن بعد رحمت بائی کی شادی جمال خاندان میں اس نوجوان سے ہو گئی۔

آغا خان نے اپنی یادداشت میں لکھا ہے۔ "میں جناح کو برسوں سے جانتا تھا۔ اس وقت سے جب وہ قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وکالت کرنے کے لیے انگلستان سے مبئی واپس آئے ان کی موت تک ہمارے تعلقات قائم رہے"[1]

یہاں اس واقعے کا ذکر اس لیے ضروری تھا کہ مسٹر جناح میں شروع ہی سے معاملہ فہمی کی جو صلاحیت، دانش مندانہ حوصلہ مندی اور ذات پات کی تفریق کے سلسلے میں جو روشن خیالی پائی جاتی تھی، اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔

کانگریس کا قیام ۱۸۸۵ء میں ہُوا تھا۔ ۱۸۸۵ء سے انیسویں صدی کے آخر تک

---

[1] دی میموائرز آف دی آغا خان۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۲۹۲۔ کیسل اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن۔

کا زمانہ اپنے دامن میں عجیب وغریب نیرنگیاں لیے ہوئے ہے کبھی تو سلطنتِ برطانیہ سے وفاداری کا ڈھونگ رچایا جاتا اور کبھی کانگریس ہاتھ جوڑ کر نظم ونسق کی تبدیلیوں اور سیاسی اصلاحوں کی بھیک مانگتی۔ انگریز حکمرانوں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ نظم ونسق کی بنیادی تبدیلیوں کے مطالبات کو نہ قبول کر کے اگر لوگوں کی دشمنی مول لی گئی ہے تو کیوں نہ سیاسی اصلاحیں نافذ کر کے انھیں دوست بنایا جائے۔ چنانچہ بڑی بے دلی کے ساتھ سیاسی اصلاحات نافذ کی گئیں کہ روز افزوں مخالفت اور مزاحمت کو کسی طرح تو ختم کیا جائے۔ انگریزوں کے اس بے دلانہ رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے ایک مرتبہ گوکھلے نے کہا تھا۔ اصلاحات میں جو تاخیر ہوئی اُن سے ان اصلاحات کی قدر و منزلت آدھی رہ گئی اور تعریف کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہا۔

انگریزی حکومت اہلِ ہند کے خلاف جو قوانین بنا رہی تھی اور جس رجعت پسندانہ سیاسی حکمتِ عملی پر عمل درآمد کیا جا رہا تھا، اس نے پورے ملک میں برطانوی اقتدار کے خلاف ایجی ٹیشن اور احتجاجی مظاہروں کا بازار گرم کر دیا۔ انگریز حاکموں نے کہ طاقت واقتدار کے نشے میں دُھت تھے۔ پہلے تو ایجی ٹیشن کچل دینے کی بھرپور کوشش کی مگر جب ظلم وستم اور ترغیب وتہدید کے حربے ناکام رہ گئے تو پھر تھوڑے بہت مطالبے قبول کرنے ہی پڑے۔ اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۸۷۰ء میں حکومت نے لارڈ لٹن کا مرتب کردہ پریس ایکٹ نافذ کیا تھا مگر جب ایجی ٹیشن اور مظاہرے بڑھنے لگے تو حکومت نے اس قانون کو واپس لے لیا۔ سیاسی میدان میں حکومت نے جو رجعت پسندانہ تدبیریں اختیار کیں ان سے فائدہ تو کچھ نہ ہوا البتہ بیس سال میں داخلی نظم ونسق کے اخراجات ۷۰ لاکھ پونڈ سے بڑھ کر ڈیڑھ کروڑ پونڈ تک جا پہنچے۔ ۱۸۹۷ء میں دفعہ ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ الف کے نفاذ اور سیاسی حریفوں کو کچلنے کے لیے دفعہ ۱۰۸ اور دفعہ ۱۴۴ کے ظالمانہ استعمال کے سبب حکومت کے خلاف عوامی ناراضی اور ناپسندیدگی میں غیر معمولی

اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۰۸ء میں دیسی اخباروں وغیرہ کے خلاف خفیہ کمیٹی بنائی گئی ــــــ بیسویں صدی کے ابتدائی پانچ سال میں حکومت نے جو کارنامے انجام دیے ان میں کلکتہ کارپوریشن کے اختیارات میں کمی سرکاری رازوں کے قانون کا نفاذ اور یونیورسٹیوں کو سرکاری تحویل میں لینے کے شرمناک اقدامات قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر اقدام سے یونیورسٹی کی تعلیم بیحد گراں ہوگئی۔ اب صرف روسا اور اُمرا کے بچے ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرسکتے تھے۔ ہندوستان کے ایک ممتاز تعلیمی ماہر ڈاکٹر گوئر کی رائے میں "درسگاہوں میں سونے کے قفل ڈال دیے گئے جو صرف طلائی کلیدوں ہی سے کھل سکتے تھے"۔ یونیورسٹیوں کو سرکاری تحویل میں لینے سے حکومت کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ درسگاہیں سرکاری محکموں میں تبدیل ہوگئیں۔ آزادانہ حصولِ علم کے جذبے کے بجائے یونیورسٹیوں میں ایک ایسا ماحول پیدا ہوگیا جہاں نظریے اور خیالات طالب علموں پر مسلط کیے جاتے تھے اور طلب علم کی سچی خواہش ٹھٹھر کر رہ جاتی تھی۔ زخموں پر مزید نمک پاشی اس طرح کی گئی کہ اس وقت کے وائسرائے لارڈ کرزن نے فرمایا: "ہندوستانی باشندے انگریزی حکومت میں اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے اہل نہیں ہیں"۔ ان الفاظ نے ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ لارڈ کرزن انگریزوں کی گوری نسل کی برتری کے صف اوّل کے حامیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ آج جب ہم جنوبی افریقہ کے سلسلے میں نسلی امتیاز کی پالیسی کی زور و شور سے مذمت کرتے ہیں، اس وقت ہمیں لارڈ کرزن کے ان الفاظ کو بھی یاد رکھنا چاہیے۔ کاش! اس وقت بھی اڈمنڈ برک اور شیریڈن جیسا کوئی عظیم برطانوی مدبر موجود ہوتا۔

حکومت کی ان جابرانہ تدبیروں اور نت نئے متشددانہ قوانین کے خلاف ہندوستانیوں کی نفرت و حقارت کا جذبہ روبہ ترقی تھا۔ قومیت کا جذبہ آہستہ آہستہ اُبھر رہا تھا اور یہ آتش فشاں ہر لمحے اپنی پوری شدت کے ساتھ اُبل پڑنے کے لیے

تیار تھا، پھر بھی صرف قوت اور وحشیانہ قوت پر بھروسہ رکھنے والی انگریزی حکومت کے طرزِ عمل میں کسی تبدیلی کے آثار نمایاں نہ تھے۔ بہت سے ممتاز اور محبِ وطن سیاسی رہنماؤں کو ناپسندیدہ افراد قرار دے کر جلاوطن کیا جا رہا تھا اور اخبارات کی اشاعت ختم کرنے کے لیے اخباروں کے ایڈیٹروں پر نئے قوانین کے تحت، مقدمے چل رہے تھے۔

آخر ان مظالم سے مجبور ہو کر لوگ کھلم کھلا تشدد پر اتر آئے اور کئی یورپی باشندوں کو قتل کر دیا گیا۔ آزمودہ کار سیاسی رہنماؤں کی تلقین صبر و ضبط اور آئینی طریقۂ کار اختیار کرنے کی اپیلوں کو نظر انداز کر کے نوجوان مظاہرین کا نعرہ یہ تھا کہ اینٹ کا جواب پتھر سے اور تشدد کا جواب تشدد سے دیا جائے۔ حالات اس درجہ سنگین تھے پھر بھی حکومت اپنی عاقبت نااندیشانہ روش پر قائم تھی۔ ۱۹۰۸ء میں باغیانہ جلسوں سے متعلق قانون، پریس ایکٹ اور ۱۹۱۰ء میں ضابطۂ فوجداری کا ترمیمی قانون اسی عاقبت نااندیشی کے مزید مظاہرے تھے۔

ہندوستان جب کہ اپنی تاریخ کے اس نازک دور سے گزر رہا تھا، قائدِ اعظم کی سیاسی سرگرمیوں میں برابر اضافہ ہو رہا تھا۔ ان کی سلجھی ہوئی طبیعت قانون کے دائرے میں رہ کر عمل کرنے کی طرف مائل تھی۔ اس لیے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے تشدد یا غیر قانونی ذرائع اختیار کرنا انھیں پسند نہ تھا اسی لیے انھوں نے سیاست کی پُرخار وادی میں دادا بھائی نوروجی، گوکھلے اور بینرجی جیسے مدبّروں کی راہ اختیار کی۔

قائدِ اعظم نے دورانِ قیام لندن میں فنش بری کے حلقے سے پارلیمنٹ کی نشست کے انتخاب کے سلسلے میں دادا بھائی نوروجی کی انتخابی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا تھا۔ اس سے ایک طرف تو ہندوستان کے اس عظیم سیاست دان کو اس نوجوان سیاسی کارکن کے تابناک مستقبل سے امیدیں وابستہ ہو گئیں اور دوسری طرف خود قائدِ اعظم کے

دل میں دادابھائی جیسے محب وطن کا احترام اور قدر و منزلت بڑھ گئی اور انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ وہ ہمیشہ ہندوستان کے اس سپوت سے جسے اپنے وطن اور عوام سے بے حد پیار تھا، رہنمائی حاصل کریں گے۔ یہ واقعہ ہے کہ قلش بری کی انتخابی مہم سے لے کر دادابھائی کے انتقال تک قائد اعظم انھیں سیاست کے میدان میں اپنا مثالی رہنما سمجھتے رہے۔ دادابھائی کی پارلیمانی رکنیت کے سبب قائد اعظم کو آئرلینڈ کے ان ممبران پارلیمنٹ سے قریبی رابطہ رکھنے کا موقع مل گیا جو اپنے ملک کی سیاسی آزادی کی جدوجہد میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ پارلیمنٹ کا ممبر منتخب ہونے کے بعد ۱۸۹۳ء میں کانگریس کے لاہور اجلاس کی صدارت کے لیے جب دادابھائی کا انتخاب کیا گیا تو انھوں نے آئرلینڈ کے ممبران پارلیمنٹ کا حسب ذیل پیغام پڑھ کر سنایا:

'اپنے کانگریسی ساتھیوں کو یہ بتا دیجیے کہ پارلیمنٹ میں آئرلینڈ کے لیے داخلی آزادی کی جدوجہد کرنے والا ہر ممبر، ہندوستانی عوام کے کاز میں آپ کا پورا پورا حامی ہے۔'

دادابھائی اپنے کانگریسی ساتھیوں کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے حامی ممبروں کی موجودگی اس ملک کے لیے سود مند ثابت ہوگی اور اس طرح برطانوی حکومت ان کے مطالبات پر ہمدردی سے غور کر سکے گی۔ ان کے ایما پر کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی نے یہ طے کیا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے آئرش ممبر الفرڈ ویب سے درخواست کی جائے کہ وہ ۱۸۹۴ء کے اجلاس کانگریس (منعقدہ مدراس) کی صدارت کریں۔

دادابھائی نوروجی کے علاوہ قائد اعظم کے دل میں مسٹر گوکھلے کے لیے بھی عزت و احترام کا غیر معمولی جذبہ موجود تھا۔ گوکھلے نے ۱۹۰۵ء میں کانگریس کے اجلاس

بنارس کی صدارت کی۔ گوپال کرشن گوکھلے کا دل ہندوستان کے ان فلاکت زدہ نحیف و نزار انسانوں کے دُکھ درد سے معمور تھا جو صرف ایک روٹی کے لیے صبح سے رات گئے تک محنت مشقت کرتے تھے ۔ باایں ہمہ اپنے حالات پر صابر و شاکر تھے۔ اور انگریز حاکموں کے دربار میں ان کی کوئی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ ان مجبور و محکوم لوگوں نے خدا اور خدا کے مطلق العنان بندوں کی مرضی کے سامنے اپنا سر تسلیم خم کر دیا تھا۔ کونسل کے ممبر کی حیثیت سے گوکھلے نے جتنی تقریریں کیں، ان سب میں نہایت واضح انداز میں انھوں نے محاصل اور اخراجات کے سوالات اُٹھائے اور ہندوستان کے افلاس زدہ عوام کی ترجمانی کی۔ قائدِ اعظم کے بارے میں گوکھلے نے ایک بار کہا تھا "مسٹر جناح سچ مچ شمع آزادی کے پروانے ہیں اور وہ اپنی وسعت نظری اور طبقاتی اور فرقہ وارانہ امتیازات سے بلند و بالا ہونے کے سبب ہندو مسلم اتحاد کے بہترین سفیر ہیں۔" مسٹر جناح نے اس سلسلے میں کہا تھا کہ "میں تو مسلمانوں کا گوکھلے بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

مسٹر جناح کو سر سریندر ناتھ بینرجی سے بھی بڑی عقیدت تھی۔ ایک بار اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنے جذبۂ عقیدت کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔ "جناب والا! میں نے سیاست میں پہلا سبق سر سریندر ناتھ بینرجی کے قدموں میں لیا۔ میں ایک پیرو کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہا ہوں اور انھیں اپنا رہنما سمجھتا رہا ہوں میری طرح ہندوستان کے بیشتر عوام ان کی عزت کرتے ہیں۔ جناب والا! میرا خیال ہے کہ اس عظیم انسان کی زندگی سے صرف ایک سبق حاصل کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ ہماری نجات اتحاد میں ہے۔"

اس زمانے میں قائدِ اعظم کے سیاسی نظریات کی تشکیل میں گوکھلے، دادا بھائی، سریندر ناتھ بینرجی اور سی آر داس کی شخصیتوں اور نظریات نے اہم کردار ادا کیا۔ یہ

واقعہ ہے کہ قائداعظم ان کو اپنا سیاسی رہنما تسلیم کرتے اور دادا ان کی بہت تعظیم کرتے تھے[1] ان مدبّروں سے اس نوجوان سیاسی رہنما نے یہ بھی سیکھا کہ سیاست کے میدان میں اپنے ضمیر اور کردار کو آلائش سے پاک رکھا جائے اور خواہ کتنے ہی مشکل و صبر آزما حالات کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے، اصول کی قیمت پر کوئی سودے بازی نہ کی جائے اس کے ساتھ ہی اپنے مجبور و محکوم ہم وطنوں کے معیارِ زندگی کو بلند کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ قائداعظم انتقال کے وقت تک اس اصول پر سختی سے قائم رہے اور کبھی اس میں کوئی ردوبدل نہیں کیا۔

۱۹۰۶ء میں کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس ہوا اور تیسری مرتبہ پھر دادا بھائی نوروجی کو اس اجلاس کی صدارت کا اعزاز بخشا گیا۔

اب قائداعظم نے ہندوستانی سیاست میں سرگرمی کے ساتھ دلچسپی لینی شروع کر دی۔ سیاست کے ایک طالب علم کی حیثیت سے برطانیہ کی لبرل پارٹی کے ترقی پسند نظریات کا بھی ان پر گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے ایک سیاسی تنظیم کے طور پر کانگریس کو اپنی سرگرمیوں کے لیے چُن لیا کیونکہ صرف اسی تنظیم کے ذریعے وہ عوام کی سیاسی ترقی کے سلسلے میں موثر طور پر اپنے فرائض ادا کر سکتے تھے۔ دادا بھائی نوروجی کے پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے قائدِاعظم نے کانگریس کے کلکتہ اجلاس میں شرکت کی۔ اس موقع پر چمن لال سیتلواد اور فیروز شاہ مہتا بھی مہمان کی حیثیت سے مہاراجہ دربھنگہ کے جوزنگی والے مکان میں قیام پذیر تھے۔

کانگریس کے اس اجلاس نے انتظامی اصلاحات اور سیاسی مقاصد کے حصول کے سلسلے میں کانگریس کے مطالبات میں مزید شدت پیدا کر دی اجلاس کے صدر کی حیثیت

---

[1] ہیکٹ مسٹر جناح مادے اے رؤف مطبوعہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۵ شیخ محمد اشرف۔ لاہور

سے دادا بھائی نوروجی نے بڑی اثر انگیز اور جوشیلی تقریر کی اور اس طرح کانگریسی نمائندوں کو پورے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے مطالبات کے حق میں آواز بلند کرنے کا موقع مل گیا۔ اس اجلاس میں دادا بھائی نوروجی کی تقریروں اور تجویزوں کے پس پشت بلاشبہ ان کے نوجوان سیکرٹری جناح کا ذہن کام کر رہا تھا، تاہم اس بات کی کوئی تاریخی شہادت موجود نہیں کہ ان تقاریر اور تجاویز کی تیاری میں جناح صاحب کا حصہ کتنا اور کہاں تک ہے اس لیے ہمیں محض روایات ہی پر اکتفا کرنا پڑے گا۔

حقیقتِ حال کچھ بھی ہو، قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہی اجلاس تھا جس میں پہلی بار ایک سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے ہندوستان کو داخلی معاملات میں خود مختار حکومت دینے کا مطالبہ کیا گیا۔ دادا بھائی نوروجی نے ۱۹۰۶ کی اس مشہور سوراج قرارداد میں یہ مطالبے پیش کیے تھے:۔

۱۔ ہرگاہ کہ کانگریس کا خیال ہے کہ داخلی مسائل و معاملات میں خود مختار برطانوی نوآبادیوں کے طرزِ حکومت کو ہندوستان تک وسیع کیا جائے۔ بنابریں یہ کانگریس مطالبہ کرتی ہے کہ مندرجہ ذیل اصلاحات پر فوری طور سے عملدرآمد شروع کیا جائے۔

ا۔ لندن میں اعلیٰ مناصب کے جو امتحانات ہوتے ہیں وہ بیک وقت ہندوستان میں بھی منعقد ہوں۔

ب۔ وزیر ہند کی کونسل اور مدراس اور بمبئی کے گورنروں کی انتظامی کونسلوں میں ہندوستانی باشندوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔

ج۔ اعلیٰ اور صوبائی مجالس قانون ساز کے دائرۂ کار میں توسیع کی جائے اور ہندوستان کے عوام کو موثر اور حقیقی نمائندگی دی جائے۔

د۔ لوکل باڈیز اور میونسپل اداروں کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے۔"

۷ اگست ۱۹۰۵ء کو کانگریس نے بائیکاٹ کی تحریک پر عملدرآمد شروع کیا۔ اس

تحریک کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستانی باشندے دیسی سامان خریدیں اور بدیشی سامان کو ہاتھ نہ لگائیں۔ اگرچہ اس تحریک کا بنیادی مقصد فرقہ داریت کے مذموم نقطۂ نظر سے آلودہ تھا تاہم بعد میں اس تحریک کے نتیجے میں اہل ہندوستان دیسی سامان کی سرپرستی کرنے لگے اور اس طرح ملک کی صنعتی اور اقتصادی ترقی میں نمایاں اضافہ ہُوا۔ سودیشی کی تحریک کو فرقہ وارانہ تحریک کہتے وقت ہمیں یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیئے کہ اس تحریک کا واحد مقصد برطانوی حکومت کو تقسیمِ بنگال ختم کر دینے پر مجبور کرنا تھا۔ بنگال کے ہندوؤں نے بڑے شد و مد کے ساتھ اس تجویز کی حمایت کی۔

۱۹۰۵ء میں ولایتی سامان کے بائیکاٹ کے سلسلے میں جو قرارداد منظور کی گئی اس میں کہا گیا تھا کہ :۔

"اس امر کے پیشِ نظر کہ ہندوستان کے نظم و نسق میں اس ملک کے عوام کا حصہ ہونے کے برابر ہے اور یہ کہ حکومت اُن کے مطالبات کو ذرا بھی اعتنا نہیں سمجھتی، کانگریس خیال ہے کہ بنگال کی تقسیم کے خلاف احتجاج کے طور پر صوبے میں بائیکاٹ کی جو تحریک چلائی گئی ہے وہ جائز تھی اور جائز ہے۔"

۱۹۰۷ء میں جب ناگپور میں کانگریس کا اجلاس شروع ہُوا تو تلک کی رہنمائی میں انتہا پسندوں نے اتنا ہنگامہ برپا کیا کہ اجلاس افراتفری کے عالم میں ختم ہو گیا اور مندوبین کو ناگپور سے سورت منتقل ہونا پڑا۔ اجلاس کی صدارت منتخب صدر ڈاکٹر راش بہاری گھوش کرنے والے تھے جس وقت اجلاس سورت منتقل کرنے کی قرارداد منظور کی گئی تو تلک اجلاس میں موجود تھے۔ اس وقت انھوں نے قرارداد کی مخالفت نہیں کی لیکن بعد میں نہ صرف کانگریس کے صدر منتخب ڈاکٹر گھوش بلکہ سورت میں اجلاس طلب کرنے کی تجویز کے خلاف بھی پورے ہندوستان میں ایجی ٹیشن شروع کرادی۔ آخر خدا خدا کر کے ۲۷ دسمبر ۱۹۰۷ء کو سورت میں کانگریس کا اجلاس شروع ہُوا۔ امبالال ساکرلال نے صدارت کے لیے

ڈاکٹر گھوش کا نام تجویز کیا۔ سریندر ناتھ بینرجی نے تحریک کی تائید کی۔ اس موقع پر تلک اور ان کے ساتھیوں نے شور مچا مچا کر انھیں تقریر نہ کرنے دی۔ کانگریس کے پنڈال میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی۔ مجبور ہو کر پھر ایک روز کے لیے اجلاس کو ملتوی کر دینا پڑا۔ دوسرے دن اجلاس شروع ہوا تو سریندر ناتھ بینرجی کی تجویز کے بعد پنڈت موتی لال نہرو نے صدارت کے لیے ڈاکٹر گھوش کے نام کی تائید کی جس پر زور شور سے تالیاں بجائی گئیں۔ جوں ہی ڈاکٹر گھوش خطبۂ صدارت پڑھنے کھڑے ہوئے تلک ڈائس پر پہنچ گئے اور تقریر کرنے کی اجازت چاہی۔ جب اُن سے ڈائس سے نیچے اُترنے کو کہا گیا تو انھوں نے انکار کر دیا۔ حاضرین میں سے کچھ لوگ اشتعال کے عالم میں تھے اور کچھ بالکل مُذبذب۔ کچھ حاضرین تلک کے حق میں نعرے لگا رہے تھے تو کچھ انھیں بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ اچانک ایک طرف سے تلک پر جوتوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ اور یہ اجلاس بھی ہنگامے اور ہڑبونگ کی نذر ہو گیا۔ اس موقع پر ایک انگریز صحافی نیون سن وہاں موجود تھا۔ اس نے اجلاس میں ہنگامے کا ذکر اس طرح کیا ہے:۔

اچانک کسی سمت سے بھورے رنگ کا، نوک دار مرہٹہ جوتا سریندر ناتھ بینرجی کے منہ پر آ کر لگا۔ اس میں لوہے کی کیلیں اور نعل لگے ہوئے تھے۔ سریندر ناتھ بینرجی کے منہ پر لگنے کے بعد اچٹ کر یہ جوتا سر فیروز شاہ مہتا پر پڑا۔ کسی نے اشارہ کیا تو سفید پگڑیاں باندھے رضاکار نہایت طیش کے عالم میں اسٹیج پر چڑھ آئے اور لاٹھیوں سے لوگوں کو گائے بھینسوں کی طرح منتشر کرنے لگے۔۔۔ اس طرح انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس ہنگامے کی بھینٹ چڑھ گیا۔

اس ہنگامے کے بعد کانگریسی تنظیم سے تلک نے علیحدگی اختیار کر لی گو بعد میں ۱۹۱۶ء کے لکھنؤ اجلاس کے موقع پر اپنے بہت سے حامیوں کے ساتھ وہ پھر کانگریس میں شامل ہو گئے۔ ان کے یہ حامی بمبئی پریذیڈنسی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ہر صوبے

میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کے درمیان سبجکٹس کمیٹی کے چناؤ کے بارے
میں اختلاف تھا۔ ابھی تک کانگریس میں گاندھی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ کانگریس کے
نئے ممبروں میں سے تھے اور بمبئی سے سبجکٹ کمیٹی کے رکن بننے کی کوشش کر رہے تھے
قاعدہ یہ تھا کہ ہر ایک نشست کے لیے دو نام تجویز کیے جاتے۔ ان میں سے ایک ممبر
تلک کے قوم پرست گروہ میں سے اور دوسرا اعتدال پسند گروپ کا ہوتا۔ تلک کو چونکہ
صوبے میں اکثریت کا اعتماد حاصل تھا اس لیے اُن کا ہر ممبر منتخب ہو گیا۔ یہ بات
دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ تلک کے ایک قوم پرست حامی کے مقابلے میں اعتدال پسند
کی حیثیت سے گاندھی کا نام تجویز کیا گیا تھا لیکن گاندھی کو چناؤ میں شکست ہو گئی اور
وہ کانگریس کی سبجکٹ کمیٹی کے رکن منتخب نہ ہو سکے۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ نے بالکل
مختلف انداز میں اس واقعے کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں: "اسی طرح جب گاندھی
کے مقابلے میں قوم پرست گروہ کے ایک ممبر کا نام تجویز کیا گیا تو گاندھی چناؤ میں ہار
گئے مگر تلک نے گاندھی کے منتخب ہونے کا اعلان کر دیا۔"[1]

گاندھی نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی آباد کاروں کی جو خدمت کی تھی اس کی وجہ
سے ان کی عزت و وقار میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں وہ جنوبی افریقہ
سے ہندوستان واپس آئے۔ ان کے عجیب و غریب طریقہ کار ستیہ گرہ کے متعلق لوگ
نہ جانے کیا کیا سوچ رہے تھے (آگے چل کر گاندھی نے انگریزوں کے خلاف جدوجہد
کے دوران میں اس ہتھیار سے بڑا کام لیا) بمبئی میں گاندھی کے اعزاز میں کئی تقریبوں کا
انتظام کیا گیا تھا۔ پہلے جو تقاریب ہوئیں، ان میں ایک گارڈن پارٹی قابل ذکر ہے۔
جو سر جہانگیر پیٹیٹ نے اپنی پیڈر روڈ کی قیام گاہ پر دی تھی۔ اس پارٹی میں شریک

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ مطبوعہ ۱۹۳۵ء، صفحہ ۲۲۵۔

تمام حضرات بہترین لباس میں ملبوس تھے اور ان میں محمد علی جناح بھی شامل تھے۔ جب گاندھی پارٹی میں شرکت کے لیے آئے تو اس دبلے پتلے آدمی پر ہر شخص کی نگاہ جم کر رہ گئی۔ گاندھی کے لباس کے بارے میں کے ایم منشی کا بیان سنیے "مہمان خصوصی ننگے پاؤں، مختصر سی دھوتی، کاٹھیاواڑی انگرکھے اور صافے میں ملبوس تشریف لائے، جیسے ان سے زیادہ غیر اہم کوئی شخص نہ ہو اور شخصیت پرستی کے ماتم کے لیے الفاظ بھی موجود نہ تھے[۱]۔ اسی پارٹی میں جناح اور گاندھی کی پہلی ملاقات ہوئی۔ ان دونوں رہنماؤں کی پہلی باضابطہ ملاقات بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ یہی وہ دونوں انسان تھے جو آئندہ بیتیس سال میں برصغیر کی تاریخ کا رخ موڑنے والے تھے۔ ان میں سے ایک برطانیہ سے ہندوستان کو مکمل آزادی دلانے والا تھا اور دوسرا رہنما پاکستان کو خود مختار ملک کی حیثیت سے وجود میں لانے والا۔

کچھ عرصے بعد گرجر سبھا نے گاندھی کی خدمت میں سپاس نامہ پیش کیا۔ گرجر سبھا ایک ادبی انجمن تھی جس کا مقصد گجراتی زبان اور ادب کا فروغ تھا۔ جناح چونکہ انجمن کے ہمدردوں میں سے تھے اس لیے ان سے اجلاس کی صدارت کرنے کی درخواست کی گئی۔ انھوں نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانیوں کی قابل قدر خدمات انجام دینے پر گاندھی کی تعریف کی اور ان کا خیر مقدم کیا۔ کے ایم منشی نے لکھا ہے۔ "گاندھی جی نے اس موقع پر گجراتی میں تقریر کی اور مسٹر جناح نے انگریزی میں اپنے خیالات کا اظہار کیا[۲]"

کانگریس کے ناگپور اجلاس میں جو کچھ ہنگامہ ہوا تھا قائداعظم اس کے چشم دید شاہد تھے۔ اس ہنگامے کے دوسرے روز انھوں نے اجلاس کے نمائندوں کے کونش

---

[۱] آئی فاودی مہاتما۔ کے ایم منشی۔ مطبوعہ ۱۹۷۰ء صفحہ ۲ [۲] محولہ بالا۔ صفحہ ۲۔

میں شرکت کی جس میں یہ طے کیا گیا کہ اہل ہند اپنے ملک کے داخلی معاملات میں خود مختار حکومت چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں صرف قانونی طریقۂ کار اختیار کیا جائے گا۔

اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں الہ آباد میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ مورلے منٹو اصلاحات کا اعلان ہو چکا تھا جن کے تحت پہلی بار مسلمانوں کے لیے جداگانہ انتخاب منظور کیا گیا تھا۔ کانگریس کے اس اجلاس میں مسٹر جناح نے ایک قرارداد پیش کی جس کی تائید مظہرالحق اور حسن امام نے کی۔ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ قرارداد کا مضمون یہ تھا:۔

"اگرچہ یہ کانگریس مجالس قانون ساز میں اقلیتی علاقوں کے مسلمانوں اور دوسرے فرقوں کی منصفانہ اور مناسب نمائندگی کی ضرورت تسلیم کرتی ہے لیکن اس مقصد کے حصول کے لیے گزشتہ سال جداگانہ انتخاب کے جو ضابطے نافذ کیے گئے ہیں انھیں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے اور حکومت پر زور دیتی ہے کہ ہندوستانی کونسلوں کے قانون مجریہ ۱۹۰۹ء کے تحت تشکیل دیے ہوئے ضابطوں میں منصفانہ طور پر اور جلد از جلد ترمیم کی جائے اور مطالبہ کرتی ہے کہ یہ کارروائی اگلے انتخابات سے پہلے کر لی جائے تاکہ رائے دہی، امیدواروں کی اہلیت اور کونسلوں کے انتخاب میں شرکت کے خواہشمند امیدواروں کو من مانے طور سے نااہل قرار دینے اور ان پر پابندیاں لگانے کے سلسلے میں تاج برطانیہ کے شہریوں میں غیر ضروری امتیاز ختم کیا جائے۔ کانگریس یہ مطالبہ بھی کرتی ہے کہ صوبائی کونسلوں میں غیر سرکاری اکثریتی ممبروں کی تشکیل کے متعلق ضابطوں میں جہاں ضرورت محسوس ہو ترمیم کی جائے تاکہ ان ضوابط کو عملی تقاضے سے زیادہ مؤثر طور پر استعمال کیا جا سکے۔"

جس وقت الہ آباد میں سر ولیم ویڈر برن کی زیر صدارت کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو ملک میں سخت نازک حالات تھے۔ اندیشہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں

کی عام کشیدگی میں مزید اضافہ نہ ہو جائے کیونکہ یہ توقع تھی کہ جداگانہ انتخاب کے اصول پر میونسپلٹیوں اور لوکل باڈیز میں بھی عمل درآمد ہوگا اور اس صورتِ حال کو ہندو کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ سر چمن لال سیتل واد نے اس صورتِ حال پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔

سر ولیم ویڈر برن نے آغا خان کے تعاون واشتراک سے یہ تحریک کی کہ دونوں قوموں کے اہم نمائندے آپس میں بعض معاملے طے کرلیں تاکہ ہندو اور مسلمانوں میں پوری طرح اتفاق رائے اور مفاہمت ہو سکے۔[1]

قائداعظم نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ مسز سروجنی نائیڈو لکھتی ہیں۔

"اس کنونشن میں جو دونوں قوموں کے درمیان کچھ قبل از وقت اور غیر فطری مفاہمت کے لیے طلب کیا گیا تھا، مسٹر جناح نے بڑا نمایاں کام کیا۔ لیکن یہ دونوں قومیں جن کے دل میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور بے اعتمادی کے جذبے سے پر ہیں آخر کس طرح مفاہمت کر سکتی تھیں۔"[2]

بدقسمتی سے کچھ ہندو لیڈروں کی فرقہ وارانہ انتہاپسندی کے سبب اس کنونشن میں کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ کنونشن کی ناکامی کی ذمہ داری جن ہندو لیڈروں پر عائد ہوتی ہے۔ ان میں پنڈت مالویہ کا نام قابل ذکر ہے۔ محمد نعمان نے کنونشن کے انجام کے متعلق لکھا ہے "بے بنیاد فخر و ناز کے ہاتھوں ایک سنہری موقع ہاتھ سے گنوا دیا گیا۔"[3]

ڈاکٹر پتا بھی سیتا رمیہ رقم طراز ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ مسٹر جناح

---

[1] ری کلکشن اینڈ ری فلکشن، سر چمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۸۲

[2] ایمبسڈر آف یونٹی۔ مسز سروجنی نائیڈو۔ [3] مسلم انڈیا۔ محمد نعمان

نے لوکل باڈیز تک جداگانہ انتخاب کی توسیع نہ ہونے دی۔[1]

لیکن جہاں تک قائدِ اعظم کا تعلق ہے، یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اس وقت قائدِ اعظم ہندو مسلم اتحاد کے صفِ اوّل کے حامیوں میں تھے اور انھوں نے اپنی قائدانہ صلاحیتوں کا تمام زور اس مقصد کے لیے صرف کیا کہ ہندو اور مسلمان متّحد ہو جائیں۔ اس عہد کی سیاسی تاریخ کے مطالعے سے اس بات کا ثبوت مل سکتا ہے کہ قائدِ اعظم غیر ملکی حکومت کی ظالمانہ پالیسی کے شدید ترین مخالفین میں سے تھے۔ اس سلسلے میں اپنے موقف سے ذرا بھی پیچھے ہٹنا انھیں منظور نہ تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندو اور مسلمان متحد ہو کر اور آپس میں مفاہمت کر کے جلد از جلد آزادی حاصل کر لیں۔

ادھر تو مشترکہ مسائل پر مذاکرات اور باہمی مفاہمت کے ذریعے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتّحاد کی کوشش ہو رہی تھی اور اُدھر ہندوستان میں برطانوی اخبار ان کوششوں کو ناکام بنانے پر تلے ہُوئے تھے۔ ان اخباروں نے یہ ہَوّا کھڑا کر دیا تھا کہ اس اتّحاد کا ایک ہی مقصد ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کا جلد از جلد خاتمہ کر دیا جائے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی مفاہمت کے سلسلے میں ویڈربرن اور آغا خان کی تحریک پر انگریزی اخبار جو کچھ لکھتے رہتے تھے اس کو سمجھنے کے لیے پائنیر الہ آباد کا ایک اداریہ کافی ہے۔ پائنیر کو سول سروس کا ترجمان کہا جاتا تھا —— اس اخبار کے اداریے کا اقتباس ملاحظہ ہو:

"اگر یہ لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں کو حکومت کے خلاف متّحد کرنا نہیں چاہتے تو

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیّہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۷۳

پھر آخر اس اتحاد کا مطلب کیا ہے ؟

۱۹۱۱ء کے کانگریس کے کلکتہ اجلاس کے صدر بشن نرائن دھر نے سول سروس اور انگریزی اخباروں کے اس رویے پر تبصرہ کرتے ہوئے پائنیر کے اس اداریے کے بارے میں اپنی صدارتی تقریر میں کہا۔ صرف اس ایک اعتراض سے یہ بخوبی معلوم ہو جاتا ہے کہ ہندوستان کے سیاسی حالات کیا ہیں؟

کانگریس نے جب ۱۹۰۶ء میں سوراج کی قرارداد منظور کی تو ہندوؤں کا سیاسی شعور بیدار ہونے لگا اور بعد میں کانگریس کے ہر ایک اجلاس میں اور زیادہ شدت کے ساتھ ہندوستان کے لیے سیاسی اور دیگر اصلاحات کی قراردادیں منظور ہونے لگیں۔ اگرچہ مسلم لیگ کانگریس کے ظہور میں آنے کے کافی عرصے بعد قائم ہوئی لیکن لیگ نے بیسویں صدی کے آغاز میں بدلتے ہوئے حالات سے سمجھوتا کر کے اپنی جدوجہد شروع کی تاکہ نئی سیاسی اصلاحات کی ہر مجوزہ اسکیم میں مسلمانوں کی مناسب نمائندگی کا مطالبہ موثر انداز میں پیش کیا جا سکے۔ جداگانہ انتخاب کے مطالبے کی منظوری مسلمانوں کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں مسلم لیگ کی پہلی کامیابی ہے۔ مسلم لیگ کے قیام کے بعد بہت سے مسلمان، جو اب تک کانگریس کے دامن سے وابستہ تھے، لیگ میں شامل ہو گئے۔ صرف گنتی کے چند مسلمان اب کانگریس میں رہ گئے تھے۔ مطلوب حسن سید نے مسلم لیگ اور قائد اعظم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "محمد علی جناح ان مسلمانوں کے ساتھی تھے جو لیگ میں شامل ہو گئے تھے وہ اپنی قوم کے وفادار رہتا ثابت ہوئے۔"[۱]

جب حکومت نے تقسیم بنگال کو منسوخ کرنے کا اعلان کیا تو مسلمانوں کو بہت رنج اور تعجب ہوا۔ رنج اس بات کا تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنے وعدوں کا ذرا

---

[۱] محمد علی جناح۔ مطلوب حسن سید۔ مطبوعہ ۱۹۴۵ء صفحہ ۵۵۔ شیخ محمد اشرف۔ لاہور

بھی پاس نہ کیا۔ اس کی وجہ ملک گیر ہندو ایجی ٹیشن کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ برطانوی حکومت کے اس اقدام نے مسلمان سیاستدانوں میں مسلم لیگ کو طاقتور بنانے کی تحریک پیدا کی تاکہ کانگریس کی روز افزوں طاقت کا مقابلہ کیا جا سکے۔ اس پر مقتدر اور با اثر ہندو رہنماؤں نے یہ محسوس کیا کہ جب تک دونوں قومیں ایک دوسرے سے کشیدہ رہیں گی۔ ہندوستان کو آزادی نصیب نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ ۱۹۱۰ء میں کانگریس کے الہ آباد کنونشن کے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہو سکے تھے تاہم ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھنے والے مخلص افراد جن میں گوکھلے اور جناح نمایاں ہیں، برابر اسی دھن میں لگے ہوئے تھے۔

تقریباً اسی وقت دو جلیل القدر رہنما یعنی مولانا محمد علی اور مولانا ابو الکلام آزاد میدان سیاست میں نمودار ہوئے۔ ان دونوں رہنماؤں نے کامریڈ اور الہلال کے ذریعے مسلمانوں میں سیاسی زندگی کی روح پھونکنے کا بیڑا اٹھایا۔ کامریڈ انگریزی میں شائع ہوتا تھا اور الہلال اردو میں۔ کامریڈ اور الہلال کی صحافتی تحریک نے پہلی بار مسلمانوں کو یہ محسوس کرایا کہ برطانوی حکومت اس قدر ناقابل تسخیر نہیں جتنی وہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ ان حق پسند اخباروں نے مسلمانوں کو سبق دیا کہ وہ انگریز کے وعدوں پر یقین نہ کریں۔ ایک ایسے زمانے میں جب حکومت کی وفاداری کا مطلب یہ تھا کہ آنکھیں بند کر کے حکم بجا لایا جائے اور حکومت کی پالیسی سے اتفاق نہ کرنے کا مطلب ناقابل معافی بغاوت قرار دے دیا گیا تھا، کامریڈ اور الہلال نے حکومت کے خلاف کھل کر آواز بلند کی اور وہ کسی اندیشے اور خوف کے بغیر اپنا فرض انجام دیتے رہے۔[۱]

مولانا محمد علی جوہر اور ابو الکلام آزاد کی تحریروں نے مسلمان نوجوانوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا اور یہ نوجوان انجام کار آزادی، مسلمان قومیت اور خود مختار حکومت

---

[۱] مسلم لیگ: یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے۔ اے بی۔ راجپوت صفحہ ۲۹ مطبوعہ ۱۹۴۸ء شیخ محمد اشرف لاہور۔

کے انقلابی نظریات کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرنے لگے۔ اب ہندوستان کے مسلمانوں میں بیداری کی ایک نئی روح پیدا ہو چکی تھی اور اُن کی واحد سیاسی جماعت مسلم لیگ کا مقصد یہ تھا کہ وقت کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سیاسی مسائل کو ایک نئے اور انقلابی انداز میں حل کیا جائے۔ قائداعظم نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی تھی اور ان کے سیاسی تدبّر کو سارے ملک نے تسلیم کر لیا تھا۔ اگرچہ اس وقت قائداعظم مسلم لیگ کے باضابطہ رکن نہیں تھے تاہم لیگ کو قدم قدم پر ان کے مشوروں اور رہنمائی کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔

۱۹۱۰ء اور ۱۹۱۱ء میں مسلم لیگ کونسل کے جو اجلاس ہوئے، قائداعظم کو ان میں شرکت اور اجلاس کو مخاطب کرنے کی دعوت دی گئی جس سے تنظیم میں ایک نیا جذبہ جوش پیدا ہو گیا۔ یہ وہ نقطہ ہے جس سے مسلم لیگ کی ترقی اور زیادہ جاندار رویے کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جاندار رویہ مسلسل ترقی پذیر رہا تا اینکہ مسلمانوں کی اس سیاسی جماعت نے اور زیادہ مؤثر انداز میں اپنے مطالبات پیش کرنے شروع کر دیے اور ان مطالبات کو منظور کرا کے ہی چھوڑا۔ قائداعظم کی گھمبیر شخصیت اور مؤثر دلائل نے لیگی لیڈروں کے دل موہ لیے تھے۔ ان لیڈروں کو ہمیشہ قائداعظم کا تعاون و اشتراک حاصل رہا اور انھوں نے مسلمانانِ ہند کے مسائل پر قائداعظم کی رائے کو ہمیشہ غیر معمولی اہمیت دی۔ ۱۹۱۲ء میں آغا خان کی صدارت میں لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں قائداعظم نے شرکت کی۔ اسی اجلاس میں لیگ کے دستور العمل پر نظرِ ثانی کی گئی اور جماعت کے دائرۂ عمل کو مزید وسعت و جامعیت دی گئی۔ لیگ کے نظرِ ثانی شدہ دستور العمل کے تحت ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ کا لکھنؤ میں اجلاس ہوا۔ لکھنؤ کی سرزمین پر مسلم لیگ کا اجلاس قومی جدوجہد کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ تھا۔ قائداعظم کی کوشش سے اس اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ لیگ کا سیاسی نصب العین یہ ہے

کہ آئینی طریقوں سے تاج برطانیہ کے تحت ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری
حاصل کی جائے اور اس مقصد کے حصول کے علاوہ ہندوستانی عوام سے تعاون اور
قومی اتحاد کے ذریعے نظم ونسق کے موجودہ ڈھانچے میں متوازن و مناسب اصلاح کرانی
چاہیے۔ قائداعظم کی کوشش سے لیگ نے ہندو مسلم اتحاد کے متعلق ان کی یہ قرارداد
منظور کرلی۔ اس سلسلے میں جناح صاحب نے جو کردار ادا کیا اس کا اندازہ سر محمد شفیع
کی اُس تقریر سے جو اُنھوں نے قرارداد کی حمایت میں کی تھی۔ بخوبی ہو سکتا ہے۔ سر محمد شفیع
نے کہا کہ ان سے پہلے بعض مقررین نے جس نوآبادیاتی نظام حکومت کی تجویز پیش کی
وہ ہندوستان کے لیے ناموزوں ہے اور اس سے ہمارے قومی وقار کو نقصان پہنچے گا
سر محمد شفیع نے آخر میں اعتراف کیا کہ میں اپنے عزیز دوست عزت مآب جناح کی اس
رائے سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں کہ کونسل کے تجویز کردہ طریقہ کار کے سوا اگر کوئی
اور طریقہ اختیار کیا گیا تو یہ قطعاً غیر دانشمندانہ ہوگا۔

مسلم لیگ کے مذکورہ بالا فیصلے سے قائداعظم کو کتنی مسرت حاصل ہوئی۔ اس
کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں آخر کار ان کی انتھک کوششیں
اور جدوجہد کامیاب ہو چکی تھی۔

اب قائداعظم کی سیاسی سوجھ بوجھ اور ان کی اثر انگیز شخصیت کسی تعارف کی
محتاج نہ رہی تھی۔ کانگریس میں انھیں ایک ممتاز رہنما کا درجہ حاصل تھا اور مسلم لیگ
کے حلقوں میں ان پر اعتماد کیا جاتا تھا۔ قائداعظم پچھلے چند سال سے ہندوستان کی سیاسی
زندگی میں جو انتھک خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس کا اثر ان کی صحت پر پڑنا
ناگزیر تھا۔ اُنھوں نے کچھ دن یورپ میں آرام کرنے کا فیصلہ کیا اور اپریل ۱۹۱۳ء میں گوکھلے
کے ہمراہ بحری جہاز سے لندن روانہ ہوگئے۔ قائداعظم جیسا شخص، جو خود کو قومی خدمت
کے لیے وقف کر چکا ہو آخر کس طرح اپنے عوام سے خود کو بے تعلق رکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ

تھی کہ لندن میں انھوں نے ہندوستانی طالب علموں کی تنظیمی سرگرمیوں سے اپنے کو وابستہ کر لیا تاکہ طالب علم انگلستان میں اپنے ملک کے لائق سفیر ثابت ہو سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لندن میں انڈین سنٹرل ایسوسی ایشن قائم ہو گئی۔ یہ قائداعظم ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ انڈیا آفس کو ہندوستانی طالب علموں کی مشکلات کی تحقیقات کرانے پر مجبور ہونا پڑا۔"

آغا خان نے ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ کی صدارت سے استعفا دے دیا۔ وہ مسلم لیگ کے قیام کے وقت اس عظیم جماعت کے صدر منتخب ہوئے تھے اور چھ سال سے صدر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ آغا خان کے استعفے کے بعد راجہ صاحب محمود آباد علی محمد خاں کو لیگ کا صدر اور سید وزیر حسن کو سیکرٹری جنرل چنا گیا نیز لیگ کا مرکزی دفتر علیگڈھ سے لکھنؤ منتقل کر دیا گیا۔

اس زمانے میں سرکاری احکام پر کانپور کی مسجد کے انہدام کا سنگین حادثہ پیش آیا جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات بری طرح مجروح ہوئے اور انھوں نے اسی جگہ دوبارہ مسجد تعمیر کرنے کا فیصلہ کیا۔ جس حکومت کو عوام کے جذبات سے ہمدردی نہیں ہوتی اس کی نظر میں ایسے واقعات کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ برطانوی حکومت کا عالم بھی یہی تھا۔ مسجد کی از سر نو تعمیر شروع ہوئے دیر نہ ہوئی تھی کہ بھاری تعداد میں پولیس کے جوان وہاں پہنچ گئے اور مسلمانوں کے مجمع کو منتشر ہو جانے کا حکم دیا۔ مگر جہاں حرمت مسجد کا سوال ہو وہاں مسلمان اپنی جان قربان کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ مجمع نے منتشر ہونے یا مسجد کی تعمیر بند کرنے سے انکار کر دیا۔ غیر ملکی حکومت کی انانیت اس عدول حکمی کو کہاں برداشت کر سکتی تھی۔ مجمع کے رویے کو حکومت کے اختیارات میں مداخلت بے جا تصور کیا گیا اور عاقبت نا اندیش خود پرست افسروں نے مسجد کے اندر اور باہر جو مسلمان جمع تھے ان پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ اس حادثے میں بہت

سے مسلمان ہلاک اور زخمی ہوئے اور حکومت کے اس وحشیانہ اقدام کے خلاف ہندوستان بھر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے اس واقعے پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور بے گناہوں کے قتلِ عام کی شدید مذمت کی۔ ستمبر ۱۹۱۲ء میں لیگ نے مولانا محمد علی اور وزیر حسن کو انگلستان بھیجنے اور کانپور کے اس حادثۂ خونچکاں کی طرف برطانوی عوام کی توجہ مبذول کرانے کا فیصلہ کیا۔ وفد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ہندوستانی مسلمانوں کی پسماندگی اور مطالبات کے سلسلے میں برطانوی رائے عامہ ہموار کی جائے۔ یہ بات تعجب کی نہ آئی کہ مسلم لیگ کی لندن شاخ کے صدر سر سید امیر علی کو لیگ کے ان دونوں نمائندوں کی حیثیت پر کیا اعتراض تھا اور انھوں نے کن جذبات کے تحت لیگ کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ دو رکنی وفد وزیرِ ہند کی ملاقات سے محروم رہا کیونکہ انھوں نے اس وفد کی ضابطے کی آڑ میں وفد کی ملاقات سے انکار کر دیا کہ حکومتِ ہند کی وساطت سے ملاقات طے نہیں کی گئی۔ تاہم مسلم لیگ کے وفد نے قیامِ لندن سے کافی فائدہ اٹھایا اور مولانا محمد علی نے اس مسئلے پر لندن کے اخبارات میں بہت سے مضامین اور مراسلے تحریر کیے اور برطانوی حکومت کو بادل ناخواستہ [illegible] کی مسجد کی تعمیرِ نو اور سرکاری احکام کی خلاف ورزی کرنے کے جرم میں گرفتار کیے جانے والے افراد کی رہائی کا حکم دینا پڑا۔

انگلستان میں چند مہینے قیام کرنے کے بعد قائدِ اعظم ہندوستان روانہ ہونے والے ہی تھے کہ مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن نے لیگ کا باضابطہ رکن بننے کی درخواست کی۔ چنانچہ قائدِ اعظم اس شرط کے ساتھ مسلم لیگ کے ممبر بن گئے کہ ان کی رکنیت کسی طرح کانگریس کی رکنیت میں مزاحم نہ ہوگی۔ مسز سروجنی نائیڈو لکھتی ہیں وہ ان دونوں لیگی رہنماؤں سے اس بات کا وعدہ لینے میں کامیاب ہو [illegible]

اور مسلمانوں کے مفاد سے وفاداری کسی طرح اور کسی وقت بھی اس عظیم تر قومی مفاد کے راستے میں حائل نہ ہو گی جس کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کر چکے تھے[1]۔

قائد اعظم ہندوستان واپس آئے تو صرف وہی ایک منفرد شخصیت تھے جو دو طاقتور قومی تنظیموں کے مابین ایک اہم رابطے کی حیثیت رکھتے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۱۳ء کو کانگریس کے اجلاس کراچی میں بھپندر ناتھ باسو نے اپنی صدارتی تقریر میں مسلم لیگ کے نئے انداز نظر کو سراہا اور کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ لیگ نے ہندوستان کے لیے داخلی معاملات میں خود مختار حکومت کے نظریے کو اپنا سیاسی نصب العین قرار دے لیا ہے۔ میں پورے خلوص کے ساتھ لیگ کی اس خواہش کی تائید کرتا ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت پیدا ہونی چاہیے۔ ماضی میں اگر ہمارے درمیان غلط فہمیاں موجود تھیں تو اب انھیں فراموش کر دینا چاہیے۔"

کانگریس کے کراچی اجلاس میں مسٹر جناح نے اس وقت کی انڈیا کونسل کے رجعت پسندانہ رویے پر ایک قرارداد کے ذریعے نکتہ چینی کی اور مطالبہ کیا کہ حقیقت پسندی اور ترقی پسندی کا مظاہرہ کرنے کے لیے کونسل کی تشکیل میں رد و بدل کیا جائے اور ہندوستان کے عوام کو اس میں زیادہ نمائندگی دی جائے۔ قائد اعظم کی اس تقریر کے چند فقرے یادگار ہیں۔ انھوں نے کہا "آپ کو علم نہیں ہے کہ اس شہر میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے تقریر کرتے وقت میں کس قدر خوش ہوں۔ یہی وہ شہر ہے جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ یہاں آنے کے بعد جب میں نے اپنے بچپن کے دوستوں سے ملاقات کی تو میرے دل کی کلی کھل گئی۔ شاید اس کیفیت کو آپ محسوس نہ کر سکیں۔" ان کی قرارداد میں خاص طور سے ان باتوں پر زور دیا گیا تھا کہ وزیر ہند کی تنخواہ برطانوی خزانے

---

[1] دی ایمبیسڈر آف یونٹی، مسز سروجنی نائیڈو۔

کا احساس کرے کہ خود مختار ہندوستان میں مسلمان دوسرے درجے کے شہریوں کی حیثیت اختیار کرنے پر آمادہ نہیں۔ دسمبر ۱۹۱۳ء میں آگرہ میں مسلم لیگ کا اجلاس سر ابراہیم رحمت اللہ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔ صدر منتخب نے اپنے خطبۂ صدارت میں اعلان کیا کہ دونوں قوموں کے درمیان یک طرفہ برادرانہ تعلقات قائم نہیں ہو سکتے۔ اکثریت کو اپنا دل ٹٹولنا چاہیئے کہ آیا وہ اقلیت کے ساتھ منصفانہ اور فراخدلانہ سلوک کر رہی ہے۔ سر رحمت اللہ نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان ایسے عظیم ملک پر سیاسی تسلّط ہمیشہ قائم نہیں رہ سکتا اور ایک نہ ایک دن یہ ملک آزاد ہو کر رہے گا۔

لیگ کے صدر کے ان خیالات سے یہ بات بخوبی ظاہر ہو جاتی ہے کہ اس وقت مسلمان کس طرح سوچ رہے تھے؟ ــــ سوراج کے بارے میں کانگریس کا تصور غیر واضح اور مبہم تھا۔ مسلمانوں نے اس تصور کو نئی روشنی بخشی اور واضح کر دیا کہ سوراج حاصل کرنے کا فیصلہ کن اور تیز تر طریقہ صرف یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد کو مستحکم کیا جائے۔ یہی دو فرقے جو برّ اعظم کی پوری سیاسی زندگی اور اس کے سیاسی کارناموں کی بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے ممبر تھے اور اس دوجماعتی رکنیت کو انہوں نے ہندوستان کی دو بڑی سیاسی تنظیموں کے مابین قریب تر دوستی اور اشتراکِ عمل پیدا کرنے کے لیے استعمال کیا۔

اس سے اگلے سال یعنی ۱۹۱۴ء میں سراجیوو (SARAJEVO) میں جنگ کی چنگاری بھڑکی اور اس چنگاری نے یورپ اور ایشیا کو پہلی جنگِ عظیم کے شعلوں کی لپیٹ میں لے لیا۔ مجبوراً انگریزوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے ہندوستان کی طرف جھکنا پڑا۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوستان سے جنگ کا ایندھن بننے کے لیے آدمی اور قتل و خونریزی کی مشینوں کو چلانے کے لیے رقم مہیا کی جائے۔ برطانوی وزیر اعظم اسکوئتھ نے ہندوستان کے عوام کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے کئی مصالحانہ بیانات دیئے۔ اسکوئتھ

سے بعد لائڈ جارج برطانوی وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے جن کا واضح اعلان یہ تھا کہ برطانوی حکومت، ہندوستان کو داخلی معاملات میں خود مختاری دینے کا تہیہ کر چکی ہے۔ اس وقت ہندوستانی لیڈروں کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ وہ اتحادیوں کی جنگی تیاریوں کی تائید و حمایت کریں یا بے تعلقی کی پالیسی پر گامزن رہیں۔ اس مسئلے پر آپس ہی میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ گاندھی جی انگریزوں کو جنگی امداد دینے والوں کی صف میں پیش پیش تھے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے جنگی رضا کاروں کی بھرتی میں بھی سرگرم حصہ لیا اور برطانوی حکام کی خوشنودی کے صلے میں قیصر ہند کا تمغہ انعام میں پایا۔ گاندھی جی اپنے اس رویے کی تائید میں یہ دلیل دیتے ہیں کہ اِن مشکل حالات میں انگریزوں کا ساتھ دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہندوستان کو ہوم رول کا حق حاصل کرنے میں آسانی ہو جائے گی بلکہ یہ حق فوراً مل جائے گا۔ اس جنگ میں ترکی اتحادیوں کے خلاف لڑ رہا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر مسلم ہندوستان کے جذبات و احساسات سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے اتحادیوں سے اپیل کی کہ مسلمانوں کے مقامات مقدسہ پر حملہ نہ کیا جائے۔

سیاسی اصلاحات کے بارے میں مولانا محمد علی نے لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ اس وقت مسلمان غم زدہ ہیں۔ تاہم ان مصائب کے باوجود جنگ کے موقع پر انگریزوں کو پریشان نہ کیا جائے۔ انھیں امید تھی کہ اختتام جنگ کے بعد انگریز ہندوستان اور عالم اسلام کو یوں نہیں کریں گے اور تدبر و دانش مندی سے کام لیں گے۔ مولانا محمد علی نے کامریڈ کے ایک اداریے میں لکھا۔ "رعایت و استحقاق زمانۂ امن کی باتیں ہیں۔ ہم خود غرض نہیں ہیں۔ ہمیں کسی رشوت کی ضرورت نہیں ہے۔" بایں ہمہ کامریڈ سے ضمانت طلب کر لی گئی اور ہر وقت یہ اندیشہ تھا کہ حکومت اخبار کے ایڈیٹر کے خلاف سخت کارروائی نہ کرے۔ یہ تھے وہ حالات جن میں کامریڈ کی اشاعت بند کرنی پڑی۔ قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی مطلق العنان حکومت ہراساں ہو جاتی ہے تو اس کے جبر و تشدد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ برطانوی حکومت

کا مزاج بالکل یہی تھا اور اس نے اسی پالیسی پر عمل بھی کیا۔ محمد علی جوہر کے حامی مسلمان رہنماؤں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نہ صرف علی برادران (محمد علی، شوکت علی) بلکہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا حسرت موہانی کو بھی جیل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں دھکیل دیا گیا۔

جنگ کی وجہ سے سیاسی سرگرمیاں کچھ سرد پڑ گئی تھیں۔ ۱۹۱۴ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد نہیں ہو سکا۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں بمقام بمبئی کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح نے اس موقع پر یہ مناسب سمجھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت اور دوستی کا جو جذبہ پیدا ہونے لگا ہے اسے ایک ٹھوس سیاسی اتحاد کی شکل دے دی جائے۔ انھوں نے اپنے مکان پر بمبئی کے سرکردہ مسلمانوں کا جلسہ طلب کیا جس میں یہ طے کیا گیا کہ کانگریس کے اجلاس بمبئی کے موقع پر مسلم لیگ کو بھی وہاں اپنا اجلاس منعقد کرنے کی دعوت دی جائے۔ مطلق العنان حکومت مخالف پارٹیوں کے اشتراک و اتحاد کو اپنے لیے چیلنج تصور کرتی ہے۔ برطانوی حکومت اس کلیے سے مستثنیٰ نہ تھی۔ وہ بھی مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد کو اپنے لیے خطرہ تصور کرتی تھی۔ قائداعظم کی اس تحریک کے خلاف حکومت کی پوری مشینری سرگرم عمل ہو گئی اور کھُل کر یہ کوشش کی گئی کہ بمبئی میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس نہ ہونے پائیں۔ حکومت کی یہ کوشش قائداعظم کے لیے ذاتی چیلنج کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے تمام کوششیں اس مقصد کے حصول کے لیے صرف کر دیں۔ سرکاری حلقوں کی طرف سے یہ افواہیں پھیلائی گئیں کہ مشترکہ اجلاس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ لیگ ختم ہو جائے گی اور اسے کانگریس میں ضم کر دیا جائے گا۔ قائداعظم نے اس بے بنیاد پروپیگنڈے اور شر انگیز افواہوں کی تردید کے سلسلے میں بیان دیتے ہوئے مسلمانوں کو یقین دلایا کہ ہمارا مقصد یہ ہے کہ بشرطِ امکان مل جل کر ایک کانفرنس بلائی جائے۔ کیا ہم آپس کے اختلافات ختم نہیں کر سکتے؟ کیا ہم متحدہ محاذ بنا کر عزت حاصل کرنے کے طلب گار نہیں؟

اس وقت بمبئی کا پولیس کمشنر ایڈورڈس تھا۔ اس شخص کی تربیت ان قدیم وحشیانہ روایات کے سائے میں ہوئی تھی کہ نوآبادیات کے باغی غلاموں سے نمٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ان پر ڈنڈے برسائے جائیں۔ پولیس کمشنر ایڈورڈس نے بمبئی کے چند سرکردہ مسلمانوں کو بلا کر ان پر دباؤ ڈالا کہ مسٹر جناح کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس کی جو کوششیں کر رہے ہیں انھیں ناکام بنایا جائے۔ یہ بھی دھمکی دی گئی کہ اگر جناح اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ان لوگوں کو خوفناک نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ قائداعظم کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے فوراً بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن سے ملاقات کر کے پولیس کمشنر کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ لارڈ ولنگڈن نے غیر جانبداری کا ڈھونگ رچانے کے لیے گورنمنٹ ہاؤس میں تمام مسلمان شرفاء کا اجلاس بلایا۔ یہ طے پایا کہ مخالفین بمبئی میں مسلم لیگ کے اجلاس کے انعقاد کی مخالفت فوراً ختم کر دیں گے۔ اس اجلاس کی کارروائی اور فیصلوں کی نسبت حکومت کی طرف سے بمبئی گورنمنٹ گزٹ میں ایک پریس نوٹ شائع کیا گیا تاکہ لوگوں کو حکومت کی نیت پر شبہ نہ ہو سکے۔ سر چمن لال سیتلواد لکھتے ہیں: اس سمجھوتے کے باوجود مخالف ٹولیاں ہنگامہ کرنے کے لیے تیار ہو کر جلسے میں شریک ہوئیں اور اجلاس درہم برہم کر دیا۔ اس وقت میں مہمان کی حیثیت سے خود اجلاس میں موجود تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح اور لارڈ ولنگڈن میں اختلاف اور نزاع کا بیج بویا جا چکا تھا اور ان دونوں طاقتور شخصیتوں کے درمیان ٹکراؤ ناگزیر تھا۔

حکومت کی خواہش اور ہر ممکن کوشش کے علی الرغم بمبئی میں دونوں سیاسی تنظیموں کا اجلاس ہو کے رہا۔ لیگ کے اجلاس کی صدارت مظہر الحق کر رہے تھے۔ انھوں نے

ریکلیکشنز اینڈ ریفلیکشنز۔ سر چمن لال سیتلواد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۲۰۵

سنہا، واچہ، سریندر ناتھ بنرجی، گاندھی، چمن لال سیتل واد اور سروجنی نائیڈو جیسے کانگریسی لیڈروں کی موجودگی میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انگریزی حکومت کو شدید نکتہ چینی کا ہدف بنایا۔ مظہر الحق نے اس بات پر اعتراض کیا کہ غیر ملکی حکومت اس بات پر تیار نہیں کہ ہندوستان اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ خود اٹھائے۔ عوام کی اس بے بسی کے سبب ہندوستان کو دوسرے ملکوں میں عزت و وقعت کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ مسلم لیگ کے صدر منتخب نے اپنی صدارتی تقریر یہ کہہ کر ختم کی کہ ہندوستانیوں کی عزت اور ہندوستان کے احترام کو اسی طرح بحال کیا جا سکتا ہے کہ ملک میں ایک قومی حکومت بنائی جائے۔ اس اجلاس کے موقع پر لوگوں میں جوش و خروش کا جو عالم تھا اس کا اندازہ ایک چشم دید واقعے سے ہو سکتا ہے: "۳۰ دسمبر ۱۹۱۵ء کی اس سہ پہر کو جوش اور جذبے کے جو مظاہرے دیکھنے میں آئے، تاریخ میں اس کی مثالیں بہت کم ملیں گی۔ زبردست تالیوں کی گونج اور پُرجوش نعروں کے درمیان کانگریس کے آزمودہ کار لیڈر اٹھے اور آگے بڑھ کر انھوں نے اپنے لیگی ساتھیوں کو گلے سے لگا لیا۔"[۱]

کانگریس اور مسلم لیگ کے مشترکہ اجلاس کی کامیابی نوکر شاہی کے منہ پر برمحل طمانچے کی حیثیت رکھتی تھی، بایں ہمہ اس کے ظاہری دم خم میں کوئی کمی نہ آئی۔ حکومت نے ہر قیمت پر یہ کوشش جاری رکھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلایا جائے تا اینکہ اس سلسلے میں اس نے بمبئی کے بدمعاشوں سے گٹھ جوڑ کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہ کی۔ لیگ کے اجلاس کے دوسرے دن — باوجودیکہ پولس کے سینکڑوں آدمی موجود تھے کرائے کے بدمعاشوں نے پنڈال پر ہلّا بول دیا۔ ان حالات میں پُرامن اجلاس ناممکن تھا۔ اجلاس کے منتظمین نے جب بدمعاشوں اور شرپسندوں کو جلسہ گاہ

---

[۱] مسٹر جناح۔ اے۔ اے رؤف۔ مطبوعہ ۱۹۴۴ء صفحہ ۵۴

سے باہر نکالنے کے لیے پولس سے مدد مانگی تو انکار کر دیا گیا۔ آخر اجلاس کی کارروائی ملتوی کر دینی پڑی اور دوسرے روز تاج محل ہوٹل میں اجلاس منعقد کیا گیا جہاں اجازت کے بغیر داخلہ ناممکن تھا۔

اجلاس کی اس نشست میں قائداعظم نے ایک قرارداد پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ لیگ ایک کمیٹی بنائے جو سوراج کے مطالبے کے پیش نظر دوسری سیاسی تنظیموں کے صلاح مشورے سے اصلاحات کی ایسی اسکیم تیار کرے جس میں مسلمانوں کے اطمینانِ خاطر اور ان کے سیاسی و قومی مفادات کے تحفظ کا پوری طرح انتظام کیا گیا ہو۔ دوسرے لیڈروں کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد نے جو اس وقت مسلم لیگ کے سرگرم لیڈر تھے، مسٹر جناح کی اس قرارداد کے حق میں ایک مدلل اور پُرزور تقریر کی۔ اجلاس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں نے والہانہ خوشی کے ساتھ اس قرارداد کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی سیاست کے مردِ مجاہد محمد علی جناح نے ہندو مسلم سیاسی اشتراک کے حق میں نہ صرف ذاتی خیرسگالی کے حقیقی جذبات بلکہ دستِ بستہ پر خود مسلم قوم کے جذبات کی ترجمانی کی تھی۔

مذکورہ مقصد کی تکمیل کی خاطر کانگریس نے بھی مسلم لیگی لیڈروں سے اشتراک و تعاون کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی۔ آخر کافی سوچ بچار اور صلاح مشورے کے بعد دونوں کمیٹیوں نے اتفاق رائے سے سیاسی اصلاحات کا ایک مسودہ تیار کیا جو کانگریس کے کلکتہ اجلاس منعقدہ نومبر ۱۹۱۶ء میں پیش کیا گیا مگر قائداعظم اس کامیابی سے مطمئن نہیں تھے۔ انھوں نے تحریک پیش کی کہ مجلس قانون ساز کے منتخب ہندوستانی ارکان لیگ اور کانگریس کے اس سمجھوتے کی حمایت کریں۔ تحریک کی روشنی میں ایک یادداشت مرتب کی گئی اور قائداعظم سمیت ۱۹ ممبروں نے اپنے دستخطوں سے ستمبر ۱۹۱۶ء میں

وائسرائے کے سامنے اسے پیش کیا۔ اس یادداشت میں جنگ ختم ہونے پر ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات تجویز کی گئی تھیں۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ نہ صرف کانگریس اور لیگ کی مفاہمت بلکہ ۱۹ ممبروں کی اس یادداشت میں بھی جداگانہ انتخاب کا اصول بنیادی طور سے تسلیم کرلیا گیا تھا۔ اس اصول کی اہمیت کے دُور رس نتائج کے پیش نظر ۱۹۱۶ء میں احمد آباد میں بمبئی کی صوبائی سیاسی کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے قائداعظم نے ہندوؤں پر زور دیا کہ جداگانہ انتخاب کے معاملے کو طے شدہ مسئلہ سمجھا جائے اور اب اس کی مخالفت نہ کی جائے۔ انھوں نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا: "میں جانتا ہوں کہ جداگانہ انتخاب کا مسئلہ پالیسی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ مسلمانوں کی نظر میں اس کی حیثیت بنیادی مطالبے کی سی ہے۔ مسلم عوام کی خواہش یہ ہے کہ طویل عرصے تک نظرانداز کیے جانے کے بعد اب ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ لہٰذا میں اپنے ہندو بھائیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ یہ مسلمان اسی ملک کی اقلیت ہیں۔" انھوں نے کہا: "ہندوستانی مسئلہ کی بنیاد یہ ہے کہ نوکرشاہی کے اختیارات جمہوریت کو منتقل کردیے جائیں اور یہ مقصد صرف ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔"

کانگریس اور مسلم لیگ کی تجویز سے اس مرتبہ پھر دونوں تنظیموں کا اجلاس بیک وقت لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ کانگریس اور لیگ کے اس تازہ مفاہمانہ رویے کو مستحکم کرنے کے لیے ہندو مسلم اقوام کے سفیر اتحاد، جناح کو لیگ کے اجلاس کا صدر منتخب کیا گیا۔ آخر ۳۰ اور ۳۱ دسمبر کو قیصر باغ لکھنؤ میں مسلم لیگ کا وہ تاریخی اجلاس منعقد ہوا جس نے آئندہ ہندوستان کی سیاسیات کا رُخ بدل دیا۔ اس موقع پر راجہ صاحب محمود آباد مسلم لیگ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔

قائد اعظم نے مسلم لیگ کے تاریخی خطبۂ صدارت میں فرمایا "میری پوری سیاسی زندگی گواہ ہے کہ میں ہمیشہ کانگریس کا پرجوش حامی رہا ہوں اور فرقہ پرستی سے میرا دامن کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی مسلمانوں پر علیحدگی پسندی کا الزام عائد کیا جاتا ہے لیکن اس الزام کا کھوکھلا پن اس وقت ثابت ہوتا ہے جب میں دیکھتا ہوں کہ یہ فرقہ وارانہ جماعت کس تیزی سے متحدہ ہندوستان کی تشکیل کے سلسلے میں ایک طاقتور عنصر بنتی جا رہی ہے۔"

کانگریس کے لکھنؤ اجلاس کے صدر امبیکا چرن مزدار نے بھی اسی قسم کے جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ "ہندوؤں اور مسلمانوں کا متنازعہ مسئلہ طے ہو چکا ہے اور دونوں قومیں متحدہ طور پر داخلی معاملوں میں خود مختار حکومت کا مطالبہ کرنے پر متفق ہو گئی ہیں۔ پچھلے دنوں کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور مسلم لیگ کے نمائندوں کی دو روز تک کانفرنس ہوتی رہی جس میں اتفاق رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں ایک نمائندہ حکومت کے قیام کے لیے مشترکہ مطالبہ کیا جائے۔"

قائد اعظم نے ان الفاظ کے ساتھ کانگریس اور لیگ کے سمجھوتے پر اپنی منظوری کی مہر ثبت کر دی کہ "جہاں تک متحدہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی مقاصد کا تعلق ہے آل انڈیا مسلم لیگ انڈین نیشنل کانگریس کا ساتھ دے گی اور مجموعی طور پر وطن دوستی کے جذبے کے ساتھ ہندوستان کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی جائیں گی، لیگ ان میں کانگریس کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہے۔"

اس سلسلے میں کانگریس اور لیگ کی مشترکہ کمیٹی نے جو تجاویز مرتب کی تھیں، دونوں تنظیموں کے علیحدہ علیحدہ اجلاس میں ان کا مسودہ پیش کیا گیا۔ اپنی اس شاندار کامیابی پر جو پہلے ناممکن نظر آتی تھی، اظہار مسرت کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا "میں

مطمئن ہوں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان قطعی سمجھوتہ ہو گیا ہے۔ اس سمجھوتے سے ہمارے ملک کی تاریخ میں ہندو مسلم اتحاد کے ایک نئے باب کا آغاز ہوتا ہے۔" اُنھوں نے کہا کہ "ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے سلسلے میں ہم دشوار ترین مرحلے سے گزر گئے ہیں اور اب کہا جاسکتا ہے کہ ہم نے آدھی لڑائی جیت لی ہے۔" انھوں نے مطالبہ کیا کہ اب حکومت برطانیہ کو اعلان کر دینا چاہیئے کہ "ہندوستان کو مناسب مدت کے اندر داخلی معاملات میں حکومت خود اختیاری دینے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔" قائدِ اعظم نے مسلمانوں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا "جہاں تک ہمارے اپنے مسائل کا تعلّق ہے ہم اپنے سوا کسی پہ بھروسہ نہیں کر سکتے — ہم ایک دوسرے سے اشتراک تعاون کریں گے۔ ہمیں ذاتی اختلافات ختم کر دینے چاہئیں اور قوم کی بہبود کے لیے ذاتی اغراض کو پس پشت ڈال دینا چاہیئے۔"

لکھنؤ میں کانگریس اور مسلم لیگ کی مفاہمت "معاہدۂ لکھنؤ" کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۱۹ء کی مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات پر اس معاہدے کا گہرا اثر پڑا۔

۱۹۰۰ء اور ۱۹۱۶ء کے دوران سولہ سال میں سیاسی رہنما کی حیثیت سے قائدِ اعظم نہ صرف، ملک گیر اہمیت و شہرت کے حامل بن چکے تھے بلکہ بمبئی بار کے حلقوں میں بھی انھوں نے ممتاز حیثیت حاصل کر لی تھی۔ اس موقع پہ خصوصیت کے ساتھ قائدِ اعظم کے دو مقدموں کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کیونکہ ان سیاسی مقدمات کو تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

۱۹۰۷ء میں بمبئی میونسپل کارپوریشن کے انتخاب ہونے والے تھے۔ اس سلسلے میں ایک انتخابی حلقہ شہر کے جسٹس آف پیس کے عہدوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہ تمام حکومت کے نامزد کردہ تھے اور بیشتر یورپی تھے۔ اس حلقۂ انتخاب سے ۱۶ جسٹس آف پیس منتخب کیے جاتے تھے۔ سر فیروز شاہ مہتا کئی سال سے اسی حلقے سے کامیاب ہوتے

اِس مرتبہ بھی وہ اسی حلقے سے امیدوار تھے۔ میونسپلٹی کے رکن کی حیثیت سے فیروزشاہ کو اُن کی دیانتداری، جرأت اور جذبۂ خدمت کی وجہ سے خاص مقام حاصل تھا۔ ن ان کے یہی اوصاف اور کردار کے یہی پہلو حکومت کی نظر میں کھٹکتے تھے اور اس کی ش تھی کہ سر فیروزشاہ مہتا میونسپلٹی کے رکن منتخب نہ ہوسکیں۔ میونسپل کمشنر شیپرڈ، ٹننٹ جنرل پیرلین، پولس کمشنر گہل اور برطانوی حکومت کے ترجمان ٹائمز آف انڈیا کے یٹر فریزر نے خود اپنے ۱۶ نامزد امیدواروں کی حمایت کرنے اور سر فیروزشاہ مہتا کو ست دینے کے لیے گٹھ جوڑ کیا اور حکومت کے تمام شعبے اور محکمے اِن ۱۱۶ امیدواروں کو یاب جانے کے لیے پوری طرح سرگرم ہو گئے۔

جُوں جُوں انتخاب کا دن قریب آرہا تھا شہر میں ہیجان بڑھتا جارہا تھا۔ بمبئی کے عوام پر یہ خبر بجلی بن کر گری کہ میونسپلٹی کے آئین کو ترقی پسندانہ رنگ دینے اور عوامی سماعت رائج کرنے والے مقبول عام شہری رہنما سر فیروزشاہ کے خلاف ــــ جن کی کوششوں سے میونسپلٹی کے وقار اور کارکردگی میں غیر معمولی اضافہ کیا تھا، سرکاری حلقوں نے ایک ناپاک سازش کی ہے۔ اب لوگوں کے غم وغصہ اور اضطراب و مایوسی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ ۲۱ر فروری ۱۹۰۷ء کو میونسپل ہال میں میونسپلٹی کا اجلاس ہوا۔ میونسپل کمشنر شیپرڈ اجلاس کی صدارت کررہے تھے۔ سر چمن لال سیتل واد نے پوائنٹ آف آرڈر کے ذریعے اعلان کیا کہ یہ اجلاس غیر قانونی ہے۔ میونسپل کمشنر نے پہلے اعلان کیا تھا انتخاب ۲۰ تاریخ کو ہوگا۔ پھر یہ تاریخ بدل دی گئی حالانکہ میونسپل کمشنر کو اس بات کا اختیار نہ تھا۔ شیپرڈ نے اس قانونی نکتے کو ٹھکراتے ہوئے اسی وقت انتخاب کرا دیا۔ اِس دھاندلی کے نتیجے میں حکومت کے نامزد کردہ سولہ کے سولہ امیدوار کامیاب قرار دے دیے گئے۔ سولہویں منتخب ممبر سلیمان عبدالواحد تھے اور یہ میونسپلٹی کے ٹھیکیدار تھے۔ بمبئی کے شہریوں نے اس شرمناک دھاندلی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا فیصلہ کیا

اور عدالت خفیفہ کے چیف جج کے سامنے انتخابی عذرداری پیش کی۔ عدالت نے سلیمان عبدالوحید کے انتخاب کو ناجائز قرار دے دیا اور فیصلہ کیا کہ یہ نشست سر فیروز شاہ مہتا کو ملنی چاہیے جن کا امیدواروں کی فہرست میں سترھواں نمبر ہے۔

اس سلسلے میں بھائی شنکر منّا بھائی نے ہائی کورٹ کی ایک خاص بنچ کے سامنے مقدمہ دائر کیا۔ اس بنچ میں چیف جسٹس سر لارنس جنکینس اور جسٹس بٹی شامل تھے۔ استغاثے کی بنیاد یہ تھی کہ چونکہ میونسپل کمشنر نے غیر قانونی طور پر انتخابات کی تاریخ تبدیل کر دی تھی اس لیے یہ انتخاب ناجائز ہیں۔ بنچ نے مقدمہ مع خرچہ خارج کرتے ہوئے فیصلہ دیا کہ یہ معاملہ پہلے عدالت خفیفہ کے چیف جج کے سامنے پیش کیا جائے۔ سر بال چندر کرشن، ہرمزجی واڈیا اور سر جہانگیر۔ آر۔ پٹیٹ نے چیف جج کے سامنے انتخاب کے جواز کو چیلنج کیا۔ قائد اعظم بھی مدعیوں کی طرف سے پیروی کر رہے تھے۔ لوگوں کو اس مقدمے سے بڑی دلچسپی تھی اور روزانہ اخبارات میں عدالتی کارروائیوں کی طویل روداد شائع ہوتی تھی۔ قائد اعظم کی قانونی موشگافیاں، شاندار جرح اور مخالفین کے گواہوں کو "ادھیڑ" کر رکھ دینے سے ان کی شہرت میں بے پناہ اضافہ ہوا اور انھوں نے بمبئی بار کے صفِ اوّل کے ممبروں میں ممتاز حیثیت حاصل کر لی۔ سر چمن لال سیتل واد نے ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"کچھ واقعات رونما ہوئے، چند نقصان دہ انکشافات کیے گئے اور کچھ فیصلے مذاق بن کر رہ گئے"[۱]

اس کے باوجود چیف جج نے انتخاب جائز قرار دے دیا۔ اس پر شہریوں نے حکومت کو ایک یادداشت پیش کی جس میں انتخابات کے سلسلے میں سرکاری مداخلت

۱۔ دی ریکلکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ سر چمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۹۳۔

کا الزام لگایا گیا تھا اور اس مداخلت کو انتہائی غیر مناسب کہا گیا تھا۔ ۱۷ اپریل ۱۹۰۷ء کو مدھو باغ میں ایک شاندار جلسہ ہوا۔ گوکھلے اس کے صدر تھے۔ تقریر کرنے والوں میں قائدِ اعظم کا نام سرفہرست تھا۔ انھوں نے اپنی تقریر میں سرکاری مداخلت کی مذمت کرتے ہوئے اسے عوام کے حقوق پر قزاقی اور رہزنی کے مترادف قرار دیا۔ جلسے کی تجویز کے مطابق وائسرائے کی خدمت میں بھی ایک یادداشت پیش کی گئی۔ جس پر دوسروں کے علاوہ قائدِ اعظم نے بھی دستخط کیے تھے مگر وائسرائے نے یہ کہہ کر مداخلت سے انکار کر دیا کہ عدالتیں پہلے ہی اس معاملے پر فیصلہ دے چکی ہیں۔ اس طرح ایک مرتبہ پھر عوام کے مقابلے پر نوکر شاہی جیت گئی۔

۲۷ جولائی ۱۹۰۸ء کو حکومت ہند نے تلک کے خلاف دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ دائر کیا۔ الزام یہ تھا کہ انھوں نے اپنے مرہٹی اخبار کیسری میں حکومت کے خلاف تشدد و بغاوت کے جذبات ابھارنے والے مضامین لکھے ہیں۔ عدالتی کارروائی کے بعد تلک کو حکومت کے عائد کردہ تمام الزاموں کا مجرم گردانا گیا اور سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ اس سزا کے خلاف تمام عدالتوں میں اپیلیں کی گئیں تاآنکہ یہ معاملہ پریوی کونسل تک پہنچا جہاں مسٹر ایسکوتھ نے جو بعد میں لارڈ ایسکوتھ بنے، تلک کی پیروی کی مگر پیچھے سے لے کر اوپر تک تمام عدالتوں نے تلک کے خلاف سزا کے فیصلے کو برقرار رکھا۔

اخبار کیسری میں باغیانہ مضمون لکھنے پر ۱۹۰۸ء میں دوبارہ مسٹر تلک پر دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت مقدمہ چلایا گیا۔ قائدِ اعظم نے ان کی درخواست ضمانت پیش کی یہ درخواست مسترد کر دی گئی۔ آخر جسٹس داور اور ایک خاص جیوری کے سامنے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ جیوری کے سات ارکان نے جو یورپی باشندے تھے، تلک کو مجرم قرار دیا۔ البتہ جیوری کے دو ہندوستانی ارکین نے ان کی حمایت میں رائے دی۔ تلک کی سزایابی کے بعد ۲۱ جولائی ۱۹۰۹ء کو وزیر ہند لارڈ مورلے نے بمبئی کے گورنر سڈنہم کو لکھا۔

میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہوں گا کہ اگر تم نے مجھ سے اور اپنے قانونی مشیروں سے رائے لی ہوتی تو وہ اتنی نقصان دہ نہ ہوتی جس قدر نقصان دہ تلک کی سزا ہے۔ اب کیا کیا جاسکتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔"

بمبئی کے گورنر سڈنہم نے لارڈ مورلے کے نام ایک مراسلے میں اپنے نقطہ نظر کی حمایت کرتے ہوئے اصرار کیا کہ تلک کے خلاف مقدمے کی کارروائی اور ان کی سزا دونوں حق بجانب ہیں۔ مگر لارڈ مورلے نے اس موقف کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے ۷ اگست والے مراسلے میں لکھا کہ تم نے تلک کے خلاف کارروائی کے حق میں جو کچھ کہا ہے اس سے میں ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ یہ صحیح ہے کہ اخلاقی اور قانونی اعتبار سے یہ کارروائی جائز تھی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے کوئی عارضی فائدہ ہو، لیکن جب مجموعی طور پر تمام نتائج پر غور کیا جائے گا تو سیاسی اہمیت اس بات کی ہوگی کہ اس اقدام سے فائدہ کتنا ہوا اور نقصان کتنا!! —— اب صرف وقت ہی بتا سکے گا کہ فائدے کا پلڑا بھاری ہے یا نقصان کا؟

تلک کی سزایابی کے خلاف ہندوستان میں جو شدید ردِ عمل ہوا تھا اس کے پیش نظر وزیرِ ہند کو یہ حکم جاری کرنا پڑا کہ آئندہ کوئی سیاسی مقدمہ اس وقت تک نہ شروع کیا جائے جب تک اس کے لیے حکومتِ ہند سے پیشگی منظوری نہ لے لی گئی ہو۔

بمبئی میونسپلٹی کے ہنگامۂ انتخاب اور تلک کے انقلابی مقدمے نے ایک وکیل اور عوامی حقوق کے پُرجوش علمبردار کی حیثیت سے قائداعظم کی شہرت میں اضافہ کر دیا۔ اس کے بعد جب بھی بمبئی کے شہریوں کی نظر میں کوئی معاملہ غیر معمولی اہمیت اختیار کر لیتا تو رہنمائی اور امداد کے لیے سب کی نظریں اس سرگرم قومی رہنما کی طرف اٹھ جاتیں۔

میونسپلٹی والے معاملے نے بمبئی کے شہریوں میں ایک ایسے انگریزی اخبار کی ضرورت کا احساس شدت کے ساتھ پیدا کر دیا جس پر ہندوستانی باشندوں کا کنٹرول ہو۔ حکومت

کا ترجمان ٹائمز آف انڈیا ہمیشہ عوام کی آواز اور ان کے موقف کا مضحکہ اڑا رہا تھا۔
بالآخر سر فیروز شاہ مہتا نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور ۱۹۱۲ء میں انڈین نیوز پیپرز کمپنی
کی بنیاد رکھی۔ سر فیروز شاہ خود اس کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کے چیئرمین بنے۔
انڈین نیوز پیپرز کمپنی نے فیصلہ کیا کہ بی۔جی۔ ہارنی مین کی ادارت میں ایک انگریزی
روزنامہ بمبئی کرانیکل کے نام سے جاری کیا جائے۔ ۳ مارچ ۱۹۱۳ء کو بمبئی کرانیکل کا
پہلا شمارہ شائع ہوا اور پہلے روز ہی اس قومی اخبار نے اخبار بینوں کے حلقے میں تہلکہ
مچا دیا۔ ٹائمز آف انڈیا کی قیمت چار آنے فی پرچہ تھی اور بمبئی کرانیکل کی صرف ایک آنہ۔
یہ چیز بھی اس نوزائیدہ پرچے کو لے اُڑی اور بہت جلد بمبئی کرانیکل کا شمار ہندوستان
کے انتہائی مقبول اور با اثر اخباروں میں ہونے لگا۔ سر فیروز شاہ مہتا کے انتقال کے بعد
ڈائرکٹروں کے بورڈ میں اس وقت کے بعض سیاسی مسائل کی نسبت اختلاف رائے پیدا
ہو گیا۔ ہارنی مین نے ڈائرکٹروں کے رجعت پسندانہ رویے سے تنگ آ کر ایک روز ان
کے خلاف اداریہ لکھا اور عملے کے بیشتر ارکان کے ساتھ دفتر سے اٹھ کر چلے گئے۔ کمپنی
کے حصہ داروں نے ہارنی مین کے موقف کی حمایت کی اور صورت حال پر غور کرنے کے
لیے حصہ داروں کی جنرل باڈی کا خاص اجلاس طلب کرنے کا مطالبہ کیا۔ ڈائرکٹروں
نے یہی مناسب سمجھا کہ جنرل باڈی کا سامنا کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنے اپنے عہدوں
سے استعفا دے دیا جائے۔ اب کمپنی کے حصہ داروں نے اپنے نئے ڈائرکٹر منتخب کیے۔
اور قائداعظم کو ڈائرکٹروں کے بورڈ کا چیئرمین چنا گیا۔ اس طرح یہ اخبار ایک بار
پھر قائداعظم کی نگرانی اور اخبار کی پالیسی پر ان کے کنٹرول کے سبب اپنی سابقہ شہرت و
عظمت پر پہنچ گیا۔ مسٹر جناح نے بورڈ کا چیئرمین نامزد ہونے کے بعد عملے اور منتظمین
کے درمیان ہم آہنگی کی فضا قائم کی اور عوامی جدوجہد جاری رکھنے کے سلسلے میں
عملہ ادارت کی ہر ممکن حوصلہ افزائی فرمائی۔

۱۹۱۵ء میں گوکھلے اور سر فیروز شاہ مہتا کا انتقال ہوا اور اس سے ملک کی قومی زندگی میں مہیب خلا پیدا ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ان جیسا کوئی لیڈر ملک میں موجود نہ تھا۔ عین اسی وقت مسز اینی بیسینٹ ایک روشن ستارے کی طرح ہندوستان کے افقِ سیاست پر طلوع ہوئیں۔ انھوں نے تصوف اور روحانیت کی سرگرمیوں کو خیرباد کہہ کر، خارزارِ سیاست میں قدم رکھا۔ بہت جلد ان کی مؤثر شخصیت نے پورے ہندوستان کو مسحور کر لیا۔ مسز اینی بیسینٹ غیر معمولی صلاحیتوں کی مالک تھیں۔ ایک مفکر، ذہین ادیبہ اور شعلہ بیان مقررہ کی حیثیت سے انھوں نے ملک کے نوجوانوں اور ترقی پسند عناصر کو اپنا ہم نوا بنا کر نیو انڈیا کے نام سے ایک روزنامہ جاری کیا اور نہایت جرأت کے ساتھ ان ہندوستانیوں کو ہدفِ ملامت بنایا جو اپنے ملک اور قوم کے اقتصادی اور سیاسی استحصال میں لگے ہوئے تھے۔ انھوں نے حصولِ آزادی کے سلسلے میں کانگریس کے سست اور غیر مؤثر رویہ پر بھی عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

یکم ستمبر ۱۹۱۶ء کو مسز بیسینٹ نے گوکھلے ہال مدراس میں آل انڈیا ہوم رول لیگ کے قیام کا باضابطہ طور پر اعلان کیا۔ ہوم رول لیگ کے جس منشور کا اعلان کیا گیا تھا اس سے واضح تھا کہ یہ جماعت فوری اور غیر مشروط طور پر ہندوستان کے لیے داخلی خود مختاری یا ہوم رول کا مطالبہ لے کر وجود میں آئی ہے۔ مسز بیسینٹ کے ملک گیر طوفانی دورے نیز ان کی پُرجوش تقریروں اور تحریروں نے ہندوستان کے دور دراز گوشوں تک میں عوام کے اندر ہوم رول کے مطالبے کی آگ بھڑکا دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں طالب علم، پروفیسر، وکیل، ڈاکٹر اور صحافی، ہوم رول لیگ میں شامل ہو گئے۔ یہ غالباً پہلا موقع تھا کہ ہندوستانی خواتین نے اپنی روزافزوں سیاسی بیداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہزاروں کی تعداد میں لیگ کے پرچم کے تحت منظم ہونا شروع کیا۔ ہندوستانی خواتین کے جوش و خروش کو دیکھ کر مسز بیسینٹ نے کہا: "اتنی بڑی تعداد میں ہوم رول لیگ سے

عورتوں کی وابستگی نے ہماری تحریک کی طاقت میں کئی گنا اضافہ کر دیا ہے۔ ان خواتین نے لیگ کو جانبازی، صبر وضبط اور ایثار کے جوہر بخشے ہیں۔ ہماری لیگ کی بہترین کارکن یہ خواتین ہیں:

۱۵ رجون ۱۹۱۷ء کو مسز اینی بیسنٹ اور ان کے دو ساتھیوں، ڈاکٹر جی ایس ارونڈیل اور بی پی واڈیا کو ٹیمیٹور اور کوٹیکونڈ میں نظر بند کر دیا گیا۔ حکومت ہند بدستور اسی فرسودہ نقطۂ نظر پر اڑی ہوئی تھی کہ کسی ایجی ٹیشن کو فوری طور پر دبانے کے لیے ضروری ہے کہ زبردست تعزیری کارروائی کی جائے۔ چنانچہ فوری کارروائی کی گئی لیکن ان تینوں لیڈروں کی نظر بندی نے حکومت کے وقار کو اور مجروح کر دیا۔ حکومت کے اس اقدام سے ہوم رول لیگ اور مقبول ہو گئی اور یہ تینوں لیڈر ملک کے تمام ترقی پسند سیاسی عناصر کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے ایک موثر نشان کی حیثیت اختیار کر گئے۔ ڈاکٹر پتابھی سیتارمیہ نے لکھا ہے۔ اس کے فوراً بعد مسٹر جناح ہوم رول لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔

الٰہ آباد میں ہوم رول لیگ کے زیر انتظام ایک زبردست جلسہ عام منعقد ہوا جس میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا "میں بتانا چاہتا ہوں کہ میں ہوم رول لیگ میں کیوں شامل ہوا۔ ہر سال جب نیشنل کانگریس سیاسی اصلاحات اور حقوق کے بارے میں یادداشتیں پیش کرتی تھی یا جب پچھلے سال امپیریل کونسل کے ۱۹ ممبروں نے ایک نہایت محتاط یادداشت کے مطالبوں پر زور دیا تھا تو حکومت کی طرف سے کہا گیا کہ یہ مطالبے عوامی مطالبات کی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ محض چند تعلیم یافتہ لوگوں اور چند وکیلوں کے خیالات ہیں، نیز یہ کہ عوام اس قسم کی اصلاحات کے لیے تیار نہیں ہیں۔ غرض ہندوستان

---

۱ دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پتابھی سیتارمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء

اور انگلستان میں ہمارے مقاصد پر جن شبہات کا اظہار کیا گیا ہے ان کو ختم کرنے ان کی غلط فہمی کو دور کرنے، لوگوں کو اپنے مقاصد سے باخبر کرنے اور ان کو ان مقاصد کا بنا کر نہ صرف برطانیہ عظمیٰ بلکہ نوکر شاہی تک عوامی مطالبات کو پہنچانے کے لیے سب یہاں جمع ہوئے ہیں اور مجھے خوشی ہے کہ اپنے دعوے کی حمایت کرنے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ صرف چند پڑھے لکھے افراد اور وکیل ہی نہیں بلکہ عوام بھی اصلاح چاہتے ہیں، دس ہزار افراد اس جلسے میں موجود ہیں۔" قائد اعظم ہوم رول لیگ کی بمبئی شاخ کے پہلے صدر منتخب ہوئے اور انھوں نے اس ذمہ داری کو پورے جوش و خروش اور سرگرمی و تندہی کے ساتھ انجام دیا۔

قائد اعظم نے ایک اخباری بیان میں ہوم رول لیگ کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا "ایک ہاتھ سے چرکے لگانا اور دوسرے ہاتھ سے زخموں پر مرہم رکھنا اس منافقانہ حکمتِ عملی کو وہ لوگ کبھی تسلیم نہیں کر سکتے جن میں ذرا سی بھی عزت نفس موجود ہے ــــــ مجھے معلوم ہے کہ کچھ جماعتیں لوگوں کو ہوم رول لیگ کے خلاف بھڑکا رہی ہیں اور یہ کہہ کر ان کے کان بھر رہی ہیں کہ ہوم رول لیگ کانگریس اور مسلم لیگ کے مطالبوں سے بھی آگے بڑھ رہی ہے۔ بمبئی ہوم رول لیگ کے صدر کی حیثیت سے میں یہ حقیقت دہرانا چاہتا ہوں کہ ہم صرف اتنا چاہتے ہیں اور ہماری تنظیم بھی اسی مقصد کے لیے کوشاں ہے کہ لکھنؤ میں اصلاحات کی جو اسکیم منظور کی گئی تھی اسے عملی جامہ پہنایا جائے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہوم رول لیگ عوام کی تربیت کرتی ہے اور کانگریس ایک غور و خوض کرنے والی جماعت ہے۔" ان لیڈروں کی نظر بندی کے بعد عام ایجی ٹیشن ہوا اور ان عوامی مظاہروں کو کچلنے کے لیے حکومت نے ظلم و تشدد کے جو مظاہرے کیے انھوں نے ہندوستان کی صورتِ حال کو اور کشیدہ کر دیا۔ اس صورتِ حال کا ذکر وزیر ہند مانٹیگو نے اپنے روزنامچے میں اس طرح کیا ہے۔" میں اڈیو تا

ا کو پسند کرتا ہوں جس نے اپنی بیوی کے جسم کے باون ٹکڑے کر دیے تو ہر ایک ٹکڑا
ن جاگتی عورت بن گیا۔ یہی حال درحقیقت مسز اینی بیسنٹ کی نظر بندی کے سلسلے میں
ارت ہند کا ہوا۔"

۱۹۰۹ء کے موسم خزاں میں مورلے منٹو اصلاحات کے تحت پہلی بار مرکزی مجلس
ن ساز کے انتخابات ہوئے اور ان انتخابات میں محض اتفاق سے قائد اعظم مجلس
ین منتخب ہو گئے۔ ان اصلاحات کے ذریعے مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا
تا اور بمبئی کے مسلمانوں کو مجلس قانون ساز میں ایک نشست ملی تھی۔ انتخابی ادارہ
، پابند ادارہ تھا جس میں خاص اہلیت رکھنے والے لوگ ہی شامل ہو سکتے تھے۔ قائد اعظم
ں کے عوام کے مسلّمہ رہنما تھے لیکن چونکہ انتخابی ادارہ بہت محدود تھا اس لیے صحیح معنوں
سی اہل و باصلاحیت فرد کے انتخاب کی گنجائش نہیں تھی۔ بمبئی کے دو دولت مند
مجلس قانون ساز کا انتخاب لڑنے کے لیے میدان میں اترے۔ مسلم عوام کو اندازہ تھا
ن کے حقوق کا تحفظ صرف اسی طرح ممکن ہے کہ سیاسی طور پر کسی باشعور آدمی کا انتخاب
ائے۔ چنانچہ ان دونوں عہدہ طلب آدمیوں کی اہلیت و قابلیت پر جن کا معیار شخصیت
ے سرمایہ تھا ہر طرف سے نکتہ چینی شروع ہو گئی۔ یہ دونوں امیدواران ایک دوسرے
رانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔ چند بہی خواہوں نے دونوں امیدواروں میں مفاہمت
نے کی کوشش کی اور یہ طے پایا کہ دونوں کسی تیسرے موزوں آدمی کے حق میں دستبردار
جائیں۔ ان دونوں نے یہ تجویز مان لی۔ اب اس نشست کے لیے کچھ متبادل نام تجویز
ہو گئے لیکن امیدواروں کی صلاحیت اور اہلیت کی جانچ پڑتال کے بعد اتفاق رائے
یہی طے کیا گیا کہ بمبئی کے مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے نوجوان بیرسٹر محمد علی جناح سے
ہتر اور موزوں تر کوئی شخص نہیں ہے۔ مجلس قانون ساز کے رکن کی حیثیت سے قائد اعظم
محمد علی جناح کا یہ پہلا انتخاب تھا۔ اس کے بعد بمبئی کے مسلمان ۳۸ سال تک برابر انھیں

مجلس قانون ساز میں اپنا نمائندہ منتخب کر کے بھیجتے رہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ ہندوستانی قانون سازی کی تاریخ میں ایک درخشاں باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

۲۵ر فروری ۱۹۱۰ء کو قائدِ اعظم نے مجلس قانون ساز میں پہلی تقریر کی۔ اس موقع پر نٹال کے لیے ہندوستان سے مزدوروں کی بھرتی کے متعلق قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا کہ میں اس لیے اس قرارداد پر تقریر کرنے کھڑا ہوا ہوں کہ میرے خیال میں یہ قرارداد غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ ایک تکلیف دہ معاملہ ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جس نے جنوبی افریقہ میں ہندوستانی باشندوں پر ظلم و ستم اور ان سے وحشیانہ سلوک کے خلاف ملک کے تمام طبقوں اور فرقوں میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی ہے۔ مجلس کے صدر لارڈ منٹو نے مقرر کو یاد دلایا کہ ظلم اور وحشیانہ سلوک کے الفاظ سلطنتِ برطانیہ کے ایک دوست اور حلیف ملک کے لیے بہت سخت ہیں۔ لیکن قائدِ اعظم اپنے موقف پر جمے رہے۔ اُنھوں نے کہا "جنابِ والا! میں اس سے بھی زیادہ سخت لہجہ اختیار کرنا چاہتا ہوں لیکن مجلس کے ضوابط و قواعد سے واقف ہونے کے سبب میں حدود سے تجاوز کرنا نہیں چاہتا۔ تاہم یہ ضرور کہوں گا کہ ہندوستانی تارکینِ وطن پر جو ظلم و ستم روا رکھا گیا ہے اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ اس مسئلے پر ہندوستان بھر میں یکساں جذبات پائے جاتے ہیں۔" مقامی اخباروں نے مجلس کے با اختیار صدر (لارڈ منٹو) اور نئے رکن (مسٹر جناح) کے درمیان اس گرما گرمی پر شہ سرخیاں لگائیں۔

مارچ ۱۹۱۲ء میں پولیس کے نظم و نسق کے سلسلے میں بھوپندر ناتھ باسو کی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے محمد علی جناح نے قرارداد کے محرک کی شکایات کی طویل فہرست میں ایک اور مثال کا اضافہ کیا۔ بھوپندر ناتھ باسو نے اپنی تقریر میں پولیس کی زیادتیوں کے خلاف شکایت کی تھی۔ قائدِ اعظم نے بتایا کہ پولیس نے ہوتی کے سردار کو اغوا کے ایک مقدمے میں ماخوذ کر کے عدالت کے سامنے پیش کیا تو پریذیڈنسی

مجسٹریٹ نے ضمانت منظور کرنے سے انکار کرتے ہوئے سردار کو سیشن سپرد کر دیا لیکن جب ایڈوکیٹ جنرل کو پتہ چلا کہ سردار کے خلاف سرے سے مقدمہ ہی موجود نہیں ہے تو اس نے استغاثہ واپس لے لیا اور جج کو مجبوراً لکھنا پڑا کہ اس قسم کا کوئی مقدمہ عدالت میں پیش ہی نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ قائد اعظم نے اپنے دلائل ختم کرتے ہوئے مطالبہ کیا کہ پولس کے نظم و نسق میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں ان کی تحقیقات ایک کمیشن کے سپرد کی جائے۔

اپریل ۱۹۱۲ء میں گوکھلے نے ابتدائی تعلیم کا بل پیش کیا۔ اور باتوں کے علاوہ سرکاری ممبروں نے اس بنیاد پر بھی بل کی مخالفت کی کہ تعلیم سے نوجوانوں کے خیالات باغیانہ ہو جاتے ہیں۔ جناح صاحب نے اپنی جوابی تقریر میں اس استدلال کی مخالفت کرتے ہوئے گرجدار آواز میں کہا۔ "کیا آپ کا واقعی یہ خیال ہے کہ تعلیم کا مقصد بغاوت ہے؟ جناب والا، میں کہنا چاہتا ہوں کہ حکومت یا حکومت کے اقدامات پر بے خوفی اور آزادی کے ساتھ نکتہ چینی کرنا مملکت کے ہر فرد کا فرض ہے ـــ لیکن یہ نکتہ چینی منصفانہ، جائز اور حقیقت پسندانہ ہونی چاہیئے۔ حکومت پر اس قسم کی نکتہ چینی کو بغاوت نہیں قرار دیا جا سکتا۔" اس مفید بل کی مخالفت کرنے والوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے کہا کہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارا مقصد حکومت کو شکست دینا اور سرکاری ممبروں کے بجائے غیر سرکاری ممبروں کو اختیارات سونپنا نہیں ہے۔ آپ سب کو علم ہے کہ اس وقت مجلس قانون ساز سے کوئی اپیل کرنا اور خود اپنی مرضی سے کسی قرارداد یا کسی قانون پر ووٹ دینے کی درخواست کرنا ناممکن ہے۔ غیر سرکاری ممبر جن کی تعداد بہت کم ہے، مجلس قانون ساز میں مختلف معاملات پر صرف اپنی رائے کا ہی اظہار کر سکتے ہیں۔"

یہ بات قابل قبول نہیں معلوم ہوتی کہ ہندو اس بنا پر بل کی مخالفت کر رہے

تھے کہ تعلیم بغاوت کی جڑ ہے۔ پیٹرک لیسی نے لکھا ہے "مسلمان چاہتے تھے کہ بل منظور ہو جائے ؛ ہندوؤں کی سب سے بڑی جماعت جس کی پشت پر کانگریسی اخبار موجود تھے، زور شور سے اس کی مخالفت میں سرگرم تھی۔ مخالفین کے گروہ کا نائب سربراہ ایک بوڑھا ہندو تھا۔ یہ شخص ابتدائی زمانے میں دیش بھگت تحریک کا سرگرم کارکن رہ چکا تھا۔ میں نے اس سے کہا "تم اس لیے مجوّزہ بل کو پسند نہیں کرتے کہ تمھیں اندیشہ ہے کہیں مسلمان بھی ہندوؤں کے برابر تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں" اس نے جواب دیا۔ "ہاں، شاید آپ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔"[۱]

اسی سال حکومت کی طرف سے ضابطہ فوجداری میں ترمیم کا نزاعی بل پیش کیا گیا۔ محمد علی جناح نے کسی تحفظ و رعایت کے بغیر ان قوانین کے خلاف جن کے ذریعے عوام کے بنیادی حقوق سلب کر لیے گئے تھے اپنی جراًت مندانہ آواز بلند کی۔ اس کے ساتھ انھوں نے حصولِ آزادی کی تشدّد آمیز تحریکوں اور حکومت کے خلاف غیر قانونی کارروائیوں کی بھی مذمت کی۔ انھوں نے کہا "میرے ہم وطن حکومت کے اختیارات کو نقصان پہنچانے اور امن و امان میں خلل ڈالنے کی اگر کوئی کوشش کرتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ان کا یہ فعل انتہائی مذمت کے لائق ہے اور وہ سخت ترین سزا کے مستحق ہیں۔ جو لوگ حکومت کے اختیارات کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں، امن و امان میں خلل ڈالنا چاہتے ہیں، میرے خیال میں وہ میرے ملک اور عوام کے سب سے بڑے دشمن ہیں۔ جو لوگ اب بھی اس انداز میں سوچتے ہیں اور اس وہم میں مبتلا ہیں، ان کو احساس ہونا چاہیے کہ انتشار پھیلا کر اور بزدلانہ جرائم کا ارتکاب کر کے کسی بہتر حکومت کو وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے کہ دنیا کے کسی

---

[۱] ناشسٹ انڈیا۔ پیٹرک لیسی، صفحہ ۷۴

ملک میں بھی یہ اوچھے ہتھیار کامیاب نہیں ہوئے اور ہندوستان میں بھی کامیاب نہ ہو سکیں گے"۔ لیکن انھوں نے حکومت کے اعمال پر منصفانہ نکتہ چینی اور متشددانہ حرکات کے درمیان جو فرق پایا جاتا ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا۔ "میں حکومت پر نکتہ چینی کا قائل ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ حکومت پر بے خوف ہو کر اور آزادی کے ساتھ نکتہ چینی جائز ہے لیکن اس کے ساتھ ہر ایک تعلیم یافتہ فرد کا یہ فرض بھی ہے کہ جہاں اور جب حکومت راستی پر ہو تو اس کی تائید و حمایت کرے"۔ جناح صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بھی کہا کہ جب لوگوں کو گمراہ کر کے تشدد پر ابھارا جاتا ہے تو اس کی تھوڑی بہت ذمہ داری حکومت پر بھی عائد ہوتی ہے۔ جس طرح ہندوستان میں کچھ لوگ شر انگیزی کے ذمہ دار ہیں اسی طرح کچھ ایسے لوگ بھی جنھیں حکومت کا حامی و معاون ہونے کا دعویٰ ہے شر انگیزی کے الزام سے نہیں بچ سکتے۔ اس کے بعد انھوں نے ٹائمز آف لندن کا ایک طویل اقتباس پڑھا۔ اس پر اجلاس کے صدر نے انھیں یاد دلایا کہ یہ اخباری اقتباس کوئی سرکاری دستاویز نہیں ہے۔ قائد اعظم نے جواب دیا۔ "جناب والا، مجھے اس بات کا علم ہے لیکن میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کس قسم کی شر انگیز حرکتیں کی جا رہی ہیں۔ جس طرح حکومت ہمارا تعاون و اشتراک چاہتی ہے اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ حکومت، شر انگیزی کا ارتکاب کرنے والے عناصر کی مذمت میں ہمارا ساتھ دے (میرا مطلب یہ ہے کہ) جس طرح آپ ان شر پسند عناصر کی مذمت کرتے ہیں جو ہمارے درمیان موجود ہیں — اسی طرح آپ کو بھی اپنے شر پسند حامیوں کی مذمت سے باز نہ رہنا چاہیئے"۔

۱۹۱۳ء میں انھوں نے "وقف بل" پیش کرنے کی اجازت چاہی لیکن بل پیش کرنے سے پہلے ہی مجلس قانون ساز کے رکن کی حیثیت سے ان کے عہدے کی میعاد ختم ہو گئی۔ تاہم وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے میعاد رکنیت میں توسیع کر دی تاکہ وہ

یہ بل پیش کرسکیں۔ قائداعظم نے بڑے سلیقے اور خوبی کے ساتھ بل پیش کیا اور اس طرح وہ کونسل کے پہلے غیر سرکاری ممبر تھے جس کے کسی بل کو قانونی حیثیت دی گئی۔

مجلس قانون ساز کے رکن کی حیثیت سے قائداعظم محمد علی جناح نے اپنی اہلیت، کارگزاری اور لیاقت سے یہ بات ثابت کردی تھی کہ پارلیمانی خطابت اور سیاسی سُوجھ بُوجھ کے میدان میں ہندوستان کے صرف چند افراد ہی ان کے رتبے تک پہنچ سکتے ہیں۔

ان ہی وجوہ کی بنا پر ۱۹۱۷ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے دوبارہ انتخاب کے موقع پر بمبئی کے مسلمانوں نے انھیں دوبارہ کونسل کے لیے اپنا ممبر چن لیا۔ اس الیکشن میں رفیع الدین مسٹر جناح کے حریف تھے۔ شکست کھاجانے کے بعد انھوں نے اس بنا پر انتخابی عذرداری پیش کی کہ چونکہ مسٹر جناح نے الیکشن میں بدعنوانیوں سے کام لیا ہے اس لیے ان کے انتخاب کو ناجائز قرار دے دیا جائے۔ پوناکے ڈسٹرکٹ اور سیشن جج پرسیول نے اس الزام کی تحقیقات کی۔ سرجمن لال سیتل واد لکھتے ہیں "یہ الزام لگایا گیا تھا کہ دوران انتخاب فلاں روز شام کے وقت جناح صاحب کی طرف سے بدعنوانیاں ہوئی ہیں۔ میں اس روز شام کے وقت جناح صاحب کی قیام گاہ پر موجود تھا، اس لیے میں نے جناح صاحب کی صفائی میں شہادت دی۔[1]" عدالت نے یہ مقدمہ اس فیصلے کے ساتھ خارج کردیا کہ بدعنوانی کے الزامات قطعاً بے بنیاد ہیں۔

---

[1] ریکلکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ سرچمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۲۵۴-۲۵۵

وہ ہارماننے والے نہیں تھے

۱۹۱۶ء کا لیگ کانگریس معاہدہ ہندوستانی عوام کی روز افزوں سیاسی بیداری کا نمایاں ثبوت تھا۔ ہندو مسلم اختلافات جو حکومت خود اختیاری کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے، اب ختم ہو چکے تھے اور برطانوی سامراج کے پاس اب یہ بہانہ نہیں رہا تھا کہ چونکہ دونوں قوموں کے درمیان سنگین سیاسی اختلافات پائے جاتے ہیں اس لیے ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کا کوئی جامع اور فیصلہ کن منصوبہ نہیں بنایا جا سکتا۔ اس زمانے میں ہندوستان کے ہر گوشے میں ایجی ٹیشن اور احتجاج کی جو لہر دوڑتی اس سے برطانوی حکومت پر سیاسی دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر ۱۹۱۷ء میں حکومت کو بادل نخواستہ یہ اعلان کرنا پڑا کہ ملک میں سیاسی اصلاحات جلد نافذ کر دی جائیں گی۔ یہ خیال آرائی عام تھی کہ کانگریس اور لیگ مل جل کر سول نافرمانی کی تحریک چلائیں گی۔ دونوں تنظیموں کی تمام شاخوں سے ستیہ گرہ کے طریقۂ کار کے متعلق رائے طلب کی گئی اور اس مسئلے کا قطعی فیصلہ کرنے کے لیے ڈیڑھ مہینے کا وقت دیا گیا۔ ۲۸ جولائی ۱۹۱۷ء کو دونوں جماعتوں کے مشترکہ اجلاس میں محمد علی جناح، سر تیج بہادر سپرو، سری نواس شاستری اور سر وزیر حسن پر مشتمل ایک وفد انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس وفد کے فرائض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ کانگریس اور لیگ کے متحدہ مطالبات کے حق میں جن کی ۱۹ ممبروں کی قرارداد کے ذریعہ مکمل تائید کی گئی تھی۔ برطانوی سیاستدانوں اور رائے عامہ کی حمایت حاصل کی جائے تاکہ ان مطالبات اور سیاسی اصلاحات کے

منصوبے کو حکومت برطانیہ سے منظور کرایا جا سکے۔ یہ وفد ستمبر میں انگلستان روانہ ہو گیا اور وہاں اس نے برطانوی مدبرین پر بہت اچھے اثرات ڈالے پھر بھی کچھ انگریز سیاستدان لیت ولعل کی پالیسی پر گامزن رہے۔ ان کا اعتراض یہ تھا کہ ایسے موقع پر جب کہ برطانوی حکومت اور وائسرائے کے درمیان اصلاحات کے بارے میں خفیہ خط و کتابت جاری ہے کانگریس، لیگ، اور ۱۹ ممبروں نے اصلاحات کی اسکیم کی نا وقت تشہیر کر کے زبردست غلطی کی ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے معاہدے کے بارے میں لارڈ چیمسفورڈ نے فرمایا کہ یہ میثاق تباہ کن تبدیلیوں کی تمہید ثابت ہو گا۔ لارڈ سڈنہام نے تو انتہا ہی کر دی۔ ان کے خیال میں ان انقلابی تجویزوں سے جرمنوں کی سازش کی بُو آتی تھی۔ غرض کٹر برطانوی مدبرین کسی طرح اس پر آمادہ نہ تھے کہ لیگ کانگریس کے پیش کردہ منصوبہ اصلاحات کو منظور کر لیا جائے۔ اور ان میں سے ہر شخص اس کی تردید میں پیش پیش تھا۔ حکومتِ برطانیہ کی اس رجعت پسند حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہُوا کہ پنجاب میں سر مائیکل اوڈائر اور مدراس میں لارڈ پینٹ لینڈ جیسے شاہنشاہیت پسند گورنروں کے حوصلے بڑھ گئے۔ اُنھوں نے کُھل کر اعلان کیا کہ کانگریس اور لیگ کی مفاہمت کا مسکت جواب یہ ہے کہ حکومت ہند سخت رویّہ اختیار کرے۔

غرض نوکر شاہی کا پوشیدہ ہاتھ شعبدہ بازی میں مصروف تھا۔ برطانوی اخباروں میں بے شمار مضامین شائع کرائے گئے۔ یہی نہیں بلکہ اس ملک کی اصلی سیاسی تصویر کو مسخ کر کے برطانوی رائے عامہ کے سامنے پیش کرنے کے لیے بہت سے کتابچے شائع کیے گئے۔ ان تمام تحریروں کا مقصد یہ تھا کہ حکومت اصلاحات منظور نہ کرنے پائے۔ اس سلسلے میں ولیم آرچر کی کتاب قابل ذکر ہے۔ وہ لکھتا ہے۔ بربریت، وحشی اور وحشیانہ ــــ ان سے صورتِ حال پوری طرح سامنے آجاتی ہے ـــــ اس میں شک نہیں کہ ہزروں افراد اس تعریف (وحشی) سے بالاتر ہیں مگر ہندوستان کے لوگوں کے متعلق

بالعموم صحیح بات یہی ہے کہ وہ مہذب نہیں ہیں۔[۱]

ٹائمز لندن نے اس کتاب کی بڑی تعریف کی اور اسے ایک بروقت کارنامہ
اردیا۔ اخبار نے لکھا کہ کتاب کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ ہندوستانی تہذیب
ے کبھی کوئی ایسا عظیم اخلاقی یا روحانی تصور پیش نہیں کیا جس سے کسی قوم کی سربلندی
یں مدد مل سکے۔[۲] تاریخی نوعیت کے اعتبار سے یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۰۱ء کی مردم شماری
یں ہندو مت کی تعریف یوں کی گئی تھی: یوں سمجھ لیجیے کہ مظاہر پرستی اور فلسفے کو آپس میں
مڈمڈ کر دیا گیا ہے یا ساحری پر مابعد الطبیعات کا رنگ چڑھا دیا گیا ہے۔" اس پر جان
ڈروف نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "اس کتاب (انڈیا اینڈ دی فیوچر) کے مطالعے سے
یہ عجیب بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ مردم شماری کے افسروں کے فرائض میں یہ
ی شامل تھا کہ وہ اس دیس کے باسیوں کے عقائد و مذاہب پر رائے دیں۔[۳] انگریزوں
ان حرکتوں کے خلاف ایشیا میں منافرت اور بغاوت کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔
یشیائیوں اور ہندوستانیوں کے خلاف اشاعت کی اس گمراہ کن اور اشتعال انگیز تحریک
م کے خلاف بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ ان میں نمایاں اور بیشتر ہندوستانی ادیبوں کی
یں جن میں ایشیا کے تاریخی ماضی کو اجاگر کرنے کے ساتھ اس امید کا اظہار کیا گیا تھا کہ
عظیم سرزمین ایک بار پھر دنیا کی سربراہی اور رہنمائی کے فرائض انجام دے گی۔ جاپانی
فکر ڈاکٹر یوجی ردمیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں: "جس سرزمین پر کنفیوشس، مہاتما بودھ،
مسیح اور محمدؐ پیدا ہوئے۔ جہاں جہاں ان کی لافانی تعلیمات کے روحانی چشمے جاری ہوئے

---

[۱] انڈیا اینڈ دی فیوچر۔ ولیم آرچر۔

[۲] از انڈیا سولائزڈ۔ سر جان وڈروف۔ مطبوعہ ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۲۲۔

[۳] از انڈیا سولائزڈ۔ سر جان وڈروف۔ مطبوعہ ۱۹۱۸ء صفحہ ۱۲۶

(جہاں غیر فانی اُپنشدوں کا ظہور ہُوا) اسے فوجی قوت سے عظیم تر قوت حاصل ہے اور وہ اب بھی دنیا کے حالات تبدیل کر دینے پر قادر ہے۔ اس سرزمین کے پاس شاید اتنی زیادہ دولت تو نہ ہو جو دنیا کے پجاریوں اور حرص و ہوس کے بندوں کو متاثر کر سکے تاہم کثیر تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جن میں سے اکثر اعلیٰ دل و دماغ کے مالک ہیں اور یہ چیز دنیوی مادہ پرستی سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔[1]

جنگ عظیم کی تباہ کاریوں اور خوفناک نتائج نے انگریزوں کو ہراساں کر رکھا تھا جنگ ابھی جاری تھی اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ یہ مہیب ترین لڑائی کب تک جاری رہے گی۔ دوران جنگ عراق میں انگریزوں کی بدعنوانیوں کے متعلق کچھ انکشافات ہوئے اور یہ الزام لگایا گیا کہ وہاں کافی نقصانات ہوئے ہیں جن کی ذمہ داری کسی نہ کسی پر یقیناً عائد ہوتی ہے۔ دارالعوام میں اس مسئلے پر ایک گرما گرم بحث کے دوران میں مانٹیگو نے وزیر ہند آسٹین چیمبرلین پر کڑی نکتہ چینی کی۔ مانٹیگو نے کہا۔ حکومت ہند اپنے فرائض انجام دینے میں بری طرح ناکام رہی ہے۔ اس نے ضرورت سے زیادہ سختی اور غیر ضروری نرمی سے کام لیا۔ بحث کا نتیجہ یہ ہُوا کہ چیمبرلین کو مستعفی ہونا پڑا اور آخر نوعمر اور ذہین مانٹیگو، جس کی عمر اس وقت صرف ۳۶ سال تھی وزیر ہند مقرر کیا گیا۔ مانٹیگو نے ایک مرتبہ کیمبرج میں وقار (PRESTIGE) پر تقریر کرتے ہُوئے کہا تھا: ــــ جہاں تک وقار کا تعلق ہے، آہ! ہندوستان، اگر انگریزی زبان میں یہ لفظ نہ ہوتا تو تیری تاریخ کس قدر خوش آئند ہوتی۔ ہم اس لفظ کی دہائی دے دے کر ہندوستان پر اپنا تسلط قائم نہیں رکھ سکتے۔ ہمیں وہاں عدل و انصاف قائم کرنا ہوگا اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ محکوموں کی رضامندی بھی حاصل

---

[1] دی فیوچر آف ایشیا۔ ڈاکٹر لوجی رو دیبا کے۔

کرنی ہوگی۔"

مانٹیگو کے وزیر ہند مقرر ہونے سے یہ امید پیدا ہو چلی تھی کہ اب سیاسی اصلاحات ضرور نافذ ہو جائیں گی اور کم و بیش ان اصلاحات کا وہی معیار ہوگا جسے کانگریس اور لیگ کے معاہدے میں پیش کیا گیا ہے۔ مانٹیگو نے وزارت سنبھالتے ہی ۲۰ اگست کو دارالعوام میں اعلان کیا "حکومت برطانیہ جس سے حکومت ہند پوری طرح متفق ہے اس پالیسی پر عمل پیرا ہوگی کہ ——— ہندوستان میں جو سلطنت برطانیہ کا ناقابل تقسیم جزو ہو گا رفتہ رفتہ ذمہ دار حکومت قائم کی جائے۔"

دریں اثنا ۶ اکتوبر کو الہ آباد میں کانگریس اور مسلم لیگ کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ جس میں تحریک سنیہ گرہ کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور طے کیا گیا کہ ایک وفد انگلستان بھیجا جائے جو حکومت کو ایک مشترکہ یادداشت پیش کرے۔ نومبر ۱۹۱۰ء میں لیگ اور کانگریس کے مشترکہ وفد نے لارڈ چیمسفورڈ اور مانٹیگو کو یادداشت پیش کی جس پر دوسرے لوگوں کے علاوہ قائداعظم کے بھی دستخط تھے۔ یادداشت میں دوسرے امور کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ ایک ایسی قوم کا جس نے اپنے آپ کو حکومت اور نظم و نسق چلانے کا اہل ثابت کر دیا ہے (غیر ملکی) حکومت کا دست نگر رہنا اس کی عزت نفس کے منافی ہے۔ جب تک ہندوستانی حکومت خود مختار، عوام کی نمائندہ اور عوام کے سامنے جوابدہ نہ ہوگی، ہندوستانی اسے اپنے سے جدا گانہ شے سمجھتے رہیں گے۔"

۱۹۱۷ء کے اواخر میں جب لارڈ چیمسفورڈ اور مانٹیگو نے ہندوستان کا دورہ کیا تو ان سے متعدد وفود ملے اور ان کو یادداشتیں پیش کی گئیں۔ مانٹیگو نے خلاقی جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے لیگ اور کانگریس کے معاہدے کو تسلیم کر لیا۔ قائداعظم جیسے لیڈر کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ آخر کار ان کی محنت ٹھکانے لگی۔ لیکن برطانوی سیاست پس پردہ شعبدہ پردازی میں مصروف تھی۔ ایک طرف تو فراخ دلی اور وسیع النظری کا

پر جاری کیا جا رہا تھا اور دوسری طرف اپنا مطلب حاصل کرنے اور اپنی سامراجی اغراض کی تکمیل کے لیے ریشہ دوانیاں جاری تھیں۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ نے لکھا ہے "بہت سے لوگوں کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ نام نہاد مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم مارچ ۱۹۱۶ء مکمل طور سے تیار ہو چکی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ (لارڈ) چیمسفورڈ اس وقت ہندوستانی فوج میں میجر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ جب حکومت برطانیہ کی طرف سے اسے وائسرائے کی حیثیت سے تقرر کا حکم ملا۔ اس تقرر نامے کو پاکر چیمسفورڈ مارچ ۱۹۱۶ء میں انگلستان گیا تو اسے مکمل سکیم دکھائی گئی"[1]

ہندو مسلم رہنما کانگریس لیگ معاہدے کے لیے عوام کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے میں مصروف تھے تاکہ حکومت پر کم از کم چند اختیارات سے ہی دستبردار ہونے کے لیے دباؤ ڈالا جا سکے۔ جناح اور گاندھی کی سرپرستی میں اس معاہدے کا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ کیا گیا اور ملک بھر میں ان مشترک مطالبات کی دستاویز پر دستخط کرانے کی مہم شروع کی گئی۔ چند مہینے میں دس لاکھ سے زیادہ آدمیوں نے دستخط کر دیے۔ ہندوستان اور انگلستان کے رجعت پسندوں نے لاکھ سر ٹکرایا مگر انھیں اپنے مقاصد میں کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔

تاہم برطانوی حکومت کو یہ اعلان کرنا پڑا کہ ہندوستان میں برطانوی راج کا مقصد یہ ہے کہ سیاسی و انتظامی اختیارات کسی ذمہ دار حکومت کے سپرد کر دیے جائیں لیکن یہ اختیارات کب منتقل کیے جائیں گے اور تفاصیل کیا ہوں گی، ان تمام باتوں پر راز کا پردہ پڑا رہا۔ ۱۹۱۷ء میں ڈاکٹر اینی بیسنٹ کی زیر صدارت کلکتہ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی منظور شدہ قرارداد میں ذمہ دار حکومت کے قیام کے

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۱۲۳۔

اصول کا خیر مقدم کرتے ہوئے مطالبہ کیا گیا تھا کہ ذمہ دار حکومت کے قیام کے سلسلے میں پہلا قدم یہ اُٹھایا جائے کہ کانگریس اور لیگ کی پیش کردہ اصلاحات کی اسکیم کو فوراً عملی شکل دے دی جائے: یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ کانگریس نے اس اجلاس میں یہ بھی طے کیا کہ مدراس پریذیڈنسی کے تیلگو بولنے والے علاقوں کو ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے ۲۶ راکتوبر ۱۹۱۷ء کو سندھ اور کرناٹک کے لیے بھی یہی اصول تسلیم کر لیا گیا۔ ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ نے لکھا ہے: "کانگریس کا خیال تھا کہ یہ مسئلہ اصلاحات کے نفاذ تک ملتوی رکھا جائے لیکن لوک مانیہ تلک نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ حقیقی صوبائی خودمختاری کے لیے ضروری ہے کہ لسانی بنیاد پر صوبوں کی از سر نو حدبندی کی جائے۔"[1] تاہم یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ۱۹۱۷ء کی اس قرارداد کے بعد کوئی موقع ایسا نہیں آیا کہ کانگریس نے سندھ کے صوبائی وجود کی مخالفت نہ کی ہو تا اینکہ قانون ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کی رُو سے سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر دیا گیا اور اس علاقے کو مکمل صوبائی خودمختاری سونپ دی گئی۔

قائداعظم نے لیگ اور کانگریس میں اشتراکِ عمل کا جو جذبہ پیدا کیا تھا اس کے سبب دونوں سیاسی جماعتوں کے دوستانہ تعلقات مربوط اور مضبوط تر ہوتے گئے۔ ۶ راکتوبر ۱۹۱۷ء کو ہندوستان کی سیاسی صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے آل انڈیا کانگریس کونسل اور مسلم لیگ کونسل کا ایک اور مشترکہ اجلاس ہوا۔ یہ محمد علی جناح جیسے رہنماؤں کی انتھک کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ جب وزیر ہند مانٹیگو نے ہندوستان کا دورہ کیا تو ہندوستان کی دو انتہائی نمائندہ سیاسی جماعتوں یعنی کانگریس اور لیگ میں غیر معمولی تعاون و اشتراک کی روح موجزن تھی۔ مانٹیگو نے

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحات ۱-۲۵

اس صورتِ حال پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے روزنامچے میں لکھا ہے "یہاں اب ہندوستان کی دُنیائے سیاست کے قہرمانوں کا سامنا کرنا تھا۔ یہ عظیم شخصیتیں کسی ایک صوبے سے تعلق نہ رکھتی تھیں بلکہ مختلف صوبوں کے صفِ اوّل کے سیاسی رہنماؤں کے درمیان مکمل تعاون اور ہم آہنگی موجود تھی۔ بنگال کے آزمودہ کار سیاست دان سر سریندر ناتھ بینرجی نے سپاس نامہ پڑھا۔ یہ سپاس نامہ جو نہایت محنت و قابلیت سے مرتب کیا گیا تھا، اتنے ہی دلکش انداز سے پڑھا گیا۔ ان کے علاوہ دوسرے رہنماؤں میں سی پی کے مدھولکر، بمبئی سے جناح، بہار اور اڑیسہ سے مظہر الحق اور حسن امام نیز گاندھی، مسز بیسنٹ اور کیپا والپلائی وغیرہ، غرض تحریک کے تمام سرکردہ رہنما یہاں موجود تھے۔"

محمد علی جناح کے متعلق مانٹیگو نے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔ "ان تمام لوگوں کی قیادت نوجوان، خوش اخلاق، دلوں کو موہ لینے والی شخصیت، مدلل اندازِ گفتگو کے مالک اور اپنی پوری اسکیم قبول کرانے پر مُصر، جناح کے ہاتھ میں تھی۔ سیاسی اصلاحات کی اسکیم کے نقصانات، انتظامی کونسل کے منتخب ممبروں کا معاملہ، مالیاتی امور میں اقلیتوں کے اختیارات کا مسئلہ غرض کوئی مطالبہ ایسا نہ تھا جس پر وہ اپنے موقف سے پیچھے ہٹ سکتے۔ ان کا مطالبہ تو بس ذمہ دار حکومت کا قیام تھا اس کے علاوہ اور کسی چیز سے انھیں مطمئن کرنا بڑا مشکل تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو ہم کچھ بھی قبول نہیں کریں گے۔ میں بُری طرح تھکا ہوا تھا اور میں نے بڑی مُشکل سے ان سے پیچھا چھڑایا۔ چیمسفورڈ نے ان سے بحث کرنی چاہی مگر انھوں نے اسے بھی لاجواب کر دیا۔ جناح بہت زیرک ہیں اور یہ بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ ایسا شخص خود اپنے ملک کے نظم و نسق سے بے تعلق رہے۔"[۱]

---

[۱] مسٹر مانٹیگوز ڈائری۔

وزیر ہند اور وائسرے کو بخوبی اندازہ ہو گیا تھا کہ کانگریس اور لیگ دونوں میثاق لکھنؤ کے مطالبات سے کم کسی بات پر ہرگز آمادہ نہ ہوں گی۔ پہلے کی طرح اب بھی سرکاری سازشوں کا رخ یہ تھا کہ اس متحدہ محاذ کی بنیادیں کمزور کی جائیں۔ ان سازشوں کے سلسلے میں ہندوستان میں رہنے والے انگریز، اینگلو انڈین باشندے اور نوکر شاہی حکومت کے خاص آلۂ کار کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان سازشوں اور اوچھی حرکتوں کے خلاف احتجاج کرنے کے لیے نومبر ۱۹۱۷ء میں ایک زبردست جلسۂ عام بمبئی میں ہوا جس کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے۔ انھوں نے نہایت بے خوفی کے ساتھ ان ریاکار سازشوں کے بخیے اُدھیڑتے ہوئے حکومت کو خبردار کیا کہ اگر عوام کی توقعات پوری نہ کی گئیں تو اسے خوفناک نتائج بھگتنا پڑیں گے۔ ادھر ہندوستانی عوام کے مطالبے "ہوم رول" کے مخالفین کی رہنمائی لارڈ سڈن ہیم کر رہے تھے۔ ان کا بیان تھا کہ ہندوستانی عوام جب بھی اس بار گراں کے متحمل ہوں گے برطانوی حکومت تمام اختیار و اقتدار ان کو منتقل کر دے گی۔ محمد علی جناح نے نہایت جرأت کے ساتھ لارڈ سڈن ہیم کی اس دلیل کے پرخچے اڑا دیے۔ ان کے الفاظ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ جناح صاحب نے کہا: "خواتین و حضرات! میں اس سلسلے میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جب ہندوستانی عوام اس ذمہ داری کو اٹھانے کے اہل ہوں گے تو کیا وہ لارڈ سڈن ہیم سے اپنے حق کا مطالبہ نہیں کریں گے، یہ ہے وہ جواب جو میں ان کی بے سروپا باتوں کا دے سکتا ہوں۔"

دسمبر ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں لیگ اور کانگریس کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ اس زمانے میں جناح صاحب خود مختار حکومت کے قیام اور ہندو مسلم اتحاد کے لیے پوری سرگرمی اور تندہی سے کوشاں تھے۔ مجوزہ اصلاحات کے متعلق مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے ایک خاص قرارداد پیش کی گئی جس کا مسودہ تیار کرنے میں جناح صاحب نے غیر معمولی

حصّہ لیا تھا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ برطانوی حکومت کے اس اعلان کا کہ نظم ونسق کے ہر شعبے میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی باشندوں کو شریک کیا جائے گا۔ اور ہندوستان میں درجہ بدرجہ ایسی ذمہ دار حکومت قائم کی جائے گی جو سلطنت برطانیہ کا جزو لاینفک ہو گی خیر مقدم کرتی ہے۔ قرارداد کی رُو سے یہ مطالبہ تھا کہ دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے مشترکہ طور پر اصلاحات کی جو اسکیم پیش کی تھی اسے ایک مسودۂ قانون کے ذریعے فوراً نافذ کر دیا جائے۔" تاکہ مقررہ مدّت کے اندر ہندوستان میں ذمہ دار حکومت قائم ہو سکے۔ البتہ یہ شرط ہمیشہ اور اصلاحات کی ہر ایک اسکیم میں بطورِ خاص ملحوظ رکھی جائے کہ مسلمانوں کو مناسب اور مؤثر نمایندگی ملے۔" قائداعظم نے اس قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے کہا "کیا اربابِ اقتدار یہ سمجھتے ہیں کہ صرف بیلٹ بکس کے ذریعے حکومت چلائی جا سکتی ہے؟ مسلمانوں کو بھی اس بات سے ہراساں نہ ہونا چاہیے کہ ہندو اپنی اکثریت کی بنا پر قانون منظور کر کے مسلمانوں کی مرضی اور رائے کے بغیر کسی معاملے کو طے کر سکتے ہیں۔ اگر ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان کوئی قانون منظور نہیں کرتے تو کیا ہندوستان میں اس قانون کو جاری کیا جا سکتا ہے — اگر ہندو اس ملک پر راج نہیں کر سکتے تو میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہاں مسلمان بھی حکومت نہیں کر سکتے۔ نہ تنہا انگریز اقتدار کے مالک بنے رہ سکتے ہیں۔ انجام کار اس ملک پر اس کے عوام اور اسی ملک کے لوگ حکومت کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ میں پورے ملک کے جذبات کا اظہار کر رہا ہوں۔ ہمارا مطالبہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت اپنے عظیم اختیارات فوراً عوام کو منتقل کر دے اور یہی بات ہم نے اصلاحات کی اسکیم میں خاص طور پر کہی ہے۔"

کم و بیش اسی وقت کانگریس کا اجلاس بھی ہوا اور اسی مفہوم کی ایک قرارداد کانگریس کے اجلاس میں بھی پیش کی گئی۔ جناح صاحب اس قرارداد کا مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی

کے بھی رکن تھے۔ انھوں نے اس قرارداد کی حمایت میں بھی تقریر کی۔ لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کے اجلاس میں پیش کردہ تجاویز کی حمایت کرتے ہوئے جناح صاحب کا لب ولہجہ اور جوش وخروش یکساں تھا۔

تاریخ نے سامراجیوں کو بہت کچھ سکھایا ہے۔ خاص طور سے یہ بات کہ جب تک عوام منقسم اور غیر متحد رہیں گے، غیر ملکی حکمراں بے خوف وخطر ان پر حکومت کر سکتے ہیں۔ سیاسی طور پر ہندو مسلمانوں کو یکجا کرنے میں جناح صاحب کو جو کامیابی نصیب ہو رہی تھی وہ انگریزوں کو بدحواس کر دینے کے لیے کافی تھی۔ آخر انگریز حاکموں نے پینترا بدلا۔ انھوں نے دو قوموں کو ایک دوسرے سے برسرِ پیکار کرنے کے لیے یہ افواہ اڑائی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو در اصل متحد نہیں بلکہ ایک دوسرے میں مدغم کیا جا رہا ہے۔ یہ خطرناک افواہیں مذہبی جنونیوں کو مشتعل کرنے کے لیے کافی تھیں۔ اس اشتعال کے تحت کئی مقامات پر فرقہ وارانہ بلوے ہوئے اور آرہ (یوپی) میں بے گناہ مسلمانوں کو ہندو اکثریت کے تشدد اور مذہبی جنون کا شکار بننا پڑا۔ البتہ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ۱۹۱۷ء میں کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں کسی نے آرہ کے فرقہ وارانہ بلوے کی نسبت ایک لفظ تک نہ کہا۔ سید رضا علی نے لیگ کے اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی جس میں آرہ کے بے گناہ مسلمانوں کے قتلِ عام پر ہندوؤں کی مذمت کی گئی تھی۔ سید رضا علی نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ آرہ کے ہندو لیڈروں نے خفیہ طور سے ہندوؤں کو ہتھیار فراہم کیے تھے۔ انھوں نے اس بات پر ناراضی کا اظہار کیا تھا کہ پولس آرہ کے بے گناہ شہریوں کے تحفظ میں ناکام رہی اور خفیہ پولیس فرقہ وارانہ فساد کی اس سازش کو بروقت بے نقاب نہ کر سکی۔ [illegible] مقامی حکام پر بھی مجرمانہ غفلت کا الزام لگایا گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ حکومت پر الزام دھرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ اکثریتی فرقے کو لازم تھا کہ وہ بڑے بھائی کی طرح اقلیتی فرقے کی حمایت کرتا۔ دونوں قوموں کو ایسے تخریب پسند سازشیوں پر کڑی نظر رکھنی چاہیے

جو ملک میں فرقہ وارانہ امن و اتحاد کو ختم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا ایک بہت بڑا سبب، عام طور پر گائے کی قربانی خصوصیت کے ساتھ عید الضحٰی کے موقعے پر ذبیحہ گاؤ کا نزاعی مسئلہ اور اوقات نماز میں مساجد کے سامنے ہندوؤں کا باجے تاشے کے ساتھ گزرنا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ قربانی گاؤ کے نزاعی مسئلے پر گاندھی نے کلکتے کے اخبار اسٹیٹسمین میں لکھا "گئو پوجا ہندو کی فطرت میں داخل ہے۔ جہاں تک مجھے علم ہے ہندو باوجود اپنی نرم روی کے عیسائیوں اور مسلمانوں کو گئو ہتھیا سے باز رکھنے کے لیے تلوار استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔" یہ کسی جنگجو سپاہی کے الفاظ نہ تھے، یہ عدم تشدد کے دیوتا گاندھی جی کے الفاظ تھے۔ جو اب ہندوستانی سیاست میں ایک جانی پہچانی شخصیت کی حیثیت اختیار کر گئے تھے اور لاکھوں ہندو انھیں مہاتما سمجھتے تھے اور ان کے مراتب میں مسلسل ترقی ہو رہی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ انھیں مہاتما سمجھا جاتا تھا بلکہ اوتار کی گدی پر بھی فائز کر دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس مہاتما اور اس اوتار کے الفاظ عام ہندو کے لیے وحی و الہام کی حیثیت اور اہمیت کے حامل تھے۔ گاندھی کے مقابلے پر جناح تھے جو دونوں فرقوں (ہندو اور مسلمانوں) کو سیاسی اشتراک عمل اور دوستانہ سماجی مفاہمت کے ذریعے ایک دوسرے سے قریب تر لانے کے موقف پر اٹل تھے اور ان کی تمام سرگرمیاں مذہبی عقائد کے تصادم اور طبقاتی و نسلی امتیاز اور تعصب سے بالکل پاک تھیں۔ ڈربن کے ایم اے مہتہ نے گاندھی اور جناح کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے "جناح یقیناً ایک اعلٰی سیاستدان ہیں۔ اس کے برعکس گاندھی تصوّر پرست ہیں۔ ان کی شخصیت کی تہہ میں خود نمائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ جناح نے کبھی کوئی بات ڈھکی چھپی نہیں رکھی مگر گاندھی گول مول بات کرنے کے عادی ہیں۔[1] جس طرح کانگریس اپنی تنظیم اور استحکام کے لیے ہندو سرمائے

---

[1] ہائینز آف دی گریٹ انڈین کنفلکٹ، ایم۔ اے مہتہ مطبوعہ ۱۹۴۷ء صفحہ ۱۲

کی محتاج تھی اسی طرح مسلم لیگ کو مسلمانوں کی مالی اعانت درکار تھی۔ جناح جیسے دور بین رہنماؤں کی پیہم اپیلوں کے باوجود فرقہ واریت کا جنون جوالا مکھی کے لاوے کی طرح ابلتا رہا۔

ب گاندھی جی ایک جہاں دیدہ سیاسی مدبر کی طرح افق سیاست پر چلتے ہوئے تھے۔ ان کی پیچیدہ اور مبہم حکمت عملی اور فلسفۂ حیات کے مظاہر اکثر و بیشتر ناقابل بیان آلام و مصائب کا سبب بن جاتے۔ گاندھی جی کی ان مہاتمائی خام اندیشیوں اور ہمالیہ جیسی غلط کاریوں کا خمیازہ ان کے پیروؤں ہی کو بھگتنا پڑتا تھا۔ جب کسی ناطرفدار نے انھیں ٹوکا جاتا تو وہ یہ کہہ کر اپنی صفائی پیش کر دیتے کہ آخر انسان سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ البتہ کامیابی خواہ وہ جزوی ہو یا کلی، ان کی مقبولیت اور احترام میں چار چاند لگا دیتی تھی۔

گاندھی کے اس طرز عمل کی ایک عبرت انگیز شان چمپارن کے کاشتکاروں کا معاملہ ہے۔ چمپارن کا خطہ راجا جنک (ہندو دیو مالا کا ایک راجا اور ہندوؤں کی دیوی سیتا کا باپ) کی جنم بھومی تھا۔ اس علاقے میں آموں کے باغات کی کثرت ہے لیکن ۱۹۱۷ء تک یہاں نیل بافراط کاشت کیا جاتا تھا اور چمپارن کے کاشتکار قانوناً اس کے پابند تھے کہ وہ اپنی زمین کے ہر بیس حصوں میں سے تین حصوں میں اپنے زمیندار کے لیے نیل کاشت کریں گے۔ گاندھی کے پرائیویٹ سیکرٹری اندو لال یاجنک نے چمپارن کی کاشتکار تحریک کے سلسلے میں اپنے رہنما کی جدوجہد پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "گاندھی جی اس طریق کار اور اس کی خرابیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے تھے"[1] ہندوستان میں برطانوی سامراج عوام کے تجارتی و اقتصادی استحصال

---

[1] گاندھی ایز آئی نو ہم ۔ اندو لال یاجنک، مطبوعہ ۱۹۴۳ء، صفحہ ۴۷

میں برابر مصروف تھا۔ اس وقت برطانیہ جنگ میں ملوّث تھا اور برسرِ پیکار حریف جرمنی نیل کی فراہمی کا سب سے بڑا وسیلہ۔ نیل کے قحط سے برطانیہ کے جنگی ذرائع کو جو نقصان پہنچ رہا تھا اس کی تلافی کے لیے چمپارن کے کاشتکاروں کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور جرمنی کے مصنوعی نیل کے مقابلے کی وجہ سے نیل کا زیرِ کاشت رقبہ جو ۱۹۱۴ء میں کم ہوتے ہوتے صرف سوا ایکڑ رہ گیا تھا آہستہ آہستہ بڑھنا شروع ہوا۔ یہاں تک کہ ۱۹۱۶ء میں ۱۲ ہزار ۹ سو ایکڑ اور ۱۹۱۷ء تک ۲۶ ہزار آٹھ سو اڑتالیس ایکڑ رقبے میں نیل کی کاشت ہونے لگی۔ نیل کے باغات کے انگریز مالک من مانے فیصلے کرتے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز مالکوں اور ہندوستانی کسانوں میں خونریز بلوے شروع ہو گئے۔

چمپارن کے حالات نے خطرناک صورت اختیار کر لی تھی۔ جب گاندھی جی وہاں پہنچے تو انھیں علاقے سے باہر نکل جانے کا حکم ملا۔ گاندھی جی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ جب مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہوئے تو گاندھی جی نے اپنے تحریری بیان میں کہا "قانون کا احترام کرنے والے ایک شہری کی حیثیت سے مجھے حکم کی تعمیل کرنی چاہیے لیکن تعمیل حکم سے پہلے مجھے اپنے احساسِ فرض کا گلا گھونٹنا پڑے گا اور میں یہاں جن لوگوں کی خدمت کرنے کے جذبے سے آیا ہوں، ان کو مایوس کرنا پڑے گا۔" یہ قدم گاندھی جی نے انفرادی طور پر اٹھایا تھا۔ اندولال یگنک نے لکھا ہے۔ "گاندھی جی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس سلسلے میں کانگریس کا نام نہیں لینا چاہیے"[1] بعد میں جو واقعات رونما ہوئے اُن سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ گاندھی کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ خود کو کانگریس جیسی تحریک سے بھی زیادہ ممتاز اور با اثر ثابت کر سکیں۔ چمپارن میں مزدور کو صرف دس پیسے، عورت کارکنوں کو چھ پیسے اور بچوں کو تین پیسے روز مزدوری ملتی تھی۔

---

[1] گاندھی ایز آئی نو ہم۔ اندولال یگنک۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ صفحہ ۲۷۔

گاندھی نے ان محنت کشوں کی اُجرت میں اضافہ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے ایسا کوئی کام نہیں کیا۔ بلکہ ضلع کے دو ہزار آٹھ سو اکتالیس دیہات میں سے چھ گاؤں میں اسکول کھول کر وہ مطمئن ہو گئے۔ ان اسکولوں کے لیے بیشتر عملہ ضلع گجرات سے بلایا گیا تھا۔ رضا کار استادوں میں ناخواندہ خواتین بھی شامل تھیں جو بہار میں ہندی زبان کی تعلیم تو کیا دیتیں خود گجراتی زبان تک نہیں پڑھ سکتی تھیں۔ گاندھی نے ان غیر تعلیم یافتہ عورتوں اور دوسرے اُستادوں کو سمجھایا کہ بچوں کو قواعد وغیرہ پڑھانے کے بجائے حفظانِ صحت اور اخلاقیات کی تعلیم دی جائے۔[1]

جب گاندھی ممبئی واپس پہنچے تو ان کے اعزاز میں جلسے ہوئے۔ کارخانے داروں نے انھیں سر پر بٹھانا شروع کر دیا اور وعدہ کیا کہ انگریز ہندوستان کے لوگوں کو جس طرح اقتصادی استحصال کا ذریعہ بنا رہے ہیں اس کے خلاف جدوجہد میں وہ ان کی پوری مالی اعانت کریں گے۔ جنگِ عظیم دُنیا کے بہت سے محاذوں پر لڑی جا رہی تھی۔ وائسرائے نے دلّی میں جنگ کے متعلق ایک کانفرنس طلب کی۔ کانفرنس کے مدعوئین میں گاندھی اور جناح بھی شامل تھے۔ گاندھی نے وائسرائے کی دعوت کا جو جواب دیا تھا، چمپارن اور اس کے بعد کھیڑہ میں کسانوں کے ساتھ ان کا رویہ اس سے بالکل مختلف رہا تھا۔ گاندھی نے اس مکتوب میں وائسرائے کو لکھا تھا: اس نازک مرحلے پر سلطنتِ برطانیہ کی خدمت کے لیے عنقریب میں ہندوستان کے تمام تندرست افراد کی خدمات پیش کروں گا۔ چمپارن میں میں نے نظام العنانی کے خلاف جدوجہد کر کے یہ دکھا دیا ہے کہ برطانوی انصاف ہی کو اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد گاندھی نے وائسرائے کو ایک مکتوب کے ذریعے اطلاع دی کہ

---

[1] گاندھی ایز آئی نو ہم۔ اندولال یجنک۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ صفحہ ۱۹۔

میں نے کانفرنس میں شرکت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کی وجہ اگر کچھ اور نہیں تو یہ ضرور ہے کہ میں یقیناً آپ (وائسرائے) کی عزت کرتا ہوں۔ مجھے انگریز قوم سے محبت ہے اور میں ہر ایک ہندوستانی کے دل میں انگریزوں سے وفاداری کا جذبہ پیدا کرنا چاہتا ہوں۔"

جس طرح انگلستان کے موسم کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کم و بیش یہی حال گاندھی کے جذبات و احساسات کا تھا۔ وہ ایک مجموعۂ اضداد تھے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کا آئندہ اقدام کیا ہوگا۔ وہ کانگریس کے واحد ترجمان بننے کی تیاری کر رہے تھے جس کا مطلب پورے ہندوستان کو مسخر کر لینا تھا۔ گاندھی جی کے بالمقابل جناح کی شخصیت اُبھر رہی تھی جو ہر بات اور ہر معاملے میں گاندھی سے بالکل مختلف تھے۔ جناح صاحب ڈھکے چھپے انداز میں کچھ کہنے سننے کے عادی نہ تھے بلکہ بے خوفی کے ساتھ کھلم کھلا اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور کسی ماہر فن جرّاح کی طرح ہر ایک مسئلے کے رگ و ریشہ کو ٹٹولتے۔ ان دونوں شخصیتوں میں اکثر اختلاف رائے رہتا اور یہی اختلاف فکر و عمل تھا جس نے آگے چل کر ہندوستان کی تاریخ کے دھاروں کا رُخ بدل دیا۔

گاندھی جی کا طریق کار یہ تھا کہ کانگریس کے باقی کارکن ان کے مقابل احساس کم تری میں مبتلا ہو جائیں۔ ادھر غیر کانگریسی انھیں سیاسی اعتبار سے سنکی کہا کرتے تھے ایسا اوقات وہ آمرانہ رویہ اختیار کر لیتے اور یہ کوئی انجانی حقیقت نہ تھی کہ ان کے بیشتر افعال و اعمال سے سیاسی دیوالیہ پن کا اظہار ہوتا تھا۔ چند سال بعد یعنی ۱۹۲۲ میں جب سول نافرمانی کی تحریک اپنے شباب پر تھی، پانچ فروری کو گورکھپور کے قریب چوری چورہ میں ایک افسوسناک واقعہ ہوا۔ کانگریسیوں کا ایک جلوس شہر سے گزر رہا تھا کہ طاقت اور ہمت کے ان خودساختہ نمائندوں یعنی کانگریسیوں نے ۲۱ سپاہیوں

اور ایک سب انسپکٹر کو ایک تھانے میں بند کر دیا اور عمارت کو آگ لگا دی۔ جو پولیس والے تھانے کی عمارت سے باہر نہ نکل سکے وہ اس آتش کدے میں جل بھن کر راکھ ہو گئے۔ ہر شخص، حتیٰ کہ بہت سے کانگریسیوں نے بھی اس واقعے کی مذمت کی۔ گاندھی کے خلاف کافی ہنگامہ برپا ہوا کہ اگر وہ چاہتے تو یہ افسوسناک حادثہ رونما نہ ہوتا۔ پنڈت موتی لال نہرو اور لالہ لاجپت رائے نے جیل سے گاندھی کو خط لکھے اور ایک مقام کے حادثہ کی پاداش میں پورے ملک کو مصیبت و آفت میں مبتلا کرنے پر گاندھی کو سرزنش کی۔[۱] ڈاکٹر سیتا رمیہ کے بقول: "ان تمام باتوں کے جواب میں گاندھی نے کہا کہ جو لوگ جیل میں ہیں ان کی نمائندہ عوامی حیثیت ختم ہو چکی ہے وہ جیل سے باہر دوسرے لوگوں کو کوئی مشورہ یا رائے نہیں دے سکتے۔"[۲]

کانگریس کے رکن جناح، کچھ عرصے سے گاندھی کی تمام سرگرمیوں اور سیاسی قلابازیوں کو بڑی گہری نگاہ سے دیکھ رہے تھے ــــ کچھ لوگ تو یہاں تک کہنے لگے تھے کہ گاندھی مذہب کی آڑ میں سیاسی شعبدہ گری کا کمال دکھا رہے ہیں۔ محمد علی جناح نے محسوس کیا کہ گاندھی کانگریس کا آمر بننا چاہتے ہیں۔ صرف کانگریس ہی نہیں ان کا مطمح نظر تو یہ ہے کہ پورے ملک پر اپنی آمریت اور مطلق العنانی کی گرفت مضبوط کر دیں۔ بھلا ایسے شخص کی تائید و حمایت جناح سے کیونکر ممکن تھی جو عوام کے مفادات کو پس پشت ڈال کر اپنی اغراض پوری کرنے کے لیے کوشاں ہو۔

۳۰ اپریل ۱۹۱۸ء کو دلی میں جنگ کے متعلق کانفرنس ہوئی۔ جناح نے نفاذ اصلاحات کے متعلق حکومت برطانیہ کے وعدوں اور برطانیہ کی جنگی تیاریوں میں ہندوستان کی شمولیت کے معاملوں کو مربوط کر کے اصلاحات کے بارے میں ایک قرارداد پیش کی۔ چونکہ اس

---

[۱] دی ہسٹری آف دی کانگریس، ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ، مطبوعہ ۱۹۳۵ء، صفحات ۳۹۹، ۴۰۰

[۲] ایضاً، صفحہ ۴۰۰

قرار داد کو بے ضابطہ قرار دے دیا گیا تھا لہذا قدرتی بات تھی کہ جناح جیسے دور اندیش رہنماؤں کے ذہن میں اندیشے اور شکوک و شبہات پیدا ہوں۔ اس کے بر خلاف، فوج میں ہندوستانی باشندوں کی بھرتی کے سلسلے میں جو تجویز پیش کی گئی تھی، گاندھی جی نے اس کی پرجوش تائید کی اور اس کے بعد وہ خود انگریزوں کی فوجی بھرتی کے سلسلے میں رضاکارانہ خدمات انجام دینے لگے تاہم جنگ میں ہندوستان کی شرکت و شمولیت کے متعلق گاندھی اور تلک کے اختلافات منظر عام پر آگئے۔ تلک کا مطالبہ تھا کہ حکومت محض زبانی اطمینان دہانی کے بجائے زیادہ ٹھوس انداز میں اس بات کی ضمانت دے کہ میثاق لکھنؤ کے مطابق ہندوستان کے لیے مناسب و معقول اصلاحات نافذ کی جائیں گی۔ جناح، تلک کے موقف کے حامی تھے۔ انھوں نے ۳۰ ر اپریل کو شانتا رام چال بمبئی میں ہوم رول لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسۂ عام کے انعقاد کا بندوبست کیا تاکہ اس بات پر احتجاج کیا جائے کہ حکومت نے جنگی سرگرمیوں کے متعلق ہوم رول لیگ کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے تلک کو انگلستان جانے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جناح نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا، کیا ہندوستانی عوام کے نمائندوں کو برطانیہ عظمیٰ کے مدبروں اور رائے عامہ کے سامنے اپنا موقف پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے ——— ؟ کیا ہندوستان کے معاملے کو یک طرفہ اور من مانے طریقے پر طے کیا جائے گا ——— ؟ جنگ عظیم سلطنت برطانیہ کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے، حکومتِ ہند کی دستوری اصلاحات کا سوال ہندوستان کے عوام کے لیے اس سے کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔"

لیکن حکومت برابر ہوم رول لیگ کے وفد کو انگلستان جانے اور برطانوی جمہور کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے کی اجازت دینے سے انکار کرتی رہی۔ اتنا یہ ہے کہ جناح صاحب نے اس سلسلے میں وائسرائے کو ایک نجی تار بھی بھیجا مگر اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا۔ آخر مجبور ہو کر انھوں نے ۲۴ ر اپریل ۱۹۱۸ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا جس

بڑاکٹر اینی بیسنٹ اور تلک کے بھی دستخط ثبت تھے۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ اتفاقی
طور پر ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جو تاریخی رشتے پیدا ہو گئے ہیں۔ ان سے دونوں
ملکوں کو فائدہ پہنچا ہے۔ لیکن ہم اپنے ملک کے نوجوانوں سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ایسے
اصولوں کے لیے جنگ کریں جن کا اطلاق خود ان کے اپنے ملک پر نہیں کیا جا رہا۔ کوئی
محکوم قوم اس جذبے اور قوت کے ساتھ دوسروں کے لیے جنگ نہیں کر سکتی جس قدر قوت
اور جذبے کے ساتھ ایک آزاد قوم اپنی اور دوسروں کی آزادی کے لیے لڑ سکتی ہے ۔۔۔
کانگریس اور لیگ کی اسکیم کے مطابق مقررہ مدت کے اندر اندر ہندوستان میں ذمہ دار حکومت
قائم کی جائے اور اس سلسلے میں فوری طور پر پارلیمنٹ کے سامنے ایک بل پیش کیا جائے۔
اگر ہم سے خلوص برتا گیا تو ہم بھی خلوص سے کام لیں گے۔ ہم سے مطالبات کیے جا رہے
ہیں لیکن اس کے عوض کچھ دیا نہیں جا رہا۔ ہم سے توقع کی جاتی ہے کہ بدگمان نہ ہوں لیکن
ہم پر اعتماد نہیں کیا جاتا۔ حکومت ہمیں صرف اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے۔
ہم آزادی کے پرچم تلے جنگ کرنا چاہتے ہیں۔ آزادی سے کم کسی قیمت پر ہمارے عوام
اس میں حصہ نہ لیں گے اور ہمارے دیس کی عورتیں قربانی نہ دیں گی۔"

۱۰ جون ۱۹۱۸ء کو بمبئی ٹاؤن ہال میں جنگی صوبائی کانفرنس منعقد ہوئی۔ لارڈ
ولنگڈن اس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے کہا: "بہت سے افراد موجود
ہیں ان میں اکثر لوگوں کا عوام پر خاصا اثر ہے۔ بیشتر افراد ہوم رول لیگ کے رکن ہیں
جن کی سرگرمیاں پچھلے چند سال سے کچھ ایسی رہی ہیں کہ مجھے ان کے خلوص پر شبہ ہونے
لگا ہے ۔۔۔ ان کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت کی دشواریوں
اور پریشانیوں میں اضافہ کیا جائے۔ ہر ملک کی سیاسی زندگی میں ایسے انتہا پسند عناصر
پائے جاتے ہیں جو عام طور پر حکومت کی مخالفت میں پیش پیش رہتے ہیں۔" لارڈ ولنگڈن کا
یہ اشارہ بمبئی کی ہوم رول لیگ کے صدر جناح کی طرف تھا جنھیں لارڈ صاحب نے باغی

بازو کے انتہا پسند عناصر اور حکومت کے مخالف افراد میں گردانا تھا۔ گاندھی نے جنگ کے متعلق دلّی کانفرنس میں جو رویّہ اختیار کیا تھا اور اس کے بعد وقتاً فوقتاً وہ جو بیانات دیتے رہے ہیں ان کے سبب برطانوی سامراج کی نظر میں گاندھی کی قدر و منزلت میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ لارڈ ویلنگٹن نے انتہا پسند طبقے کے ان افراد کو واضح طور پر بتا دیا کہ وہ یا وائسرائے جناح کے مطالبے کے مطابق کسی مقررہ عرصے میں حکومت برطانیہ سے ہوم رول دلا دینے کے متعلق کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔ جناح کا مطالبہ تھا کہ حکومت جنگی تیاریوں میں ہندوستان سے مکمل تعاون چاہتی ہے تو اسے یہ یقین دلانا ہو گا کہ ہندوستان کو ایک خاص مدت کے اندر اندر ہوم رول دے دیا جائے گا۔ گاندھی اس مطالبے کو جنگ ختم ہونے تک معرض التوا میں ڈال دینے کے مؤید اور حامی تھے۔ لارڈ ویلنگٹن نے اپنی تقریر کے آخر میں امید ظاہر کی کہ انھوں نے اتحادیوں کے موقف کے بارے میں جو سرکاری قرارداد پیش کی ہے، صوبائی کانفرنس اتفاق رائے سے اسے منظور کر لے گی۔

لارڈ ویلنگٹن نے جوں ہی تقریر ختم کی جیالے اور بے خوف تلک نے لارڈ ویلنگٹن کی پیش کردہ قرارداد میں ترمیم پیش کر دی مگر اسے بے ضابطہ قرار دے دیا گیا۔ چونکہ سرکاری قرارداد کے متعلق کوئی ترمیم پیش نہ کی جا سکتی تھی اس لیے خیال تھا کہ قرارداد جوں کی توں منظور کر لی جائے گی۔ تلک بھلا کس کی سنتے۔ انھوں نے کانفرنس کے صدر کے فیصلے کو نظر انداز کرتے ہوئے تقریر جاری رکھی اور کہا۔ ہوم رول کے بغیر ہندوستان کے دفاع کا کوئی مجاز نہیں ہے۔" لارڈ ویلنگٹن کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں اور انھوں نے یہ کہہ کر تلک کو بیٹھ جانے کا حکم دیا کہ اجلاس میں کوئی سیاسی بحث نہیں کی جا سکتی۔ تلک نے کہا کہ اس وقت ایک سیاسی مسئلے پر غور ہو رہا ہے اس لیے سیاسی بحث ناگزیر ہے۔ لارڈ ویلنگٹن اپنی بات پر اڑے رہے اور ہر چند کہ بحیثیت صدر کانفرنس

انھوں نے ہوم رول لیگ کے پروگرام اور رویے پر اعتراض کیا تھا اور الزامات لگائے تھے، تلک کو صفائی پیش کرنے کی اجازت نہ دی۔ تلک کا غصہ حق بجانب تھا۔ وہ لارڈ ویلنگٹن کے نامناسب اور جانبدارانہ رویے کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ کانفرنس سے اُٹھ کر چلے گئے۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: "تلک اپنی تقریر مشکل سے ہی جاری رکھ سکے تھے کہ انھیں روک دیا گیا، کیونکہ انھوں نے ہوم رول لیگ کے ممبروں کے متعلق لارڈ ویلنگٹن کے الزامات کے جوابات دینے شروع کر دیے تھے۔"[1]

اگرچہ جناح کو اپنے ساتھی کے رویے سے مکمل اتفاق تھا تاہم وہ کانفرنس میں موجود رہے اور تلک کے واک آؤٹ کے بعد جب کانفرنس کی کارروائی شروع ہوئی تو وہ تقریر کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے لارڈ ویلنگٹن کے طرزِ عمل اور ان کے غیر مناسب رویے پر سخت تنقید کی اور کہا کہ اس بات سے مجھے بڑا دکھ پہنچا ہے کہ ہز ایکسیلنسی نے ہوم رول لیگ پارٹی کے خلوص و وفاداری پر شبہ کیا ہے ـــــ میں اس پر شدید احتجاج کرتا ہوں ـــــ حکومت نے اپنی اسکیم تیار کر لی ہے یعنی حکومت سپاہی بھرتی کرنا چاہتی ہے ـــــ ہم (ہوم رول لیگ) ایک قومی فوج یا شہریوں کی فوج بنانا چاہتے ہیں۔ کرائے کے فوجیوں کی جتھہ بندی نہیں چاہتے ـــــ حکومت کہتی ہے کہ ہمیں سلطنت برطانیہ کا شریک کار سمجھا جائے گا اور شریک کار بنایا بھی جائے گا مگر یہ تجاویز الفاظ ہی نہیں عمل اور فوری عمل کی ضرورت ہے ـــــ جب تک ہندوستان کو امورِ سلطنت میں شریک نہیں کیا جائے گا، جب تک ہم سے اچھا سلوک نہیں ہوگا، ہم حکومت کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔"

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتارامیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵۔ صفحہ ۱۲۵

لارڈ ویلنگٹن کی خواہش و کوشش تھی کہ بے چون و چرا اس کی قرارداد منظور کر لی جائے۔ بھلا وہ مخالفت کس طرح برداشت کر سکتا تھا۔ نوکر شاہی کا تو خاصہ ہی یہ رہا ہے کہ تمام احکام پر کسی اعتراض کے بغیر عمل درآمد کیا جائے۔ اس نے قائداعظم کو مخاطب کر کے کہا کہ یہ تمام باتیں مرکزی حکومت سے کہی جائیں۔ قائداعظم بھلا کب خاموش رہتے۔ انھوں نے نہایت ہی تلے انداز میں لارڈ ویلنگٹن کی دلیل کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہاں جو لوگ موجود ہیں وہ اس قرارداد کی یا تو مکمل تائید کر سکتے ہیں یا قرارداد کے صرف ان حصّوں کی حمایت کر سکتے ہیں جن سے انھیں اتفاق ہے۔ میں اس کانفرنس کے ممبر کا یہی حق کو استعمال کر رہا ہوں۔ اس حق کو سلب نہیں کیا جا سکتا۔

لارڈ ویلنگٹن نے ایک بار پھر یہ سوال اٹھایا کہ اجلاس کے صدر کی حیثیت سے وہ جو فیصلہ دے چکا ہے، جناح اسے چیلنج نہیں کر سکتے۔ لیکن ان باتوں سے جناح کو خاموش نہیں کیا جا سکا۔ انھوں نے تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا کہ لارڈ ویلنگٹن نے قرارداد میں ترمیم پیش کرنے کی اجازت نہ دے کر جو رویہ اختیار کیا ہے اس کی نظیر موجود نہیں۔ تاہم میں کانفرنس کے صدر کے فیصلے کا احترام کروں گا خواہ اس کی قانونی اور آئینی حیثیت سے مجھے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو۔ لارڈ ویلنگٹن اپنے اختیار سے کام لیتے ہوئے جناح کو بآسانی تقریر سے روک سکتا تھا لیکن جناح بھی فوراً ہی اس کا اس بات کا ثبوت دے دیتے کہ اگر کسی شخص کو عوامی حمایت حاصل ہے تو وہ اپنے سیاسی حریف کو بڑی آسانی سے پچھاڑ سکتا ہے۔

اس کانفرنس کے کچھ عرصے بعد جنوبی افریقہ کے معاملے پر غور کرنے کے لیے ایک اور اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس کی صدارت بھی لارڈ ویلنگٹن ہی کر رہے تھے۔ ہوم رول لیگ کے چار لیڈروں یعنی جناح بجے کر، بھولا بھائی ڈیسائی اور ہارنی مین کو اجلاس سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ اس معاملے پر غور کرنے

کے لیے کہ لارڈ ولنگٹن کا دعوت نامہ قبول کر لیا جائے یا مسترد کر دیا جائے، ہوم رول لیگ کی انتظامیہ کمیٹی کا خاص اجلاس طلب کیا گیا۔ اس اجلاس میں پچھلی کانفرنس میں تلک کو تقریر کرنے کی اجازت نہ دینے پر کڑی نکتہ چینی کی گئی اور طے کیا گیا کہ دعوت نامہ مسترد کر دیا جائے۔ بھولا بھائی ڈیسائی نے، جو چند سال بعد مرکزی مجلسِ قانون ساز میں کانگریس پارٹی کے لیڈر چنے گئے، اس فیصلے سے اتفاق نہ کیا "اس فیصلے کی وجہ سے بھولا بھائی ڈیسائی نے (ہوم رول) لیگ سے استعفا دے دیا اور اجلاس میں شرکت کی (اجلاس کے صدر لارڈ ولنگٹن تھے)"[1]

ہوم رول لیگ نے لارڈ ولنگٹن سے اپنی تنظیم اور اس کے رہنماؤں کی توہین کی بنا پر قائدِ اعظم کے ایما پر دو دو ہاتھ کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس سلسلے میں عام مظاہرے کا بندوبست کیا گیا۔ اس موقع پر بیشتر منڈیاں اور دکانیں بند رہیں۔ اور بمبئی میں پہلی دفعہ بڑے پیمانے پر ہڑتال ہوئی۔ بعد میں ہڑتال کی تحریک ایک ایسا ہتھیار ثابت ہوئی جس سے انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں اکثر مواقع پر مؤثر طریقے سے کام لیا گیا۔ ہڑتال کے دن چوپاٹی سے جلوس نکلنے شروع ہوئے۔ ان جلوسوں کی قیادت کرنے والے رہنماؤں کے ہاتھ میں ہوم رول لیگ کے پرچم تھے۔ قائدین جلوس میں جناح ممتاز اہمیت رکھتے تھے۔ یہ جلوس شہر کی خاص خاص سڑکوں سے گزر کر شانتارام چال پر اکٹھے ہوئے جہاں گاندھی کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسۂ عام ہوا۔ مسٹر جناح نے ایک پرجوش قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ "جنگ کے دوران متعلقہ محکموں کے نگران افسر۔ مساوی حیثیت سے عوام کا تعاون حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں" قائدِ اعظم نے خاص طور سے لارڈ ولنگٹن کو نشانہ بنایا تھا۔ ان کے متعلق

---

[1] دی کلکٹنز اینڈری کلکٹنز۔ چمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء صفحہ ۵۸

قرارداد میں کہا گیا تھا کہ برطانیہ کی جنگی تیاریوں کے لیے اس نے ہندوستان کے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے معاملے کو قطعی غیر دانشمندانہ انداز میں طے کرنے کی کوشش کی ہے۔" لارڈ ولنگڈن نے —— ہوم رول لیگ کی توہین کی ہے —— جب تک لارڈ ولنگڈن معافی نہیں مانگیں گے ہم کسی ایسے جلسے میں شریک نہیں ہوں گے جس کی صدارت وہ کر رہے ہوں —— لارڈ ولنگڈن کا اعتراض ہے کہ ہوم رول لیگ کی حمایت تسلی بخش نہیں ہے۔ میرا جواب یہ ہے کہ ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ بھرتی کرنے کے متعلق ان کی پالیسی اس سے بھی زیادہ ناقابل اطمینان ہے۔ وہ عوام سے کھلونے کی طرح کھیل رہے ہیں۔ ان کی نیت میں خلوص نہیں ہے۔ ان کے طریقے اور پالیسی سرے سے غلط ہیں۔ میں اس بات پر یقین نہیں کر سکتا کہ نوکر شاہی اس قدر اندھی ہے کہ اس بات کو محسوس نہیں کر سکتی۔"

جناح صاحب نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔ "جب تک حکومت اپنی پالیسی تبدیل نہ کرے گی ہم لشکر متفقہ طور حکومت کی حمایت نہ کریں گے۔"

لارڈ ولنگڈن کے عہدے کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ ٹائمز آف انڈیا کے ایڈیٹر سر اسٹینلے ریڈ کی سرکردگی میں ٹوڈیوں کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے بمبئی کے شیرف سے درخواست کی کہ بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے لارڈ ولنگڈن نے جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، ان پر اظہارِ تشکر کے لیے شہریوں کی طرف سے ایک الوداعی دعوت دینے کی اجازت دی جائے۔ محمد علی جناح کو بمبئی میں عوام کے ترجمان کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ غلط تاثر کہ بمبئی پریذیڈنسی کے باشندے اس گورنر کے راج میں خوش رہے ہیں، جناح صاحب کے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ انھوں نے ۸ نومبر کو سر اسٹینلے کے نام ایک خط لکھا جس پر ۲۹ دیگر ممتاز شہریوں نے بھی دستخط کیے۔ اس خط میں احتجاج کیا گیا کہ مجوزہ دعوت سے تاثر پیدا ہوگا کہ شہر کے تمام لوگ اس اظہارِ تشکر

کے حامی ہیں۔ مذکورہ خط میں دستخط کنندگان نے مطالبہ کیا تھا کہ بمبئی کے شہری کی حیثیت سے انھیں اس بات کا آئینی اور قانونی حق حاصل ہے کہ مجوزہ دعوت کے بارے میں انھیں بتایا جائے کہ وہ کب اور کہاں ہوگی اور اس موقع پر کیا قرارداد منظور کی جائے گی تاکہ اگر وہ ضروری سمجھیں تو کوئی ترمیم پیش کرتے، قرارداد کی مخالفت کرنے یا اگر ناگزیر ہو تو رائے شماری کرانے کے لیے تیار ہو کر آئیں۔ خط ان الفاظ پر ختم ہوتا تھا "ہم نے یہ درخواست اس لیے مناسب سمجھی کہ یہ کارروائی، عام جلسوں کے مقررہ طریق کار کے مطابق نظم و ضبط کے ساتھ انجام پا سکے۔"

اسی پر اکتفا نہ کر کے جناح صاحب کے ۲۰ ساتھیوں نے بمبئی کے شیرف سے مطالبہ کیا کہ بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے لارڈ ویلنگٹن کی گورنری کے ذلیل مدت عہد کے خلاف احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کی اجازت دی جائے۔

سرکاری پٹھوؤں اور ٹوڈیوں کی حالت نہایت مضحکہ خیز ہو کر رہ گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ جناح آگے بڑھے اور انھوں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ صورتِ حال کو بگڑنے سے بچانے کے کام میں مہارت رکھتے ہیں۔ ایک مطلق العنان حاکم اور عوامی خواہشات کے درمیان جو جنگ ہو رہی تھی اس کے سلسلے میں رائے عامہ کو منظم کرنے کی غرض سے انھوں نے کئی جلسوں کا انتظام کیا۔ ایک احتجاجی جلسے میں بی جی ہارنی مین خاص مقرر تھے۔ انھوں نے بمبئی میں مسلم لیگ کا اجلاس درہم برہم کرنے کے سلسلے میں بمبئی کے پولس کمشنر ایڈورڈس کی سرگرمیوں پر روشنی ڈالی اور کہا کہ گورنر نے لوگوں کی موجودگی میں پولس کمشنر کی حرکت پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن تخلیے میں لیگ کا اجلاس درہم برہم کرنے پر اسے مبارکباد دی۔ بی جی ہارنی مین نے ممتاز شہری محمد علی جناح کی جو نوکر شاہی کے دبدبے اور رعونت سے ذرا بھی خوفزدہ نہ ہو سکے تھے، بے باکانہ اور جرأت مندانہ جدوجہد کا خاص طور پر

ذکر کیا۔ انھوں نے حاضرین کو یاد دلایا کہ "ایڈورڈس پولس اور حکومت بمبئی کے شرمناک رویے کے متعلق میں نے کچھ عرصہ پہلے گورنر کو جو احتجاجی مراسلہ لکھا تھا اس کا جواب آج تک موصول نہیں ہوا۔ بمبئی پولس کے خلاف اس خط میں مسلم لیگ کے اجلاس کو درہم برہم کرنے کی حوصلہ افزائی کرنے کا واضح الزام لگایا گیا تھا کیا کوئی غیرت مند حکومت ایسے الزام پر خاموش بیٹھی رہے گی؟ کیا لارڈ ولینگٹن نے اس شرمناک حرکت پر پولس افسروں سے باز پرس کی تھی اور اس معاملے کی کوئی تحقیقات کرائی گئی؟ میرا جواب ہے نہیں۔ طویل عرصے تک پریذیڈنسی ایسوسی ایشن کو حکام کی طرف سے کوئی جواب موصول نہیں ہوا اور آخر کار ایک دن یہ جواب ملا کہ اس معاملے کی تحقیقات کرانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس لیے اب بھی حکومت پر یہ الزام عائد ہے کہ لیگ کے اجلاس میں ہنگامہ آرائی پولس کی سازش سے ہوئی تھی۔ یہ وہ گورنر ہے جسے لوگوں کو سرٹیفکیٹ دینے کے لیے کہا جا رہا ہے —— کیا یہ ممکن ہے؟" اس پر لوگوں نے نہیں نہیں کے نعرے لگائے۔

جو اخبار سیاسی حاشیہ برداروں کا کردار ادا کر رہے تھے ان کے کالم اس بحث سے سیاہ ہو رہے تھے کہ لارڈ ولنگڈن نہایت مقبول گورنر ہیں مگر جناح اور ان کے مٹھی بھر ساتھی ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔ ان اخباروں نے مشورہ دیا تھا کہ بمبئی کے گورنر کی حیثیت سے لارڈ ولنگڈن نے جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں ان پر اظہار تشکر کے لیے ولنگڈن میموریل بنایا جائے۔ آخر ۱۱ دسمبر ۱۹۱۸ء کو ٹاؤن ہال میں اس مقبول گورنر کو الوداع کہنے کے لیے "شہریوں" کا ایک اجلاس طلب کیا گیا۔

اگرچہ یہ الوداعی جلسہ شام کے پانچ بجے ہونے والا تھا تاہم صبح سات بجے سے ٹاؤن ہال کے بند دروازوں کے سامنے لوگوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوتی تھیں۔ جناح کے ایم منشی، پوٹھ بین جوزف، جمنا داس دوارکا داس جیسے رہنماؤں کے سیلے

صف اول میں نشستیں حاصل کرنے کی غرض سے ان کے ساتھی ان مظاہروں میں آگے آگے تھے۔ قریب ہی الفنسٹن گارڈن میں دونوں مخالف گروہوں کے حامی صف آرا تھے جیسے کسی شعلۂ جوالہ کے پاس بارود بچھا دی گئی ہو جو نہ جانے کس وقت بھڑک اٹھے جب حکومت کو یقین ہو گیا کہ ان کے پٹھو اب ٹاؤن ہال کے بند دروازوں کے پاس جمع ہو چکے ہیں تو خلاف توقع دس بجے صبح ٹاؤن ہال کے دروازے کھول دیے گئے اور لوگ نشستوں پر بیٹھنے کے لیے آگے بڑھنے شروع ہوئے۔ جناح اور ان کے ساتھیوں نے آگے بڑھ کر وہ نشستیں سنبھال لیں جو ان کے آدمیوں نے روک رکھی تھیں۔ ابھی جلسہ شروع ہونے میں پورے سات گھنٹے باقی تھے۔

ہر عام جلسہ میں اگلی نشستیں پہلے آنے والوں کے حصے میں آتی ہیں۔ جناح اور ان کے کچھ ساتھی ان نشستوں پر قابض تھے لیکن پولس حکام کو یہ بات پسند نہ آئی۔ بمبئی کے ناپسندیدہ عنصر اور غنڈوں کے چند مشہور سرپرستوں نے جناح اور ان کے ساتھیوں سے بلا وجہ جھگڑنا شروع کر دیا اور انھیں پہلی صف کی نشستوں سے اٹھانے کی کوشش کی۔ گرما گرمی اور بحث و تکرار نے اتنا طول پکڑا کہ ہاتھا پائی شروع ہو گئی۔ لاٹھیاں اور دوسرے ہتھیار نکل آئے جو بلوے کے لیے پہلے سے ہی جلسہ گاہ میں چھپا کر رکھ دیے گئے تھے۔ صورت حال خطرناک ہونے لگی تھی کہ دونوں حریف گروپوں میں سمجھوتہ ہو گیا اور جناح اور ان کے ساتھیوں کو اگلی نشستیں چھوڑ کر اٹھنا پڑا۔ کچھ لوگوں کو تو جلسہ گاہ میں درمیانی نشستیں مل گئیں مگر باقی لوگوں کو پچھلی نشستوں پر ہی قناعت کرنی پڑی۔ سرکاری پٹھوؤں کو جلسہ گاہ میں کھانا کھلایا گیا البتہ جناح اور ان کے ساتھیوں کو خشک میووں وغیرہ پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ بمبئی کے ان شورہ پشتوں سے بحث و تکرار کے دوران جناح کی بیوی مسز رتی بائی جناح ان کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اس جھگڑے میں وہ بھی کسی سے پیچھے نہ تھیں۔

ٹاؤن ہال کے گھنٹوں کی سوئی آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی۔ جب پانچ بجے تو جلسہ گاہ میں انتہائی کشیدگی کے آثار پائے جاتے تھے۔ خطرہ تھا، نہ جانے کیا ہو جائے۔ جدوجہد کا وقت آ پہنچا تھا۔ جب بمبئی کا شیرف اندر داخل ہوا تو جہاں یورپینوں، اینگلو انڈین باشندوں اور ٹوڈیوں نے جو ڈائس اور اگلی نشستوں پر قبضہ جمائے بیٹھے تھے نعرہ ہائے تحسین سے اس کا استقبال کیا، ولنگڈن کے مخالفین نے آوازے کسنے شروع کر دیے۔ ہڑبونگ کے باوجود شیرف جلسۂ عام طلب کرنے کے متعلق سرکاری اعلان پڑھنے کھڑا ہوا ہی تھا کہ فوراً بی جی ہارنی مین پوائنٹ آف آرڈر پیش کرنے اور جلسۂ عام کے جواز کو چیلنج کرنے کے لیے ڈائس پر پہنچ گئے۔ ان کی آواز شور و غل میں دب کر رہ گئی۔ جس وقت ہارنی مین اپنے آئینی حقوق کی وضاحت کا مطالبہ کر رہے تھے سر ڈنشا واچہ نے اٹھ کر جلسے کی صدارت کے لیے سر جمشید جی جیج بھائی کا نام تجویز کر دیا۔ سر جمشید جی تو جیسے تیار بیٹھے تھے ان سے اتنا صبر بھی نہ ہوا کہ اس تجویز پر رائے شماری کا انتظار کر لیں۔ وہ آگے بڑھے اور بے تامل کرسی صدارت پر براجمان ہو گئے۔ انھیں یہ ڈر ہو گا کہ اگر دیر ہو گئی تو کہیں کوئی دوسرا شخص اس کرسی پر قبضہ نہ جما لے۔ ہارنی مین نے مشہور ہندوستانی لیڈر اور ہوم رول لیگ کے ممتاز رکن کے ڈی تیلانگ کا نام صدارت کے لیے تجویز کیا جس پر اتنا ہلڑ ہوا کہ خدا کی پناہ! سر جیج بھائی کیا کچھ کہنا چاہتے تھے اس ہلڑ میں کچھ سنائی نہ دیا۔

عین اس موقع پر مسلح پولس کا ایک دستہ جلسہ گاہ میں داخل ہوا اور سیدھا ڈائس پر پہنچ گیا۔ ایک یورپی افسر اس دستے کی کمان کر رہا تھا۔ جلسہ گاہ میں پولس کی موجودگی کا مطلب مخالفین کو ڈرانے دھمکانے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔ سر جمشید جی نے لارڈ ولنگڈن کی خدمات جلیلہ کے اعتراف کے لیے ایک قرارداد پیش کی اور تائید کے بغیر ہی انھوں نے اور ان کے حامیوں نے اعلان کر دیا کہ قرارداد منظور ہو گئی۔[1] جلسہ گاہ

---

[1] ری کلکشنز اینڈ ری فلکشنز۔ چمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء صفحہ ۲۵۸

ں اس جھوٹی منظوری کے خلاف ہر طرف شرم شرم اور لعنت لعنت کے نعرے بلند
نے لگے۔ پولس نے جو پہلے ہی سے وہاں موجود تھی اپنی کارروائی شروع کر دی اور
وں کو مارنے پیٹنے لگی۔ پولس نے جن لوگوں پر دست درازی کی تھی ان میں قائداعظم
ں شامل تھے۔ وہ اس توہین کو بھولنے والے نہ تھے اور نہ پولس یا لارڈ ولنگڈن سے
گزر کرنے والے تھے۔

جوں ہی جناح اور ان کے ساتھی ٹاؤن ہال سے باہر آئے ایک جم غفیر نعرہ ہائے
سین بلند کرتا آگے بڑھا اور اس نے ان جیالے لیڈروں کو اپنے کاندھوں پر بٹھا لیا۔
اح نے بتایا کہ شانتارام چال میں رات کو ایک احتجاجی جلسہ ہوگا جس میں ٹاؤن ہال
آنکھوں دیکھی روداد سنائی جائے گی۔ رات کو جب احتجاجی جلسہ منعقد ہوا تو انھوں نے
یہ کرتے ہوئے کہا "حضرات، بمبئی کے شہری آپ ہیں۔ آج آپ نے زبردست فتح حاصل
ہے یہ فتح جمہوریت کی فتح ہے۔ اس سے یہ واضح ہو گیا کہ نوکرشاہی اور مطلق العنانی
تحد ہو کر بھی آپ کو نہیں دبا سکتیں۔ ۱۱ر دسمبر بمبئی کے لیے ایک تاریخی دن ہے جائیے
ر جمہوریت کی اس فتح پر جشن منائیے۔"

احتجاجی اجلاس میں اتفاق رائے سے بمبئی کے شیرف کے خلاف ایک قرارداد
ظور کی گئی جس میں اس بات پر احتجاج کیا گیا تھا کہ ٹاؤن ہال کے جلسے میں شہریوں
ے نمائندوں کو اظہار خیال کی اجازت نہیں دی گئی۔ قرارداد میں پولس کے طرز عمل
ی کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ یہ قرارداد ان الفاظ پر ختم ہوتی تھی کہ "بمبئی کے شہریوں کا
جلسہ، لارڈ ولنگڈن کی انتظامیہ کی مذمت کرتا ہے اور لارڈ ولنگڈن کی خدمات کے
عتراف کے طور پر کوئی یادگار قائم کیے جانے کی ہر تجویز کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔"
ینڈ جسین نے قرارداد کی حمایت کی اور محمد علی جناح کو اہالیان بمبئی کے جذبات وخواہشات
ا ایک ایسا علمبردار قرار دیا جس پر نہ صرف بمبئی بلکہ پورے ہندوستان کو فخر ہے۔

ایک با اختیار گورنر کے خلاف جسے نوکرشاہی کی پُرجوش حمایت حاصل تھی۔

محمد علی جناح نے جس طرح جنگ کی تھی اس نے بمبئی کے باشندوں کی نظر میں ان کے وقار اور درجے کو بے حد بلند کر دیا۔ اہل شہر نے شکرگزاری کے اظہار کے طور پر ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کیے اور گارڈن پارٹیاں اور عصرانوں وغیرہ کی تقاریب منعقد کیں۔

بی ڈی لیم نے بمبئی کرانیکل میں ایک خط لکھا۔ "ٹاؤن ہال کے جلسے میں جو کچھ ہوا اس کے پیش نظر اگر کسی شخص کی یادگار قائم کی جا سکتی ہے تو وہ مسٹر جناح ہیں، جنھوں نے اپنی بے مثل قیادت اور جرأت مندانہ رہنمائی سے بمبئی کی عوامی زندگی میں اہم حیثیت حاصل کر لی ہے۔ انھوں نے اسی بے خوفی اور جیالے پن کا ثبوت دیا ہے جو ہمارے عظیم آنجہانی رہنماؤں دادا بھائی نوروجی اور گوپال کرشن گوکھلے کا خاصہ تھا۔"

"مسٹر جناح کی شاندار خدمات کا اعتراف کرنے کی غرض سے ہمیں رقم اکٹھی کرنی چاہیے اور ان کا ہر ایک مؤید اور پیرو اس فنڈ میں ایک روپیہ دے۔ ہر شخص اس رقم کی ادائیگی کو ایک اعزاز سمجھے گا۔ اگر ہمارے راستے میں رکاوٹیں کھڑی نہ کی گئیں تو ہم بمبئی کے ٹاؤن ہال میں مسٹر جناح کا مجسمہ نصب کر دیں گے کیونکہ مسٹر جناح نے اسی ٹاؤن ہال میں ایک ایسے جلسہ عام کا پول کھول کر جو عوام کے نام پر طلب کیا گیا تھا، مطلق العنانی کا سر ہمیشہ کے لیے جھکا دیا ہے۔ ہر شہر کے ٹاؤن ہال وہاں کے باشندوں کی خواہشات اور ان کے جذبات کے مرکز ہوتے ہیں۔ بمبئی میں یہ جذبہ موجود نہ تھا، لیکن کل کے جلسہ عام کی کارروائی سے جناح نے اس جذبے کو ٹھوس بنیاد پر قائم کر دیا ہے۔"

لیم کی اپیل پر لوگوں نے بڑے جوش و ولولے کے ساتھ لبیک کہی اور نہ صرف بمبئی کے کونے کونے سے بلکہ کراچی اور کلکتہ جیسے دُور دراز شہروں تک سے رقوم موصول ہونے لگیں۔ ان یانوں سے عوام کے اس جذبے کا اظہار ہوتا تھا کہ جو شخص بھی نوکرشاہی کے خلاف سرگرم عمل ہوگا اس کا درجہ عوام کے نزدیک ہیرو کا سا ہوگا۔ اس طرح ایک

ایک روپیہ کر کے بہت جلد ایک بھاری رقم جمع ہوگئی اور بمبئی میں اس فتح عظیم کی یاد میں کہ جناح نے عوام کی توہین کرنے والی نوکر شاہی کو سرنگوں کر دیا تھا، جناح پیوپلز میموریل ہال تعمیر کیا گیا۔

جس دن مسز سروجنی نائیڈو نے اس ہال کا افتتاح کیا تو جناح انگلستان میں تھے، مسز نائیڈو نے بڑی خیال آفریں اور شاعرانہ تقریر کی اور انھوں نے اپنے مخصوص لہجے اور دلکش انداز میں ان خدمات پر روشنی ڈالی جو مسٹر جناح نے بمبئی اور ہندوستان کے لیے کی تھیں۔ جناح پیوپلز میموریل ہال کے افتتاح کے بعد مسز نائیڈو نے جناح کو ایک تار بھیجا اور لکھا۔ "ایک پیغمبر کو اس کے اپنے ملک میں اور اپنی زندگی ہی میں اعزاز مل گیا۔"

اس واقعے کے کئی سال بعد جان گنتھر نے لکھا "لیکن اب کانگریسی اس ہال (پیوپلز جناح میموریل ہال) کو صرف پی جے ہال کہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں سے ان کے اختلافات اتنے شدید ہیں کہ وہ جناح کا نام تک استعمال کرنا نہیں چاہتے۔"[1]

ہندوستان کی نبض سیاست میں زندگی اور طاقت کی لہریں دوڑ رہی تھیں حکومت برطانیہ نے ہندوستان کا مطالبۂ اصلاحات قبول نہیں کیا تھا۔ اس کے خلاف کہیں کہیں ہنگامہ برپا ہو جاتا اور کبھی کبھی مظاہرین تشدد پر بھی اُتر آتے۔ ۱۹۱۸ء میں حکومت ہند نے سر سڈنی رولیٹ کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی اور ایک بل کی صورت میں اس کی رپورٹ غور و خوض کے لیے امپیریل کونسل میں پیش کی گئی۔ جناح فقط ایوان کے باہر ہی عوامی خواہشات کے علمبردار نہ تھے بلکہ انھوں نے ایوان کے اندر بھی قومی مفادات کے لیے جنگ کی۔ مسودۂ قانون کی دفعات پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے انھوں نے

---

[1] ان سائڈ ایشیا۔ جان گنتھر

کہا: "رووبلیٹ کمیٹی کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا تھا کہ ملک میں مجرمانہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ یہ
سازشیں تو موجود ہیں اور موجود رہی ہیں ——— ہمیں تو اس مسودہ قانون کے
اس حصّے سے زیادہ دلچسپی ہے جس میں امتناعی تدابیر کو قانونی شکل دینے کی سفارش
کی گئی ہے ——— آپ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ ۱۹۰۵ء سے پہلے ہندوستان میں انقلابی
نوعیت کی مجرمانہ سازشوں کا وجود نہ تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں بم کا پہلا واقعہ
۱۹۰۶ء کے بعد پیش آیا ——— پھر یہ کیا بات ہے کہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۸ء تک ان لاقانونیت
پھیلانے والی سرگرمیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا گیا؟ ——— ملک میں بے اطمینانی
افسردہ دلی اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے ——— جناب والا، اس میں تھوڑا بہت
ہاتھ آپ کی پالیسی کا بھی ہے۔ ہم سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا خواہش مند نہیں
کہ ان جرائم کا انسداد کیا جائے۔ جناب والا، معاملے کے اس پہلو پہ کونسل کے کسی رکن
نے روشنی نہیں ڈالی۔ معاملہ زیر بحث کا اس طرح جائزہ لیا جا رہا ہے گویا کچھ مجرم
قبیلے نمودار ہو گئے ہیں اور ان سے خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اس خطرے کی روک تھام کے
لیے ضروری ہے کہ مزید غور و خوض کے بغیر قوانین بنائے جائیں۔ مگر کیا آپ یہ سمجھتے
ہیں کہ صرف قانون بنا دینے سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا؟ مجھے یہ کہنے دیجیے، جناب
والا، کہ محض قانون بنا کر آپ یہ مسئلہ حل نہیں کر سکتے۔ آپ کو اپنی پالیسی بھی تبدیل کرنی
پڑے گی۔ اگر آپ چاہیں تو اس سے پہلے ہی آپ خطرے کی تمام وجوہ و اسباب کو ختم
کر سکتے ہیں۔ جناب والا، میں رووبلیٹ کمیٹی کی کچھ سفارشوں سے تو غالباً اتفاق رائے
کر لوں گا لیکن میں یقین دلاتا ہوں کہ بعض سفارشات ایسی ہیں کہ کوئی مہذب حکومت
بھی انھیں قبول نہیں کرے گی۔ کوئی مہذب حکومت ان سفارشوں کو قانونی شکل میں
نافذ کرنے کا خیال تک نہ لائے گی۔ میں اس موقع پر خاص طور سے رووبلیٹ کمیٹی
کی تجویز کردہ امتناعی تدابیر کا ذکر کروں گا:

جناح صاحب نے جس موثر انداز میں رولیٹ بل کی مخالفت کی اس نے بے شک وشبہ یہ حقیقت ثابت کردی کہ وہ ایک ایسے عظیم رہنما ہیں جو اصولوں کی قیمت پر کوئی مصالحت نہیں کر سکتے، خواہ انھیں کتنی ہی دشواریوں کا سامنا کیوں نہ کرنا پڑے۔ جہاں تک عوام سے محبت و دلچسپی کا تعلق ہے، ان کے احساسات اٹل ہیں۔

۸ر جولائی کو حکومت نے مانٹیگو چیمسفورڈ سکیم شائع کی۔ اس سکیم کے متعلق لوگوں کے ملے جلے تاثرات تھے۔ میثاق لکھنؤ اور کونسل کے ۱۹ ممبروں نے اپنی یادداشت میں جو اصلاحات پیش کی تھیں، ان سے یہ سکیم خاصی مختلف تھی۔ جناح بھی ان لوگوں میں شامل تھے جنھوں نے سکیم کے متعلق شروع میں بیانات دیے تھے۔ انھوں نے ۲۳ر جولائی ۱۹۱۸ء کو ایک اخباری بیان جاری کیا جسے پڑھ کر ہندوستانیوں نے سوچنا شروع کیا کہ نئی سکیم کانگریس اور لیگ کے مطالبوں سے کس قدر مختلف ہے اور یہ کہ اس سلسلے میں انھیں کیا کرنا چاہیئے۔ جناح صاحب نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ میثاق لکھنؤ ہندوستان کے عوام کی آواز ہے تاہم انھوں نے بغیر غور وخوض کے ان اصلاحات کو مسترد کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے ساتھ یہ بھی درست ہے کہ عوام ان اصلاحات سے پوری طرح مطمئن نہ تھے۔ انھوں نے اپنے بیان میں کہا۔" لیکن یہ تجاویز حرف آخر نہیں۔ انھیں آخری اور قطعی قوانین نہیں سمجھا جا سکتا۔ مزید غور وخوض کے بعد ان میں ترمیم کی گنجائش موجود ہے۔ میں یہ ماننے کو تیار ہوں کہ امن و قانون حکومت ہی کی تحویل میں رہنا چاہیئے لیکن یہ کارروائی صرف وقتی اور عارضی ہوگی۔" انھوں نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ مجموعی حیثیت سے ان اصلاحات نے اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ میں عوامی نمائندوں کی حیثیت کو کم کر دیا ہے اور انھیں غیر ذمہ دار نکتہ چین ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ عوامی نمائندوں کی رائے کا لحاظ کیے بغیر کونسل میں گورنر جنرل کوئی بھی مسودۂ قانون منظور کر سکتا ہے ——— بجٹ مجلس قانون ساز میں پیش تو کیا جائے گا

لیکن بجٹ پر ووٹ نہیں دیا جا سکتا ـــــــ" جناح صاحب نے اس بیان میں کونسل کے ۱۹ ممبروں کی یادداشت اور کانگریس اور لیگ کی اسکیم اور مانٹفورڈ سکیم کے اجزائے ترکیبی کے درمیان حسب ذیل موازنہ کیا تھا۔

۱۔ حکومت ہند میں نمائندوں کو انتظامیہ پر کوئی اختیار حاصل نہ ہوگا۔

۲۔ حکومت کا پیش کردہ کوئی قانون بھی کونسل میں گورنر جنرل کی منظوری کے بعد منظور ہو جائے گا۔

۳۔ حکومت کی مالیاتی پالیسی پر بحث نہیں کی جا سکے گی اور مالیاتی امور کے سلسلے میں حکومت ہند پارلیمنٹ کے زیر اختیار ہوگی۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کے موقف کو کئی بار نظر انداز کیا جا چکا ہے کیونکہ برطانوی حکومت خواہ لبرل پارٹی برسر اقتدار ہو یا کنزرویٹو پارٹی۔ برطانیہ کے مفاد کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔ دونوں پارٹیاں مانچسٹر یا لنکا شائر کے مفادات کے حق میں ضرور آواز بلند کریں گی

۴۔ مقننہ کو مجموعی اعتبار سے بجٹ یا کسی مطالبہ زر کو بھی تبدیل کرنے کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔" اس لیے عملی نقطۂ نظر سے حکومت ہند میں عوامی نمائندوں کی حیثیت وہی ہے کہ جو رپورٹ کے مرتبین کے الفاظ میں "حکومت پر اثر انداز ہونے سے زیادہ نہیں۔ یہ حیثیت ہمیں ۱۸۹۲ء سے حاصل ہے۔"

تاہم اس بیان کے ذریعے جناح صاحب نے عوام کو یہ مشورہ نہ دیا کہ اصلاحات کو قبول نہ کیا جائے۔ ان کا بیان ان الفاظ پر ختم ہوتا تھا۔ اس لیے میں اپنے ہم وطنوں پر زور دوں گا کہ زیر بحث رپورٹ اور سکیم پر مناسب طور پر توجہ دی جائے اور سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ ان اہم تبدیلیوں کے پیش نظر ملک میں رائے عامہ بیدار کرنے کی غرض سے ہمیں اپنی تمام دانائی اور توانائی سے کام لینا چاہیے۔ اگر ہم سب متفق ہو جائیں تو مجھے یقین ہے کہ حکومت کو سکیم میں ردوبدل پر مجبور ہونا پڑے گا

اس موضوع پر تنقید کی بھی ضرورت ہے اور غور و خوض کی بھی۔ آخر کار برطانوی وزارت اور پارلیمنٹ ہماری مطلوبہ تبدیلیوں کو عملی شکل دے گی۔"

اگست میں سید حسن امام کی زیر صدارت مانٹفورڈ اسکیم پر غور کرنے کے لیے بمقام بمبئی کانگریس کا خاص اجلاس منعقد ہوا۔ بہ ظاہر تھا کہ کانگریس کے انتہا پسند ارکان اصلاحات کے مخالف ہیں جب کہ اعتدال پسند عناصر اصلاحات کو مشروط طور پر منظور کر لینے کے حامی تھے۔ گاندھی جی نے خرابیٔ صحت کا بہانہ بنا کر اجلاس میں شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ تاہم کانگریس کے اس معرکۃ الآرا اجلاس میں محتاط طریقے پر یک قرارداد منظور کی گئی جس میں سکیم کو "نامناسب، غیر تسلی بخش اور مایوس کن" قرار دیا گیا۔ قرارداد میں یہ تجویز بھی پیش کی گئی کہ مجوزہ منصوبے میں تبدیلیاں کی جائیں۔ آخر میں لوگوں پر زور دیا گیا کہ اصلاحات پر اس مقصد سے عملدرآمد کرکے دیکھیں کہ ہم جن تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے ہیں انھیں برطانیہ قبول کر لے۔

کم و بیش اسی دوران میں بمبئی میں راجہ صاحب محمود آباد کی زیر صدارت مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں تقریباً اسی مضمون کی قرارداد منظور کی گئی۔ جناح صاحب نے اپنے اخباری بیان میں پہلے ہی اس اندازِ فکر کی نشاندہی کر دی تھی۔ کانگریس اور لیگ نے اپنے اپنے طور پر انھیں کے زاویۂ نظر کو اپنی باضابطہ پالیسی قرار دے دیا۔

لارڈ سنہا جیسے اعتدال پسند سکیم کے حق میں تھے۔ ۸ر جولائی ۱۹۱۸ء کو ٹائمز لندن میں سر (لارڈ) ایس پی سنہا کا ایک بیان شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ ایک طرح سے دونوں منصوبوں (کانگریس۔ لیگ اسکیم اور مانٹفورڈ سکیم) میں اصول سے زیادہ طریقۂ کار کا فرق ہے۔ دونوں سکیموں کا مقصد مناسب مدت میں ذمّہ دار حکومت کا قیام ہے ——— مجھے یقین ہے کہ جب ہندوستان میں لوگ اس سکیم کا پوری طرح اور محتاط انداز میں جائزہ لیں گے تو اکثریت ان اصلاحات کو قبول کر لے گی ———

کیونکہ ان سفارشوں کے ذریعے کافی حقوق حاصل ہو گئے ہیں —— مجھے یقین ہے
جن برطانوی مدبروں نے ہندوستان کی شاندار خدمت کی ہے ان میں مانٹیگو اور
چیمسفورڈ کے نام بھی نمایاں طور پر شامل ہوں گے۔"[1]

قائداعظم وائسرائے ہند لارڈ چیمسفورڈ کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ البتہ
چیمسفورڈ کے پیش رو لارڈ ہارڈنگ سے ان کے تعلقات خوشگوار رہے تھے۔ لہجے
اور الفاظ میں منافقت برتے بغیر اپنے سیاسی حریفوں کو نشانۂ تنقید بنانے میں قائداعظم
کو کمال حاصل تھا۔ جولائی ۱۹۱۷ء کا ذکر ہے کہ بمبئی کے ایک عظیم الشان جلسہ عام میں
انھوں نے لارڈ چیمسفورڈ کے متعلق کچھ چبھتی ہوئی باتیں کیں۔ انھوں نے کہا۔ "اس
وقت جب کہ ہندوستان میں خاصا ہیجان موجود ہے، لارڈ چیمسفورڈ گونگے بنے
سب کچھ دیکھ رہے ہیں۔" اسی کے ساتھ انھوں نے اس امید کا اظہار بھی کیا کہ "شاید
میرے الفاظ شملے کی قلعہ بند فضا میں نفوذ کر سکیں۔" یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں
کہی جا سکتی کہ قائداعظم کو لارڈ چیمسفورڈ کے ۴ر اکتوبر ۱۹۱۸ء والے اس مراسلے کا
علم تھا یا نہیں، جس میں انھوں نے ملک معظم کو لکھا تھا کہ:

ہمارا سابقہ ایک تعلیم یافتہ طبقے سے ہے جس کے ۹۵ فی صدی افراد ہمارے
دوست نہیں ہیں۔ میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ یونیورسٹی کا ہر طالب علم ہمارے خلاف
نفرت کے جذبات رکھتا ہے۔ اس وقت تو یہ طبقہ ہندوستان کی آبادی کا ایک معمولی سا
جزو ہے لیکن ہر سال تعلیم یافتہ گروہ کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ہم بخوبی اندازہ کر سکتے
ہیں کہ مستقبل میں ان طالب علموں کی شدت پسندی زبردست مزاحمت ثابت ہو گی۔ اگر
ہم ان افراد کی حمایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس کے لیے ان کا اعتماد

---

[1] اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف لارڈ سنہا۔ مطبوعہ ۱۹۱۹ء۔ صفحات ۱۷۷ تا ۱۸۰۔

حاصل کرنا ہو گا۔"[1]

ڈاکٹر پٹابھی رقم طراز ہیں۔ "مانٹفورڈ سکیم ادب کا ایک شاندار نمونہ تھی۔ عام تاثر یہ تھا کہ اس رپورٹ کی ترتیب میں لارڈ میسٹن اور سر ڈبلیو ایم مارس نے اہم حصہ لیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ (گول میز کانفرنس کے ایک مندوب) مسٹر لائنل کرٹس نے بھی منصوبے کی ترتیب میں کافی ہاتھ بٹایا تھا۔"[2] ستمبر ۱۹۱۸ء میں امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں مانٹفورڈ سکیم پر غور و خوض کیا گیا۔ طویل بحث مباحثے ہوئے۔ اس کے بعد سر سریندر ناتھ بینرجی نے ایک قرارداد کے ذریعے سفارش کی کہ غیر سرکاری ارکان کی ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو سکیم پر غور کر کے حکومت ہند کو رپورٹ پیش کرے۔ یہ قرارداد صرف چار اختلافی ووٹوں کے بعد منظور کر لی گئی۔ اب ایڈون سیموئیل مانٹیگو نے سکیم کو دارالعوام میں پیش کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سفارشات کا تفصیلی جائزہ لینے کی غرض سے لارڈ ساؤتھ برو اور مسٹر فیٹ ہیم کی سرکردگی میں دو کمیٹیاں مقرر کی گئیں۔ ان کمیٹیوں کو ساؤتھ برو کمیٹی اور فیٹ ہیم کمیٹی کہا جاتا ہے۔

جنگ عظیم قریب الختم تھی اور عارضی صلح کا چرچا ہونے لگا تھا مگر اس صلح کی بنیادوں میں دوسری جنگ عظیم کی چنگاریاں دبی ہوئی تھیں۔ آخر ۱۱ر نومبر ۱۹۱۸ء کو متحاربین کے درمیان مصالحت ہو گئی اور اس طرح خدا خدا کر کے پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی۔ اگلے مہینے دلی میں کانگریس اور لیگ کے اجلاس ہوئے۔ کانگریس کے جلسے کی صدارت پنڈت مدن موہن مالویہ نے کی۔ مسلم لیگ کے اجلاس میں مذکورہ سفارشات کو ایک قرارداد کے ذریعے منظور کر لیا گیا۔ لیکن جزوی طور پر لیگ نے کوئی جلد بازانہ

---

[1] کنگ جارج فقتھ۔ ہز لائف اینڈ رین۔ ہیرولڈ نکلسن۔ صفحہ ۵۰۳۔

[2] دی ہسٹری آف کانگریس۔ پٹابھی سیتا رمیّا۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحات ۲۵۵ تا ۲۵۷

قدم اٹھانے سے احتراز کیا. تاہم بعض دفعات کے بارے میں شدید اعتراض کیے ساتھ اس کے ساتھ یہ بھی مطالبہ کیا کہ مشرقِ وسطیٰ کے اسلامی ممالک کا تحفظ کیا جائے اور ان کی خودمختاری بحال کی جائے۔ لیکن کانگریس دو جنگ آزما گروہوں یعنی اعتدال پسندوں اور انتہا پسندوں کے نرغے میں تھی۔ گاندھی جی، کانگریس کے اجلاس میں موجود تھے۔ کانگریسی نمائندوں نے مانٹفورڈ اسکیم کو مکمل طور سے مسترد کر دیا اور اپنے موقف کی وضاحت کے لیے ایک وفد انگلستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس نازک موقع پر جب کہ برطانوی حکومت اصلاحات منظور کرنے میں بخل سے کام لے رہی تھی، دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان وسیع اختلافات رُونما ہونے لگے۔ صورتِ حال کو خراب کرنے کے لیے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کرائے گئے۔ برطانیہ کے خلاف زبردست مظاہرے ہوئے اور نفرت انگیز غیر ملکی اقتدار سے جلد از جلد نجات پانے کے لیے عوام میں بیداری کی ایک بے مثال لہر دوڑ گئی۔

نوکر شاہی نے پھر اپنی عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا اور کونسل میں ایک ترمیم پیش کر دی جس کا مقصد تھا کہ ضابطہ فوجداری میں ایسی گنجائش پیدا کی جائے کہ نوکر شاہی عوامی مظاہروں کو دبا سکے۔ یہ ترمیم رولیٹ ایکٹ ہی کی ایک شکل تھی۔ اس ترمیم کی بنا پر حکومت کو سیاسی احتجاجوں اور مظاہروں کو کچلنے کے لیے غیر معمولی اختیارات مل گئے۔ نئے تعزیری قوانین ازمنۂ وسطیٰ کی یاد دلاتے تھے۔ ان کے خلاف محمد علی جناح نے امپیریل کونسل میں نہایت مؤثر تقریر کی۔ بحث کے دوران انھوں نے ان قوانین کی مذمت کرتے ہوئے کہا کہ "میری پہلی دلیل یہ ہے کہ مجوزہ ضابطہ انصاف اور قانون کے بنیادی اصول یعنی اس امر کے خلاف ہے کہ شہادت اور عدل و انصاف کے مسلّمہ طریق کار کے مطابق مقدمہ چلائے بغیر کسی شخص کو آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ میرا اعتراض یہ ہے کہ انتظامیہ کو جو اختیارات دیے جا رہے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ عدلیہ کے اختیارات انتظامیہ کو تفویض کر دیے جائیں۔ اس طرح اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔

کہ ان اختیارات کا غلط استعمال ہوگا۔ ماضی کی مثالیں موجود ہیں کہ انتظامیہ نے ایسے اختیارات کو غلط طریقے سے استعمال کیا۔ مجھے اس مسودۂ قانون پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کی کوئی نظیر موجود نہیں جس سے معلوم ہو سکے کہ کسی دوسرے مہذب ملک میں بھی اس نوعیت کے قوانین رائج ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ اراکین کونسل، حکومت کے نامزد ارکان کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کا کام ہر معاملے میں سرکاری نقطۂ نظر کی تائید و حمایت تھا۔ ظاہر ہے کہ بڑی آسانی سے کونسل کی اکثریت نے ان قوانین کو منظور کر لیا۔ البتہ جناح اور وٹھل بھائی پٹیل جیسے محب وطن رہ نما عوام کی حقیقی خواہشات کی ترجمانی پر ڈٹے رہے۔ انھوں نے ان قوانین کی مخالفت کا پرچم بلند رکھا۔

گاندھی نے سابرمتی آشرم سے ستیہ گرہ کے متعلق اپنا شہرۂ آفاق عہد نامہ شائع کیا۔ اس میں گاندھی جی نے صراحت کی تھی کہ "چونکہ میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے ضابطۂ فوجداری (ترمیمی) ۱۹۱۹ء کا مسودۂ قانون نمبر ا اور ضابطۂ فوجداری (ہنگامی اختیارات) ۱۹۱۹ء کا مسودۂ قانون نمبر ۲ غیر منصفانہ، عوام کی آزادی اور عدل و انصاف کے اصول کے منافی نیز افراد کے بنیادی حقوق کے لیے نقصان رساں ہے اس لیے ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اگر یہ قوانین نافذ کیے گئے تو ہم ان قوانین اور کسی دوسری کمیٹی کے مرتب کیے ہوئے اسی قسم کے دوسرے ضوابط کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ہم یہ عہد کرتے ہیں کہ اس جدوجہد میں ہم حق کے اصول پر قائم رہیں گے اور کسی شخص کے جان و مال کے خلاف تشدد سے کام نہیں لیں گے۔" آئین و انصاف کی بالادستی پر یقین رکھنے والے جناح نے ۲۸ مارچ ۱۹۱۹ء کو ان عوام دشمن قوانین کے خلاف (جنھیں حکومت امپیریل کونسل میں جلد سے جلد منظور کرانے کی خواہشمند تھی) وائسرائے کو ایک کھلا مکتوب لکھا۔

"جناب والا، عوام کی خواہشات کے برخلاف رولٹ بل کی منظوری اور بحیثیت

گورنر جنرل اس بل پر آپ کی تصدیق کے بعد برطانوی انصاف کے بارے میں عوامی اعتماد کو زبردست ٹھیس پہنچی ہے۔ مزید براں اس سے امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی تشکیل کی حقیقت سب پر ظاہر ہو گئی ہے جو کہنے کو تو قانون سازی کے اختیارات رکھتی ہے لیکن درحقیقت غیر ملکی حکومت استبدادیہ کی آلہ کار ہے۔ کونسل کے غیر سرکاری ہندوستانی ارکان کی متفقہ رائے اور عوام کے جذبات کا ذرا بھی احترام نہیں کیا گیا ——— انصاف کے بنیادی اصول اور عوام کے آئینی حقوق کو ایک تُند خُو اور ناقص نوکر شاہی نے ایسے موقع پر پامال کیا ہے جبکہ مملکت کو کوئی حقیقی خطرہ لاحق نہیں۔ نہ تو یہ نوکر شاہی عوام کے سامنے جوابدہ ہے نہ اسے عوامی جذبات کا کوئی پاس و احساس ہے۔ بنابریں میں اس مسودۂ قانون کی منظوری اور اس قانون کی منظوری کے طریقۂ کار کے خلاف احتجاج کے طور پر امپیریل کونسل سے استعفا دیتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ بحالات موجودہ کونسل میں میری شمولیت ملک کے عوام کے لیے بے کار ہے اور یہ امر کسی شخص کی عزتِ نفس کے منافی ہے کہ وہ کسی ایسی حکومت سے تعاون کرے جس نے کونسل کے ایوان میں عوامی نمائندوں اور ایوان سے باہر ملک بھر کے عوام کی رائے کو بالکل نظر انداز کر دیا ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو کوئی حکومت زمانۂ امن میں اس قسم کے قانون منظور کرتی ہے، اسے مہذب حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ مجھے اب بھی یہ اُمید ہے کہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو تاج برطانیہ کو مشورہ دیں گے کہ اس سیاہ قانون کی منظوری نہ دی جائے۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے۔ جناح"

مسٹر جناح کے استعفے سے یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ انھیں اپنی عزتِ نفس اور اپنے عوام کے جذبات سے زیادہ کوئی چیز عزیز نہ تھی۔ چونکہ وہ ایک عملی انسان تھے اس لیے انھوں نے آئینی طریقۂ کار کے مطابق احتجاج کیا اور ایسی حکومت کے ساتھ

تعاون سے انکار کر دیا جو رائے عامہ کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ گاندھی جی اپنے دلچسپ تجربات میں مصروف تھے یعنی حکومت کے خلاف اخلاقی ہتھیاروں سے جنگ، سول نافرمانی اور اہمسا کے متعلق ان کے حیران کن نظریوں کا دائرہ روز بروز وسیع تر ہو رہا تھا اور ان کے پیرو بھیڑ چال چل رہے تھے۔

گاندھی جی نے ہندوستانی عوام سے اپیل کی کہ ۳۰ر مارچ کو یوم احتجاج منایا جائے اور اس روز مکمل ہڑتال کی جائے۔ بعد میں احتجاج کی تاریخ بدل کر ۶ر اپریل کر دی گئی مگر اس تبدیلی کی اطلاع بروقت دلی نہ پہنچ سکی اور وہاں ۳۰ر مارچ کو کافی ہنگامہ برپا ہوا۔ مظاہرین پر پولیس نے گولی چلا دی اور ہر طرف خون کی ندیاں بہہ گئیں۔ جب پولس بلووں پر قابو نہ پا سکی تو فوج کی مدد طلب کی گئی جس نے ہجوموں کو منتشر کرنے کے لیے اندھادھند فائرنگ کر دی۔ پولس اور فوج کی فائرنگ سے کافی آدمی ہلاک اور زخمی ہوئے۔ گاندھی نے قوم کو تشدد کے خلاف متنبہ کرتے ہوئے اعلان کیا کہ تشدد ستیہ گرہ اور اہمسا کے عظیم اصولوں کے منافی ہے۔

۶ر اپریل کو ملک بھر میں ہڑتال ہوئی اور جلسے منعقد کیے گئے۔ ہندوستانی لیڈروں نے ان جلسوں میں بڑی اشتعال انگیز تقریریں کیں اور ملک بھر کے تمام جلسوں میں ایک ہی قرارداد منظور کی گئی۔ یہ قرارداد خود گاندھی جی نے مرتب کی تھی۔ اس قرارداد کی نقلیں وائسرائے کو بھیجی گئیں۔ گاندھی بذاتِ خود بمبئی کے جلسۂ عام میں شریک تھے اگلے روز وہ پنجاب جانے کے لیے دہلی روانہ ہو گئے۔ ابھی گاندھی پنجاب کی سرحد تک ہی پہنچ پائے تھے کہ ریل کے اندر انھیں حکومتِ پنجاب کا حکم نامہ ملا کہ وہ صوبے کی حدود میں داخل نہ ہوں۔ گاندھی نے یہ حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ آخر انھیں پولس کی حراست میں بمبئی واپس لایا گیا۔

گاندھی کی گرفتاری کی خبر نے عوام کو مشتعل کر دیا اور انھوں نے ہنگامہ آرائی

شروع کر دی۔ لوگوں نے قانون شکنی کرتے ہوئے سڑکوں اور گلیوں میں اکّا دکّا یورپی
باشندوں پر حملے شروع کر دیے۔ جن لوگوں نے ان کا ساتھ نہ دیا ان سے بدسلوکی
کی گئی۔ امن و امان کے محافظوں اور شرپسندوں کے درمیان جو حکومت کے خلاف
اپنے مخصوص انداز میں اظہار ناراضی کر رہے تھے، بے ضابطہ لڑائی شروع ہو گئی۔
اس دوران میں لوٹ مار اور آتش زدگی کے بھی کئی واقعات پیش آئے۔ کچھ پولیس
افسروں اور سارجنٹوں کو بھی ہلاک کر دیا گیا۔ صورت حال برابر بگڑ رہی تھی اور سول
حکام ہنگاموں پر قابو پانے میں ناکام ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند شہروں میں مارشل لا
نافذ کر دیا گیا۔

۱۱ اپریل کو امرتسر میں مشتعل عوام کا زبردست ہجوم ایک تھانے کے سامنے جمع
ہو گیا اور گرفتار کیے جانے والے کچھ لیڈروں کی رہائی کا مطالبہ کرنے لگا۔ پولیس نے
ڈنڈے برسا کر ہجوم کو منتشر کرنا چاہا مگر لوگ دھرنا دے کر بیٹھ گئے اور اس طرح بین
کرنے لگے جس طرح کسی کی موت پر ماتم کرتے ہیں۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا
کہ پولیس نے نہتے ہجوم پر گولی کیوں چلائی۔ آیا یہ سب سازشی ایجنٹوں کی اشتعال انگیزی
پر کی گئی یا کسی اور معمولی واقعے کے سبب۔ بہرحال کئی آدمی گولی کھا کر ہلاک ہو گئے۔
امرتسر کی سڑکوں پر انتقام کے نعرے بلند ہونے لگے اور غضب ناک بلوائیوں نے کئی
سرکاری عمارتوں اور ریلوے سٹیشن کو آگ لگا دی۔ پانچ انگریزوں کو وحشیانہ طور سے
ذبح کر دیا گیا۔ ایک انگریز خاتون مس شیروڈ پر دست درازی کی گئی اور ایک بہادر
ہندوستانی نے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈال کر اُس کی جان بچائی۔

دوسرے روز صبح کو امرتسر میں حالات معمول کے مطابق تھے۔ لوگ اپنے روزمرہ
کے کاموں میں اسی طرح مصروف تھے جیسے کل کوئی خاص واقعہ ہی پیش نہ آیا تھا۔
جذبات کا طوفان تھم چکا تھا اور کشیدگی ختم ہو رہی تھی کہ حکومت کے ایک احمقانہ اقدام

سے عوامی اشتعال کی آگ دُور دُور تک بھڑک اُٹھی اور اس خونی آگ کی لپیٹ میں پورا شہر آگیا۔ برطانوی حکومت کے سیاہ کارناموں میں سے اس ہولناک حادثے کی یاد آج بھی ذہن میں تازہ ہے۔

حالات اتنے خراب نہ تھے کہ امرتسر کا نظم و نسق فوج کے حوالے کرنا ضروری ہوتا پھر بھی فوج طلب کر لی گئی اور شہری حکّام کی ذمہ داریاں فوجی حکّام کے سپرد کر دی گئیں۔ اس حادثے میں جہاں ہندوستانی عوام کو جدوجہد کی قیمت اپنی جان سے ادا کرنی پڑی اور بے انتہا آلام و مصائب کا شکار بننا پڑا وہاں انگریزوں کے وقار کو بھی شدید دھچکا پہنچا۔ سر ویلنٹین شیرل نے لکھا ہے: "پہلے امرتسر پھر لاہور اور دوسرے شہروں میں شہری اختیارات فوج کے سپرد کرنے کی کارروائی، جیسا کہ بعد میں حکومت برطانیہ نے خود تسلیم کر لیا تھا، انڈین سول سروس کی بہترین روایات کے انتہائی منافی اور ان روایات کے لیے تباہ کن تھی۔"[1]

فوری طلبی پر جنرل ڈائر ۱۲ تاریخ کی شام کو امرتسر پہنچا اور اگلے روز اتوار کے دن جنرل ڈائر اور اس کے افسروں اور جوانوں نے امرتسر کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ امرتسر کے شہری پہلے ہی اعلان کر چکے تھے کہ اتوار کے روز احتجاجی جلسہ منعقد کیا جائے گا۔ جلیانوالہ باغ کے کشادہ سبزہ زار کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں تھیں۔ باغ میں آنے جانے کے لیے صرف پانچ "تنگ راستے" تھے۔ جمعے کے روز پولیس اور فوج کی فائرنگ سے جو لوگ ہلاک و زخمی ہوئے تھے ان سے اظہارِ ہمدردی کے لیے کوئی بیس ہزار آدمی اس سبزہ زار میں جمع ہو گئے۔ ظالم اور خونی جنرل ڈائر کے جوان نہ صرف رائفلوں سنگینوں بلکہ مشین گنوں تک سے لیس صف آرا تھے۔ نہتے آدمیوں کو اس طرح سنگینوں اور رائفلوں کے نرغے میں لے لینا کہ نکلنے کے تمام راستے مسدود ہوں بہادری کی

---

[1] انڈیا اولڈ اینڈ نیو۔ سر ویلنٹین شیرل۔ مطبوعہ ۱۹۲۱ء میکمیلن اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن صفحہ ۱۸۴

عجیب و غریب مثال ہے۔ جنرل ڈائر نے چالیس جوانوں کو حکم دیا کہ گولیاں برسا دو۔ تعمیلِ حکم کے ساتھ ہی ہر طرف بارود کا دھواں پھیل گیا۔ دھوئیں کے اس گہرے پردے میں خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے نیم جان لوگ اس خون آشام جنرل سے رحم کی بھیک مانگ رہے تھے۔ جنرل ڈائر کے جوانوں کے پاس جب تک گولی بارود رہی نہتے ہندوستانیوں پر بے دریغ فائرنگ ہوتی رہی۔ جب گولی بارود ختم ہو گئی تو جنرل اپنے جوانوں کے ساتھ باغ کے باہر چلا گیا۔ باغ میں سینکڑوں لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور بے شمار آدمی شدید زخمی ہوئے تھے۔ زخمیوں کے حلق میں پانی ٹپکانے تک کا کوئی انتظام نہ کیا گیا اور انھیں سسک سسک کر دم توڑ دینے کے لیے وہاں یوں ہی پڑا رہنے دیا گیا۔ ڈائر ایک انگریز سپاہی تھا اور اس عقیدے سے سرشار کہ انگریز سپاہی کا کام یہ ہے کہ وہ ذلیل ہندوستانیوں کو ایسا سبق دے جسے وہ عمر بھر یاد رکھیں۔ اپریل کی اس گرم رات میں جلیاں والہ باغ کے زخمی رات بھر پانی کے لیے تڑپتے رہے اور سسکتے رہے لیکن ان کے حلق میں کوئی ایک بوند تک ٹپکانے والا نہ تھا۔

اس حادثے سے دہشت و بربریت کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ پنجاب میں مارشل لا لگا دیا گیا۔ سفاکی اور خونریزی کے ناقابلِ تصور واقعات روزمرہ کا دستور قرار پا گئے۔ ہر ہندوستانی باشندے کی توہین اور اس کی بے عزتی معمولی بات بن گئی۔ گورے بندوقچی بے بس عوام کے مقابل اپنے شانوں سے مشین گنیں لٹکائے، سینہ تانے سڑکوں پر گشت کرتے رہے۔ ان کی رفتار سے رعونت اور فتح مندی کا غرور ٹپکتا تھا۔ ان مشکل ترین حالات میں گاندھی جی نے ایک اور سیاسی قلابازی کھائی اور انھوں نے ستیہ گرہ کی تحریک ختم کرنے کا اعلان کر دیا اس اعتراف کے ساتھ کہ بڑے پیمانے پر ستیہ گرہ کی تحریک بجائے خود بہت بڑی غلطی تھی۔

مارشل لا کے نفاذ کے بعد پنجاب کے گوشے گوشے میں بھیانک تشدد کا جو لاکھی

پھٹ پڑی، شہروں، قصبوں اور دیہات میں ہزاروں آدمیوں کو برطانوی فوجیوں کی
دلیوں کا نشانہ بننا پڑا۔

بی جی ہارنی مین نے اس ملک گیر بے اطمینانی کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ
رادی طاقت سے اتحادیوں کو ہر ممکن امداد دینے کے بعد اہل ہند بمشکل یہ یقین کر سکتے
نے کہ حکومت ایسے تباہ کن قوانین (رولیٹ ایکٹ اور ضابطۂ فوجداری میں ترمیم کا
نون) منظور کرے گی جن سے لوگوں کے بنیادی حقوق تک سلب کر لیے جائیں گے اور
ن کی نظیر جدید دور کے کسی مہذّب و متمدن ملک میں نہ مل سکے گی[۱] اپنے نقطۂ نظر
، ہارنی مین نے اس طرح وضاحت کی ہے کہ "مان لیا حکومت نے یہ بیہودہ قوانین صرف
ں لیے نافذ کیے تھے کہ شورش پسندوں کو خاموش کیا جا سکے تب بھی یہ کس طرح ممکن ہے
باشعور سیاسی رہنما ان قوانین کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہ سکتے۔ ایک سیاسی جلسۂ عام
ہا جب کہ عوام کے جذبات انتہائی مشتعل ہوں دنیا کے کسی مقرر کے لیے بھی ممکن نہیں
دہ محتاط انداز میں انتہائی پیچیدہ معاملات پر رائے زنی کرے[۲]"

جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے خلاف غیظ و غضب کے جذبات شباب پر تھے۔
ہور، گجرانوالہ اور قصور میں زبردست مظاہرے ہوئے۔ سرکاری املاک کو لوٹ لیا گیا یا
ے لگا دی گئی۔ ان ہنگاموں میں کچھ پولس والوں کو قتل بھی کر دیا گیا۔ مارشل لاء کی آڑ لے
ں برطانوی حکومت نے انتہائی بربریت کا ثبوت دیا اور بے گناہوں پر جو مظالم ڈھائے
ے ان کا حال سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مارشل لاء کے دوران میں عوام جس تشدّد کا نشانہ بنائے گئے، ڈاکٹر آئی ایچ قریشی

۱ؑ ارتھ سرایندا اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی جی۔ ہارنی مین۔ مطبوعہ ۱۹۲۰ء۔ صفحہ ۴۹۔
۲ؑ ارتھ سرایندا اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی جی۔ ہارنی مین۔ مطبوعہ ۱۹۲۰ء۔ صفحہ ۲۰

نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے: ”رولیٹ ایکٹ کے نفاذ کے بعد جس
کا مقصد کسی مناسب کارروائی کے بغیر مشتبہ دہشت انگیزوں اور سازشیوں کی سرکوبی اور
انسداد تھا، وسیع پیمانے پر احتجاج اور مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جلیانوالہ باغ، جس
کے چاروں طرف اونچی دیواریں اور باہر آنے کے چند راستے تھے، ہجوم پر فائرنگ کے
علاوہ امرتسر اور لاہور میں فوجی قوانین کا اجرا کیا گیا۔ شہریوں کو ناقابل بیان جسمانی
دی گئیں، مثلاً زمین پر پیٹ کے بل چلنا۔ ان حرکتوں سے عوام مشتعل ہو گئے۔“[1]

۱۹۲۰ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے نام سے ایک قرطاس ابیض جاری کیا گیا جس میں
اعتراف کیا گیا تھا کہ دوسرے مقامات کے مقابلے میں پنجاب کے اندر مارشل لا زیادہ
مؤثر رہا ہے، بدیں سبب کہ لاہور کا مارشل لا کمانڈر لفٹننٹ کرنل فرینک جانسن تھا۔
لفٹننٹ کرنل پہلے ہی افریقہ میں مارشل لا کا سزا اور حکم عدولی کرنے پر فوراً پچوانا لینے
والی چھڑی والے انسانوں کو گولی سے اڑا دینے کا فن سیکھ چکا تھا۔ پنجاب کے واقعات
اور جلیانوالہ باغ کے سانحے کی تحقیقات کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کمیٹی کے روبرو
لفٹننٹ کرنل فرینک جانسن نے شہادت دیتے ہوئے بغیر کسی ندامت کے اعتراف
کیا کہ میں لوگوں پر یہ بات ثابت کر دینی چاہتا تھا کہ مارشل لا میں کتنی قوت ہے اور یہ
جب مجھے یہ موقع ملا تو میں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔“[2] فرینک جانسن نے
وضاحت کرتے ہوئے لکھا: میں فوجی دستے کی کمان کرتا ہوا لاہور میں داخل ہوا۔ فضا
ہوائی جہاز نیچی پرواز کر رہے تھے۔ ہوابازوں کو حکم دے دیا گیا تھا کہ فوج جوں
فائرنگ کرے وہ بھی غیر مسلح شہریوں پر بمباری شروع کر دیں۔[3] جو کہ ان بند نظر آتی

---

[1] ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ۔ ڈاکٹر آئی ایچ قریشی، جلد اول، مطبوعہ ۱۹۵۷ء، صفحہ ۱۸

[2] امرتسر اینڈ آور ڈیوٹی ٹو انڈیا، بی جی ہارنی مین، صفحہ ۱۳۲/۳ [3] حوالہ بالا صفحہ ۲۳

ے کھیلنے کا حکم دے دیا جاتا" اور حکم عدولی پر دوکان کے مالک کو گولی سے اڑا دیا جاتا؛
زبردستی دوکان کھول جاتی اور تمام سامان لوگوں میں مفت تقسیم کر دیا جاتا۔ طالب علموں
علم دیا گیا کہ مختلف مقامات پر روزانہ دن میں چار مرتبہ فوجی حکام کے روبرو پیش ہوں
یں سے اکثر مقامات چار میل سے زیادہ فاصلے پر واقع تھے۔ اس حکم کا مطلب یہ
اکہ اپریل کی شدید گرمی اور دھوپ میں جب کہ سائے میں بھی درجہ حرارت ١٠٠ سے
پر ہوتا ہے انھیں روزانہ ٢٢ میل چلنا پڑتا اور یہ سب کچھ سو رما لفٹننٹ کرنل جانسن کی
ریں اس لیے ضروری تھا کہ طالب علم شر انگیزی نہ کر سکیں۔ کسی کالج کی دیوار پر سے
سل لا کا کوئی نوٹس اتار لیا گیا۔ اس پر بطور سزا کالج کے پرنسپل اور دیگر استادوں کو تین
ن فوجی حراست میں رکھا گیا۔ مصیبت زدہ لوگوں کو کھانا کھلانے کے لیے جو لنگر کھولے
ے تھے وہ زبردستی بند کرا دیے گئے اور لفٹننٹ کرنل جانسن کے حکم کے تحت ایک بوڑھے
می کو جو ایک گلی میں رات کے آٹھ بجے کے بعد اپنی دکان کے سامنے گائے باندھ رہا
ا پکڑ لیا گیا اور کرفیو کی خلاف ورزی پر اس کے کوڑے لگائے گئے۔ نارووال، مریدکے
ر کامونکی جیسے دیہات تک پر بمباری کی گئی اور ان دیہات کے مکھیوں کو فوج کے
ام میں مزاحمت کرنے اور دیہاتیوں کو عبرت دلانے اور ان کی اصلاح کرنے کی غرض سے
سر عام کوڑے لگائے گئے۔"

چھ ہفتے تک لاہور اور آس پاس کے دیہات میں یہی قیامت برپا رہی۔ ان
خونی کارناموں کے بعد لاہور کے یورپی باشندوں نے لفٹننٹ کرنل جانسن کو جو الوداعی
ڈنر دیا اس میں اسے غریبوں کا محافظ قرار دیا گیا۔ اس کے جواب میں کرنل نے کہا: "میں

سه ارت سر اینڈ اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی جی۔ ہارنی مین۔ صفحہ ١٢٣

سه محولہ بالا۔ صفحہ ١٣٥ سه محولہ بالا۔ صفحہ ١٣٩

نے لوگوں سے نرمی کا برتاؤ کیا ہے اور خود اُن کی بھلائی کے لیے انھیں سرزنش کی ہے۔[1]

گوجرانوالہ میں مارشل لا کے مقامی ناظم کرنل او برائن، قصور میں کیپٹن ڈوویٹن اور شیخوپورہ میں بوسورتھ اسمتھ نے انتہائی مجرمانہ اور غیر انسانی حرکات کیں۔ جب گوجرانوالہ کے ہنگاموں کی خبر لاہور پہنچی تو پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سر مائیکل او۔ڈائر نے وہاں ہوائی جہاز بھیجنے کا حکم دیا۔ ان ہوائی جہازوں نے گوجرانوالہ میں میجر کاربیری اور لفٹنٹ ڈوڈ کنس کی کمان میں بمباری کی۔[2] امرتسر میں جنرل ڈائر کی جنگی سفاکیوں کی فہرست خاصی طویل ہے مگر ان میں سب سے زیادہ شرمناک کارروائی وہ تھی جسے "پیٹ کے بل چلنے کا حکم" کہا جاتا ہے۔ اس حکم کے تحت، اس گلی سے گزرنے والے ہر شخص کو پیٹ کے بل چلنا پڑتا جس میں مس شیروڈ پر دست درازی کی گئی تھی۔ حد یہ ہے کہ اس گلی میں رہنے والے معزز باشندوں تک کو اس تعزیر سے نہ بخشا گیا۔ بہت سے مبیّنہ ملزموں کو یہاں لایا جاتا اور گورے سپاہی کالی چمڑی والوں کو عبرت دلانے کے لیے ان کے کوڑے لگاتے تھے۔

جنرل ڈائر نے جلیانوالہ باغ میں فائرنگ کرنے کے علاوہ یہ حکم بھی جاری کیا کہ

عام جلسے منعقد نہ کیے جائیں، اگرچہ اسے "یہ کارروائی کرنے کا کوئی اختیار نہ تھا —— کیونکہ ابھی مارشل لا نہیں لگا تھا۔"[3] جنرل نے کسی اختیار کے بغیر امرتسر کے لیے پانی اور بجلی کی سپلائی منقطع کرنے کا بھی حکم دے دیا تھا۔

سولھویں ڈویژن کے جنگی روزنامچے میں ۱۴ اپریل کی سرخی کے ذیل میں درج ہے

گورنمنٹ ہاؤس میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں امرتسر کی کارروائی کے متعلق

۱؎ امرت اینڈ اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی۔ جی۔ ہارنی مین۔ صفحہ ۱۴۰۔

۲؎ محولہ بالا۔ صفحہ ۱۴۰۔ ۳؎ محولہ بالا۔ صفحہ ۱۴۶

جنرل ڈائر کی رپورٹ زیر غور آئی اور ڈائر نے جو کچھ کارروائی کی تھی، لفٹننٹ گورنر نے اس کی منظوری دی۔"

جنرل ڈائر نے امرتسر میں جس خونریزی کا مظاہرہ کیا اس کے متعلق لفٹننٹ گورنر کی منظوری سے جنرل کے نام ایک تار بھیجا گیا جس کا مضمون یہ تھا: "تمہاری کارروائی درست ہے۔ لفٹننٹ گورنر اسے استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں"[1]۔ دوسرے علاقوں سے جو وکیل اور بیرسٹر "ملزموں" کی پیروی کے لیے بلائے گئے تھے، گورنر نے ان کے داخلۂ پنجاب پر پابندی لگا دی تھی۔

جب مارشل لا کا سیلاب خون گزر گیا تو حکومت ہند نے قانونی چارہ جوئی سے تحفظ کے نام سے ایک قانون منظور کیا۔ اس قانون کی رو سے ہندوستان کی عدالتوں میں حکومت کے خلاف استغاثہ دائر کرنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا[2]۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اپنی قوم کو غیر ملکی اقتدار و تسلط سے آزاد کرانے کے لیے ہمارے محب وطن ہم وطنوں کو کتنی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اخبارات پر کڑا سنسر لگا دیے جانے کے سبب دوسرے علاقوں کے لوگوں کو پنجاب کے مظالم کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا اور افغانستان کے خلاف تیسری جنگ کے موقع پر جب پنجاب سے فوجی بھرتی کی ضرورت پڑی تو حکومت کے لیے حالات انتہائی پیچیدہ اور مشکل تھے۔ ستمبر ۱۹۱۹ء میں وائسرائے نے پنجاب میں بدامنی کے اسباب کی تحقیقات کے لیے لارڈ ہنٹر کی سربراہی میں ایک کمیشن مقرر کیا جو ہنٹر کمیٹی کے نام سے موسوم ہے۔

---

[1] امرتسر اینڈ اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی۔ جی۔ ہارنی مین۔ صفحہ ۱۲۰

[2] امرتسر اینڈ اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی۔ جی۔ ہارنی مین۔ صفحہ ۸۱-۱۸۰

جناح اس وقت کانگریس، ہوم رول لیگ اور مسلم لیگ تینوں تنظیموں کے رکن
تھے۔ مسز اینی بیسنٹ نے رولیٹ ایکٹ پر اعتراضات ختم کرنے کے لیے ایک موقع
کہا تھا "جب مشتعل گروہ ان (فوجیوں) پر پتھراؤ کرنا شروع کر دے تو فوجیوں کو چند
باڑھ چلانے کا حکم دینا رحمدلانہ اقدام ہے۔" اس پر مسز اینی بیسنٹ "اینٹ اور پتھر کے
بدلے گولی پر یقین رکھنے والی خاتون" کے نام سے مشہور ہو گئیں۔ جناح صاحب کو مسز بیسنٹ
اور ہوم رول لیگ پر جو اعتماد تھا وہ بری طرح مجروح ہوا تھا۔ پنجاب میں مسلمانوں
اور ہندوؤں پر جو ظلم و ستم اور بربریت روا رکھی گئی تھی، اس سے ان کی حساس طبیعت
بے حد متاثر ہوئی تھی۔ اس کے برعکس گاندھی جو ایک حد تک اس بدامنی کے ذمہ دار
تھے، مبہم بیانات دینے اور اس شدید جانی و مالی نقصان کو برداشت کر لینے کی تلقین
کرتے رہے۔ ڈاکٹر پٹابھی نے لکھا ہے "اپریل ۱۹۱۹ء کے بعد سے ـــــ سیاسی جماعتوں
کے درمیان اختلاف کی خلیج گہری ہونے لگی۔"[۱]

مارشل لا کے تحت پنجاب میں مسلمانوں پر جو ظلم ڈھائے گئے تھے، نیز ہندوستان
کے دوسرے علاقوں میں بلووں کے موقع پر غریب مسلمانوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا
تھا، انھوں نے جناح صاحب کو بے حد غم زدہ کر دیا۔ ستم ظریفی یہ کہ مسلمانوں کو ایک
ایسے شخص کی قیادت کے سبب ان آفتوں کا شکار بننا پڑا جس کے طریقۂ کار سے وہ
کبھی اتفاق رائے نہ کر سکتے تھے۔ لیکن حالات کے جبر سے کسی شخص کو اپنا دامن چھڑانے
کے لیے کچھ نہ کچھ وقت یقیناً درکار ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے آلام و مصائب پر تبصرہ کرتے
ہوئے ہارنی مین نے اقرار کیا ہے "مسلمانوں کو خاص طور سے ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑا۔"[۲]

۱؎ دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ۔ صفحہ ۲۹۱

۲؎ امرت سر اینڈ اور ڈیوٹی ٹو انڈیا۔ بی۔ جی۔ ہارنی مین۔ صفحہ ۳۲

ہندوستانی اخباروں کے ایڈیٹروں نے ہندوستان کے ایک ہمدرد انگریز پادری
۔ ایف اینڈریوز سے درخواست کی کہ وہ پنجاب کے ہنگاموں کی تحقیقات کریں۔
مت پنجاب نے فوراً قدم اٹھایا اور اینڈریوز کے داخلے پر پابندی لگادی۔ بمبئی
نیکل کے ایڈیٹر بی جی ہارنی مین پنجاب کے غم انگیز واقعات کی نقاب کشائی میں سرگرم
ے کہ انھیں حکومت ہند نے جلاوطن کردیا۔ ہندوستان کے افق سیاست سے ہارنی مین کی
موجودگی کا فائدہ گاندھی نے اٹھایا۔ وہ ینگ انڈیا کے ایڈیٹر بن بیٹھے اور کئی سال تک
اخبار کی ادارت کرتے رہے۔

۱۴ اکتوبر ۱۹۱۹ء کو پنجاب کے بلوؤں کی تحقیقات کے لیے ہنٹر کمیٹی مقرر کی گئی
ی۔ ۲۹ اکتوبر کو دہلی میں کمیٹی نے تحقیقات کا آغاز کیا اور بعد میں لاہور، بمبئی اور
مدآباد میں کمیٹی کے اجلاس ہوئے۔ مسلم لیگ نے اپنی قرارداد میں اس کمیشن کو لیپاپوتی
نے والا تحقیقاتی کمیشن قرار دیا ـــــ کیونکہ اس میں انڈین نیشنل کانگریس اور انڈین
ملم لیگ کو کوئی نمائندگی نہیں دی گئی: مارشل لا کے تحت نظر بند کیے جانے والے
لوں یا ان لوگوں کی طرف سے جن پر مارشل لا کے تحت مقدمے چل رہے تھے، کانگریس
ے نمائندہ کی حیثیت سے ہندوستان کے عظیم سپوت، بنگال کے چترنجن داس پیش ہوئے
اس نے مطالبہ کیا کہ چند نظر بند افراد کو ہنٹر کمیٹی کے روبرو شہادت دینے کے لیے
لب کیا جائے۔ لیکن یہ مطالبہ مسترد کردیا گیا اور کانگریس اس وعدے سے دست بردار
دگئی کہ وہ کمیٹی سے تحقیقاتی کام میں تعاون کرے گی۔ کانگریس نے فوراً مارشل لا کے
متعلق ایک رپورٹ تیار کی۔ اس رپورٹ میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ
جنرل ڈائر نے ہنٹر کمیٹی کے روبرو جو اعتراف کیا ہے کسی شک و شبہے کے بغیر اس سے
یہ ثابت ہوگیا ہے کہ ان کی ۱۳ اپریل کی کارروائی نہتے اور بے گناہ مردوں اور عورتوں
ے سفاکانہ اور جانے بوجھے قتل عام کے سوا کچھ نہ تھی۔ جدید دور میں اس بزدلانہ بہیمیت

کی کوئی مثال موجود نہیں ہے"۔ جنرل ڈائر کے سفاکانہ کردار کا اندازہ اس کے اپنے بیان سے لگایا جا سکتا ہے جس میں اس نے کہا تھا کہ میں جلیانوالہ باغ میں لوگوں پر فائرنگ کرنے کے لیے ایک بکتر بند گاڑی میں سوار ہو کر گیا تھا۔ جب میں نے دیکھا کہ راستہ اس قدر تنگ ہے کہ گاڑی نہیں گزر سکتی تو اسے وہیں چھوڑ دیا۔

ہنٹر کمیٹی کے ایک ممبر سر چمن لال سیتل واد کے حوالے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کمیٹی کے انگریز اور ہندوستانی ممبروں کے درمیان تعاون کا کوئی جذبہ کارفرما تھا۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ حکومت نے کمیٹی کے اراکین کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے تقرر سے انکار کر دیا تھا اس لیے کمیشن کو سیاسی رہنماؤں اور عوام کا اعتماد حاصل نہ تھا۔ تحقیقات کی تکمیل کے بعد سرکاری گیسٹ ہاؤس آگرہ میں رپورٹ مرتب کرنے کی غرض سے کمیٹی کا اجلاس ہوا پہلے دن سے ہی کمیٹی کے یورپی اور ہندوستانی اراکین میں شدید اختلاف رائے موجود تھا۔ اختلاف کی بنیاد مارشل لا کے جواز اور نفاذ کا مسئلہ اور یہ سوال تھا کہ اتنے طویل عرصے تک مارشل لا کیوں قائم رہا؟ اس موقع پر یورپی باشندوں، خصوصاً لارڈ ہنٹر نے جس طرز عمل کا مظاہرہ کیا، سر چمن لال سیتل واد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "بحث سے، جو اکثر خاصی تیز ہو جاتی، کچھ ناگوار سی فضا پیدا ہو گئی۔ خاص طور سے معمولی سے اختلاف رائے پر بھی لارڈ ہنٹر جن تاثرات کا اظہار کرتے ان سے کشیدگی بڑھتی اور لارڈ ہنٹر کا رویہ ناقابل برداشت محسوس ہونے لگتا۔ کسی ایسے ہی موقع پر لارڈ ہنٹر مجھ سے بحث کر رہے تھے کہ اچانک وہ غصے سے بے قابو ہو کر چلانے لگے "تم لوگ (یعنی میں اور میرے ہندوستانی ساتھی) انگریزوں کو اس ملک سے نکال باہر کرنا چاہتے ہو، اس بات پر مجھے غصہ آنا ہی چاہیے تھا۔ میں نے کہا "ہندوستان کے عوام کا یہ قطعاً جائز حق ہے کہ وہ غیر ملکی حکومت سے نجات پانے کی خواہش کریں

آزادی صرف باہمی سمجھوتے اور حسنِ مفاہمت کے ذریعے حاصل کی جا سکتی ہے۔ انگریز اگر اس ملک میں تم جیسے کوتاہ بین اور متعصب لوگوں ہی کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجتے رہے تو انگریزوں کو یہاں سے نکال باہر کرنا ضروری ہو جائے گا۔ اس کے بعد ہم ہندوستانی اراکین نے لارڈ ہنٹر سے کوئی بات نہیں کی۔[1]

---

[1] دی کلاٹنہ اینڈ ریفلکشنز۔ چمن لال سیتل واد۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۲۱۱

سوراج کی سٹرانڈ

ہنٹر کمیٹی نے حکومت کو جو رپورٹ پیش کی اس پر کمیٹی کے ممبروں کے درمیان اختلاف رائے تھا۔ کمیٹی کے تین اراکین سر چمن لال سیتل واد، پنڈت جگت نرائن اور صاحب زادہ سلطان احمد خاں نے اکثریتی پارٹی یعنی یورپی ممبروں کی رپورٹ کے مقابلے میں اختلافی نوٹ لکھے اور حکومت کو پیش کر دیے۔ حکومتِ ہند نے دونوں رپورٹوں پر غور کرنے کے بعد نتائج اخذ کیے جو زیادہ تر یورپی ممبروں کی رپورٹ کے حق میں تھے اور وزیر ہند کے ذریعے یہ معاملہ برطانوی کابینہ کے سامنے پیش کر دیا۔

دارالعوام میں بجٹ اجلاس کے دوران میں مسٹر ایڈورڈ کارسن نے ہندوستان کی صورتِ حال سے نمٹنے کے طریقۂ کار، پنجاب میں مارشل لا کے نفاذ اور جلیانوالہ باغ کے سانحے پر حکومت کی مذمت کرتے ہوئے تخفیفِ زر کی ایک تحریک پیش کی۔ ونسٹن چرچل نے اپنے مخصوص انداز میں مارشل لا کی بعض قابلِ اعتراض باتوں پر دھواں دھار تقریر کی۔ جب مانٹیگو تقریر کرنے اٹھے تو انھوں نے بھی فوجی حکومت کے خلاف بعض سخت باتیں کہیں۔

تخفیفِ زر کی تحریک پر جب رائے شماری کرائی گئی تو ۳۷ ووٹوں کے مقابلے میں ۲۴۷ ووٹوں سے یہ تحریک نامنظور کر دی گئی۔ لیکن پارلیمنٹ میں اس معاملے پر بحث سے حکومتِ ہند کی بنیاد بری طرح ہل گئی۔

تاہم اس کے بعد جنرل ڈائر سے مستعفی ہو جانے کے لیے کہا گیا اور "میدہ الیقین

ہے کہ اُسے آدھی پنشن دی گئی[1]"

۱۹ر جولائی ۱۹۲۰ء کو دارالاُمرا میں اس واقعے کی گونج سنائی دی۔ لارڈ فنلے نے جنرل ڈائر کے متعلق احکامات منظور کرتے پر حکومت کے خلاف تحریک مذمت پیش کی۔ تحریک پر بحث کے دوران لارڈ فنلے نے ہنٹر کمیٹی کے ہندوستانی ممبروں پر جانبداری کا الزام لگایا۔ لارڈ سنہا نے کمیٹی کے ہندوستانی اراکین کا دفاع کیا اور ان تینوں اصحاب کی بے داغ سیاسی زندگی پر روشنی ڈالی۔ لارڈ سنہا، دارالامرا کے واحد اور پہلے ہندوستانی رکن تھے۔

اس پر دارالامرا میں غیر معمولی بحث ہوئی اور بہ ظاہر ہوگیا کہ اس معاملے پر ایوان میں اختلاف رائے ہے۔ تقریباً آدھے ممبر لارڈ سنہا کی موافقت میں تھے۔ آخر لارڈ کرزن نے، جو ہندوستان کے مسئلوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے، تحریک کی مخالفت اور حکومت کا دفاع کیا۔ تحریک مذمت کے حق میں ۱۲۹ اور مخالفت میں ۸۶ ووٹ آئے۔

پنجاب میں جنرل ڈائر کی سرگرمیوں کے متعلق پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں کی بحث کو برطانوی اخباروں نے خوب اُچھالا اور برطانیہ کے سرمایہ داروں کے رجعت پسند اخباروں نے اسے قومی ہیرو بنا دیا۔ اسے ان عظیم انگریز باشندوں میں شمار کیا گیا جنھوں نے سلطنتِ برطانیہ کی عظمت اور شان و شوکت میں اضافہ کیا اور اسے دُنیا کی سب سے بڑی سلطنت بنا دیا۔ طاقتور اخبارات رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور عوام کے خیالات و احساسات کا رُخ کسی بھی سمت موڑ سکتے ہیں۔ ان اخباروں نے جنرل ڈائر کو ایک قومی ہیرو بنا کر عوام کے سامنے پیش کیا جسے نوآبادیات

---

[1] دی کلکٹنز اینڈری فلکٹنز۔ چمن لال سیتل واد۔

کے عوام کے ہاتھوں مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ اخبارات کے پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر کچھ لوگوں نے جنرل کی مدد کے لیے رقم جمع کرنی شروع کی اور بعد میں "بہی خواہ عوام" کی طرف سے اسے تھیلی پیش کی گئی۔

بعض انگریز نورخوں اور سیاسی مبصروں کو بھی مجبوراً یہ لکھنا پڑا کہ جنرل ڈائر کو تھیلی پیش کرنا اور اخباروں میں اس کی مدح و ستائش قابلِ مذمت فعل تھے اور ان سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان تلخی بڑھ گئی تھی۔

سر ویلنٹن شیرول نے لکھا ہے۔ "ہندوستانیوں کے جذبات انتہا تک پہنچ گئے تھے۔ ہندوستانی عوام ہندوستان کی مجلسِ قانون ساز کی پابندو بے نتیجہ بحث اور انگلستان میں جنرل ڈائر کی عظمت کے اعتراف کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم سے بہت ناراض تھے۔ ادھر پنجاب میں حکومت ابھی تک جلیانوالہ باغ کے سانحے کے نتیجے میں بیوہ ہونے والی عورتوں اور یتیموں کو خیرات بانٹنے میں حجت کر رہی تھی۔"[1]

دریں اثنا افقِ سیاست پر گاندھی کے نمودار ہونے سے ہوم رول لیگ اور کانگریس میں دور رس تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ گاندھی دوسرے رہنماؤں سے آگے بڑھ کر ان دونوں تنظیموں پر قبضہ کر لینے کی فکر میں تھے۔ وہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آئے اور ۲۵ رمئی ۱۹۱۵ء کو انھوں نے سابرمتی آشرم قائم کیا۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک سے متعلق تجربات اسی آشرم میں کیے۔ اس کے بعد ۱۹۱۷ء میں انھوں نے حکومت پر زور دیا کہ جنوبی افریقہ کے لیے بھرتی کیے جانے والے مزدوروں کے متعلق پالیسی پر نظرِ ثانی کی جائے۔ چمپارن میں انھوں نے ۱۹۱۷ء میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کی۔ ۱۹۱۸ء میں کیہرہ میں بھی اس تحریک کا آغاز کیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں

---

[1] انڈیا اولڈ اینڈ نیو۔ سر ویلنٹن شیرول۔ مطبوعہ ۱۹۲۱ء میکملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ لندن۔ صفحہ ۱۸۴/۵

عظیم صنعتی مرکز احمد آباد میں مزدوروں کی کامیاب ہڑتال کرائی اور اس ہڑتال کے لیے خود کئی روز تک مرن برت رکھا۔ جب مانٹیگو نے ہندوستان کا دورہ کیا تو اس نے گاندھی کے متعلق بدیں الفاظ اپنے تاثرات رقم کیے۔ "وہ (گاندھی) قلیوں کا سا لباس پہنتے ہیں، ترکِ لذّات کے حامی ہیں، ہوا پر زندہ ہیں اور خالصتہً تصوّر پرست ہیں"[۱]

یہی زمانہ تھا جب مسز اینی بیسنٹ کی مقبولیت کم ہوتی جا رہی تھی اور کچھ لیڈروں نے تو اس بات پر شک کرنا شروع کر دیا تھا کہ انھیں اہلِ ہند کے موقف سے کوئی جذباتی تعلّق بھی ہے کہ نہیں ان تمام شبہوں کی بنیاد ان کی برطانوی شہریت تھی۔ ہوم رول لیگ کے سرکردہ ممبروں نے ایک طاقت ور گروہ بنایا تاکہ انھیں لیگ کی صدارت سے ہٹا کر گاندھی کو صدر بنا دیا جائے۔ ان لوگوں میں کے ایم منشی بھی شامل تھے انھوں نے لکھا ہے: "میں نے سب سے آخر میں اس بات سے اتفاق کیا۔ اس وقت میرا خیال تھا کہ گاندھی جی کا طریقہ کار غیر یقینی، مبہم اور غیر عملی ہے۔"

بہرطور گاندھی جی کو ہوم رول لیگ کا صدر منتخب کر لیا گیا اور مسز بیسنٹ کو بحالتِ مجبوری اس تنظیم کا فیصلہ قبول کرنا پڑا جسے انھوں نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا تھا۔ جن لوگوں نے گاندھی کو لیگ کے صدر کی حیثیت سے اس پر مسلط کیا تھا انھیں بہت جلد یہ معلوم ہو گیا کہ گاندھی تو مسز بیسنٹ کے مقابلے میں کہیں زیادہ مطلق العنان ہیں۔ کے ایم منشی اس سلسلے میں لکھتے ہیں۔ "کوئی قرارداد اس وقت تک منظور نہیں ہو سکتی تھی جب تک اس کا مسودہ خود گاندھی جی تیار نہ کریں۔ ہمیں کسی معاملے پر رائے شماری کرانے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ دو چار منٹ کی بحث کے بعد ہر شخص کو چپ چاپ منظوری دینا پڑتی — ہم ششدر رہ جاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ احساس تحقیر ہوتا کہ ٹھیس پہنچتی تھی۔"[۲]

---

[۱] ڈائری آف مسٹر مانٹیگو
[۲] آئی فالو دی مہاتما۔ کے ایم منشی۔ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔ صفحہ ۱۷
[۳] محولہ بالا۔ صفحہ ۲۰

مانٹیگو نے، جسے سیاسی رجحانات کی نبض شناسی کا ملکہ حاصل تھا، ہندوستان کے دورانِ قیام میں کہا تھا "کاش میں حکومت ہند کو یہ سمجھا سکتا کہ ہم ایک آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہوئے ہیں" مانٹیگو ہندوستان کا دورہ کرکے انگلستان واپس چلا گیا۔ غیر ملکی نوکر شاہی طاقت و اقتدار کے نشے میں سرشار پورے ملک میں اپنے غرور اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھی اور اس کے خلاف مظاہرے اور ہنگامے روزمرّہ کی بات تھی۔ رولیٹ ایکٹ اور ضابطۂ فوجداری کا ترمیمی قانون نافذ کیا جا چکا تھا۔ گاندھی نے ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر رکھی تھی، جلیانوالہ باغ کے سانحے میں کچھ تخمینوں کے مطابق، دو ہزار ہندوستانی باشندے جامِ اجل پی چکے تھے۔ کے ایم منشی رقم طراز ہیں "لیکن اچانک پیغامبر انقلاب نے اپنا رُخ بدل لیا۔ انہیں گہرا صدمہ ہوا تھا۔ انھوں نے اعتراف کیا کہ ان سے غلطی ہوئی ہے اور غلطی بھی ہمالیہ جیسی۔ انھوں نے تحریک ختم کردی اور کسی گناہگار انسان کی طرح برت رکھ لیا اور مجھے ایک ایسے قائد کی پیروی کرتے رہنے پر بڑی شرمندگی محسوس ہوئی جو میرے خیال میں اپنے منصوبوں اور سکیموں کے نقصان دہ نتائج کا سامنا کرنے کا بھی حوصلہ نہ رکھتا تھا"[لے]

اس وقت جناح ہوم رول لیگ اور کانگریس دونوں جماعتوں کے رکن تھے اور گاندھی نے ان تنظیموں پر آمرِ مطلق کی طرح قبضہ کر رکھا تھا۔

گاندھی نے انگریزوں سے جو امیدیں باندھ رکھی تھیں، جنگ کے خاتمے کے بعد ان میں سے کوئی بھی امید پوری ہوتی نظر نہ آئی۔ اب گاندھی کو ہوش آیا۔ انھوں نے یہ سوچ کر انگریزوں کی جنگی تیاریوں میں اپنی پوری قوت سے ان کا ہاتھ بٹایا تھا کہ وہ اصلاحات کے متعلق کانگریس اور لیگ کی سکیم کے مطابق ہندوستان کے مطالبوں پر ہمدردی سے غور کریں گے لیکن انھوں نے محسوس کیا کہ انگریز حکومت خود اختیاری کے

لے آئی فالو دی مہاتما، کے ایم منشی۔ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔ صفحہ ۹

طابے پر سرد مہری برت رہے ہیں۔ جنگ کے بعد ہندوستان کی نوکر شاہی جس کے
یارات کا دائرہ برطانوی حکومت کے دباؤ کی وجہ سے اتنا وسیع نہ رہا تھا، اس نے
پر پرزے نکالنا شروع کیے۔ اور اپنے آپ کو مضبوط و مستحکم بنانے کی کوشش کرنے لگی۔
دوستان کو تو اس نئی صورتِ حال کا سامنا تھا اور گاندھی من مانے طور پر پوچھے بغیر
ن سے فیصلے کرنے میں مصروف تھے۔ جناح یہ پسند نہیں کر سکتے تھے کہ کسی ایک فرد
نے لامحدود اختیارات سونپ دیے جائیں وہ تو پیدائشی جمہوریت پسند تھے اور قانون
الادستی کا احترام کرتے تھے۔

گاندھی ہوم رول لیگ پر اپنی گرفت مکمل کرنے کی غرض سے جوڑ توڑ میں لگے ہوئے
۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ آل انڈیا ہوم رول لیگ کے مقاصد اور نصب العین تبدیل
یے جائیں۔

گاندھی نے جو تبدیلیاں تجویز کی تھیں، ۳ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو بمبئی میں ہوم رول
کے عام اجلاس میں ان پر غور کیا گیا۔ جناح ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے بڑی
دی سے ہوم رول لیگ کے مقاصد میں ردوبدل کرنے کے متعلق گاندھی کی تجویز کی
ست کی۔ ایم آر جیکر، کے ایم منشی، منگل داس پکواسا اور جمنا داس دوارکا داس نے
کی تائید کی۔ بحث کے دوران دونوں گروپوں نے ایک دوسرے کی ڈٹ کر مخالفت
جناح نے جماعت کا آئین بدلنے کے متعلق گاندھی کی تجویز کے جواز کے بارے میں
ٹ آف آرڈر پیش کیا۔ گاندھی اس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے۔ انھوں نے
دیا کہ تجویز باضابطہ ہے۔ صدر کا یہ فیصلہ درست نہ تھا۔ ان رہنماؤں نے جو
ھی کی متلون مزاجی اور خبط کے ہاتھوں پہلے ہی قوتِ برداشت کھو چکے تھے، احتجاجاً
ہوم رول لیگ سے استعفا دے دیا۔

ہوم رول لیگ سے مستعفی ہونے والے رہنماؤں نے جن میں جناح، جیکر، منشی

دیوانجیہ، دوارکاداس، این ٹی ماسٹر، جمنا داس ایم مہتا اور بپٹسٹا شامل تھے۔ اپنے مشترکہ مکتوب میں اور باتوں کے علاوہ اس بات پر بھی احتجاج کیا کہ ہوم رول لیگ کے نئے آئین میں جان بوجھ کر برطانیہ سے تعلق کا ذکر نہیں کیا گیا ہے اور اس میں غیر آئینی اور غیر قانونی سرگرمیوں کی گنجائش واضح طور پر رکھی گئی ہے بشرطیکہ یہ کرما پر امن اور مؤثر ہوں۔

گاندھی نے ایک اخباری بیان میں استعفے کے اس مشترکہ مکتوب کا جواب دیا اس بیان میں انہوں نے دیگر امور کے علاوہ یہ بھی کہا کہ میں اپنے ملک کے لیے سوراج چاہتا ہوں خواہ برطانیہ سے تعلق رکھنا پڑے یا نہ رکھنا پڑے۔ میں اس تعلق کا مخالف نہیں ہوں لیکن میں اسے اہمیت نہیں دینا چاہتا۔ میں برطانیہ سے اس تعلق کی خاطر ہندوستان کو ایک لمحے کے لیے بھی غلام نہیں رکھوں گا۔ لیکن میں نے اور میرے ہم خیال ساتھیوں نے اپنی قوت محدود کر رکھی ہے تاکہ ہم کانگریس کو اپنے ساتھ شامل کر سکیں اور اس طرح کانگریس سے ملحق رہ سکیں — پاک نظام انتظامیہ کے حکم کو نظر انداز کرنا قانون کے منافی ہو سکتا ہے لیکن میرے خیال میں یہ غیر قانونی فعل نہیں ہے۔

تیز و تند تحریر کرنا جسے کوئی جج باغیانہ سمجھتا ہو، غیر قانونی سرگرمی نہیں ہے — اگر آپ لوگ ملک کے نئے حالات میں شریک ہونا اور ملک کو اپنے تجربات اور پختگی سے فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ بنیادی طور پر کوئی بات آپ کے ضمیر کے خلاف نہیں ہے تو میں آپ کو اور آپ کے ساتھ مستعفی ہونے والے احباب کو دعوت دیتا ہوں کہ آپ اپنے استعفے پر نظر ثانی کریں۔

اس کے باوجود مخالف گروہ ہوم رول لیگ سے الگ ہی رہا اور اس طرح ہوم رول لیگ سے جسے مقبول بنانے میں جناح صاحب نے اس قدر اہم کردار ادا کیا تھا، ان کا تعلق ختم ہو گیا۔

گاندھی خیالی جنت میں بسنے والے تصور پرست انسان تھے۔ اس کے برعکس جناح حقیقت پسند تھے اور زندگی کے ٹھوس و مثبت حقائق کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ بیسویں صدی کے آخری نصف حصے کے طوفانی دور میں ان دونوں شخصیتوں میں بھرپور ٹکراؤ ہوا۔ سیاسی بیداری اور تنظیم کی رفتار تیز تر ہو گئی تھی اور جنگ کے بعد یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کا قیام انتہائی ضروری ہے۔ اصلاحات نافذ ہونے والی تھیں اور پنجاب میں مارشل لا اور دیگر علاقوں میں ظالم و جابر حکومت کے ظلم و ستم کے نتیجے میں ہندوستانی افق پر قتل و غارت گری کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ خواہ کوئی نزاعی معاملہ کیوں نہ ہو گاندھی جی سوچے سمجھے بغیر میدانِ جنگ میں کود پڑتے۔ اس کے برعکس جناح مسائل حاضرہ کے بارے میں غور و فکر سے کام لیتے اور ان مسائل کا حل تلاش کرتے۔ مسز اینی بیسنٹ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ گاندھی اچانک اور بلا سوچے سمجھے قدم اٹھاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھیں آلام و مصائب سے پیار ہے اور اس لیے اگر وہ اپنا مقصد تمام تدریجی طریقوں سے حاصل کر سکیں تو اس سے انھیں خوشی نہ ہوگی۔[1]

مسلم لیگ کے ایک خاص اجلاس جس کی صدارت راجہ صاحب محمود آباد نے کی۔ اور کانگریس کے اجلاس، جو سید حسن امام کی صدارت میں منعقد ہوا، میں مانٹفورڈ اصلاحات کے خلاف فیصلے کیے گئے۔ دونوں سیاسی تنظیموں نے کم و بیش ایک ہی سی قراردادیں منظور کیں۔ یہ اس بات کا اظہار تھا کہ اصلاحات کے متعلق سیاسی طور پر باشعور ہندوستانی باشندوں میں اتفاق رائے ہے۔ اس کے برعکس حکومت نے یہ طے کر رکھا تھا کہ خواہ عوام چاہیں یا نہ چاہیں، اصلاحات ضرور نافذ کی جائیں گی۔ ساؤتھ برو اور فیٹ ہیم

---

[1] گاندھی جی۔ رکانجی دوارکا داس۔ صفحہ ۲۲

کمیٹیاں مجوزہ اصلاحات کے تحت، حکومت کے اختیارات و بالغ رائے دہی کے سلسلے
میں تفصیلات کی ترتیب میں مصروف تھیں۔ انگلستان کے قانون ڈورا کے انداز پر ہندوستان
میں ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ نافذ تھا۔ اس قانون کے تحت حکومت ہند کو معمولی سے
بہانے بلکہ محض شک و شبے کی بنیاد ہی پر لوگوں کو قید و بند میں ڈالنے کے وسیع اختیارات
مل گئے تھے۔ اسی قانون کے تحت کامریڈ کے ایڈیٹر مولانا محمد علی اور ان کے بھائی مولانا
شوکت علی ایڈیٹر ہمدرد کو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں بند کر دیا گیا اور انھیں
صفائی کا موقع نہیں دیا گیا۔ ہندوستان کی نوکر شاہی نے علی برادران کے خلاف یہ
کارروائی ایسے وقت کی تھی جب اہل ہند خواب گراں سے بیدار ہو چکے تھے اور ملک
میں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مولانا محمد علی کی گرفتاری کا سبب یک مضمون "مصر
خالی کردو" تھا اس مضمون میں انھوں نے بڑی بے باکی سے مشرق وسطیٰ میں برطانوی حکمت
عملی (جس کا مقصد دنیائے اسلام کے حصے بخرے کرنا اور عالم اسلام کو جنگ کے بعد
کمزور و نحیف کر کے چھوڑ دینا تھا) کا پردہ چاک کیا تھا۔ دونوں بھائی قید و بند کی
صعوبتیں برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ صلح کے بعد شاہی فرمان کے بموجب سیاسی قیدیوں
کو معافی دے دی گئی اور اس طرح علی برادران کو ۲۵ دسمبر ۱۹۱۹ء کو رہائی نصیب
ہوئی۔

۱۹۱۹ء میں پارلیمنٹ کا پھر اجلاس ہوا اور مانٹیگو نے اس موقع سے فائدہ اٹھا
کر ان اصلاحات کے متعلق ایک مسودۂ قانون پیش کیا جو برطانوی حکومت۔ ہندوستان
کے لیے منظور کرنے پر آمادہ تھی۔ مانٹیگو نے دارالعوام میں یہ بل پیش کرتے ہوئے کہا۔
"اگر ہم ہندوستان پر قبضہ جمائے رہے تو ہندوستان میں نسلی کشیدگی موجود رہے گی --- اور
اسے موجود رہنا چاہیے۔ اگر ہم نظم و نسق کی نگرانی کے اختیارات جلد از جلد ہندوستان
کے بڑے بڑے صوبوں کے حوالے کر دیں تو ہندوستان کے عوام پارلیمنٹ کے ارکان پر

اعتراضات اور ان کے خلاف دل کا غبار نکالنے سے پرہیز کریں گے۔ مانٹیگو نے کہا۔
"یہ بل پارلیمنٹ کے ارکان کی وساطت سے حکومت اور ہندوستان کے عوام کے درمیان ایک اہم رابطے کی حیثیت رکھتا ہے۔ عوام کو نظم ونسق سونپ دینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ قومیت کی شاہراہ پر چلنے کے لیے بھی ہندوستان کو مدد کی ضرورت ہے۔"

ادھر ہندوستان میں یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ انگریز لاکھ یہ کہتے رہیں کہ اصلاحات فراخدلانہ اور دور رس ہیں، وہ جامع اور ترقی پذیر نہیں ہیں۔ ینگ ہسبنڈ نے لکھا ہے 'سو سال تک تذبذب میں مبتلا رہنے کے بعد آخر کار انگریزوں نے حکومت خود اختیاری قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور قدم بقدم چلنے کے بجائے ایک لمبی جست لگائی۔'[1]

اس بل کی پہلی اور دوسری خواندگی پر جو بحث ہوئی اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ مجوزہ اصلاحات کے متعلق دارالعوام کو اہل ہند کے احساسات کا ذرہ برابر بھی پاس نہیں ہے۔ دوسری خواندگی کے بعد بل کو دونوں ایوانوں کی ایک مشترکہ کمیٹی کے پاس بھیج دیا گیا تاکہ مناسب افراد کی شہادتوں کے حصول کے بعد اسے پارلیمنٹ میں پیش کیا جائے۔ اس مشترکہ کمیٹی کے سربراہ لارڈ سیلبورن تھے اور کے واحد ہندوستانی ممبر، دارالامرا کے رکن لارڈ سنہا تھے۔

اگرچہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے عوام کو برطانیہ کے وعدوں پر اعتماد نہ رہا تھا اور وہ مانٹفورڈ سکیم سے بری طرح مایوس ہوئے تھے، تاہم متعدد نمائندہ وفد (اور چند حکومت کے پٹھو بھی) اصلاحات کے متعلق ایوانوں کی مشترکہ کمیٹی کے سامنے شہادت دینے کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں تمام اعتراضات کی سماعت کی۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ اصلاحات کو مکمل طور پر مسترد کر دیا جائے

---

[1] انڈیا۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ۔ مطبوعہ جان مرے لندن ۱۹۳۰ء۔ صفحہ ۱۲۴

اور کچھ لوگ کہتے تھے کہ انھیں جوں کا توں منظور کر لیا جائے۔ مسز سروجنی نائیڈو نے کمیٹی کے سامنے یہ مطالبہ بھی پیش کیا کہ خواتین کو ووٹ ڈالنے کا حق دیا جائے۔

مسلم لیگ نے جناح صاحب کی سرکردگی میں سندھ کے جی۔ ایم بھرگری اور یعقوب حسن پر مشتمل ایک سہ نفری وفد انگلستان بھیجا اور جناح صاحب نے پارلیمانی کمیٹی کو اپنے مؤثر دلائل اور پارلیمانی صلاحیتوں سے بہت متاثر کیا۔ حاکم کتنا ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو اس کے اور محکوم کے درمیان ہمیشہ اختلاف رائے کی خلیج حائل رہتی ہے۔ لارڈ سنہا کے علاوہ کمیٹی کے تمام ارکان انگریز تھے، اس لیے اس امر کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ کمیٹی کی رائے کیا ہوگی؟ تاریخ گواہ ہے کہ ایسے مواقع پر تمام اخلاقی اصول، دلائل اور منطق بے معنی ہو جاتی ہے اور ذاتی مفاد و اغراض کامیاب ہوتی ہیں۔ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کا حشر بھی یہی ہُوا۔ نومبر ۱۹۱۹ء میں کمیٹی نے پارلیمنٹ کو اپنی رپورٹ پیش کی اور حکومت نے واضح اکثریت کے ساتھ یہ بل تیسری خواندگی کے لیے پیش کر دیا۔ جس کے ساتھ کمیٹی کی رپورٹ بھی منسلک تھی۔ اگرچہ دارالعوام نے کمیٹی کی رپورٹ پر چند اعتراضات کیے تاہم نائب وزیر ہند لارڈ سنہا دارالامرا میں بل پیش کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

برطانوی حکومت نے ۲۳ دسمبر کو اس بل کی منظوری دے دی، اور اس نے قانون کی شکل اختیار کر لی۔ اس کے بعد ایک شاہی فرمان کے ذریعے بڑے زور شور سے قانون حکومت ہند مجریہ ۱۹۱۹ء نافذ کیا گیا جس کے گرد اس برصغیر کے آئندہ سیاسی حالات کی نشوونما ہونی تھی۔

جنگ عظیم میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا تھا اس لیے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے اپنی وفاداری کے مرکز کا تعین کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ سلطنت برطانیہ کے شہری کی حیثیت سے انھیں برطانیہ کا وفادار رہنا تھا۔ لیکن اسلامی اخوت کے رشتے سے

وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ ترکی کو نقصان پہنچے۔ جنگی سرگرمیوں میں مسلمانوں کی اعانت و حمایت حاصل کرنے کے لیے برطانوی حکومت نے وعدہ کر لیا تھا کہ دنیائے اسلام کے مقامات مقدسہ کی بے حرمتی نہیں کی جائے گی اور ترکی کی کتر بیونت کر کے اس کے حصے اتحادیوں میں تقسیم نہیں کیے جائیں گے۔ لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد کسی لاش پر بیٹھے ہوئے گدھ کی طرح فاتح ممالک یہ کوشش کر رہے تھے کہ ترکی کا زیادہ سے زیادہ علاقہ ہتھیا لیں۔ نہ صرف ترکی بلکہ دیگر اسلامی ممالک کے بارے میں بھی ان کے عزائم یہی تھے۔ اس پر برصغیر کے مسلمانوں میں خاصا ہیجان پیدا ہو گیا۔ انھیں اندیشہ تھا کہ ان کے مقدس مقامات غیر مسلموں کے تسلط کے بعد ان کی دستبرد سے محفوظ نہ رہیں گے۔ نہ صرف یہی نہیں بلکہ اتحادی عالمِ اسلام کے مفاد کے خلاف یہودیوں کی خواہشات کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے تھے۔ اب یہ بات صاف تھی کہ خلافت ترکی کی مرکزی حیثیت ختم کر دی جائے گی اور اسے اتحادیوں کا باجگذار بنا لیا جائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں نے اسلامی ملکوں کے خلاف اس ناپاک سازش کا پوری قوت سے مقابلہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔

صلح سے کم و بیش ایک سال پہلے دلّی میں مسلم لیگ کا گیارھواں اجلاس ہوا جس کی صدارت اے کے فضل الحق نے کی۔ انھوں نے بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں کہا۔ "اگر اتحادی ترکی کو ختم کرنے کے لیے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں تو مجھے کوئی تعجب نہ ہو گا ــــ ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم دوسرے فرقوں کے خلاف اپنے تمام جذبات کو بالائے طاق رکھ دیں اور اپنی مشکلات میں ان کی امداد و تعاون حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

تاریخی اعتبار سے یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ پاکستان کے قیام سے قبل ہی سے اس برصغیر کے مسلمان دنیا کے دوسرے مسلمانوں سے مذہبی رشتے کے علاوہ سیاسی اعتبار سے بھی اپنے آپ کو وابستہ سمجھتے تھے۔ آج بھی اہل پاکستان اسی انداز

سے سوچتے ہیں اور اسی تاریخی روایت کی بدولت، پاکستان کے تمام اسلامی ممالک سے انتہائی دوستانہ تعلقات ہیں۔

ترکی کو جس صورتِ حال کا سامنا تھا اس کے پیشِ نظر مسلمانوں نے سنجیدگی سے حالات کا جائزہ لیا اور انھوں نے انگریزوں پر سیاسی دباؤ ڈالا کہ فاتح اتحادی ترکی کے معاملے میں حق و انصاف سے کام لیں۔ اس کے نتیجے میں ایک انتہائی طاقتور تحریک وجود میں آئی جسے تحریکِ خلافت کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کا بنیادی مقصد خلافت کا تحفظ اور اس کی بقا کے لیے کوشش کرنا تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ قید و بند کے مراحل سے گزر چکے تھے۔ علی برادران نے ہندوستان بھر میں انتہائی بےخوف اور بڑے جذباتی رہنما تھے اور جس انداز میں ان کی تربیت ہوئی تھی اس کے نتیجے میں مذہبی معاملات میں وہ کسی قسم کی بات یا نرمی کے قائل نہ تھے۔

جس وقت گاندھی جی نے ہندوستان کی قومی سیاست میں قدم رکھا، گاندھی جی نے اس وقت تک کانگریس اور مسلم لیگ میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے اور ان دونوں کے بیچ خلیج ہو گئی۔ اسی سلسلے میں دلی میں خلافت کے معاملے اور ترکی کے سوال پر غور کرنے کے لیے ہندو اور مسلم رہنماؤں نے خلافت کانفرنس طلب کی۔ یہ کانفرنس خاصی کامیاب رہی اور اس سے ایک انتہائی ممتاز ہندوستانی لیڈر کی حیثیت سے گاندھی کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ زبردست مخالفت کے باوجود گاندھی کانفرنس کی آخری قرارداد میں حکومت سے عدمِ تعاون کا مطالبہ شامل کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ خلافت کانفرنس کو ابھی ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ گاندھی نے ایک اور قلابازی کھائی۔ ہوا یوں کہ جب امرتسر میں مسلم لیگ اور کانگریس کے بیک وقت اجلاس ہوئے تو مسلم لیگ نے تو خلافت کانفرنس کی قرارداد کو پیشِ نظر رکھتے

ہوئے حکومت سے عدم تعاون کے متعلق قرارداد منظور کی۔ لیکن کانگریس نے گاندھی
کے ایما پر جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ نئے دستور کو آزما کر دیکھا جائے
اور لوگوں پر زور دیا گیا کہ وہ حکومت سے تعاون کریں۔ جناح انگلستان میں پارلیمانی
کمیٹی کے روبرو لیگ کے وفد کے سربراہ کی حیثیت سے اصلاحات کے بارے میں مسلمانوں
کا موقف پیش کرنے کے بعد ہندوستان واپس آچکے تھے۔ انھوں نے دِلّی اور امرت سر
کے اجلاس میں شرکت کی اور انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ہندوستانی لیڈر گاندھی کسی
رتب باز کی طرح اپنے اصولوں اور رائے اور موقف سے کس طرح منحرف ہو جاتے ہیں؟
ن تمام باتوں کے باوجود گاندھی بڑی جرأت سے اخلاقیات کا سہارا لے کر اپنے متضاد
وقفوں کی حمایت کرتے رہے۔

دلی کی خلافت کانفرنس میں گاندھی نے اس بات پر زور دیا کہ خلافت کے تحفظ
ے لیے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کی جائے۔ اس کا مطلب یہ ظاہر کرنا تھا کہ اس
لسلے میں وہ کانفرنس کے مسلمان شرکا کے مقابلے میں انگریزوں کے کہیں زیادہ مخالف ہیں
ں پرنجی محفلوں میں گاندھی کے دوستوں اور قریبی ساتھیوں نے اس کا خاصا مذاق بھی
ڑایا۔ اس بات کا اندازہ شاید ولبھ بھائی پٹیل کے ان الفاظ سے ہو سکے جو انھوں نے
ا ندھی کے سیکرٹری اندولال یاجنک سے کہے تھے۔ "ذرا سوچیے تو! ایسے وقت میں جب
ہم خود اپنے ملک میں انگریزوں کی سنگینوں کے زیر سایہ غلاموں کی زندگی بسر کر رہے
یں، عرب اور فلسطین کے عربوں، شام اور میسوپوٹامیہ کی آزادی کے لیے کیسے جدوجہد
ر سکتے ہیں؟ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات اور کیا ہوگی؟" اندولال نے اس کانفرنس پر
تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ان اجتماعات میں ایک ایسے بے کار محض اور عیاش سلطان
خلیفہ) کی سیاسی اور مذہبی آزادی بحال کرنے کے لیے حلق کا پورا زور لگایا جاتا جس کے
خلاف انگریز تو تھے ہی خود اس کی اپنی رعایا نے بھی بغاوت کر دی تھی۔"[1]

---

[1] گاندھی ایز آئی نو ہم۔ اندولال یاجنک، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، صفحہ ۱۱۲

علی برادران کو قدامت پسند مسلمانوں کے علاوہ گاندھی اور سوامی شردھانند (جو مسلم دشمنی میں کافی مشہور تھے) جیسے لیڈروں کی حمایت بھی حاصل تھی۔ وہ کانفرنس سے یہ طے کرانے میں کامیاب ہو گئے کہ خلافت کی بحالی کے لیے برطانوی حکومت کے خلاف، شدید اور انتہائی مؤثر پروپیگنڈہ شروع کیا جائے۔ کانفرنس نے یہ بھی طے کیا کہ ترکی کے متعلق برطانوی حکومت کی پالیسی کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۱ر نومبر کو صلح کے سلسلے میں ہونے والے جشن کا بائیکاٹ کیا جائے۔ گاندھی نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں لکھا۔ "ایک تجویز پیش کی گئی تھی کہ خلافت کے مسئلے کے ساتھ پنجاب (مارشل لا) کے معاملے کو بھی اٹھایا جائے لیکن میں نے اس کی مخالفت کی۔" لیکن ان کے سیکرٹری نے لکھا ہے۔ "اور ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے کہ گاندھی جی نے عوام سے اپیل کی کہ پنجاب اور خلافت کے حق میں پُرامن عدم تعاون کی مہم شروع کی جائے۔"[۱]

اس زمانے میں گاندھی کے اخبار میں جو مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے ولبھ بھائی پٹیل اندولال یگنک سے اکثر کہا کرتے: "گاندھی جی اپنی پوری صلاحیتوں سے کام لے رہے ہیں لیکن ان کے مضامین میں وہ زور اور تاثیر نظر نہیں آتی جو پچھلے سال رولٹ ایکٹ سے متعلق اپیلوں میں موجود تھی۔"[۲]

خلافت کا معاملہ اگرچہ خالصتہً مسلمانوں سے متعلق تھا تاہم یہ معاملہ گاندھی کی نگرانی اور سربراہی میں آ گیا اور تحریک خلافت کے حامی مسلمانوں نے کسی حیل و حجت کے بغیر انھیں اپنا رہنما تسلیم کر کے مسلمانوں کی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مثال قائم کر دی۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ایک ہندو لیڈر کو مسلمانوں نے اپنی نیم سیاسی، نیم مذہبی تحریک کا قائد تسلیم کر لیا۔ گاندھی نے خلافت کے معاملے پر ہندوؤں کی حمایت حاصل کرنے کی

---

[۱] گاندھی ایز آئی نو ہم۔ اندولال یگنک۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ صفحہ ۱۱۲ ۔ [۲] محولہ بالا۔ صفحہ ۲۵۵

مر توڑ کوشش کی لیکن انھیں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس پر انھیں انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد میں خلافت کے معاملے کے علاوہ پنجاب کا مسئلہ، عدم تعاون اور ناؤ کشی کے معاملے بھی شامل کرنے پڑے۔ راے بی راجپوت نے اس تاریخی ستم ظریفی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "اس موقع پر ایک پختہ و آزمودہ کار رہنما کی ضرورت تھی۔ ابوالکلام آزاد ابھی گمنامی کی زندگی بسر کر رہے تھے اور مولانا محمد علی جیسے جذباتی شخص سے بمشکل یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ ایجی ٹیشن کے دوران میں عوام کو قابو میں رکھ سکیں گے۔ پھر تحریک کی قیادت کون کرے؟ آخر نظر انتخاب ایم کے گاندھی پر پڑی۔"[۱]

۱۴ مئی ۱۹۲۰ء کو ترکی سے صلح نامے کی شرائط شائع کی گئیں۔ وائسرائے نے ایک بیان میں یہ کہہ کر مسلمانوں کے زخموں پر نمک چھڑکا کہ صلح نامے سے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس تو پہنچے گی تاہم انھیں صبر و ضبط سے کام لینا چاہیے۔

جنگ کے دوران میں برطانیہ کے وزیر اعظم لائڈ جارج نے ہندوستانی مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ "ہم ترکی کو ایشیائے کوچک اور تھریس کے شاداب علاقوں سے (جہاں ترکوں کی اکثریت ہے) محروم کرنے کے لیے جنگ نہیں کر رہے ہیں۔" یہ وعدے جنگ کے بعد وفا نہ کیے گئے۔ اور بجائے اس کے کہ جزیرۃ العرب مع میسوپوٹیمیا، شام اور فلسطین جہاں مسلمانوں کے مقامات مقدسہ واقع تھے خلیفہ اسلام کے تحت رہنے دیے جاتے، ان کے حصے بخرے کر دیے گئے۔ تھریس یونان کو دے دیا گیا۔ سلطنت ترکیہ کے ایشیائی علاقے برطانیہ اور فرانس نے بانٹ لیے اور خلیفہ ایک طرح سے قیدی ہو کر رہ گیا۔ برطانوی حکومت کی اس وعدہ خلافی پر مسلمان بپھر اٹھے — جنھوں نے انگریزوں پر اعتماد کرتے ہوئے اپنے مسلمان بھائیوں کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔[۲]

---

[۱] مسلم لیگ یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے۔ راے بی راجپوت۔ مطبوعہ ۱۹۴۸ء۔ صفحہ ۳۰

[۲] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۳۱۹

انگریزوں نے مسلمانوں پر مصائب کی انتہا کر دی تھی اور اب ان کی قوتِ برداشت جواب دے رہی تھی۔ مولانا محمد علی نے، جو افضل اقبال کے الفاظ ہیں "نپولین کا سا دل، برک کی سی خطابت اور میکالے کے سے قلم[1] کے مالک تھے خلافت کے سوال پر پیرس میں ۲۱ مارچ ۱۹۲۰ء کو ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے کہا: ہم یہاں آپ سے صرف ایک چیز مانگنے آئے ہیں جو ہمیں ساری دنیا سے زیادہ عزیز ہے، جو ہمارے نزدیک تمام دنیاوی دولت سے زیادہ بیش بہا ہے ــــ اور وہ چیز ہمارے ضمیر کی آزادی ہے۔ خلافت صرف ترکی ہی کا معاملہ نہیں ہے، یہ تمام عالمِ اسلام کا مسئلہ ہے، یہ ہندوستان کا معاملہ ہے، الجزائر کا معاملہ ہے اور تونس کا معاملہ ہے۔" ہندوستان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا محمد علی نے کہا: "مہاتما گاندھی کی آمد سے پہلے ہندوستان کے سیاسی حالات وہی تھے جو حضرت عیسیٰ کے ظہور سے پہلے جوڈیا کے تھے۔" گاندھی جی کے تحریکِ خلافت کی قیادت سنبھالنے پر قائداعظم نے کسی جوش و خروش کا اظہار نہیں کیا جب کہ مولانا محمد علی گاندھی جی سے جو تحریکِ خلافت کے آمرِ مطلق بن چکے تھے مسحور نظر آتے تھے اور یوں اس ملک کے دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کی باگ ڈور برضا و رغبت ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی جسے محض کھینچ تان کر ہی مسلمانوں کا بہی خواہ ثابت کیا جا سکتا تھا۔[2]

تحریکِ خلافت کے آمر گاندھی نے خلافت کی بحالی کے لیے جدوجہد کی غرض سے پُرامن عدم تعاون کا پروگرام مرتب کیا۔ اس سلسلے میں یہ طے کیا گیا کہ ولایتی مال کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ووٹر انتخابات میں شریک نہ ہوں، وکیل عدالتی کارروائی کا مقاطعہ

---

[1] رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف مولانا محمد علی۔ افضل اقبال۔ مطبوعہ ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۲

[2] مسلم لیگ یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے۔ اے بی راجپوت۔ مطبوعہ ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۲

کریں، تمام ہندوستان ہر مزدوروں کی ہڑتالیں ہوں اور طالب علم اپنی کلاسوں میں نہ جائیں۔ چونکہ مسلمانوں میں جوش و خروش پھیلا ہوا تھا اس لیے انھوں نے گاندھی کے پروگرام کی حمایت کی۔ اس تحریک میں مسلمانان ہند کی ذہنی نشوونما کا مرکز علی گڑھ بھی کسی دوسرے ادارے سے پیچھے نہ رہا۔ علی گڑھ کے سینکڑوں طالب علموں نے تعلیم ترک کر دی۔ اس کے برعکس ہندو یونیورسٹی بنارس کے طالب علموں اور استادوں پر گاندھی کی اپیلوں اور تلقین کا کوئی اثر نہ ہوا اور ہندو یونیورسٹی تمام ہنگاموں سے الگ رہی۔ گاندھی نے اسی پر بس نہ کی، انھوں نے یہ تک کہہ دیا کہ اگر خلافت بحال نہ کی گئی تو ہندوستان کے تمام مسلمان ہجرت کر جائیں گے۔[1] یہ حقیقت ہے کہ گاندھی کے پروگرام کے اس حصے سے ہزاروں مسلمان متاثر ہوئے اور ان کے جال میں پھنس گئے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو گاندھی کی دیانت اور خلوص پر کتنا اعتماد تھا؟ ہندوستان کے مسلمانوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ کہیں یہ ہندو لیڈر خلافت کے بہانے ہندوستان کو مسلمانوں سے صاف کرنا تو نہیں چاہتا؟

ہماری تاریخ کے اس دور میں تحریک ہجرت کا آغاز ہوا اور تقریباً بیس ہزار مسلمان ہندوستان چھوڑ کر قریبی ہمسایہ ملک افغانستان کی طرف چل دیے۔ صوبہ سندھ ہجرت کی تحریک میں دوسرے صوبوں سے آگے تھا اور مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے اس تحریک میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا عبیداللہ سندھی اپنی بیشتر زندگی جلاوطنی میں گزار کر آخری عمر میں سندھ واپس آئے تھے اور شیخ عبدالمجید سندھی کی بیشتر عمر رتن کیری جیل میں گزری تھی۔ تحریک ہجرت سندھ سے بڑھتے بڑھتے شمال مغربی سرحدی صوبے اور پنجاب تک پھیل گئی جس سے افغانستان کے حکام کے لیے شدید

---

[1] مسلم لیگ یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے۔ اے بی راجپوت۔ مطبوعہ ۱۹۴۸ء صفحہ ۲۲

صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ آخر کار حکومت افغانستان نے ایک حکم کے ذریعے لوگوں کے افغانستان آنے پر پابندی لگا دی۔ اس طرح گاندھی کی قیادت کی بدولت مسلمانوں کو زبردست جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

ستمبر ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میں بیک وقت کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس ہوئے۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت لالہ لاجپت رائے اور مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت جناح نے کی۔ ان اجلاسوں کا مقصد خلافت اور عدم تعاون جیسے مسئلوں پر غور کرنا تھا۔ قائدِ اعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا "ہم یہاں خاص طور سے اس صورتِ حال پر غور کرنے کے لیے جمع ہوئے ہیں جو صلح کے بعد سے حکومت کی سوچی سمجھی پالیسی سے پیدا ہو گئی ہے۔ پہلے تو پنجاب میں ظلم و ستم کی لہر کے ساتھ رولیٹ ایکٹ نافذ کیا گیا۔ اور پھر سلطنت عثمانیہ اور خلافت کی بے حرمتی کی گئی (اس پر لوگوں نے شرم شرم کے نعرے لگائے) پہلا حملہ ہماری آزادی پر اور دوسرا حملہ ہمارے مذہب پر کیا گیا۔ ہر ملک کو دو خاص اور اہم فرائض ادا کرنا ہوتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ وہ بین الاقوامی پالیسی پر اپنی رائے کا اظہار کرے اور دوسری بات یہ کہ داخلی طور پر انصاف اور انسان دوستی کے اعلیٰ ترین آدرشوں کو برقرار رکھے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ نظم و نسق عوام کے اپنے ہاتھ میں ہو تاکہ وہ اسے اپنی مرضی کے مطابق چلا سکیں (نعرہ ہائے تحسین)۔۔۔۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی متفقہ رائے کو نظر انداز کر کے اور وزیرِ اعظم کے وعدوں سے منحرف ہو کر ترکی پر ذلت آمیز شرائط تھوپ دی گئیں اور تولیت کے پردے میں اتحادیوں نے سلطنت عثمانیہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے (شرم شرم کے نعرے) خدا کا شکر ہے کہ اس سے ہماری آنکھیں کھل گئیں اور ہم سب کو یقین ہو گیا ہے کہ ہم بین الاقوامی مسائل میں اپنی نمائندگی کے لیے حکومتِ ہند یا برطانوی حکومت پر بھروسہ نہیں کر سکتے"۔ قائدِ اعظم نے کہا کہ خلافت کانفرنس کے اختیارات کی تفویض کے بعد گاندھی نے مسلم لیگ

کے سامنے عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا اور اب لیگ کو اس معاملے پر فیصلہ کرنا ہے قائد اعظم نے عدم تعاون کی تحریک کی حمایت کرنے کی اپیل نہیں کی بلکہ لوگوں کو خبردار کیا کہ "صرف آپ ہی کو اپنی طاقت کا اندازہ لگانا ہے اور کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے اس معاملے کے سیاق و سباق پر غور کرنا ہے" بعد میں پیش آنے والے واقعات سے یہ ثابت ہو گیا کہ وہ عدم تعاون کے خلاف تھے لیکن فطری طور پر جمہوریت پسند ہونے کے ناطے انھوں نے اپنے پیروؤں کو خود فیصلہ کرنے کی آزادی دے دی۔ کانفرنس کے بعد ایک اخباری نمائندہ نے عدم تعاون کی تحریک کے بارے میں ان کی رائے معلوم کی تو انھوں نے کہا "میں اس تحریک کے پروگرام کا مطالعہ نہیں کر سکا ہوں اور جب تک میں مطالعہ نہ کر لوں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اب جناح اور گاندھی کے درمیان خط فاصل غیر مبہم اور واضح ہو چکا تھا اور دونوں رہنماؤں کے سیاسی اشتراک عمل کے ختم ہونے میں کچھ ہی دیر رہ گئی تھی۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں جناح نے ہوم رول لیگ کے ایک اجلاس میں جس کے صدر گاندھی جی تھے، ان کے ایک غلط فیصلے کے خلاف احتجاج کے طور پر ۱۹ دیگر ساتھیوں کے ہمراہ ہوم رول لیگ سے استعفا دے دیا۔ گاندھی نے انھیں ایک خط میں لکھا کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کریں لیکن جناح کا ذہن اس وقت ایسے اہم فیصلے کرنے میں مصروف تھا جن سے برصغیر کی سیاست میں ان کے لیے نئی راہیں استوار ہونے والی تھیں ــــ اس لیے انھوں نے گاندھی کو جو جواب دیا وہ بڑا اہم ہے۔ انھوں نے لکھا "آپ نے ملک کی نئی زندگی میں میری شرکت کے متعلق جو تجویز کی ہے، میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر اس نئی زندگی سے آپ کا مقصد اپنے طریقے اور پروگرام ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں قبول نہیں کر سکتا کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ان کا حاصل تباہی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ لیکن صحیح معنوں میں ملک کی نئی زندگی یہ ہے کہ ہمارا مقابلہ ایک

ایسی حکومت سے ہے جو عوام کی شکایات، جذبات و احساسات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ یہ کہ ہمارے ہم وطن متحد نہیں ہیں، یہ کہ اعتدال پسند جماعت اب تک غلط اقدام کر رہی ہے، یہ کہ آپ اب تک جتنے اداروں سے بھی متعلق رہے ہیں آپ کے طریقۂ کار سے ان کا شیرازہ منتشر ہو گیا ہے اور ملک کی سیاسی زندگی میں نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں اور ہندوؤں اور مسلمانوں اور مسلمانوں کے درمیان حتیٰ کہ باپ اور بیٹوں تک میں چپقلش اور اختلاف پیدا ہو گیا ہے۔ ملک بھر میں لوگ عام طور پر انتہائی مایوس ہیں اور آپ کے انتہا پسندانہ پروگرام سے وقتی طور پر زیادہ تر ناتجربہ کار نوجوان، کم فہم اور ناخواندہ افراد متاثر ہوئے ہیں۔ ان تمام باتوں کا مطلب بدنظمی اور افراتفری کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے جو نتائج ہوں گے میں اُن کے تصور سے کانپ جاتا ہوں لیکن ایک بات پر مجھے یقین ہے اور وہ یہ کہ اس کا سبب بنیادی طور پر حکومت کی موجودہ پالیسی ہے اور جب تک یہ علت دور نہ ہوگی، اثرات موجود رہیں گے۔ بے چینی اور انتشار کے اسباب کو دور کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ میرے وطن کے عوام کا شیرازہ اس طرح منتشر ہو جائے۔ قوم پرست عناصر کے لیے صرف ایک راستہ موجود ہے اور وہ یہ کہ متحد ہو کر ایک ایسا پروگرام مرتب کریں کہ مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے ملک بھر میں اتفاق رائے ہو سکے۔ کوئی فردِ واحد یہ پروگرام تیار نہیں کر سکتا بلکہ یہ کام ملک کے ممتاز قوم پرست رہنماؤں کو انجام دینا ہوگا اور اس مقصد کے حصول کے لیے مجھے یقین ہے کہ میں اور میرے ساتھی جد و جہد کرتے رہیں گے۔"

دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب ناگپور میں بیک وقت کانگریس اور لیگ کے اجلاس ہوئے تو گاندھی کی سرکردگی میں تحریکِ خلافت اور کانگریس ایک عظیم طاقت کا روپ دھار چکی تھی۔ اس کے مقابلے میں مسلم لیگ نسبتاً کمزور تھی۔ سیاسی اور مذہبی اعتبار سے مسلمانوں کے انتہا پسند عناصر خلافت کی تحریک میں شامل تھے اور ان کے موقف نے لیگ کو کمزور کر دیا

تھا۔ کانگریس کا اجلاس بڑے جوش و خروش کے ساتھ ہوا۔ کسی بھی تنظیم کے حامی اس کی کامیابی سے پھولے نہیں سماتے اور ان کے نزدیک اس کامیابی سے ان کی تنظیم کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ کانگریس کے اجلاس کی صدارت جنوبی ہندوستان کے سی وجیہ گھو ادے چریر کر رہے تھے۔ عام اجلاس میں تقریباً ۵ ہزار آدمیوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر برطانیہ کی لیبر پارٹی کے مندوب کی حیثیت سے کرنل ویج وڈ، ہلفورڈ نائٹ اور بین اسپونر بھی کانگریسی لیڈروں کے ساتھ ڈائس پر موجود تھے۔

۴ ستمبر سے ۹ ستمبر ۱۹۲۰ تک کلکتہ میں کانگریس کا خاص اجلاس ہوا جس میں گاندھی کی خواہش کا پاس کرتے ہوئے، چند نمائندوں کی انتہائی مخالفت کے باوجود ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں کانگریس کے ارکان پر زور دیا گیا کہ نئی اصلاحات کے تحت انتخاب میں کھڑے نہ ہوں اور ووٹروں سے کہا گیا کہ وہ ووٹ نہ دیں ـــــ سی آر داس اور بپن چندر پال کی سرکردگی میں بنگال کے نمائندوں نے اس معاملے پر گاندھی کا نقطۂ نظر قبول کرنے کی سخت مخالفت کی۔ جناح اب تک کانگریس کے رکن تھے اور شاید یہی پس منظر ہے جس کی وجہ سے ڈاکٹر سیتا رمیّہ نے لکھا ہے کہ ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی سیاست میں مختلف جماعتوں کے درمیان قطعی طور پر اختلاف پیدا ہو گیا۔ بہرحال جب انتخابات ہوئے تو ۸۰ فی صد ووٹروں نے جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، انتخابات کا بائیکاٹ کیا اور کئی علاقوں سے معمولی حیثیت کے لوگ قانون ساز اسمبلیوں کے ممبر منتخب ہو گئے۔ حکومت کو مجبوراً اعتراف کرنا پڑا کہ نئی کونسلوں کے انتخاب کے بائیکاٹ سے ایسا نظر آتا ہے کہ اگلے چند برسوں کی تاریخ پر مسٹر گاندھی کی عدم تعاون کی مہم کا زبردست اثر پڑے گا۔"

کانگریس اور لیگ میں جو اختلافات رونما ہوتے ان کی ذمہ داری بڑی حد تک ناگپور کے اجلاس پر ہے کیونکہ گاندھی نے ان لوگوں پر جو ان کے خیالات سے اتفاق نہ

رکھتے تھے دباؤ ڈالا کہ وہ ان کے مسلک کو اختیار کر لیں اور انھیں ایک مبعوث مسیحا تسلیم کر لیں۔ اس اجلاس کے صدر وجیہ گھوا دُے چریر کا کانگریس میں زیادہ اثر نہ تھا جب بھی کوئی ایسی قرارداد بحث کے لیے پیش کی جاتی جس سے انھیں اتفاق نہ ہو' اور کرسیِ صدارت خالی کر دیتے۔ سی آر داس بنگال کے موقف کے حق میں جدوجہد کی غرض سے اپنے خرچ پر بنگال کے ڈھائی سو مندوبین کو اجلاس میں لے کر آئے تھے۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس اجلاس میں گاندھی کی تیار کردہ ایک قرارداد منظور کر لی گئی اور ان کے خیالات سے اتفاق نہ رکھنے والے افراد کی مخالفت کے باوجود کانگریس کا مسلک بدل دیا گیا۔ جناح نے مجموعی اعتبار سے اس قرارداد پر زبردست نکتہ چینی کی اور اپنے مخصوص انداز میں ہندوستان کی سیاسی صورت حال اور اس کے مستقبل پر روشنی ڈالی۔ لیکن ۵۰ ہزار افراد کے اجتماع کو دلائل سے متاثر کرنے کے مقابلے میں ان کے جذبات سے کھیلنا زیادہ آسان ہے۔ جب قائداعظم اجتماع سے خطاب کرنے کے لیے کھڑے ہوئے تو انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ سے شروع کی "میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں" ان کی آواز شور و غل اور ہنگامے میں ڈوب گئی۔ انھیں یقین ہو گیا کہ حاضرینِ جلسہ ان کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ اسی طرح ڈائس پر کھڑے خاموشی سے ہنگامہ ختم ہونے کا انتظار کرتے رہے اور جب شور و غوغا ختم ہوا تو پھر انھوں نے تقریر شروع کرنی چاہی۔ ابھی انھوں نے یہی کہا تھا کہ "میں اس قرارداد کی مخالفت کرتا ہوں ــــ" کہ لوگوں نے پھر ہڑبونگ شروع کر دی۔ ہجوم کی اس غوغا آرائی کے باوجود انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ وہ ایک رہنما تھے اور دوسرے ان پر حکم نہیں چلا سکتے تھے، انھیں اس امر کا بخوبی احساس تھا۔ انھوں نے گھن گرج کے ساتھ تقریر جاری رکھی اور قرارداد کی بھرپور مخالفت کی۔ آہستہ آہستہ ان کے حوصلے اور تحمل کے سامنے ہنگامہ پسندوں نے ہتھیار ڈال دیے اور پنڈال میں خاموشی چھا گئی۔ انھوں

نے اپنے عزم اور حوصلے سے لوگوں کو اپنے حق میں کرلیا تاہم ان کے ووٹ حاصل نہ کرسکے۔

ناگپور اجلاس سے پہلے کانگریس کا مسلک "دستوری اور آئینی طریقوں سے قومی اتحاد کے ذریعے نظم ونسق میں اصلاح کرانا تھا" ناگپور اجلاس میں گاندھی نے جو قرارداد پیش کی تھی اس میں کہا گیا تھا کہ "انڈین نیشنل کانگریس کا مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی عوام تمام جائز اور پرامن طریقوں سے سوراج حاصل کریں۔" سیتل واد نے لکھا ہے "جناح نے اس بنیادی تبدیلی کی شدید مخالفت کی اور حاضرین کی اکثریت کی خلل اندازی کے باوجود اپنے موقف پر قائم رہے۔ اس کے بعد جناح کانگریس سے الگ ہوگئے"[1]

تحریک خلافت میں مسلمانوں کی قیادت گاندھی کے ہاتھ میں ہونے سے اس وقت کے کچھ مسلمان رہنماؤں کو تعجب ہوا لیکن آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد اس ستم ظریفی کی وضاحت کرنا آسان نہیں ہے۔ بظاہر یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ مسلمان ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں خلافت جیسا معاملہ دینے پر آمادہ ہوگئے تھے جس نے لکھا ہے، "میں خود کو سناتنی (قدامت پسند) ہندو کہتا ہوں کیونکہ اول تو ویدوں، اپنشدوں، پرانوں اور ہندوؤں کی تمام دینی کتب پر میرا اعتقاد ہے ــ دوم یہ کہ میں ویدوں کے مطابق ورناشرم دھرم (نسلی امتیاز کا قانون) کا قائل ہوں۔ تیسری بات یہ کہ میں گئو ماتا کے تحفظ کو دھرم کا جزو سمجھتا ہوں اور چوتھی بات یہ کہ مورتی پوجا پر میرا ایمان ہے"[2] ــ

ڈاکٹر سیتا رمیہ نے لکھا ہے۔ "ناگپور اجلاس گاندھی کی ذاتی فتح کی حیثیت رکھتا ہے ــ پال، مالویہ، جناح، کھاپرڈے، داس اور لالہ جی جیسے آزمودہ کار سیاست دانوں کو

---

[1] ری کلکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ چمن لال سیتل واد مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ صفحہ ۳۱۵

[2] ینگ انڈیا۔ ۱۲ر اکتوبر ۱۹۲۱ء۔ اداریہ از ایم کے گاندھی۔

آسانی سے زیر کر لیا گیا[1]۔ اس وقت کی دو ممتاز سیاسی شخصیات جناح اور گاندھی کے نقطۂ نظر، در انداز فکر میں تصادم قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا اور عنقریب دونوں کی راہیں جدا ہونے والی تھیں۔

جناح گاندھی کی بائیکاٹ اور غیر متشدد عدم تعاون کی قرارداد کے انتہائی مخالف تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سکولوں، کالجوں، مجالس قانون ساز اور لوکل باڈیز میں سامراجیت کے خلاف جدوجہد آئینی شکل میں ہونی چاہیئے۔ ان کے علاوہ ایک اور مسلمان رہنما مولانا حسرت موہانی بھی گاندھی کی قرارداد کی مخالفت کر رہے تھے لیکن ان کی مخالفت میں انتہاپسندی کا رنگ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر ہندوستان آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو عدم تشدد سے نہیں بلکہ تشدد سے کام لینا ہو گا۔ گاندھی کی تجویز کردہ نرم کارروائیوں سے جن کے ساتھ مذہبی اوہام بھی نتھی ہیں، کام نہیں چلے گا۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو آئرلینڈ کے واقعات سے سبق حاصل کرنا چاہیے[2]۔

ناگپور اجلاس میں جناح سرکشی کی کیفیت میں تھے۔ وہ سوچتے تھے کہ آخر میرے ساتھیوں اور عوام کو کیا ہو گیا ہے جو ایک فردِ واحد کی اندھی تقلید کر رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے موقع پر گاندھی کا مقابلہ کر رہے تھے جب کہ گاندھی کے گرد ان کے مداحین نے ایک آہنی فصیل کھڑی کر رکھی تھی اور ان کو یہ یقین ہو گیا کہ اب زیادہ حوصلے اور جرأت سے کام کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ جب بھی وہ گاندھی کا ذکر کرتے تو جان بوجھ کر انہیں مہاتما کے بجائے مسٹر گاندھی کہا کرتے۔ لوگ چیختے چلاتے کہ مہاتما گاندھی کو مہاتما گاندھی کہو۔ لیکن وہ ان باتوں کا کوئی اثر قبول نہ کرتے اور لوگوں کے شور و غل

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس، ڈاکٹر پتابھی سیتا رمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۰۸
[2] یہ امر ان چشم دید واقعات پر مبنی ہے جو جناب ضیاالدین برنی نے مصنف کو سنائے ہیں۔

سے بے نیازان کو بدستور مسٹر گاندھی کہتے رہے۔ اپنی تقریر کے دوران میں ایک بار انھوں نے مولانا محمد علی کو "مسٹر محمد علی" کہا تو لوگ پھر مشتعل ہو گئے اور آوازیں آنے لگیں نہیں نہیں۔ مولانا محمد علی کہو"۔ چند منٹ تک اسی طرح ہنگامہ ہوتا رہا اور جب سکون ہوا تو جناح نے مجمع پر حقارت کی نگاہ ڈالتے ہوئے بڑی گھمبیر آواز میں کہا "میں آپ آپ کا حکم نہیں مان سکتا۔ مجھے یہ حق ہے کہ میں کسی شخص کو جس لقب سے چاہوں مخاطب کروں بشرطیکہ وہ ناشائستہ نہ ہو۔ میں مسٹر محمد علی کو مولانا تسلیم نہیں کرتا"[1] انھوں نے ہجوم کو خاموش اور لاجواب کر دیا اور اس کے بعد جب بھی دونوں آدمیوں کا ذکر کیا انھیں مسٹر ہی کہا۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا شوکت علی اس پر بڑے ناراض ہوئے اور اپنے بھائی کی توہین کو ذاتی توہین سمجھ کر لاٹھی لے کر مسٹر جناح کی طرف بڑھے لیکن عدم تشدد آڑے آگیا۔[2]

چند مہینوں بعد ۲۱ فروری ۱۹۲۱ء کو بمبئی کے شہریوں نے عظیم محب وطن گوکھلے کی برسی کے سلسلے میں مجلس خدام ہند (سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی) کے احاطے میں ایک جلسہ عام کا انتظام کیا۔ گوکھلے نے سوسائٹی کے قیام میں کافی ہاتھ بٹایا تھا اور اپنی زندگی میں اسے بڑی ترقی دی تھی۔ ڈاکٹر آر پی۔ پارنجپے، جو گوکھلے کے انتقال کے بعد فرگوسن کالج کے پرنسپل مقرر کیے گئے تھے، اس جلسے کی صدارت کر رہے تھے اور گوکھلے کے مداح جناح مقررین خصوصی میں شامل تھے۔ جب جناح تقریر کرنے کے لیے اٹھے تو لوگوں نے، بمبئی کے عوام کے اس ہیرو کا استقبال پر جوش "تالیوں سے کیا۔ اپنی تقریر میں جناح نے پہلے تو گوکھلے کے اوصاف اور ہندوستان کے سیاسی مقاصد کے سلسلے میں ان کی خدمات کا ذکر کیا اور حاضرین جلسہ کی داد و تحسین حاصل کی۔ اس کے بعد انھوں نے

---

[1] میٹ مسٹر جناح۔ اے۔ اے۔ رؤف۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ء۔ صفحہ ۲۲۵۔ [2] محولہ بالا۔

ملک کے موجودہ سیاسی حالات پر روشنی ڈالی اور اس سلسلے میں گاندھی کے سیاسی کردار
اور اجلاس ناگپور میں اپنی شرانگیز قرارداد منوانے کے لیے کانگریس پر دباؤ ڈالنے کا ذکر
کیا جس کی جناح شدید مخالفت کر چکے تھے۔ یہ سن کر لوگوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہونے
لگے اور انھوں نے ناپسندیدگی کے اظہار کے طور پر شور و غل مچانا شروع کر دیا۔ لیکن جناح
ان باتوں سے خاموش نہیں ہو سکتے تھے۔ انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ حکومتِ ہند عوام
کی خواہشات اور اُمنگوں کی مخالف ہے۔ اس کو عوام سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور وہ
نوکر شاہی کے ہاتھ میں ہے جو حالات کو جُوں کا تُوں رکھنے پر مُصر ہے کیونکہ وہ عوام کو کوئی
رعایت دینا خود اپنے وسیع اختیارات میں کمی کرنے کے مترادف سمجھتی ہے اور اسی لیے
جانبدار نامزد ممبروں نے عوام پر اس حقیقت کے باوجود رولٹ ایکٹ جیسے قوانین
مسلط کر دیے کہ تمام غیر سرکاری ممبروں نے اس عوام دشمن قانون کی مخالفت کی تھی۔

گاندھی کے عدمِ تعاون اور بائیکاٹ کے پروگرام کا ذکر کرتے ہوئے جناح نے کہا
کہ مجھے یقین ہے کہ گاندھی غلطی اور انتہائی غلطی کر رہے ہیں۔ "میں ان کی بہت عزت و
اکرام کرتا ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ملک کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں۔" ان الفاظ
پر لوگوں نے سخت احتجاج کیا لیکن جناح نے اس کی پروا کیے بغیر اپنی تقریر جاری رکھی
اور کہا اگر مجھے گاندھی کے پروگرام سے اتفاق ہوتا تو میں عدم تعاون اور بائیکاٹ
کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیتا۔ انھوں نے کہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں ایک ایسی حقیقی
سیاسی تحریک کی ضرورت ہے جس کی بنیاد حقیقی سیاسی اصولوں اور اس جذبۂ حُب الوطنی
پر ہو جس سے ہر ہندوستانی سرشار ہو۔ جب تک یہ بنیاد موجود نہیں ہے، ہمارا پروگرام
ادھورا رہے گا۔" انتخابات کا بائیکاٹ کرنے کے متعلق گاندھی کی اپیل سے اختلاف
کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اگر ہم انتخابات میں حصّہ لیتے تو امپیریل لیجسلیٹو اسمبلی میں
ہمارے تقریباً ۳۰ بہترین آدمی منتخب ہو جاتے اور ہم حکومت کو اپنے تمام اہم مسائل پر

عوام کے حقیقی احساسات و خواہشات سے واقف کرا سکتے تھے۔ جلسہ گاہ میں سے کسی نے کہا
حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔" جناح ان اشتعال انگیزیوں کا جواب دینا جانتے تھے
انھوں نے جواب دیا کہ ان تیس منتخب ممبروں کی موجودگی سے حکومت کے لیے معاملہ اتنا زیادہ
آسان نہ رہتا اور اسے اسمبلی توڑنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ انھوں نے روس کی مثال دی جہاں
ایک مطلق العنان زار نے یہ محسوس کر کے ڈوما توڑ دی تھی کہ وہ اس کی خواہش اور مرضی کے
مطابق کام نہیں کر سکی تھی۔ ہندوستان کے حالات کا مصر کے حالات سے تقابل کرتے
ہوئے انھوں نے زغلول پاشا کی خدمات کی تعریف کی جو انھوں نے تعلیمی ترقی کے سلسلے میں
انجام دی تھیں۔ انھوں نے کہا اس کے برعکس گاندھی کی خواہش یہ ہے کہ ہمارے نوجوان
طالب علم سکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کر دیں اور توہم و افلاس میں مبتلا ہندوستانی عوام کو
تعلیم سے بہرہ ور کرنا ترک کر دیں۔

اس کے بعد جناح نے گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا
"اگر ہم ہندوستان میں عدم تشدد اور عدم تعاون کے ذریعے حالات سنوارنا چاہتے ہیں تو ہم
انسانی فطرت کو نظر انداز کرنے کی غلطی کر رہے ہیں۔" ایک بار پھر ان الفاظ پر حاضرین نے
شیم شیم کے نعرے لگائے۔ جناح اپنے موقف پر قائم رہے اور انھوں نے کہا کہ "مجھے یقین
ہے گاندھی ہمیں غلط راستے پر ڈال رہے ہیں اور اس لیے میں کسی بھی صورت میں ان کے
عدم تعاون کے مسلک کا ساتھ نہیں دوں گا۔"

انھوں نے کھل کر گاندھی سے اختلاف کرنے کی ہمت کی تھی اور اس زمانے میں
جب کہ گاندھی کے ایک ادنیٰ اشارے پر سیاسی لیڈر قعر گمنامی میں گر جاتے تھے، اس
قدر جرأت سے کام لینا ہر شخص کے بس کی بات نہ تھی۔ گاندھی سے اشتراک ختم کر دینے کے
ساتھ ساتھ جناح نے کانگریس سے بھی جس سے ان کا ساتھ تقریباً بیس سال تک رہا تھا،
علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ ہوا کے رخ پر چلنا اور کسی اجتماع کو اپنے حق میں کر لینا آسان ہے

لیکن کسی ایسے عوامی مسئلے پر اختلاف کرنا جسے قبولیت عامہ حاصل ہو، بہت دشوار ہے
لیکن قائدِ اعظم پختہ عزم و ارادہ کے مالک تھے۔ جن لوگوں سے وہ متفق نہیں ہوتے تھے،
کی مخالفت کرتے تھے اور اس طرح وہ کارزارِ سیاست میں بڑی پُر پیچ اور غیر یقینی راہوں
سے گزر رہے تھے۔

پُورے برِ صغیر میں گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کا زور تھا لیکن کچھ سیاسی رہنما
اس سے بالکل الگ تھلگ تھے۔ ان رہنماؤں میں جناح بھی شامل تھے۔ ۱۹۲۱ء کے اوا
کے لگ بھگ حکومت نے گاندھی کے مخالفین کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تاکہ
تحریک عدم تعاون کا توڑ کیا جا سکے۔ لیکن جناح نے اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور ایک
اخباری بیان میں کہا۔ "عدم تعاون کی تحریک عام بے اطمینانی کی ایک علامت اور مظہر
ہے ــــ یہ بے اطمینانی رائے عامہ اور بڑے بڑے مسئلوں کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہوئی
۔۔ عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا، دانشور اور معقولیت پسندی سے کام لینے والے افراد بھی حکو
کی موجودہ پالیسی سے کسی طرح مطمئن نہیں ہیں۔"

جس طرح بارش کے بعد ملیریا کی وبا پھیلتی ہے اسی طرح عدم تعاون کی اپیل
بعد لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور تقریباً ۳۰ ہزار افرا
مختلف جیلوں میں ٹھونس دیے گئے۔ ہراساں اور خوف زدہ حکومت کے لیے تو ذر
سا ہنگامہ بھی پریشان کن ہوتا ہے۔ معمولی معمولی باتوں پر پولیس نے مردوں، عورتو
اور بچوں پر لاٹھیاں برسائیں اور آنسو گیس پھینکی اور ان کو جیل خانوں کی اونچی اونچی
دیواروں کے اس پار دھکیل دیا گیا کہ اس طرح ہنگامے ختم ہو جائیں گے۔ ۸ر جولائی
۱۹۲۱ء کو کراچی میں کل ہند کانفرنس ہوئی اور مولانا محمد علی نے اس کانفرنس میں
صدارتی تقریر کی۔ آج تک کسی ہندوستانی باشندے نے اتنی اشتعال انگیز تقریر نہیں
کی تھی۔ یہ تقریر مولانا محمد علی کی کراچی تقریر کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کانفرنس

ں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ کانگریس کے اجلاس احمدآباد
ں جمہوریہ ہند کا پرچم لہرایا جائے اور مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ اگر برطانیہ حکومت
ورہ سے جنگ کرے تو وہ بڑے پیمانے پر سول نافرمانی شروع کر دیں۔ کانفرنس
ں ایک اور قرارداد میں کہا گیا کہ "آج سے کسی مسلمان باشندے کے لیے فوج میں
رتی ہونا یا فوجی بھرتی میں مدد دینا ناجائز قرار دیا جاتا ہے۔" حکومت ہند نے
انفرنس کے ممتاز شرکا کو گرفتار کر لیا۔ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، حسین احمد
ثار احمد، پیر غلام مجدد سندھی، ڈاکٹر کچلو اور سرادہ کے جگت گورو شری شنکراچاریہ
رفتار ہونے والوں میں شامل تھے۔ کراچی کے خالق دینا ہال میں ایک سپیشل مجسٹریٹ
یٹھا اور اس کی عدالت میں ان لیڈروں پر مقدمہ چلایا گیا۔ مولانا محمد علی نے سپیشل
سٹریٹ کے سامنے اپنے دفاع میں جو تقریر کی وہ آج بھی ان کی مقدمۂ کراچی کی تقریر
کے نام سے مشہور ہے۔ جب ان لوگوں کو سزا سنا دی گئی تو یہی تقریر عوام کے ان
طن دوست لیڈروں کی ہمدردی میں جنھیں حکومت سزا یافتہ مجرم خیال کرتی تھی، پورے
ہندوستان میں ہزاروں جلسوں میں پڑھ کر سنائی گئی۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ خلافت کے
یڈروں کی سزایابی کے بعد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے "مسلمان ریاستوں کو یقین دلایا
ہ ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری ملنے کے بعد ہندوستان کی خارجہ پالیسی کی تشکیل
یں اس بات کا لحاظ رکھا جائے گا کہ اسلام نے مسلمانوں کے لیے جو مذہبی ذمہ داریاں
تعین کی ہیں، ان کا احترام کیا جائے۔"[1]

عدم تشدد کی تحریک کے سیاسی قیدیوں کو عام معافی دی گئی تو مولانا محمد علی کو
بھی رہا کر دیا گیا۔ ان کا زبردست استقبال ہوا اور رام پور میں شاندار جلوس نکالا گیا

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیہ۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۲۶۷

لوگوں نے جس عقیدت اور جوش و خروش کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اس کے جواب میں انھوں نے جو الفاظ کہے وہ حکومت کے مخالفین میں انتہائی مقبول ہو گئے۔ مولانا محمد علی نے کہا تھا "میں چھندواڑہ جیل سے واپسی سفر کا ٹکٹ لے کر آیا ہوں"

گاندھی کی تحریک میں خرابی یہ تھی کہ اگرچہ عدم تعاون کے اصول پر عمل ہو رہا تھا لیکن قائداعظم جیسے رہنماؤں کی پیشین گوئی کے مطابق اس میں "عدم تشدد" کا اصول موجود نہ رہا تھا۔ اہنسا کے پجاری کانگریسی رضاکار اور کارکن "تشدد" کا پرچار کر رہے تھے۔ کیرالہ کے ساحل مالابار پر ویلوانڈ اور ارناڈ کے ضلعوں میں مسلمان موپلوں کی خاصی آبادی تھی۔ موپلے عرب نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے مذہبی جذبات کو ابھار کے انھیں سرکشی پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ خلافت کی تحریک کی بھن بھن ان تک پہنچ چکی تھی۔ جب انھیں مسلمان سیاسی اور مذہبی لیڈروں کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو ان میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ ان کی سرکشی کو کچلنے کے لیے حکومت نے موپلا آؤٹ ریجز ایکٹ نافذ کیا لیکن اس کا اُلٹا اثر ہوا اور پولیس کے ہاتھوں تھانگل یعنی موپلوں کے مذہبی پیشواؤں کی بے عزتی کے نتیجے میں اگست ۱۹۲۱ء میں خونریز ہنگامے شروع ہو گئے اور موپلوں نے تلواروں اور آتشیں اسلحہ سے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ موپلوں اور حکومت میں جھڑپیں بڑھتے بڑھتے "فوجی پیمانے تک پہنچ گئیں" اور موپلوں نے حکومت کے خلاف گوریلا لڑائی شروع کر دی۔ اکتوبر میں موپلوں کے علاقے میں مارشل لا نافذ کر دیا گیا۔ ساحل مالابار پر مسلمانوں کو یہ بغاوت بڑی مہنگی پڑی اور انھیں زبردست جانی و مالی نقصان اُٹھانا پڑا۔

انگریزوں نے موپلوں پر انتہائی وحشیانہ مظالم کیے جو شدت میں کلکتہ کے تاریخی بلیک ہول (اندھیری کوٹھری) سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس سے جہاں انگریزوں کی پیشانی اور رد عذابہ ہو گئی وہاں عوام کی جدوجہد آزادی میں نئے باب کا اضافہ بھی ہوا۔ انگریز

نوکرشاہی نے سو کے لگ بھگ موپلوں کو ایک ریلوے ویگن میں بند کر دیا۔ ساحل مالابار پر شدید گرمی پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ ریلوے ویگن کسی جہنم سے کم نہ تھا۔ جب ویگن اپنی منزل پر پہنچی تو بچھتر بہادر موپلے مر چکے تھے۔

تقریباً ایک مہینے بعد ۱۷ر نومبر کو پرنس آف ویلز، جو اب ڈیوک آف ونڈسر ہیں ہندوستان پہنچے۔ ان کے اعزاز میں ہونے والی تقریبوں کا بائیکاٹ کرنے کی اپیل کی گئی۔ بمبئی میں زبردست بلوے شروع ہو گئے اور ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔ ان بلووں میں تقریباً ۵۳ افراد ہلاک اور پانچ سو سے زیادہ زخمی ہوئے۔ اہنسا کے پیغامبر گاندھی اس وقت بمبئی میں موجود تھے اور انھوں نے شہر کا دورہ کر کے خود یہ دیکھ لیا کہ ان کی تحریک کی کتنی بڑی قیمت خونریزی اور غارت گری کی صورت میں صرف ایک شہر کو ایک دن میں ادا کرنی پڑی ہے۔ انھوں نے کہا "سوراج نے میرے دماغ کو متعفن کر دیا ہے"[1]

پرنس آف ویلز کے استقبال کے سلسلے میں سرکاری تقریبات ۲۵ دسمبر کو کلکتہ میں ہونے والی تھیں اور حکومت کو ڈر تھا کہ ان تقریبات کا مکمل مقاطعہ کیا جائے گا۔ پنڈت مالویہ کے ذریعے حکومت اور کانگریس میں مفاہمت کی بات چیت شروع ہوئی۔ کانگریس کے صدر سی آر داس ان دنوں علی پور جیل میں اور گاندھی احمد آباد میں تھے۔ اس بات چیت کے نتیجے میں کانگریس اس پر تیار ہو گئی کہ بائیکاٹ کی اپیل واپس لے لی جائے گی۔ اس کے بدلے میں حکومت نے سول نافرمانی کے قیدیوں کو رہا کرنا مان لیا اور کانگریس اور حکومت کے درمیان ۲۲ر مارچ کو گول میز کانفرنس منعقد کرنے پر بھی راضی ہو گئی۔ لیکن گاندھی اور داس نے یہ مطالبہ کیا کہ کسی تفریق و امتیاز کے بغیر تمام قیدیوں کو

---

[1] دی ہسٹری آف دی کانگریس۔ ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیّا۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء۔ صفحہ ۲۰۵

رہا کر دیا جائے۔ کچھ ممتاز سیاسی رہنماؤں نے حکومت اور کانگریس میں مفاہمت کے لیے رابطے کے طور پر کام کیا۔ ان رہنماؤں میں جناح اور پنڈت مالویہ آگے آگے تھے۔ لیکن انھیں اپنی کوششوں میں کامیابی نہ ہوئی اور پورے ہندوستان میں پرنس آف ویلز کے دورے کی تقریبات کا بائیکاٹ کیا گیا۔

جناح کو ان کے اس موقف سے پیچھے ہٹانا بہت مشکل تھا کہ جلد از جلد سوراج اسی صورت میں حاصل کیا جا سکتا ہے کہ ایک طرف تو ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہو جائے اور پھر دوسری طرف متحد عوام اور حکومت کے درمیان سمجھوتہ کیا جائے۔ انہی کی کوششوں کے نتیجے میں ۱۴، ۱۵ اور ۱۶ جنوری ۱۹۲۲ء کو بمبئی میں ایک کل جماعتی کانفرنس طلب کی گئی جس کی صدارت سر ایم وسویسوریہ نے کی۔ جناح اس کانفرنس کے تین سیکرٹریوں میں سے ایک تھے۔ کانفرنس نے ایک متفقہ قرارداد میں حکومت کی متشددانہ پالیسی کی مذمت کی اور مطالبہ کیا کہ قیدیوں کی رہائی، خلافت اور پنجاب کے مارشل لا کے معاملے اور سوراج کے اہم ترین مسئلے پر غور کرنے کی غرض سے حکومت اور کانگریس کے درمیان گول میز کانفرنس ہو۔ کانفرنس کے لیے خوشگوار ماحول پیدا کرنے کی غرض سے ضابطۂ فوجداری کا ترمیمی قانون اور باغیانہ اجتماعات کا قانون فوراً واپس لینے کا مطالبہ کیا گیا۔ سر ایس نائر نے کانفرنس کے کام، وہ اس کی قراردادوں پر کڑی نکتہ چینی کی لیکن جناح نے کانفرنس کے دوسرے دو سیکرٹریوں جیکر اور ناتھارجن کے ساتھ اس کے جواب میں ایک اخباری بیان دیا اور کل جماعتی کانفرنس کے فیصلوں کی حمایت کی۔

درمیانی وقفہ

بیسویں صدی کے ابتدائی سال وکیل کی حیثیت سے مسٹر جناح کی [illegible] قابلیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بعد کے دس سال میں وہ ایک سیاسی رہنما کی حیثیت سے مشہور ہوئے اور دوسری دہائی ان کی زندگی میں ایک غیر متوقع طوفان کی طرح در آئی اور کامیابی و فتح مندی کے ایسے نقوش چھوڑ گئی جس کی بدولت عظمت کا یہ مینار دوسروں کے لیے تتبع اور پیروی کا آدرش بن گیا۔ مزاجی ساخت کے لحاظ سے وہ ان پُرشور سیاسی معارکوں کے لیے موزوں نہ تھے جو بازاری اور شورہ پشت مقرر ہندوستان کے کھلے میدانوں میں لڑتے تھے۔ اس کے برعکس مجالسِ قانون ساز کی فضا ان کے مزاج کے موافق تھی۔ تاہم امن و آشتی کے علمبردار جناح کو عملی سیاست میں داخل ہونے کے بعد طوفانی زندگی بسر کرنی اور اس میدان میں طویل لڑائی لڑنی پڑی۔ بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سال کا خمیر آتشگیر مادے سے اُٹھایا گیا تھا۔ اگر وہ منضبط دل و دماغ اور مستحکم شخصیت کے مالک نہ ہوتے، جس کی بڑی وجہ ایک بیرسٹر کی حیثیت سے ان کی ذہنی تربیت تھی تو خود ان کا ایک آتش فشاں بن جانا عین ممکن تھا جو نہ جانے کیا اور کتنی قیامتیں ڈھاتا۔ فطرت کا نادیدہ ہاتھ ایک عظیم و لافانی زندگی کے راستے کی نشاندہی کر رہا تھا اور وہ برابر آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

عدالتوں میں شب و روز کی مصروفیتوں اور بقیہ اوقات میں سیاسی سرگرمیوں کے باوصف انھوں نے اپنے خاندان سے برابر قریبی رابطہ قائم رکھا۔ ان کا خاندان

اب تک خوجہ محلے میں سکونت پذیر تھا۔ ان کے والد جناح بھائی پونجا نے اپنی آنکھوں
سے اپنے بڑے بیٹے محمد علی کو بمبئی کی ایک عظیم شخصیت بنتے دیکھ لیا لیکن زندگی نے
اتنی وفا نہ کی کہ وہ اس کو ہندوستان کی ممتاز ترین قیادت کی سیڑھیوں پر چڑھتے
دیکھتے۔ جناح عظمت، مقبولیت اور شہرت کی منزلیں طے کر کے برصغیر کے ممتاز ترین
رہنماؤں میں شمار کیے جانے والے ہی تھے کہ جناح بھائی پونجا کا انتقال ہو گیا۔ والد
کے انتقال کے بعد جناح صاحب کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اپنی
بہن، فاطمہ جناح کی تعلیم کا کیا بندوبست کیا جائے۔ وہ بالکل تنہا تھے اور گھر کی ساری
ذمہ داریوں کا بوجھ ان کے کاندھوں پر آ پڑا تھا۔ اکثر و بیشتر انھیں ہندوستان کے
طول و عرض کا سفر کرنا پڑتا جس کی وجہ ان کی پیشہ ورانہ مصروفیات بھی تھیں اور
سیاسی سرگرمیاں بھی۔ بہن کی تعلیم و تربیت کے لیے انھیں کسی اچھے اسکول کی تلاش
تھی۔ اگرچہ قرب و جوار میں چند ایسی درسگاہیں موجود تھیں مگر ان میں بورڈنگ نہ تھا۔
جناح صاحب نے طے کر لیا تھا کہ فاطمہ کو وہ کسی ایسے اسکول میں داخل کرائیں گے
جہاں تعلیم کے ساتھ وہ رہ بھی سکیں۔ بالآخر وہ باندرہ میں ایک کیتھولک کانونٹ
میں گئے۔ یہ مقام شہر کے مرکزی علاقے سے خاصے فاصلے پر تھا۔ انھیں اس سکول
کے معیارِ تعلیم اور اقامتی انتظامات نے متاثر کیا اور انھوں نے اپنی ہمشیرہ کو باندرہ کانونٹ
میں داخل کرا دیا۔ جب تک فاطمہ کانونٹ میں زیرِ تعلیم رہیں وہ ہر اتوار کو بمبئی سے
گھوڑے پر سوار ہو کر باندرہ بہن سے ملنے جاتے[1]۔ تعطیلات کے دوران میں مس جناح
بھائی کے پاس آ جاتیں اور اگر وہ بمبئی میں نہ ہوتے تو اپنی شادی شدہ ہمشیرہ کے پاس
ٹھہرتیں۔ غرض اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود قائدِ اعظم نے خاندان کے بزرگ

---

[1] جناح۔ ہیکٹر بولیتھو، مطبوعہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۱۲

کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریوں کو کبھی فراموش نہیں کیا۔

۱۸۹۲ء میں یورپ روانہ ہونے سے ذرا پہلے قائداعظم کی شادی ہوئی تھی۔ انھیں کراچی سے انگلستان گئے ہوئے چند ہی روز گزرے تھے کہ ان کی نوعمر اہلیہ امی بائی کا انتقال ہو گیا۔ اب ۱۹۱۷ء کا زمانہ تھا۔ ان کی پہلی بیوی کے انتقال کو ۲۵ سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا اور انھوں نے اب تک دوسری شادی نہ کی تھی۔ ان کی عمر ۴۰ سال سے زیادہ تھی لیکن اب بھی ان کے چہرے پر جوانوں جیسی تازگی نظر آتی تھی۔ بلاشبہ وہ اپنی وجاہت اور خوش ذوقی کی وجہ سے خواتین میں مقبول ہوں گے لیکن ان میں سے کسی نے بھی انھیں شادی کے متعلق سوچنے اور غور کرنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ قائداعظم کی نجی زندگی کسی بند کتاب کے اوراق کی طرح تھی گویا انھوں نے اپنے ذاتی معاملات کے متعلق ایک قانون بنا لیا تھا کہ کوئی شخص اس بارے میں کچھ نہیں پوچھ سکتا۔ تاریخی اہمیت رکھنے والے جو افراد ایسی زندگی گزارتے ہیں ان کے متعلق اکثر و بیشتر عجیب و غریب افواہیں پھیل جاتی ہیں۔ ان میں حقیقت بھی ہوتی ہے اور افسانوی رنگ بھی لیکن قائداعظم کے معاملے میں کوئی بہتان تراشی نہیں کی جاسکتی۔ وہ نہایت پاکیزہ زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ دوسروں کی نظر میں وہ ایک کامیاب انسان تھے لیکن خود اپنی نظر میں ایک ایسا تنہا شخص جو زندگی کے مسائل سے نبرد آزما تھا اور پھر بھی ان سے دور تھا۔ ۴۰ سال کی عمر تک وہ تجرد و تنہائی کی زندگی گزارتے رہے۔ ان کی دنیا میں رومان کی ایک ہلکی سی لہر بھی نہ آئی۔

لیکن کیوپڈ کا کوئی مدون ضابطۂ قانون نہیں ہے۔ وہ کسی نہ کسی گوشے سے انسان کے دل کو نشانہ بنا ہی لیتا ہے۔ جناح صاحب بمبئی کے مالدار پارسی فرقے میں بہت مقبول تھے۔ اگرچہ یہ فرقہ سماجی اعتبار سے آزاد خیال ہے تاہم غیر پارسیوں کے ساتھ شادی بیاہ کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتا۔ بمبئی کے پارسیوں کا ایک مخصوص

کلب تھا جہاں بیشتر مالدار پارسی روزانہ شام کو مل بیٹھتے۔ اس کلب کے ممبر صرف پارسی فرقے کے افراد ہی بن سکتے تھے۔ لیکن ممبروں کو کلب میں غیر پارسی مہمان لانے کی اجازت تھی۔ جناح صاحب اس کلب کے ممبروں کے مستقل مہمان کی حیثیت رکھتے تھے اور اس طرح کلب میں اٹھنے بیٹھنے والے کچھ مالدار گھرانوں سے انھیں میل جول کا موقع ملا۔ ان میں سرڈنشا اور لیڈی پیٹٹ بھی تھیں جن سے ان کی اکثر ملاقات ہوتی اور ان کی ڈنر پارٹیوں میں وہ اکثر مہمان بنتے۔ جناح صاحب نہ صرف وکیل کی حیثیت سے اپنی ذہانت کا سکّہ جما چکے تھے بلکہ عام مجلسی زندگی میں بھی ان کا انداز گفتگو دل موہ لیتا تھا۔ اگر وہ ایسے لوگوں کی محفل میں شریک ہوتے جن سے بات چیت کرنا مناسب نہ سمجھتے تو خاموش رہتے۔ اس پر لوگ انھیں خاموشی پسند سمجھتے۔ لیکن دوستوں کی محفل میں ان کی گفتگو سے بذلہ سنجی اور ظریفانہ ذہانت کے دریا بہنے لگتے تھے۔ اور اگر گفتگو سنجیدہ ہوتی تو وہ اتنی ہی سنجیدگی سے مختلف مسئلوں پر اظہارِ خیال کرتے۔

سرڈنشا اور لیڈی پیٹٹ کی ایک صاحبزادی رتن بائی تھیں جن کی عمر سترہ سال کی تھی لیکن اپنی عمر کے مقابلے میں کہیں زیادہ ذہین واقع ہوئی تھیں۔ ان کے مکان پر جو سنجیدہ بحثیں ہوتیں وہ بھی اکثر ان میں شریک ہوتیں۔ رتن بائی کو سماجی کاموں سے بڑی دلچسپی تھی اور وہ عورتوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کرنا اپنا مقصدِ حیات سمجھتی تھیں۔ سماجی فلاح و بہبود کی تحریکوں میں حصّہ لینا اس زمانے میں بڑا صبرآزما اور حوصلہ طلب کام تھا۔ شروع شروع میں قائداعظم سے ان کی دلچسپی کی بنیاد صرف یہ تھی کہ وہ پبلک پلیٹ فارم کی ایک ممتاز شخصیت تھے اور رتن بائی ان کی صلاحیت کی مدّاح تھیں۔ قائداعظم خواتین کے حقوق کے لیے جو جدوجہد کر رہے تھے رتن بائی اس سے بہت متاثر تھیں لیکن جلد ہی دونوں نے محسوس کیا کہ ان کی زندگی میں ایک اور قدرِ مشترک موجود ہے۔ دونوں کو گھڑ سواری کا شوق تھا اور اکثر دونوں صبح سویرے چوپاٹی کے

ساحل پر گھوڑوں پر سوار، میلوں نکل جاتے ـــ جہاں ہنگاموں اور شور و شغب سے بھرے پُرے شہر کی مصروفیات تھوڑی دیر کے لیے ذہن سے دُور ہو جاتیں۔

سر ڈنشا اور لیڈی پیٹِٹ اپنی بیٹی کے ساتھ گرمیاں گزارنے کسی صحت افزا پہاڑی مقام پر جا رہے تھے۔ انھوں نے قائدِ اعظم سے کہا کہ کہیں اور تعطیلات گزارنے کے بجائے کیوں نہ وہ ان کے ساتھ چلیں۔ اس پہاڑی مقام پر سر ڈنشا کے خاندان سے ان کی اکثر ملاقات ہوتی رہتی۔ کبھی کبھی مس پیٹِٹ اور وہ گھڑ سواری کے لیے نکل جاتے۔ خاموش اور پُرسکون پہاڑیاں ان کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے گونجنے لگتیں اور وہ نامعلوم منزلوں کی طرف بڑھتے رہتے۔ ان کے مراسم محض دوستی کی حد تک تھے جس کی بنیاد مشترکہ دلچسپی یعنی گھڑ سواری کا ذوق تھا۔ بمبئی واپس آنے کے بعد وہ اپنے کام میں مصروف ہو گئے البتہ کبھی کبھی وہ سر ڈنشا کے مکان پر دعوتوں میں ضرور مدعو ہوتے۔

ایک بار پھر موسمِ گرما کی تعطیلات گزارنے کا پروگرام بنا اور سر ڈنشا نے اس مرتبہ کہیں دوسری جگہ تعطیلات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے جناح صاحب کو بھی شرکت کی دعوت دی۔ اس شاداب کوہستانی وادی میں اس خاندان سے جناح صاحب کی ملاقات کم و بیش روزانہ ہوتی۔ مسٹر جناح اور رتن بائی حسبِ معمول گھڑ سواری کے لیے نکل جاتے۔ آخر فطرت کے حسین مناظر کے سائے میں دونوں نے محسوس کیا کہ ان کی دوستی بڑھ کر رفتہ رفتہ تعلقِ خاطر اور یگانگت میں تبدیل ہو رہی ہے۔ دونوں نے فیصلہ کیا کہ یہ بات سر ڈنشا اور لیڈی پیٹِٹ کے کان تک پہنچا دی جائے تاکہ ان کی اجازت سے دونوں شادی کر سکیں۔

بمبئی واپس آنے کے بعد مس پیٹِٹ نے اپنے والدین کو اس راز سے باخبر کیا تو وہ ہکا بکا رہ گئے کیونکہ ان قدامت پسند پارسی والدین کے لیے، فرقے سے باہر بیٹی کی شادی کرنا ایک ناقابلِ برداشت سانحے کی حیثیت رکھتا تھا۔ انھوں نے بیٹی کو سترہ سالہ دوشیزہ

اور ۴۱ سالہ مرد کی شادی کے نتائج اور اپنے فرقے کی روایات و رسوم سے آگاہ کیا اور سمجھایا کہ اچھے خاندانوں کی لڑکیاں برادری سے باہر شادی نہیں کیا کرتیں۔ لیکن رتن بائی نے عزم کر لیا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت ان کے فیصلے کو نہیں بدل سکتی۔ والدین نے ہر طرف سے مایوس ہو کر قانون کا سہارا لیا اور کہا کہ جب تک تم اٹھارہ سال کی نہ ہو جاؤ والدین کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کر سکتیں۔ سر ڈنشا اور لیڈی پیٹیٹ کا خیال تھا کہ ایک سال تک جناح سے دور رہ کر رتن بائی کا جذبہ سرد پڑ جائے گا۔ دل کے معاملے میں جناح صاحب نے اسی قانون پسندی کا ثبوت دیا جو ان کی طبیعت ثانی بن چکی تھی۔ انھوں نے تسلیم کر لیا کہ سر ڈنشا اور لیڈی پیٹیٹ بجا کہتے ہیں۔ اگر رتن بائی ان سے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کرتی تو یہ ان کے لیے ایک سانحہ سے کم نہ ہوتا لیکن رتن بائی کو آزادی کے ساتھ اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق تھا اور یہی سوچ کر انھوں نے ایک سال تک انتظار کرنا منظور کر لیا۔

بہر طور صبر و انتظار کے طویل روز و شب گزر گئے۔ رتن بائی اب اٹھارہ سال کی تھیں لیکن اس ایک سال میں ان کے احساسات و جذبات میں کوئی تبدیلی رونما نہ ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنے پسندیدہ مرد سے شادی کرنے کا تہیہ کر رکھا تھا جس نے ان کے دل میں سچی محبت کا جادو جگا دیا تھا۔ ان کے والدین نے یہی مناسب سمجھا کہ حالات سے صلح کر لیں اور بالآخر ۱۹ اپریل ۱۹۱۸ء کو اسٹیٹسمین میں یہ خبر شائع ہوئی "سر ڈنشا پیٹیٹ کی اکلوتی صاحبزادی مس رتن بائی نے کل اسلام قبول کر لیا اور آج آنریبل ایم۔ اے جناح سے ان کی شادی ہو رہی ہے۔[1]"

محبت نے تمام مشکلات پر فتح پالی تھی

---

[1] جناح۔ ہیکٹر بولیتھو مطبوعہ ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۷۵

شادی کے بعد رتن بائی کے جوہر کھلے۔ انھوں نے ماؤنٹ پلیزینٹ روڈ پر
...اح صاحب کے نئے مکان کو اپنے ذوق کے مطابق "انتہائی سلیقہ سے آراستہ کیا۔ جناح
...احب کو اپنی پیشہ ورانہ اور سیاسی مصروفیات سے اتنی فرصت ہی کہاں ملتی تھی کہ وہ ان
...وں کی طرف توجہ کر سکیں اس لیے رتن بائی کے علاوہ اور کون مکان کی آرائش کا خیال
...تا؟ انھوں نے آرٹ کے بہت سے نمونے اور نوادرات خریدے تاکہ اس مکان کو، جس
...ے در و دیوار سے خوش ذوقی اور امارت کا اظہار ہوتا تھا، تھوڑے رد و بدل اور اضافے
...ے بعد اپنے عظیم شوہر کے شایانِ شان بنا سکیں۔" وہ چمنستانِ بمبئی کا پھول تھیں۔
...ی زندہ دل، بڑی بذلہ سنج، بڑی ذہین"[1]

شادی سے پہلے قائداعظم کے گھر کا انتظام ایک با اعتماد اور پرانا ملازم دِس
...اکرتا تھا۔ گھر کا سارا انتظام اسی کے سپرد تھا۔ قائداعظم کو تو صرف یہ ہدایت دینا ہوتی
...فلاں فلاں تاریخ کو اتنے آدمی دوپہر یا رات کے کھانے پر مدعو ہیں اور دِس انتظامات
...لیتا۔ رتن بائی سے ان کی شادی کے بعد بھی دِس اسی طرح اس گھرانے کی خدمات
...ام دیتا رہا اور دونوں اس سے مطمئن تھے۔

"ابتدائی چند ہفتے بڑی اچھی طرح گزرے۔ ۴۱ سالہ شوہر شام کو گھر واپس آکر عدالتو[2]
...ی روداد سناتا اور ۱۸ سالہ عروس سراپا انتظار بنی رہتی ——— لیکن اسی دوران میں
...چھ پرانے دوست آجاتے اور وہ مسرت و شادمانی کی یہ گھڑیاں بھی چھین لیتے ———
...ن بائی کو اخلاقاً ان کی طویل داستانیں سننی پڑتیں۔ اگرچہ اس وقت ان کا دل چاہتا
...شوہر کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے نکلیں۔

اگرچہ جناح اور لارڈ ولنگڈن، گورنر بمبئی کے تعلقات خوشگوار نہ تھے تاہم بمبئی

...ے جناح، ہیکٹر بولیتھو مطبوعہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۴۷۔ [2] محولہ بالا، صفحہ ۷۵۔

کے ممتاز شہری ہونے کے ناتے اکثر گورنمنٹ ہاؤس کی سماجی تقریبات میں انھیں مدعو کیا جاتا۔ بولیتھو نے لکھا ہے: ایک دفعہ انھیں اپنی اہلیہ کے ہمراہ گورنمنٹ ہاؤس میں کھانے پر مدعو کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ مسز جناح جو لباس پہنے تھیں اس کا گلا نیچا تھا جو ان کی میزبان کو پسند نہ آیا۔ جب وہ لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے تو لیڈی ولنگڈن نے ایک اے ڈی سی سے کہا کہ مسز جناح کو شاید ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے، ان کے لیے ایک شال لے آؤ۔ کہتے ہیں کہ یہ سن کر جناح اُٹھ کھڑے ہوئے اور بولے "اگر مسز جناح کو ٹھنڈ محسوس ہوگی تو وہ خود شال مانگ لیں گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنی بیوی کے ساتھ اُٹھ کر چلے گئے اس کے بعد اُنھوں نے گورنمنٹ ہاؤس کی دعوتوں میں شرکت سے انکار کر دیا۔[1]

مسز جناح کا انداز گفتگو بڑا دلکش تھا، دوران گفتگو وہ لطافت اور بذلہ سنجی کے دریا بہا دیتیں۔ ان کے مقابلے پر جیتے رہنا آسان کام نہ تھا۔ ایک دلچسپ واقعہ سننے کے قابل ہے۔ جناح صاحب امپیریل کونسل کے رکن کی حیثیت سے کسی کام سے دلّی آئے تھے۔ مسز جناح بھی ساتھ تھیں۔ اس زمانے میں لارڈ چیمسفورڈ ہندوستان کے وائسرائے تھے۔ اُنھوں نے چند معزز مہمانوں کو، جن میں مسٹر اور مسز جناح بھی شامل تھے، رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ اس زمانے کے آداب و قواعد کے مطابق جب اے ڈی سی نے وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ کی آمد کا اعلان کیا تو مہمان تعظیماً کھڑے ہو گئے۔ ہر مہمان اُٹھ کر میزبان تک جاتا اور اس کا تعارف کرایا جاتا اور تمام خواتین رواج کے مطابق باری باری لیڈی چیمسفورڈ کے سامنے تعظیم کے طور پر سر خم کرتیں۔ جب مسز جناح کا وائسرائے اور لیڈی چیمسفورڈ سے تعارف کرایا گیا تو مسز جناح نے مسلمان خواتین کی طرح لیڈی چیمسفورڈ کی خدمت میں آداب عرض کیا۔ اے ڈی سی دم بخود تھے اور وائسرائے

---

[1] جناح۔ ہیکٹر بولیتھو۔ صفحہ ۷۵۔

کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن انھوں نے اور ان کی لیڈی نے ناراضی ظاہر نہ ہونے دی۔
جب کھانا ختم ہوا اور میزبان اور مہمانوں میں بے تکلفی کے ساتھ بات چیت
ہونے لگی تو وائسرائے نے مسز جناح کو مخاطب کرکے کہا "مسز جناح، آپ کے شوہر کا
مستقبل بہت شاندار ہے اور آپ کو ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے۔ آپ نے
میر وائسرائے کے آداب کے مطابق ہماری تعظیم نہیں کی۔ روم میں آپ کو رومن جیسے
آداب اختیار کرنے چاہئیں۔" مسز جناح پر اس بات کا کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ انھوں نے
تمام تر تبسم کے ساتھ وائسرائے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا "یور ایکسیلینسی۔
میں نے جملہ آداب کو ملحوظ رکھا ہے۔ آپ ہندوستان میں ہیں اور میں نے ایک ہندوستانی
خاتون کی طرح آپ کو تعظیم دی ہے۔"

اس بات کی شہادت موجود نہیں کہ مسز جناح کے اس جواب سے وائسرائے کو
غصہ آیا یا نہیں۔ نہ اس بات کا کوئی مصدقہ ثبوت موجود ہے کہ مسز جناح نے وائسرائے
کو جو جواب دیا تھا اس کی نسبت شوہر کا ردِ عمل کیا تھا۔ لیکن جہاں تک قائد اعظم کے
کردار اور اندازِ نظر کا تعلق ہے یہ بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ اس بات سے
کتنے خوش ہوئے ہوں گے کہ ان کی اہلیہ ایک بااختیار اور طاقتور شخص سے حق گوئی اور
بے باکی سے پیش آئیں۔

اس کے برخلاف وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ سے جناح صاحب کے بڑے اچھے
تعلقات تھے۔ لارڈ ریڈنگ ان کی صلاحیت، دیانت داری اور فرض شناسی کی بے حد
عزت کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ریڈنگ نے ان کو ترغیب دی کہ وہ ہائی کورٹ کے
جج کا عہدہ قبول کرلیں۔ اس کے بعد وائسرائے کی کابینہ میں قانونی رکن کی حیثیت سے
تقرر کی پیشکش کی۔ جناح صاحب نے دونوں پیشکشیں مسترد کردیں۔ بعد میں لارڈ ریڈنگ
نے اس بارے میں ان کا ایما معلوم کیا کہ آیا وہ برطانوی حکومت کی طرف سے سر کا خطاب

پسند کریں گے ؟ جناح جیسے شخص کو نہ خریدا جا سکتا تھا نہ وہ برطانوی حکومت کے حواریوں میں شامل ہو سکتے تھے ۔ انھوں نے کہا "سر محمد علی جناح کے مقابلے میں ، میں یہ زیادہ پسند کروں گا کہ مجھے صرف مسٹر محمد علی جناح کہا جائے ۔" ایک تقریب کے موقع پر لارڈ ریڈنگ نے مسز جناح سے دریافت کیا کہ وہ یہ پسند نہیں کریں گی کہ لوگ انھیں لیڈی جناح کہیں ؟ اے اے رؤف نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے " مسز جناح نے بے ساختہ جواب دیا کہ اگر جناح نے سر کا خطاب قبول کر لیا تو میں ان سے الگ ہو جاؤں گی ۔"[1]

ایک اور موقع پر کھانے کی ایک دعوت میں وہ لارڈ ریڈنگ کے پاس بیٹھی تھیں لارڈ ریڈنگ اپنی زندگی کے واقعات سنانے لگے ۔ انھوں نے جنگ سے پہلے جرمنی میں اپنے زمانۂ طالب علمی کا ذکر کیا اور کہا کہ یہ سوچ کر کتنا دکھ ہوتا ہے کہ اب میں خواہش کے باوجود جرمنی نہیں جا سکتا ۔ مسز جناح نے پوچھا "آخر کیوں نہیں یور ایکسیلنسی ؟" وائسرائے نے جواب دیا "بات یہ ہے کہ جرمن ، ہم انگریزوں کو ، خاص طور پر جنگ کے بعد ، پسند نہیں کرتے ۔ یہی وجہ ہے کہ میں جرمنی نہیں جا سکتا ۔" وہ غضب کی حاضر جواب اور اپنے عالی مرتبت شوہر کی طرح وطن دوستی کے جذبے سے سرشار تھیں ، انھوں نے فوراً یہ کہہ کر لارڈ ریڈنگ کو لاجواب کر دیا "تو پھر یور ایکسیلنسی آپ ہندوستان کیسے آ گئے ؟"

خوش پوشاکی رتن بائی کی کمزوری تھی ۔ وہ بمبئی کی خوش لباس خواتین میں امتیازی حیثیت رکھتی تھیں ۔ ان کے ملبوسات ، ہارن بی روڈ پر یونیورسٹی کی عمارت کے سامنے ایک عالی شان دکان میں تیار ہوتے تھے جو یورپی ماہر ملبوسات ایلیلے فنڈ گردون

---

[1] میٹ مسٹر جناح ۔ اے اے رؤوف ۔ مطبوعہ ۱۹۵۵ ، صفحہ ۲۳۰

کی ملکیت تھی۔ ایک مرتبہ وہ اپنے نئے لباس کے متعلق معلوم کرنے دکان پر آئیں۔ اور انھوں نے جوں ہی دکان سے باہر قدم رکھا تو ایک دل ہلا دینے والا واقعہ پیش آیا۔ ایک بوڑھی گھاٹن (مراٹھن) سر پر پھلوں کا بھاری ٹوکرا اٹھائے افتاں و خیزاں ان کی طرف بڑھی اور ٹوکری دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر رکھ کر ان سے کچھ پھل خریدنے کی درخواست کی۔ اتنے میں ایک انگریز پولیس افسر وہاں پہنچ گیا اور وہ ہارن بی روڈ پر جو یورپی باشندوں اور امرا کا مخصوص کاروباری مرکز تھا، اس مفلس و ضعیف عورت کو دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ فرعون صفت انگریز نے اس غریب بڑھیا کو مغلظ گالیاں دے کر حکم دیا کہ فوراً وہاں سے چلی جائے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے پھلوں کی ٹوکری پر ایک لات رسید کر دی۔ غریب عورت کے پھل سڑک پر بکھر گئے اور وہ ملتجی نگاہوں سے پولیس افسر کو دیکھنے لگی جس کی آنکھوں سے بدستور نفرت و حقارت کے شعلے نکل رہے تھے۔

مسز جناح آگے بڑھیں اور اس پولیس افسر پر برس پڑیں "تمھیں لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے کا کوئی حق نہیں۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہوگا کہ یہ پھل اٹھا کر ٹوکری میں رکھ دو اور اسے جانے دو ورنہ تمھیں پچھتانا پڑے گا۔" پولیس افسر ہکا بکا ہو کر اس نامعلوم مگر حسین خاتون کا منہ دیکھنے لگا جس کا انداز اس قدر تحکمانہ تھا۔ اس کی اکڑی ہوئی گردن سیدھی ہو گئی۔ اس نے جلدی جلدی سڑک سے پھل چن کر ٹوکری میں رکھے اور بڑھیا کو ٹوکری اٹھانے میں مدد دی۔ مسز جناح نے آگے بڑھ کر اس ضعیف عورت کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ رکھا اور آگے بڑھ گئیں۔ وہ بھی اپنے شوہر کی طرح غریبوں کی ہمدرد و غمگسار اور ہر قسم کے جبر و تشدد کی انتہائی مخالف تھیں۔[1]

---

[1] یہ واقعہ مصنف کو مسٹر ایلن میسیج نے سنایا ہے جو بمبئی میں مسز رتن بائی سے مل چکا [illegible]

زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ جناح گھرانے کی دنیا میں مسرت و شادمانی کی گرم دھوپ پھیلی ہوتی تھی۔ جناح جہاں بھی جاتے، خواہ وہ مسلم لیگ کے اجلاس ہوں یا دوسری سیاسی تنظیموں کے اجتماعات، مسز جناح ضرور ان کے ہمراہ ہوتیں۔ شوہر اور بیوی ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے۔ سر ڈنشا اور لیڈی پیٹیٹ نے، جو اس رشتے کے حق میں نہ تھے اب حالات سے صلح کر لی تھی اور اپنی بیٹی اور داماد کو خوش دیکھ کر خود بھی خوش ہوتے۔ جناح کو یک مثالی رفیقۂ حیات مل گئی تھی۔ ان کے دل کی دنیا مسرّت سے مالا مال تھی اور مستقبل روز بروز روشن تر ہوتا جا رہا تھا۔

۱۵ اگست ۱۹۱۹ء کو ان کی دنیا میں ایک ننھی منّی جان نے قدم رکھا۔ یہ ان کی اکلوتی بیٹا ڈینا تھی۔ ظاہر ہے کہ محبّت کرنے والے ماں باپ نے اس کے لیے کیا کچھ نہ کیا ہوگا؟ لیکن محبّت اور یگانگت کا یہ مستحکم رشتہ بھی ان کے درمیان پائیدار تعلق پیدا نہ کر سکا۔ کیونکہ جناح دوسروں کے احکام پر عمل کرنے کے عادی نہ تھے۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہوتی ہے تاہم حقیقت ہے کہ انھوں نے اپنا ایک ذاتی ضابطۂ اخلاق مقرر کر لیا تھا خواہ کوئی شخص اُن سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، اس کے ذاتی معاملات میں دخل اندازی نہیں کر سکتا تھا۔ لوگوں کو اس بات پر تعجب ہے کہ وہ کیا اسباب تھے جنھوں نے ان دونوں کے درمیان افتراق کا بیج بویا اور آخر کار وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے؟

قائدِاعظم اپنی اہلیہ کے ہمراہ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے کے لیے دلّی گئے تھے۔ جب دونوں بمبئی واپس آئے تو مسز جناح اسٹیشن سے سیدھی تاج ہوٹل چلی گئیں۔ [illegible] انھوں نے چند سال تک اپنے شوہر سے الگ قیام کیا۔ اگرچہ دونوں ایک [illegible] رہتے تھے تاہم ایک دوسرے کی خیریت طلبی اور مزاج پرسی کے [illegible] جانتا ہے کہ دونوں کو ان اختلافات پر کتنا دکھ ہوا ہوگا

جنھوں نے ان کو الگ الگ کر دیا تھا اور شاید دونوں کا دل چاہتا ہو کہ آپس میں
صلح صفائی کر لیں۔ لیکن اسی اثنا میں میاں بیوی کے درمیان مستقل علیحدگی کی نوبت
لئی اور یہ خواہش ادھوری ہی رہ گئی۔

ان کی صاحب زادی ڈینا قائداعظم کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہ ایک شفیق باپ
کی طرح اپنی بیٹی کو بہترین تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ جب ڈینا بارہ سال کی عمر کو
پہنچیں تو انھیں انگلستان کے ایک بورڈنگ سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ قائداعظم جب
ں فاطمہ جناح کے ہمراہ انگلستان جاتے تو ڈینا اپنی تعطیلات باپ کے ساتھ گزارتیں
ینا کو اپنے باپ سے بہت محبت تھی اور محبت کا یہ گہرا رشتہ قائداعظم کی وفات تک
ی طرح استوار رہا۔ تاہم ڈینا نے جب بمبئی کے ایک پارسی نوجوان نیول واڈیا سے
ادی کی تو قائداعظم کو سخت ذہنی تکلیف ہوئی۔ انھوں نے اپنی خانگی زندگی کی تباہی
ہایت خاموشی اور صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔

اپنی محبوب ترین رفیقۂ زندگی سے علیحدگی کے اسباب کے بارے میں قائداعظم نے
ی کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ یہاں ایک دلچسپ واقعہ قابل ذکر ہے۔ ایک بار
داعظم معمول کے مطابق جب انگلستان گئے تو ان کی خوشدامن اس توقع میں بیٹی
ہاں لے گئیں کہ شاید دونوں میں مصالحت کرا سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ ممکن ہے
ہ دونوں ماضی کی غلط فہمیوں کو نظر انداز کر کے پھر ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیں۔

دیوان چمن لال جناح صاحب کے ذاتی دوستوں میں سے تھے اور اتفاق سے
ی بار یہ دونوں ایک ہی بحری جہاز سے انگلستان جا رہے تھے۔ چمن لال نے لکھا ہے۔
ح آج بہت اداس ہیں ـــــ وہ بڑے دل شکستہ نظر آتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے
ہ دنیا کے سب سے زیادہ تنہا اور دل گرفتہ شخص ہیں۔"

جب جہاز ساؤتھیمپٹن کی بندرگاہ پر پہنچا تو جناح صاحب آئرلینڈ چلے گئے

اور چمن لال پیرس روانہ ہو گئے۔ پیرس میں چمن لال نے سنا کہ مسز جناح پیرس کے ایک اسپتال میں داخل ہیں اور شدید بیمار ہیں۔ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چمن لال اسپتال پہنچے۔ ہیکٹر بولیتھو نے اس سلسلے میں لکھا ہے کہ دیوان چمن لال نے انھیں بتایا: "میں نے رتی جناح کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔ آج بھی دنیا میں ان جیسی حسین و دلکش کوئی عورت نہیں۔ وہ لاڈ پیار میں بگڑی ہوئی ایک خوب صورت خاتون تھیں اور جناح نادانستہ انھیں نہ سمجھنے پر مجبور تھے۔"[1] مسز جناح نے چمن لال کو اسکر وائلڈ کی نظموں کی ایک کتاب دی اور ایک نظم پڑھنے کے لیے کہا۔ چمن لال نے نظم شروع ہی کی تھی کہ وہ بے ہوش ہو گئیں۔ چمن لال دوڑے گئے اور ڈاکٹر کو بلا لائے۔ اس کے بعد انھوں نے جناح صاحب کے نام "ارجنٹ" تار بھیجا۔ اس تار کو پاتے ہی وہ اپنی علیل اہلیہ کے پاس پہنچ گئے۔ جناح صاحب "تقریباً ڈھائی گھنٹے" تک ان کے کمرے میں رہے۔ اور چمن لال باہر بیٹھے سوچتے رہے کہ کتنا اچھا ہو کہ یہ دونوں گئی گزری باتوں کو بھول جائیں اور ان میں پھر ملاپ ہو جائے۔ جناح صاحب نے اہلیہ کے کمرے سے باہر آکر چمن لال سے کہا: "میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی بچائی جا سکتی ہے۔ ہم ڈاکٹر بدل دیتے ہیں اور انھیں دوسرے اسپتال لے جائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔"[2]

بعد میں دیوان چمن لال کینیڈا چلے گئے۔ چند ہفتے بعد جب وہ پیرس واپس آئے تو جناح صاحب خلافِ توقع اکیلے تھے۔ چمن لال نے پوچھا "رتی کہاں ہیں؟" انھوں نے بڑے غمناک لہجے میں جواب دیا "ہم میں جھگڑا ہو گیا تھا اور وہ بمبئی واپس چلی گئی ہیں۔"[3]

بمبئی واپس آنے کے بعد مسز جناح اپنے شوہر کے ہاں جانے کے بجائے اپنے

---

[1] جناح۔ ہیکٹر بولیتھو۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء۔ صفحہ ۹۲۔ [2] محولہ بالا۔ صفحہ ۹۲۔

بھائی کے ساتھ رہنے لگیں۔ شاید جذباتی اعتبار سے وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنا اختلاف رکھتے تھے کہ ان کے لیے مل جل کر رہنا ممکن نہ تھا۔

۱۹۲۸ء کا ذکر ہے کہ قائد اعظم امپیریل اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے سلسلے میں دلی میں مقیم تھے مس فاطمہ جناح ان کے ساتھ تھیں کہ انھیں اپنی بیوی کی بیماری کے متعلق تار ملا۔ وہ سب کام چھوڑ چھاڑ کر بمبئی روانہ ہو گئے لیکن وقت گزر چکا تھا ان کے بمبئی پہنچنے سے قبل ہی رتن بائی اس دنیا سے سدھار چکی تھیں تھیں۔ وہ رنج و غم میں ڈوبے ہوئے کچھ دیر تک اپنی اہلیہ کی میت کے پاس خاموش بیٹھے رہے اور پھر جنازہ کے ساتھ ساتھ آرام باغ بمبئی تک گئے جہاں مسز جناح دفن ہیں۔

بولیتھو نے تدفین کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "جب میت قبر میں اتاری گئی تو جناح کو صبر و ضبط کا یارا نہ رہا اور وہ سر جھکا کر ہچکیوں سے رونے لگے"[1]

[1] جناح، ہیکٹر بولیتھو، مطبوعہ ۱۹۵۴ء، صفحہ ۹۵۔

وہ بے یار و مددگار رہ گئے

فرقہ وارانہ بلووں کو روکنے کے لیے ممتاز رہنما ہندو مسلم مفاہمت پر زور دے رہے تھے اس سے یہ حقیقت آشکار ہو گئی تھی کہ حالیہ واقعات سے سیاسی فضا کتنی مکدّر ہو چکی ہے۔ دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، سریندر ناتھ بنرجی اور جناح صاحب نے ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے حصولِ آزادی کے جو آدرش پیش کیے تھے وہ لوگوں کے ذہن سے محو ہو گئے تھے۔ اب گاندھی جی ہوم رول لیگ اور خلافت کے ڈکٹیٹر تھے اور ان کا یہ نظریہ کہ "غیر متشددانہ عدم تعاون کے ذریعے آزادی لی جائے" ایک مقبول سیاسی حربہ کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ تشدّد، خونریزی، ہندو مسلم فسادات اور سرکاری املاک کو لوٹنے اور آگ لگانے جیسی مجنونانہ حرکتوں کی صورت میں نکلا۔ اس وقت فروری ۱۹۲۲ء میں گاندھی نے صورتِ حال پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا۔ "ہندوؤں اور مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس جدوجہد کو مذہبی جنگ سمجھ کر اس میں حصہ لے رہی ہے۔ آج اگر مسلمانوں کی یہ امید ختم ہو جائے کہ خلافت بحال نہ ہو گی اور ہندوؤں کو پتہ چل جائے کہ گاؤکشی ختم نہیں ہو سکتی تو پھر دیکھیے کہ کانگریس سے یہ دونوں فرقے کس طرح علیحدگی اختیار کر لیتے ہیں۔" اس بیان سے یہ ثابت ہو گیا کہ ہندوستانی سیاست میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی سرگرمی اور جوش و خروش کا سب سے بڑا سبب مذہب تھا۔ کانگریس کے کمانڈر اعلیٰ گاندھی کے اس اعتراف کے باوجود کانگریس کی طرف سے اس نظریے

کی بار بار تردید کی گئی تاہم حالات اس کے مقتضی تھے کہ خالص فرقہ وارانہ بنیادوں پر مسلم لیگ کی تنظیم نو کی جائے۔ کبھی کبھی اکّا دکّا، ہندو مسلم اتحاد، کانفرنسیں اور کل جماعتی کانفرنسیں ہوتی رہیں۔ لیکن ہندوستانی سیاست پر اب مذہبی گروہ بندی کی مہر لگ چکی تھی باوجودیکہ کانگریس اس خیال کی مخالف تھی مگر یہ حقیقت ہے کہ کوئی سیاسی تنظیم بھی فرقہ وارانہ چھاپ سے مبرّا نہ تھی۔ مسلم لیگ نے رفتہ رفتہ صورت حال کے اس پہلو کا پہلے دبے لفظوں میں اور پھر بانگ دہل اعتراف کر لیا۔ البتہ کانگریس نے اس الزام کے خلاف احتجاج کیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اس کی تردید کی۔

اسی سال کونسلوں میں شمولیت کے مسئلے پر کانگریس کی صفوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ کانگریس کے صدر سی آر داس شمولیت کے حامی تھے جبکہ گاندھی کی قیادت میں ایک گروپ، جو تنظیم کے بنیادی اصولوں سے ایک انچ بھی ہٹنے کو تیار نہ تھا، شمولیت کا شدید مخالف تھا۔ یہ چپقلش اتنی بڑھی کہ سی آر داس کانگریس سے علیحدہ ہو گئے اور کونسلوں کے انتخابات میں اپنے حامی کھڑے کرنے کے لیے انھوں نے سوراج پارٹی کی تشکیل کی۔

امپیریل کونسل کے انتخابات ستمبر ۱۹۲۳ء میں ہونے والے تھے۔ اس موقع پر قائد اعظم نے بمبئی کے مسلم حلقۂ انتخاب سے کھڑے ہونے کا اعلان کیا۔ انھوں نے اپنے انتخابی منشور میں کہا کہ مجھے علم ہے کہ کونسل میں شمولیت کے معاملے پر انفرادی اور اجتماعی طور سے لیڈروں اور سیاسی جماعتوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود میں نے کونسل کی نشست کے لیے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ کیونکہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے لیے کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے ان کی نشستوں پر قبضہ کرنا بہتر ہوگا۔ اپنے انتخابی منشور میں قائد اعظم نے کہا تھا کہ ۱۹۰۶ء کے اجلاس کانگریس سے اب تک میری سیاسی سرگرمیاں ووٹروں کے سامنے ہیں۔ آخر میں انھوں نے کہا تھا کہ اگر کسی عہدے یا خطاب کا خواہ

نہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ اپنی تمام تر صلاحیتیں ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دوں۔"

سوراج پارٹی اور کانگریس میں اس موقع پر مفاہمت ہوگئی تھی اور سوراج پارٹی نے فوراً قائد اعظم کے مقابلے پر ایک امیدوار کھڑا کر دیا۔ حالانکہ اس سے قبل ایک آزاد امیدوار ان کے مقابلے پر آچکا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اب انھیں دو حریفوں کا مقابلہ کرنا ہے بمبئی کے کانگریسی اخباروں نے قائد اعظم کے خلاف شدید مہم چلا رکھی تھی البتہ آزاد روزنامہ بمبئی کرانیکل، ان کا حامی تھا۔ اہالیان بمبئی اس مقابلے سے جو دلچسپی لے رہے تھے۔ بمبئی کرانیکل نے ایک اداریے میں اس پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا "اگر مسٹر جناح آج کانگریس میں شامل نہیں ہیں تو کیا ہوا انھوں نے کئی دوسرے افراد کے برعکس نہ تو کبھی ملک کے مفاد سے غداری کی ہے اور نہ کانگریس سے اپنے اختلاف کو بنیاد بنا کر ذاتی فائدے کے لیے کوئی سودا بازی کی ہے۔" بمبئی کے اخبارات امیدواروں کی انتخابی سرگرمیوں کو نمایاں طور پر شائع کر رہے تھے۔ بعض لوگ قائد اعظم کو شکست دینے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے یہاں تک کہ وہ ان کے حریفوں کی مالی معاونت کرنے پر بھی آمادہ تھے۔ لیکن قائد اعظم کو ان باتوں سے ہراساں یا مرعوب کرنا ممکن نہ تھا۔ انھوں نے انتخاب کے سلسلے میں بے سیاسی حریفوں سے سمجھوتے کی ہر پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا۔ انھیں سیاسی لیڈروں کے بجائے بمبئی کے مسلمانوں پر بھروسہ تھا اور اپنی تقریروں میں انھوں نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنے اصولوں سے ایک انچ پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اسمبلی کی نشست جیتنے کے لیے کسی مصالحت کا تصور بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ فریب اور بددیانتی کے ذریعے نہیں بلکہ اپنی صلاحیتوں کے بل پر کامیابی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگرچہ ان کے خلاف زبردست مہم چلائی جا رہی تھی تاہم یہ بات صاف تھی کہ ووٹروں کی اکثریت ان کے حق میں ہے آخر ان کے دونوں حریفوں نے اسی میں عافیت سمجھی کہ عبرت ناک شکست کھانے کے

بجائے مقابلے سے ہٹ جائیں اور قائدِ اعظم کو بلا مقابلہ مرکزی مجلس قانون ساز کا رکن منتخب ہو جانے دیں۔

اسی سال ایک اور قابلِ ذکر واقعہ پیش آیا۔ کینیا میں ہندوستانی آبادکاروں کے ساتھ جو ناروا سلوک کیا جا رہا تھا اس پر اخباروں اور سیاسی جماعتوں نے احتجاج کیے اور رفتہ رفتہ معاملہ ایک قومی مسئلہ بن گیا۔ دولت مشترکہ کے علاقوں کے مسئلوں پر غور و خوض کرنے کے لیے امپیریل کانفرنس کا اجلاس ہو رہا تھا اور حکومتِ برطانیہ نے اس کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کے لیے سر تیج بہادر سپرو کو نامزد کیا تھا۔ حالانکہ وہ عوامی نمائندہ نہ تھے۔ اس طریقۂ کار کے خلاف شدید احتجاج ہوا اور سر تیج بہادر سپرو پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ لیکن جناح کو اس سے اتفاق نہ تھا۔ ان کا بیان تھا کہ میں کانفرنس میں سر سپرو کو ہندوستان کا نمائندہ تسلیم نہیں کرتا اس لیے کانفرنس سے ان کے مستعفی ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے ساتھ ایک اخباری بیان کے ذریعے انھوں نے کینیا کے ہندوستانی آبادکاروں کے ساتھ حکومتِ برطانیہ کے نامناسب سلوک کی شدید مذمت کی۔ اس بیان میں کہا گیا تھا کہ "ہندوستان اور ہندوستانیوں کو، خواہ وہ کہیں ہوں، اس وقت تک کوئی عزت کی نظر سے نہ دیکھے گا جب تک یہ ملک برطانیہ عظمیٰ کا باجگذار ہے۔" کینیا میں ہندوستانیوں کے مصائب کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا: "اس فیصلے کی بنیاد واضح طور پر یہ ہے کہ یورپی اقوام بالاتر ہیں اور ہندوستانی ان کے مقابل ایک پست قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔" ہندوستانی سیاست میں انتشار و اختلاف کی جو صورتِ حال پائی جاتی تھی قائدِ اعظم نے سخت الفاظ میں اس پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "ہمیں سب سے پہلے ہر قیمت پر اتحاد درکار ہے۔ مختلف حلقوں کے لیڈروں کو تمام نزاعی معاملے بالائے طاق رکھ کر متحد ہو جانا چاہیے ——— سوراج یادداشتیں پیش کرنے سے نہیں مل سکتا اور نہ ہم یہ دولت اتحاد کے بغیر

حاصل کر سکتے ہیں ـــ ہمیں خالص سیاسی بنیاد پر یہ اعلان کر دینا چاہیئے کہ ہندوستان ہندوستانیوں کا ہے اور سچے معنی میں سوراج حاصل کرنے کی جدوجہد شروع کرنی چاہیئے۔"

کانگریس کے مسلم رہنماؤں میں مولانا محمد علی جوہر کا نام سر فہرست تھا اور ساس زمانہ وہ کانگریس کے اجلاس کوکانڈا کی صدارت کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر اور تحریک خلافت میں ان کے چند ساتھیوں کا خیال تھا کہ پین اسلامی اتحاد قائم ہونا چاہیئے۔ بس فکر و عمل کے اس میدان میں "پین ایشین موومنٹ" (تحریک اتحاد ایشیا) اسی پین اسلامی اتحاد کے نظریہ کا ایک پہلو تھی۔ انڈین نیشنل کانگریس کی تاریخ میں پہلی مرتبہ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا محمد علی نے جاپان اور دوسرے ایشیائی ممالک کو ہندوستان کی طرف سے دوستی اور خیر سگالی کے پیغام بھیجے۔ انھوں نے اپنے خطبہ صدارت میں بھی اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے مابین قریبی تعلقات قائم ہونے چاہئیں ـــ کئی سال تک کانگریس نے اس خیال کو اپنائے رکھا اور ایشیائی ملکوں کو کانگریس کی طرف سے خیر سگالی کے پیغام روانہ کیے جاتے رہے۔

۱۹۲۰ء کے بعد ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کافی کشیدہ ہو چکے تھے اور پہلے کے سے اتحاد و تعاون کا وجود کہیں باقی نہ تھا۔ قائد اعظم کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہو چکی تھی۔ گاندھی کی حکمت عملی سے نہ صرف سیاسی جماعتوں میں اختلافات پیدا ہو گئے تھے بلکہ دونوں بڑی قوموں کے رہنماؤں کے دلوں میں بھی ایک دوسرے کے خلاف کدورت جاگزیں ہو گئی تھی۔ مسلمان رہنماؤں میں سے جو لوگ کونسل کی رکنیت کے حق میں تھے وہ مسلم لیگ میں شامل ہو گئے اور کونسل کی رکنیت کے مخالف خلافت کمیٹی اور جمعیت العلماء ہند کے پرچموں کے تلے صف آرا ہو گئے۔ مسلم لیگ کے حامیوں نے لیگ کے اجلاس مارچ ۱۹۲۴ء میں بمقام دہلی فیصلہ کیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کو منظم کیا

ے نظریے (کونسل کی رکنیت) کے حامی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔
ے کیا گیا کہ مئی کے آخر میں قائدِ اعظم کی زیرِ صدارت لاہور میں مسلم لیگ کا عام اجلاس
منعقد کیا جائے۔ قائدِ اعظم نے ایک بیان میں لیگ کے نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے
۔ "اجلاس کے سامنے خاص خاص مسئلے یہ ہوں گے:" ہندوستان کے آئین میں ترمیم
انا۔ خاص طور سے پنجاب میں جہاں فرقہ وارانہ غلط فہمیاں پیدا کر دی گئی ہیں ہندو
لم مفاہمت کرانا اور ۱۹۱۶ء کے میثاق لکھنؤ کے انداز پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں پھر
ب بار مکمل اتفاقِ رائے کی کوشش کرنا۔۔۔۔ لیگ کوئی ایسی پالیسی یا پروگرام قبول
یں کرے گی جو انڈین نیشنل کانگریس، خلافت کمیٹی یا جمیعت العلماء ہند کے خلاف ہو۔ اس
ے برعکس مسلم لیگ عام قومی مفاد کے پیشِ نظر کام کرے گی ۔۔۔ البتہ مسلمانوں کے
فادات کو بطورِ خاص ملحوظ رکھا جائے گا۔ انھوں نے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ
ہندوستان کے کئی علاقوں میں حالیہ ہندو مسلم فسادات سے جن کا خاص سبب شدھی اور
سنگھٹن کی تحریکیں تھیں، دونوں قوموں کے اتحاد کو خاصا نقصان پہنچا ہے۔ قائدِ اعظم
ے دونوں قوموں سے متحد ہو کر اور مل جل کر کام کرنے کی اپیل کرتے ہوئے اپنا بیان ان
لفاظ پر ختم کیا: میں تمام ممتاز مسلمانوں سے خواہ وہ لیگ کے ممبر ہوں یا نہ ہوں، مسلم
یگ کے اجلاس میں شرکت کی اپیل کرتا ہوں۔

لیگ کے اجلاس لاہور کے موقع پر قائدِ اعظم کو بڑی تشویش تھی۔ ان کی دلی خواہش
تھی کہ ہندو اور مسلمان پھر متحد ہو جائیں کیونکہ اس کے بغیر ہندوستان آئینی اعتبار سے
ترقی نہیں کر سکتا تھا مگر مسلم لیگ کا اجلاس کیا فیصلہ کرے گا اس کے بارے میں ابھی
کچھ کہنا ممکن نہ تھا۔ لیگ کے اجلاس میں بھی انھوں نے اسی نکتے پر زور دیتے ہوئے
کہا کہ جب تک ہندوستان کے عوام متحد نہ ہوں گے یہ ملک غیر ملکی تسلط اور غلبے کا شکار رہے گا۔
جب ہندو مسلمان دونوں سوراج چاہتے ہیں تو آخر دونوں اقوام کے اتحاد میں کیا رکاوٹ

سے ہے؟ وہ اب تک اپنے اس نظریے پر قائم تھے کہ ہندوستان کی نجات ہندو مسلم اتحاد ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ہندوستانی سیاست کی تمام ممتاز و مدبر شخصیتوں نے ہمیشہ اس خیال کی تائید کی تھی لیکن کچھ عرصے سے اس نظریے کو فراموش کر دیا گیا تھا۔

مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی کہ لبشرط امکان دوسری سیاسی جماعتوں کے تعاون سے دستوری اصلاحات کی ایک سکیم مرتب کی جائے اور لیگ کے آئندہ اجلاس میں اس سکیم پر غور کیا جائے۔ اس سلسلے میں گاندھی نے کہا۔ مجھے مسٹر جناح کی اس بات سے اتفاق ہے کہ ہندو مسلم اتحاد ہی کے ذریعے سوراج حاصل کیا جا سکتا ہے۔ لیکن مولانا محمد علی نے ایک بیان میں اس بات پر شک و شبہ کا اظہار کیا کہ آیا مسلم لیگ اور جناح صاحب کو مسلمانوں کی نمائندگی کرنے کا حق حاصل ہے۔ جناح صاحب نے اس بیان کا مدلل جواب دیا اور کہا "میں اپنے ہندو دوستوں سے اپیل کروں گا کہ وہ مسٹر محمد علی کی باتوں سے گمراہ نہ ہوں ـــــ آپ لوگ جانتے ہیں کہ میں کس حد تک قوم پرست ہوں۔ میں اگر مسلمانوں کو منظم کرنا چاہتا ہوں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میرا مقصد قومی ترقی یا قومی مفاد کے خلاف کوئی کام کرنا ہے۔" مولانا محمد علی اپنے مخصوص انداز میں جواب الجواب کے طور پر مسلم لیگ اور قائد اعظم دونوں پر برس پڑے۔ یہ حقیقت کس قدر افسوس ناک ہے کہ دونوں مسلم رہنماؤں کے درمیان، جو مسلمانوں کی سیاست میں شیر بنیاں کی حیثیت رکھتے تھے بُری طرح ٹھن گئی اور اس طرح ہندوستانی مسلمانوں کے مفاد کو شدید نقصان پہنچا۔

جناح صاحب نے اسمبلی میں نیشلسٹ پارٹی کے رکن کی حیثیت سے ایوان میں ہمیشہ ہندوستانی عوام کے کاز کی پُرجوش حمایت و تائید کی۔ انھوں نے ہندوستانیوں کی فوج میں زیادہ سے زیادہ بھرتی، دستوری اصلاحات پر نظر ثانی، ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت انڈین سول سروس کے امتحانات کے انعقاد، ہندوستان کو

درجہ نوآبادیات دینے اور بی جی ہارنی مین کے ہندوستان واپس آنے دیجئیں پانچ سال پہلے ملک بدر کر دیا گیا تھا) جیسے معاملات پر خصوصی توجہ دی۔ اپنی محنت اور ذہانت سے انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا یہ دعویٰ غلط نہ تھا کہ اسمبلیوں میں فرض کی ادائگی بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی اسمبلی کے باہر کی سرگرمیاں۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کی اساس یعنی گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پر ان کے بے پناہ حملوں سے اس قانون کی خامیاں اچھی طرح ظاہر ہو گئیں اور نوکر شاہی کو بادل نخواستہ یہ تسلیم کرنا پڑا کہ عوامی مطالبے کو پورا کرنے کے لیے اس ایکٹ میں تبدیلیاں اور ترمیمیں کرنی ضروری ہیں چنانچہ امور داخلہ کے نگران رکن (ہوم ممبر) سر الیگزینڈر مڈی مین کی سربراہی میں ایک کمیٹی مقرر کی گئی جسے یہ رپورٹ دینی تھی کہ آیا موجودہ قانون میں ردو بدل ضروری ہے؟ ردو بدل کی صورت میں ایوان کی سفارشات کیا ہوں گی؟ یا ہندوستانی عوام کی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کوئی نیا قانون مرتب کیا جائے؟ اس کمیٹی میں سر محمد شفیع (لا ممبر) قائداعظم، تین یورپی باشندے اور کچھ غیر سرکاری ہندوستانی باشندے اراکین کی حیثیت سے شامل کیے گئے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت صوبوں کو کچھ اختیارات تفویض کیے گئے تھے۔ ان اختیارات کو اختیارات منتقلہ کا نام دیا گیا اور گورنروں کو ان کے نظم ونسق کی ذمہ داری اس شرط پر سونپی گئی کہ وہ وزیروں کے مشورے سے یہ کام کریں گے ادھر خود وزیر مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ تھے جس میں منتخب غیر سرکاری ارکان کی بھاری اکثریت تھی۔ سرکاری طور پر کانگریس نے واضح پروگرام کے تحت ان انتخابات کا بائیکاٹ کیا تھا تاہم جب موتی لال نہرو اور سی آر داس نے تین سال بعد سوراج پارٹی کی داغ بیل ڈالی تو کانگریسی سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر اسمبلیوں کے رکن منتخب ہو گئے۔ جناح صاحب اور ان کی طرح دوسرے آزاد ممبر

مخالف بنچوں کے ارکان میں شامل تھے۔ ۱۹۱۹ء کے ایکٹ کی دفعہ ۸۴ کے تحت وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال بعد یعنی ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی کمیشن "نظام حکومت پر عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لیے" مقرر کیا جائے گا۔ یہ کمیشن "برطانوی ہند کے نمائندہ اداروں کی ترقی کی رفتار کا بھی جائزہ لے گا" اور پارلیمنٹ کو یہ تجویز پیش کرے گا کہ دس سال کی میعاد گزرنے کے بعد اس ایکٹ میں کیا کیا ترمیمیں کرنی چاہئیں۔ مرکزی اسمبلی کی نظر میں دس سال کا عرصہ خاصا طویل تھا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں کہ ۱۹۱۹ء کا ایکٹ ہندوستانی باشندوں کی قومی امنگیں پوری نہیں کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اصلاحات کے سلسلے میں تحقیقاتی کمیٹی کے طور پر مڈیمن کمیٹی کا تقرر کیا گیا۔

مڈیمن کمیٹی نے ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کے بارے میں لوگوں کی رائے معلوم کرنے اور یادداشتیں اور تجاویز قبول کرنے کی غرض سے ۱۹۲۴ء کے وسط میں ہندوستان کا دورہ کیا۔ جناح صاحب نے اس کمیٹی کے رجعت پسند صدر اور تینوں یورپی ممبروں کے خلاف بھرپور جنگ لڑی اور یہ ظاہر ہو گیا کہ کمیٹی اتفاق رائے سے کوئی رپورٹ پیش نہ کر پائے گی۔ جناح صاحب نے اکثریت کی رپورٹ سے اختلاف کرتے ہوئے ایک نوٹ لکھا اور تین دیگر اراکین یعنی سر سوامی آئر، سر تیج بہادر سپرو، اور ڈاکٹر آر پی پارنجپی کے ساتھ ایک اختلافی (اقلیتی) رپورٹ مرتب کی۔ ان کی رپورٹ کا خاص نکتہ یہ تھا کہ موجودہ آئین میں بنیادی تبدیلیوں کے بغیر ملک کی سیاسی صورت حال نہیں سدھر سکتی۔ اس رپورٹ پر پی سی رائے نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "ان (قوم پرستوں) کی نئے آئین کے تحت پہلی کونسل میں عدم شرکت سے انڈین کانگریس کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور اہل ہند کو بروقت صوبائی اختیار و اقتدار کی دو عملی اور اس کی خامیوں کا اندازہ نہ ہو سکا۔"[1]

---

[1] لائف اینڈ ٹائمز آف سی آر داس۔ پی سی رائے۔

مڈیمین کمیٹی کی دونوں رپورٹوں پر اسمبلی نے ستمبر ۱۹۲۵ء میں بحث شروع کی ۔ اکثریتی رپورٹ منظور کر لینے کے سلسلے میں ایک سرکاری تحریک پیش کی گئی ۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اس تحریک میں طویل ترمیم پیش کی جس کا خاص مقصد فوری طور پر مکمل ذمہ دار حکومت کا قیام تھا ۔ قائداعظم نے ترمیم کے حق میں ایک مؤثر تقریر کی اور اس بات پر زور دیا کہ تمام دستوری اصلاحات میں اقلیتوں کے مفاد کا خیال رکھا جائے ۔ دو روز کی گرماگرم بحث کے بعد یہ ترمیم ۴۵ کے مقابلے میں ۷۲ ووٹوں سے منظور کر لی گئی ۔ جناح صاحب کا یہ موقف اب پوری طرح درست ثابت ہو گیا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے بجائے نشستوں پر قبضہ کرنا بہتر ہوگا ۔

ہر ایسی حکومت کو جو عوام کی تائید و حمایت سے محروم ہو ، اپنی بقا اور اپنے وجود کے لیے عوامی خواہشات کو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے ۔ یہی حال حکومت ہند کا تھا ۔ مڈیمین کمیٹی کی رپورٹ پر اسمبلی کا فیصلہ کاغذی کارروائی تک ہی محدود رہا اور اسے عملی شکل کبھی نہیں دی گئی ۔ پنڈت موتی لال نہرو نے مارچ ۱۹۲۵ء کو حکومت کو بتا دیا کہ ہم حکومت سے تعاون کرنے کے لیے اسمبلیوں کے رکن بنے ہیں ۔ اگر ہم سیاسی طور پر ہم گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کے حامی و مؤید ہیں ۔ اگر حکومت کا رویہ یہی رہا تو میری پارٹی عدم تعاون پر مجبور ہو جائے گی ۔ انھوں نے اعلان کیا کہ میں اور میری سوراج پارٹی نے ایوان کی رکنیت سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کیا ہے ۔ مرکزی اسمبلی کے صدر وٹھل بھائی پٹیل نے اندیشہ ظاہر کیا کہ موتی لال نہرو کی پارٹی کی علیحدگی کے بعد ایوان میں مخالف پارٹی کا وجود باقی نہ رہے گا ۔ انھوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اس موقع پر اختلافی قوانین نہ پیش کیے جائیں ورنہ وہ اپنے اختیارات سے کام لیتے ہوئے اور بشرط ضرورت ہندوستانی قوم کے مفادات کے پیش نظر اسمبلی کے اجلاس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کرنے پر مجبور ہو جائیں گے ۔

ایک طرف تو ہندوستان کے سیاسی حالات بدلتے اور دوسری طرف پورے ملک میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک رہی تھی۔ ان مجنونانہ حرکتوں سے اتحاد کے وہ خواب پارہ پارہ ہو چکے تھے جن کی تعبیر کے لیے قائداعظم اور ان جیسے دیگر رہنماؤں نے اپنی زندگی وقف کر رکھی تھی۔

یہ دادا بھائی نوروجی، گوکھلے، محسن الملک اور جناح صاحب جیسے رہنماؤں ہی کا کام تھا کہ انھوں نے دونوں قوموں کے آتش فشاں جذبات کو ابلنے نہ دیا اور ہندو اور مسلمان تعاون کے جذبے سے کام کرتے رہے لیکن اب اس میدان میں جناح تن تنہا تھے دادا بھائی نوروجی، گوکھلے اور محسن الملک کا انتقال ہو چکا تھا، میثاق لکھنؤ کو دس سال گذر چکے تھے اور ایک بار پھر ہندوستان کے ہر گوشے میں فرقہ وارانہ کشیدگی کی آگ بھڑک اٹھی تھی۔ جولائی ۱۹۲۵ء میں دہلی، کلکتہ اور الہ آباد وغیرہ میں انتہائی خونریز فسادات ہوئے سینکڑوں افراد ہلاک و زخمی ہو گئے۔ سب سے زیادہ تباہی حیدرآباد دکن میں ہاموں آباد کے مقام پر پھیلی۔ وہاں ہندوؤں نے عیدالاضحیٰ کے موقع پر مسلمانوں کے محلوں پر حملہ کر کے قتل و غارت، آتش زدگی اور لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا۔ فسادات پر تبصرہ کرتے ہوئے گاندھی جی نے کلکتہ میں جو کچھ کہا وہ بھی سننے کے قابل ہے۔ آپ نے فرمایا "اگر یہ ہمارا مقسوم بن گیا ہے کہ ملاپ سے پہلے ہم ایک دوسرے کا خون بہائیں تو پھر میں یہ کہوں گا کہ جس قدر جلد ہم یہ کام ختم کر لیں، اتنا ہی اچھا ہے۔"

اس کے تقریباً ایک سال بعد کلکتہ میں ہندو مسلم فساد شروع ہو گیا۔ چھ ہفتے تک شہر کی سڑکوں پر انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی۔ ہر طرف لاشوں کے انبار لگ گئے۔ اس فساد کا سبب شہر کی ایک مسجد کے سامنے باجہ بجانے کا تنازعہ تھا جس کے پس پشت آریہ سماجیوں کا ہاتھ تھا۔ سوامی شردھانند آریہ سماج کی جنگجو ہندو تنظیم کے لیڈر تھے۔ آریہ سماج کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں بحیثیت قوم مسلمانوں کا خاتمہ

کر دیا جائے۔ بلوہ شروع ہوتے ہی پولس موقع پہ پہنچ گئی اور فساد کو روکنے کے لیے اسے گولی چلانا پڑی۔ چھ ہفتے میں مسجدوں اور مندروں پر سو سے زیادہ حملے کیے گئے اور تقریباً سوا سو آدمی ہلاک اور ہزاروں زخمی ہوئے۔ صورت حال اتنی کشیدہ اور خطرناک تھی کہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ارون کو ہندوستان کی قومی زندگی اور مذہب کے نام پر "فرقہ وارانہ اتحاد و امن کی اپیل کرنی پڑی۔

چند مہینے بعد غازی عبدالرشید نے اسلام اور رسولِ مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے خلاف شردھانند کی دریدہ دہنی اور گستاخانہ تحریروں سے مشتعل ہو کر اسے قتل کر ڈالا۔

مئی ۱۹۲۷ء میں فرقہ وارانہ فسادات کا جنون پورے شباب پر تھا۔ اندازہ یہ تھا (جو بعد میں درست ثابت ہوا) کہ جب تک ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین سیاسی مزاحمت و منافرت کے اسباب ہمیشہ کے لیے ختم نہ کیے جائیں گے، دونوں اقوام میں قتل و خونریزی کی چنگاری اسی طرح سلگتی رہے گی۔ ۳ مئی سے ۷ مئی ۱۹۲۷ء کے درمیان لاہور میں فرقہ وارانہ جھگڑے ہوئے جن میں تقریباً تیس آدمی ہلاک اور کوئی تین سو آدمی زخمی ہوئے۔ اس کے بعد (پنجاب میں) ملتان اور (یوپی میں) بریلی کے مقام پر یہی خونچکاں کہانی دہرائی گئی۔ پھر بہار میں بھی کئی جگہ شدید فسادات ہوئے۔ غرض ہندو مسلم خانہ جنگی کی یہ آگ ناگپور (سی پی) تک پھیل اٹھی۔ ناگپور میں بیس آدمی ہلاک اور سو دا سو زخمی ہوئے۔ بیشتر مقامات پر فسادات کا اصل سبب مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کرنے کے لیے آریہ سماجیوں کی شر انگیزی اور بہتان طرازی تھی۔ مثال کے طور پر ایک شر انگیز پمفلٹ "رنگیلا رسول" شائع کیا گیا جس سے مسلمانوں کے مذہبی احساسات کو سخت صدمہ پہنچا۔ آریہ سماج کے ہیڈ کوارٹر سے اس قسم کے پمفلٹ شائع ہوتے اور بہاں سے ملک میں تقسیم کر دیے جاتے لیکن قانون ان مجرمانہ حرکات کے انسداد سے قاصر تھا۔ آخر مسلمانوں کے احتجاج پر اگست ۱۹۲۷ء میں مرکزی اسمبلی میں ایک بل پیش کیا گیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ

کوئی شخص جان بوجھ کر، شر انگریزی کے ارادے سے تقریر یا تحریر کے ذریعے یا تنظیم کی حیثیت سے تاج برطانیہ کی رعایا کے کسی فرقے کے مذہبی عقائد کی توہین کرے گا یا ان کے مذہبی عقائد مجروح کرنے کی کوشش کرے گا تو اسے دو سال کی سزائے قید یا جرمانہ یا دونوں سزائیں دی جائیں گی۔" بحث کے بعد یہ بل لسٹر عنت تمام منظور کر لیا گیا اور دو دن کے اندر اندر اس کا نفاذ ہو گیا۔

دو سال کے عرصے میں تقریباً تیس فساد ہوئے جن میں ہزاروں آدمی ہلاک و زخمی ہوئے تھے۔ جس وقت یہ بل منظور کیا گیا تو فرقہ داریت کے مسئلے کو ہمیشہ کے لیے مٹانے کی غرض سے اتحاد کانفرنسیں ہوئیں، مگر ان نام نہاد کانفرنسوں کے انعقاد سے ہندو مسلم مفاہمت کے امکانات ذرا بھی روشن نہ ہوئے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ (ہندوستان میں) فرقہ وارانہ اتحاد و امن ناممکن ہے۔ سیاسی رہنما غالباً اس حقیقت سے چشم پوشی کر رہے تھے کہ ملک کی سیاسی زندگی میں اس مسئلے کی جڑیں دُور دُور تک پھیلی ہوئی ہیں اور اب محض لیپا پوتی سے کام نہ چلے گا۔

ہندوؤں نے اپنی مسلم دشمن پالیسی کے مطابق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو کتابیں اور مضامین لکھے تھے وہ کس قدر شر انگیز اور خطرناک تھے، آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں مثال کے طور پر راتش موہن اگروال کی کتاب کا ایک حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ عجیب سی بات ہے کہ راتش موہن کے پائے کا پروفیسر اور اسکالر یہ کہتا ہے کہ "درست قدم اٹھانا کبھی بعد از وقت نہیں ہوتا۔ تاہم ہندو مہا سبھا یا کل ہند کانفرنس جیسی کسی نمائندہ ہندو تنظیم کو فوراً ایک اعلیٰ کونسل مقرر کرنی چاہیے جو تمام بیرونی مذاہب کو ہندومت کے سانچے میں ڈھالنے کی تحریک شروع کرے۔ اس کے بعد یہ تنظیم چاروں بیرونی مذاہب کے لیے (جنھیں ہندومت کے سانچے میں ڈھالنا مقصود ہے) مناسب نام تلاش کرے۔ ہماری تجویز ہے کہ اسلام کو "نرا کار سماج" مسیحیت

کو اینگلو پوجک سماج اور یہودیت کو 'پوتر سماج' کا نام دیا جائے۔[1]

اسی مصنف نے ایک اور مقام پر لکھا ہے "یہ بات بڑی افسوسناک ہے کہ ہمیں ابھی چار مذاہب کی حیثیت بدلنی ہے۔ یہ مذاہب اسلام، عیسائیت، مجوسیت (زرتشتی) اور یہودیت ہیں۔ اگر ہندو رہنما ان مذاہب کو اسی وقت ہندو بنا لیتے جس وقت وہ یہاں آئے تھے تو وہ تمام ہندو جو ان مذاہب میں سے کسی کو قبول کرنے اپنے دھرم سے برگشتہ ہوئے بغیر ہندو رہتے اور ہندوستان آنے والے وہ تمام لوگ بھی جو ان مذاہب کو یہاں لائے تھے ترکِ مذہب کیے بغیر آسانی کے ساتھ ہندو قوم میں شامل ہو سکتے تھے۔

آریہ سماجیوں اور دیگر انتہا پسند ہندو فرقوں کی اشتعال انگیزی اور دریدہ دہنی سے بیشتر مسلمان سخت مشتعل تھے۔ حد تو یہ ہے کہ قائداعظم نے بھی (جنہیں کبھی ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جاتا تھا) مسلم لیگ کے اجلاس ۱۹۲۶ء میں بادل ناخواستہ یہ تسلیم کیا کہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ ہندوستان میں فرقہ واریت موجود ہے۔ محض جذبات اور باتوں سے اسے ختم نہیں کیا جا سکتا۔ نیشنلزم (قوم پرستی) محض مشترکہ انتخابی اداروں سے پیدا نہیں کیا جا سکتا۔"

دونوں قوموں میں اختلافات کے اسباب کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ فرقہ وارانہ صورت حال انتہائی خطرناک تھی اور کشت و خون کے امکانات ختم کرنے کی تدبیریں بڑی شد و مد سے تلاش کی جا رہی تھیں۔ کانگریس نے دونوں قوموں کے درمیان تصفیے کا منصوبہ تیار کر کے ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا جس نے اس منصوبے کا بڑی خوش اسلوبی سے گلا گھونٹ دیا اس نے کانگریس کو سرے سے کوئی رپورٹ ہی پیش نہ کی۔ تاہم اس موضوع پر سی آر داس کی تجاویز پر بحث ہوئی جنہیں منظور نہ کیا جا سکا کیونکہ خیال تھا کہ ان تجاویز کے ذریعے مسلمانوں

---

[1] ہندو مسلم راٹس۔ رانش موہن اگروال۔ صفحہ ۸۵

کو ضرورت سے زیادہ رعائتیں اور استحقاق بخش دیا گیا ہے۔ دریں اثنا فرقہ وارانہ منافرت کی آگ برابر سلگ رہی تھی اور پے در پے فرقہ وارانہ فسادات اس شعلے کو دور دور تک پھیلا رہے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ دونوں قوموں نے ایک دوسرے کے خلاف ایک قسم کی بے ضابطہ جنگ شروع کر رکھی تھی۔

جناح صاحب کو (جنھیں اب تک یقین تھا کہ سوراج حاصل کرنے کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کا اتحاد ناگزیر ہے) یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوتا کہ خانہ جنگی کی لہر پورے ملک میں پھیلتی جا رہی ہے۔ انھوں نے اخبارات کو ایک بیان دیتے ہوئے کہا کہ کانگریس چونکہ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک جاری رکھنے کی اہل ثابت نہیں ہوئی، اس لیے اس نے اتحاد کے مسئلے کو سرد خانے میں ڈال دیا ہے۔ انھوں نے اخباروں سے، جن کی اکثریت ہندوؤں کے زیر اثر تھی، اپیل کی کہ وہ اس موقع پر ذمہ داری کا ثبوت دیتے ہوئے تعمیری اور مصالحتی کردار ادا کریں۔ جناح صاحب نے تجویز پیش کی کہ مسلمان اپنی سیاسی تنظیم کریں، اور دونوں قوموں کے لیڈر ان تمام مسئلوں کو حل کرنے کے لیے جن سے فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوتے ہیں ایک گول میز کانفرنس بلائیں۔ انھوں نے بیان کے آخر میں کہا کہ میری زندگی کا نصب العین یہ ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں پائیدار اتحاد اور مفاہمت پیدا کی جائے۔

اسی سال نومبر میں بمبئی میں ایک کل جماعتی کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ کانفرنس میں جلد از جلد سوراج حاصل کرنے اور فرقہ واریت کے مسئلے کا مستقل حل معلوم کرنے کے لیے اعلیٰ اختیارات کی ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جناح صاحب نے دن رات انتھک کوشش کی کہ کسی طرح ہندو مسلم مسئلے کا فوری اور مؤثر حل دریافت کر لیا جائے تاکہ دونوں اقوام مل جل کر رہ سکیں اور آپس کی منافرت اور ناچاقی کی وجہ سے سوراج کے حصول میں جو تاخیر ہو رہی ہے وہ ختم ہو جائے۔

جب لارڈ برکن ہیڈ نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں وزیر ہند کی حیثیت سے دارالامراء میں

یہ اعلان کیا کہ فی الفور ایک شاہی کمیشن مقرر کیا جا رہا ہے جو ہندوستان کے لیے سیاسی اصلاحات کے مسئلے کی چھان بین کرے گا د گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء کے تحت یہ کمیشن ۱۹۲۸ء میں قائم کیا جانا تھا) تو کئی ہندوستانی لیڈروں نے اسے ہندوستانی عوام کی فتح قرار دیا۔ لیکن بعد میں تاریخی دستاویزات سے یہ انکشاف ہوا کہ اس وقت شاہی کمیشن کے تقرر میں عجلت حکومت برطانیہ کے اپنے مفاد میں تھی۔ ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء کو لارڈ برکن ہیڈ نے وائسرائے ہند لارڈ ریڈنگ کے نام ایک نجی مکتوب میں لکھا:۔

مجھے ہمیشہ اس خیال سے کوفت ہوتی ہے کہ ہمارے جانشین شاہی کمیشن کا تقرر کریں۔ آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کرنل ودیج ووڈ اور ان کے ساتھی کس قسم کا کمیشن مقرر کرتے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ ہمیں دوراندیشی سے کام لے کر ۱۹۲۷ء کے موسم گرما تک کمیشن مقرر کر دینا چاہیئے۔ آپ جب یہ سمجھیں کہ اس سودے بازی کے ذریعے سوراج پارٹی کا مقابلہ کرنے یا اس کا شیرازہ منتشر کرنے کی ساعت آ پہنچی ہے تو مجھے اطلاع دیں۔" اسی مکتوب میں لارڈ برکن ہیڈ نے لکھا تھا: "مجھے یقین ہے کہ اس ملک کے سیاسی حالات و واقعات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمیشن کے اراکین کی نامزدگی کا سوال ہم اپنے ہاتھ میں رکھیں گے۔ اس سلسلے میں ہم کوئی معمولی سا خطرہ بھی مول لینے کو تیار نہیں۔ اس لیے فی الحال میں یہ سمجھتا ہوں ۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ وزیر اعظم کو اس خیال سے اتفاق ہے کہ ہم کمیشن کا تقرر ۱۹۲۷ء کے وسط تک کر دیں اور اسی میں ہماری بھلائی ہے۔ اگر آپ اس طریقہ کار کو سودے بازی کے لیے مفید سمجھتے ہیں تو اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائیے اور یہ بات یاد رکھیے کہ حکومت آپ کی تائید کرے گی۔"

غرض کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا گیا۔ کمیشن کے تمام اراکین یورپی تھے ایک بھی ہندوستانی نہ تھا۔ ہندوستان میں اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور برصغیر کے ہر علاقے میں

شدید ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا۔ حکومت نے کمیشن میں ہندوستانی باشندوں کو نمائندگی
نہ دینے کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ جس وقت گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء نافذ
کیا گیا تھا اس وقت یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ کمیشن کے ارکان پارلیمنٹ کے ممبروں میں سے
نامزد کیے جائیں گے۔ اسی دوران میں لارڈ ارون کو لارڈ ریڈنگ کی جگہ وائسرائے ہند
مقرر کیا گیا اور ان کی کابینہ نے اس کمیشن کی (جس کے تمام ارکان انگریز تھے) باضابطہ
منظوری دے دی۔ سر محمد حبیب اللہ اس وقت وائسرائے کونسل کے رکن تھے اور وہ
کونسل کے واحد ممبر تھے جس نے کمیشن میں ہندوستانیوں کی نمائندگی نہ ہونے پر کڑی نکتہ چینی
کی اور اس کی شدید مخالفت کی لیکن ان کی آواز دوسرے ممبروں کے ہنگامے اور
شور و شغب میں دب گئی اور اس طرح اس کمیشن کے لیے منظوری حاصل کر لی گئی۔

سر جارج سائمن شاہی کمیشن کے سربراہ تھے۔ نومبر ۱۹۲۷ء میں وزیر ہند نے کمیشن
کے ارکان کے ناموں اور ان کے فرائض وغیرہ کا اعلان کیا۔ اس پر ملک کے ہر مکتب
خیال کے سیاسی رہنماؤں نے زبردست احتجاج کیا۔ جب بھی سیاسی جماعتوں اور مختلف
فرقوں میں مکمل اتفاق رائے کی ضرورت پر زور دیا جاتا، قائداعظم ہمیشہ پیش پیش رہے
انھوں نے دوسری سیاسی تنظیموں کے رہنماؤں سے رابطہ پیدا کیا۔ جن میں سر علی امام
سر عبدالرحیم، سر سوامی آئر، سر تیج بہادر سپرو، سر پرشوتم داس ٹھاکر داس، مسٹر
ایچ پی موڈی اور سر چمن لال سیتل واد قابل ذکر ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ایسے
موقعوں پر مناسب طریقہ کار یہی ہے کہ عام جلسے منعقد کیے جائیں اور قراردادیں منظور
کر کے حکومت پر دباؤ ڈالا جائے۔ اس سلسلے میں انھوں نے خود پہل کی اور ۱۹ نومبر
۱۹۲۷ء کو بمبئی میں ایک جلسۂ عام طلب کیا۔ یہ جلسۂ عام سر ڈنشا پیٹیٹ کی صدارت میں
سر کاؤس جی جہانگیر ہال میں منعقد ہوا اور قائداعظم کی پیش کی ہوئی حسب ذیل تحریک
اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔

بمبئی کے شہریوں کا یہ جلسۂ عام پُرزور الفاظ میں اعلان کرتا ہے کہ جس کمیشن
کا اعلان کیا گیا ہے وہ اہلِ ہند کے لیے ناقابلِ قبول ہے کیونکہ اس میں واضح طور
پر ہندوستانی عوام کے اس حق کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ ملک کے آئندہ دستور کی
تشکیل میں انھیں بھی برابر اور مساوی نمائندگی ملنی چاہیئے۔ جلسۂ عام یہ فیصلہ بھی کرتا
ہے کہ ان حالات میں اہلِ ہند کسی وقت اور کسی طرح بھی کمیشن کی سفارشات کے پابند
نہ ہوں گے۔"

سائمن کمیشن کے تقرر کے معاملے پر دارالعوام کی بحث جب اخباروں میں
شائع ہوئی تو قائداعظم نے فوراً ایک بیان جاری کیا۔ ۲۸ نومبر کے اس بیان میں
انھوں نے کھلم کھلا پارلیمنٹ کے فیصلے کی مذمت کی۔ قائداعظم نے سائمن کمیشن کے خلاف
احتجاج کا راستہ دکھا دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ احتجاج اور ایجی ٹیشن برابر جاری رہے۔
اس مقصد کے حصول کے لیے خاص طور پر ان کی کوشش سے ۳ دسمبر کو ایک اور جلسۂ عام
منعقد ہوا۔ قائداعظم نے اس جلسۂ عام میں ایک خاص تقریر داد تحسین کرتے ہوئے بعض
مسلمانوں کے رویے کا ذکر اس طرح کیا۔ یقین کیجیے کہ میرا یہ کہنا غلط نہیں کہ جو نادان
دانستہ غلط راستے پر ڈال دیے گئے ہیں اس مسئلے کو مکمل طور پر نہیں سمجھتے۔ مجھے
امید ہے کہ مسلمان کسی طرح ہندوؤں سے پیچھے نہیں رہیں گے بلکہ ہندوؤں، پارسیوں اور
دیگر باشندوں کے ساتھ مل جل کر کام کریں گے، متحد ہو کر آگے بڑھیں گے۔ جو لوگ
مسلمانوں کو ورغلا رہے ہیں میں انھیں خبردار کرتا ہوں کہ ان حرکتوں سے باز آ جائیں۔
اگر ان لوگوں نے مسلمانوں کو ورغلانے کی کوشش کی تو ماضی کی طرح اب بھی منہ کی
کھائیں گے۔ میں اپنے ہندو بھائیوں سے اپیل کرتا ہوں کہ قبل از وقت مسلمانوں کے متعلق
کوئی رائے قائم نہ کیجیے، ان کی وفاداری پر شک و شبہ نہ کیجیے، انھیں الزام نہ دیجیے۔ میں
آپ سے اپیل کرتا ہوں کہ اکثریتی فرقے کی حیثیت سے آپ اپنے نظریات و خیالات پڑھئے

رہیئے اور اگر آپ نے ایسا کیا تو اقلیتی فرقے، جن میں مسلمان بھی شامل ہیں، یقیناً آپ کی پیروی کریں گی۔"

برطانوی حکومت ہندوستان میں ایسے پٹھوؤں کی تلاش میں تھی جو عوام کی اس سیاسی مزاحمت کو ختم کرا سکیں اور حکومت سائمن کمیشن کے حق میں لوگوں کی حمایت حاصل کر سکے مسلمانوں میں قائداعظم کا جو اثر و رسوخ تھا اسے زک پہنچانے کے لیے پنجاب اور بنگال میں انگریزوں کو آخر کار کچھ مسلمان ٹوڈی مل ہی گئے اور ان ٹوڈیوں نے قائداعظم کے بیانات کے جواب میں اپنے بیان داغنے شروع کر دیے، سائمن کمیشن کا تقرر منظور کر لینے اور ہندوستانی مسلمانوں کو ورغلانے کے لیے جو پروپاگنڈا کیا جا رہا تھا۔ اس کے جواب میں قائداعظم نے ۱۱ دسمبر کو اخباروں کے نام ایک منشور جاری کیا جس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ "آپ خواہ قومی وقار و احترام کے وسیع تر اصول کو لیں یا ذاتی مفاد کے تنگ نظر اصول کو، مسلمانوں کو اس کمیشن سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ انھیں تاریخ میں ملک کی سیاسی زندگی کے ایک اہم اور نازک موڑ پر ملک دشمن کا نام دیا جائے گا۔ اور دوسرے فرقے بجا طور سے مسلمانوں کو الزام دے سکیں گے کہ نہ صرف انھوں نے اپنے قومی مفاد بلکہ مادر وطن سے بھی غداری کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ مسلمان ایسی کوئی راہ اختیار نہیں کریں گے اور گمراہ نہ ہوں گے، خواہ ذاتی غرض کے بندے ان پر کتنا ہی دباؤ کیوں نہ ڈالیں۔"

قائداعظم کے ان واضح بیانات کے باوجود، جو مسلمانوں کی اکثریت کے خیالات کی ترجمانی کرتے تھے، انگریز "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کی پرانی پالیسی پر عمل پیرا رہے لارڈ برکن ہیڈ نے فروری ۱۹۲۸ء میں وائسرائے کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا۔ "اب پوری پالیسی واضح ہو گئی ہے۔ اس پالیسی سے ہندوؤں میں یہ خوف و خدشہ پیدا کرنا مقصود ہے کہ کمیشن پر مسلمان چھا جائیں گے اور ہو سکتا ہے کہ یہ کمیشن جو رپورٹ پیش کرے اس سے

ہندوؤں کی پوزیشن کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے۔ اس طرح ہمیں مسلمانوں کی ٹھوس حمایت حاصل ہو جائے گی اور جناح بے یار و مددگار رہ جائیں گے۔" ان الفاظ سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سامراج کے ذہن میں "پھوٹ ڈالنے اور حکومت کرنے" کے نظریے کے سوا کوئی تعمیری خیال موجود ہی نہ تھا۔

سائمن کمیشن اپنے کام میں مصروف تھا اور چونکہ کمیشن کے تقرر سے انگریزوں کی نظر میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا تھا اس لیے سائمن کمیشن کے ارکان نے ہندوستان کی رائے عامہ کے احتجاج کی کوئی پرواہ نہ کی۔ مسٹر جناح نے ایک طویل اخباری بیان میں چند حکومتِ برطانیہ کو خبردار کیا کہ اگر انھوں (لارڈ برکن ہیڈ) نے برطانوی عوام اور پارلیمنٹ کو یہ یقین دلا دیا ہے کہ ہندوستان ایک ایسا عجائب گھر ہے جہاں مختلف قومیں اور فرقے آباد ہیں اور وہ آپس میں برسرِ پیکار رہتے ہیں تو ذمہ دار حکومت کے قیام سے متعلق ہندوستان کا موقف ایک بے معنی سی بات ہو گی۔ پھر کابینہ کو آخر ایک ایسا پارلیمانی کمیشن مقرر کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی جس کا ترجمان پہلے ہی ہندوستان کی پوزیشن پر نکتہ چینی اور ناپسندیدگی کا اظہار کر چکا ہے —— حیرت اس پر ہے کہ یہ کہا جا رہا ہے کہ ہندوستان کے آئندہ آئین سے متعلق جو فیصلے کیے جائیں گے ان میں ہندوستانیوں کو کوئی ذمہ داری نہیں سونپی جا سکتی —— اب کچھ لارڈ ریڈنگ کے متعلق سنیے۔ وہ تمام سیاست دانوں سے ناراض ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر ان سیاست دانوں ہی نے ہندوستان کے آئین سے تعلق رکھنے والے مختلف معاملات پر تجاویز مرتب کی ہیں۔ کیا لارڈ ریڈنگ یہ تجویز پیش کرنا چاہتے ہیں کہ اس کمیشن کے ممبر ہندوستان کے آئندہ آئین کے بارے میں سرے سے کوئی خیال یا رائے ہی نہیں رکھتے؟ —

ان اسباب کی بنا پر ہندوستان سرکاری پالیسی کی تائید نہیں کر سکتا۔ ہندوستانی خواہ کسی مرحلے پر کسی صورت میں بھی کمیشن کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے کیونکہ یہ ہندوستانی آئین...

کے کام میں ہندوستان کی شرکت کے اصول کی نفی کرتا ہے ـــ اس اصول کو تو حکومت برطانیہ نے کئی بیانات میں علی الاعلان تسلیم کر لیا ہے۔ پھر آخر اس سے گریز کیوں کر رہا ہے؟"

سائمن کمیشن ۳ فروری کو بمبئی پہنچا تو کمیشن کے صدر نے ایک بیان جاری کیا۔ اس سے پہلے کمیشن کا استقبال کالی جھنڈیوں اور "سائمن واپس جاؤ" کے فلک شگاف نعروں سے کیا گیا تھا۔ بندرگاہ سے گورنر ہاؤس تک ہر طرف یہی کالی جھنڈیاں نظر آتیں اور یہی نعرے سنائی دیتے۔ کمیشن کے صدر نے اس بیان میں کہا تھا "کمیشن کا تقرر چونکہ تاج برطانیہ نے مکمل آزاد و خود مختار ادارے کی حیثیت سے کیا ہے جس میں پارلیمنٹ کے ممبر شامل ہیں، اس لیے کمیشن، حکومتِ ہند کے سامنے جواب دہ ہے نہ حکومتِ برطانیہ کے۔ اس کے فرائض کا دائرہ چونکہ آزاد ہے اس لیے ہم ہندوستان کی مجالس قانون ساز کے اراکین سے توقع کرتے ہیں کہ وہ ہم سے تعاون کریں گے" اس کے باوجود کراچی سے کلکتہ تک ایک ہی نعرہ سنائی دیا اور وہ "سائمن واپس جاؤ" کا نعرہ تھا۔ کمیشن کے اراکین کو بخوبی اندازہ ہو گیا کہ انھیں کسی طرح بھی ہندوستان کی تقدیر کا غیر جانبدار منصف تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک میں مزید زور پیدا کرنے کے لیے جناح صاحب نے ۲۰ فروری کو ایک اور بیان میں کہا "سر جان سائمن اور وائسرائے کے بیان پڑھنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ کمیشن کے ساتھ مل کر کام کرنے والی ہندوستانی کمیٹی کو مساوی حیثیت نہیں دی جائے گی۔" انھوں نے اس بات پر بھی اعتراض کیا کہ کچھ شہادتیں خفیہ طور پر قلم بند کی جا رہی ہیں اور کہا کہ "کمیشن کی کارروائی پر ہندوستانی ممبروں کو اظہارِ خیال کا حق حاصل نہیں۔ چیئرمین کو یہ اختیار حاصل ہے کہ سنٹرل کمیٹی کے ممبر کسی صوبے میں شہادتیں اور آرا قلمبند کریں یا نہ کریں۔ نیز ہندوستانی کمیٹی کی رپورٹ کو ثانوی حیثیت دینے سے یہ بات بالکل واضح ہو

ے کہ کمیٹی اس کمیشن کی ماتحت ہے ـــــ ان حالات میں ہم تمام فریقوں اور تمام سیاسی
، عتوں سے اپیل کرتے ہیں کہ وہ متحد ہو کر لافر قہ دارانہ یا نسلی اختلافات طے کریں (ہمیں
ین ہے کہ یہ مسئلہ تمام فریقوں کے اطمینانِ خاطر کے مطابق جلد طے ہو جائے گا) (۲) زیادہ
ے زیادہ اتفاقِ رائے کا ثبوت دیتے ہوئے ایک مسودہ آئین مرتب کریں اور ایک کنونشن
ں یہ مسودہ منظور کر لیں اور پھر (۳) اس آئین کے نفاذ کی جدوجہد کریں۔"

سائمن کمیشن نے جس شہر کا دورہ کیا ہے وہاں سیاہ جھنڈیاں اور احتجاجی نعرے
ں کے حصے میں آئے۔ کمیشن کو ان مظاہروں سے یقین ہو گیا ہو گا کہ عوام کمیشن کی کاروائی
بند نہیں کرتے اور اس پر ذرا سا اعتماد بھی کرنے کو تیار نہیں۔ لیکن عوام کی پسند اور
ند کا خیال کسے ؟ کمیشن کو جو احکام ملے تھے اسے ان کی بجا آوری کرنی تھی خواہ
ک جن کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا، اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں یا ناپسندیدگی کی؟
کمیشن کے ورودِ بمبئی کے موقع پر شہر میں مکمل ہڑتال اور بھرپور بائیکاٹ کا مظاہرہ
ہا۔ مدراس میں ہائی کورٹ کی عمارت کے سامنے زبردست ہجوم جمع ہو گیا جس پر
ں نے گولی چلا دی۔ بہت سے آدمی ہلاک و زخمی ہوئے۔ کلکتہ میں طالب علموں اور
ں میں کئی جھڑپیں ہوئیں اور طلبہ کو بربریت اور تمرّد کا شکار بننا پڑا۔ کمیشن نے
ابطہ طور پر سب سے پہلے دہلی کا دورہ کیا۔ وہاں بھی سائمن واپس جاؤ کے نعرے
ں دیے۔ کمیشن کے دورے کے خلاف لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی قیادت میں
دست جلوس نکلا۔ مگر گھڑسوار اور لٹھ بند پولس نے اس پرامن جلوس کو منتشر کر دیا۔
س ہنگامے میں کئی آدمی شدید طور پر زخمی ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس موقع پر لالہ
پت رائے کو جو زخم آئے تھے وہی ان کی موت کا سبب بنے۔ پولس کی زیادتیوں کے
ف تحقیقات کرانے کا مطالبہ پیش کیا گیا لیکن حکومت کے دامانِ رحمت نے وفادار نوکرشاہی
پنے سائے میں لے لیا تاکہ ان کی بدعنوانیوں کا پردہ چاک نہ ہو سکے۔ اس سلسلے میں سب

سے زیادہ نقصان غالباً لکھنؤ کو اُٹھانا پڑا۔ وہاں مسلسل چار دن تک پولس نے جلوسوں کو ہر ممکن طریقے سے منتشر کرنے کی کوشش کی۔ کئی لوگوں کو بندوقوں کے کُندوں سے مارا پیٹا گیا اور ہجوم پر گھوڑے دوڑا دیے گئے۔ اس موقع پر جو لوگ شدید زخمی ہوئے ان میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی شامل تھے۔ پٹنہ میں پچاس ہزار آدمیوں نے سیاہ جھنڈیوں سے کمیشن کا استقبال کیا۔ مظاہرین کے ہاتھوں میں سپلے کارڈ تھے جن پر احتجاجی نعرے لکھے ہوئے تھے۔

۶ فروری کو سر جان سائمن نے وائسرائے کے نام ایک مکتوب میں لکھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے سات ارکان مرکزی اسمبلی کے منتخب سات ہندوستانی اراکین کے ساتھ کام کرنے پر تیار ہیں اور یہ چودہ اراکین مشترکہ طور پر لوگوں کی رائے اور خیالات معلوم کریں گے۔ ہندوستانی ارکان مساوی حیثیت سے کمیشن کے اراکین کے طور پر کام کریں گے۔ اس تجویز کی روشنی میں مرکزی اسمبلی کے غیر سرکاری ممبروں کا اجلاس ہوا۔ جناح صاحب نے اس سلسلے میں خاص طور سے کام کیا۔ اجلاس میں طے کیا گیا کہ غیر سرکاری ممبران اسمبلی اپنے سات نمائندے نامزد کرنے سے انکار کر دیں گے۔ مرکزی اسمبلی کے سامنے غیر سرکاری ممبروں نے ۱۶ فروری کو ایک قرارداد پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ "کمیشن کی تشکیل اور اسکیم اسمبلی کے لیے ناقابلِ قبول ہے اور اسمبلی کمیشن سے کسی وقت، کسی صورت میں کوئی تعاون نہ کرے۔" یہ قرارداد ۶۲ کے مقابلے میں ۶۸ ووٹوں سے منظور کر لی گئی ——— یہ ہندوستان کی ترقی پسند قوتوں کی پہلی فتح تھی۔

سائمن کمیشن، سر جارج سائمن کے بقول "ہندوستان کے مختلف علاقوں میں تمام فرقوں اور طبقوں کی آراء معلوم کرنے کے بعد" ۳۱ مارچ کو انگلستان روانہ ہو گیا مگر سر جان سائمن کا یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد تھا کیونکہ خود کمیشن کی سرکاری رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ سیاسی رہنماؤں اور جماعتوں نے "نہ صرف باضابطہ طور پر کمیشن کے بائیکاٹ کا عہد

کر رکھا تھا بلکہ انھوں نے سماجی اعتبار سے بھی کمیشن سے کوئی تعلق نہ رکھا۔" سائمن کمیشن کی حیثیت ناخواندہ مہمان کی سی تھی اسی لیے اس کو ناکام و نامراد واپس جانا پڑا۔

قائدِاعظم نے کمیشن کے خلاف جدوجہد میں اپنی تمام قوتیں صرف کر دی تھیں ۵ رمئی ۱۹۲۸ء کو وہ آرام کرنے کے لیے انگلستان روانہ ہو گئے۔ انھوں نے لگاتار کئی گھنٹے روزانہ کام کیا تھا، وہ بہت تھک گئے تھے اور آرام ان کے لیے بہت ضروری تھا۔

وہ ایس ایس راجپوتانہ سے روانہ ہوئے۔ اتفاق سے دوسرے دو ممتاز سیاسی رہنما، سری نواس آئینگر اور دیوان چمن لال بھی اسی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ دیوان چمن لال نے اس سفر کے متعلق لکھا تھا "یہ دن بڑی راحت و اطمینان کے دن تھے۔ ہمارے سیاست داں کو شاذ و نادر ہی یہ نعمت نصیب ہوتی ہے۔ لوگوں کو کھیلتے کودتے اور کھاتے پیتے دیکھنے کے لیے ہمیں فرصت ہی فرصت تھی۔ بالخصوص ہمیں اتنا وقت مل گیا تھا کہ مل بیٹھ کر تھوڑی دیر اطمینان سے بات چیت کر سکیں۔ جہاز پر ہندوستان کے دو بہترین مقرروں، محمد علی جناح اور سری نواس آئینگر کی موجودگی نعمت سے کم نہ تھی۔ اگرچہ اُن کا پیشہ ہی بولنا تھا مگر اس سفر میں وکالت یا سیاست سے ہٹ کر یہ لوگ بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ دیگر امور پر گفتگو کر سکتے تھے ...... میں نے اس مضمون کے آغاز میں کہا ہے کہ ہمیں جہاز پر بات چیت کے بے انتہا مواقع ملے۔ اس بات چیت کی نوعیت بڑی حد تک سیاسی تھی۔ یہاں مجھے اس بات کا اعتراف کر لینا چاہیے کہ قانون ساز اسمبلی میں سائمن کمیشن کے معاملے پر محمد علی جناح نے صورتِ حال کو سنبھال لیا۔ ان کا خیال تھا کہ اسمبلی میں ہندوستانہ اندازِ فکر پیدا ہو جائے تو اس سے حقیقی اتحاد پیدا ہو سکے گا۔ بدقسمتی سے آج وہ بہت مایوس اور دل برداشتہ ہیں کیونکہ ان کی سعی و کاوش کے ٹھوس نتیجے برآمد نہیں ہو پائے۔ سندھ کے مسئلے نیز شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیے اکثریت کی

نمائندگی اور نشستوں کی تخصیص کے معمولی مسئلوں پر وقتی طور سے ہندو مسلم اتحاد کے تمام امکانات ختم ہو گئے تھے۔ محمد علی جناح کا اصرار ہے کہ صرف تین رہنما اگر مجھ سے ایک متحدہ پروگرام پر اتفاق رائے اور تعاون کر لیں (جو وائسرائے کو منظور ہے) تو سوراج جیسا مجرد تصوّر حقیقت کا روپ دھار کر سامنے آجائے گا۔ میں نے ان سے ان تین رہنماؤں کے نام پوچھے تو انھوں نے کہا! "پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت مدن موہن مالویہ اور لالہ لاجپت رائے۔ جناح صاحب نے کہا کہ پہلا اور سب سے بڑا مسئلہ ہندو مسلم اتحاد ہے۔ یہ مسئلہ زبانی جمع خرچ سے طے نہیں ہوگا۔ یہ ایک سنجیدہ اور ٹھوس نظریہ ہے۔ میں نے جہاز پر مختلف الخیال سیاسی گروہوں سے تعلّق رکھنے والے دوسرے ہندوستانی باشندوں سے بھی اس موضوع پر بات چیت کی اور ہر شخص نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ہندوستانی لیڈر میرے بیان کردہ مسائل پر تصفیے سے گریز کر رہے ہیں۔ اگر ان مسائل پر مصالحت ہو گئی یا کوئی فریق اپنے موقف سے دستبردار ہو گیا تو کیا ہندوستان تباہ ہو جائے گا؟ اور فرض کیجیے کہ ہم نے یہ مسائل حل کر لیے تو یقین کیجیے کہ قوم کی متحد آواز کو کسی طرح دبایا نہیں جا سکے گا ...... ہم نے گاندھی کا ذکر چھیڑا تو جناح صاحب نے ہنستے ہوئے بتایا کہ کس طرح گاندھی اور عمر سبحانی نے انھیں تحریکِ عدم تعاون میں شامل کرنے کے لیے اپنا سارا زور لگا دیا۔ انھوں نے کہا میرا خیال تھا کہ تحریک ناکام ہو جائے گی لیکن میں نے کہا کہ آپ غلطی پر ہیں۔ تحریک تو کم و بیش کامیاب ہو گئی تھی۔ ناکامی ہوئی تو اس لیے کہ گاندھی جی میں لینن کی سی سپرٹ نہیں تھی ورنہ پچھلے چند برس کی تاریخ بالکل بدل جاتی۔ انھوں نے کہا "گاندھی سیاست دان نہیں ہیں ـــ کاش وہ ایک سیاست دان ہوتے۔"

تین کوششیں

۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی درمیانی مدت کے آخری سال بھی کشمکش کے تھے۔ کوشش
کے باوجود سیاسی تنظیموں کے مابین کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا اور اس طرح یہ خواب شرمندۂ تعبیر
ہی رہا کہ دستوری اصلاحات کے سلسلے میں متحدہ محاذ بنا کر حکومت کا مقابلہ کیا جائے۔
اس سلسلے میں کئی کوششیں کی گئیں۔ قائداعظم کی وہ مساعی جو ۲۰ مارچ ۱۹۲۷ء کو دہلی
میں مسلم رہنماؤں کو یکجا کرنے کے سلسلے میں انھوں نے انجام دیں قابل ذکر ہیں۔ اس
اجلاس میں ہر مکتبِ فکر کے نمائندہ مسلم رہنماؤں کو مدعو کیا گیا تھا۔ قائداعظم نے کانفرنس
کی صدارت کی اور ان کے اصرار سے ایک قرارداد منظور کی گئی جس میں منجملہ دیگر امور
کے یہ بھی کہا گیا تھا کہ "مسلمانوں کو حسب ذیل شرائط پر دوسری سیاسی تنظیموں سے سمجھوتہ
کر لینا چاہیے .... (۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے۔
(۲) جس بنیاد پر کسی دوسرے صوبے میں اصلاحات نافذ کی جائیں، شمال مغربی سرحدی
صوبے اور بلوچستان میں بھی اسی بنیاد کو پیشِ نظر رکھا جائے۔" کانفرنس نے مطالبہ
کیا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی کا
تعین کیا جائے اور اس کے عوض سندھ، سرحدی صوبے اور بلوچستان میں ہندوؤں
کو بھی اسی بنیاد پر نمائندگی دی جائے گی۔ پنجاب اور بنگال میں دونوں قوموں کی
نمائندگی ان کی آبادی کی بنیاد پر ہوگی۔ تاہم قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ مرکزی اسمبلی
میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب ایک تہائی یعنی ۳۳ فی صدی سے کم نہ ہو۔ انتخابات

کے لیے مخلوط حلقۂ انتخاب بنایا جائے۔

دہلی کانفرنس جناح صاحب کی عظیم ذاتی کامیابی کی حیثیت رکھتی تھی کیونکہ وہ اپنے تدبر سے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور آئندہ دستوری اصلاحات کی نسبت ایک مشترک پالیسی منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس پالیسی کی رُو سے مسلمانوں کی نمائندگی کا مسئلہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ مسٹر ایم سی چھاگلہ نے مسٹر جناح کو رہبر عظیم قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس ناممکن بات کو ممکن بنانا جناح ہی کا حصّہ تھا اور اس طرح انھوں نے شاندار کامیابی حاصل کی۔ چھاگلہ ہی نہیں ہر مکتب خیال کے ہندو لیڈروں نے بھی جناح صاحب کو بڑھ چڑھ کر خراج تحسین پیش کیا۔ ان میں مسز نائیڈو بھی شامل تھیں جنھوں نے جناح صاحب کو "ہندو مسلم اتحاد کا سفیر" کہہ کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا تھا۔

دہلی کانفرنس کی قرارداد صرف اسی صُورت میں مؤثر ہو سکتی تھی جب لیگ، کانگریس اور دوسری سیاسی جماعتیں اس کی توثیق کر دیتیں۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے قرارداد کا جائزہ لیا اور اسے آل انڈیا کانگریس کی کونسل کے اجلاس میں پیش کر دیا جو سری نواس آئینگر کی زیر صدارت منعقد ہوا تھا۔ تفصیلی غور و خوض کے بعد دہلی کانفرنس کی تجاویز منظور کر لی گئیں۔ کئی ہندو لیڈروں اور اخباروں نے لیگ اور کانگریس کے فیصلے پر شدید اعتراضات کیے اور جناح صاحب کو ۲۰ مئی کو مجبوراً اپنے ایک بیان میں کہنا پڑا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے جان بوجھ کر غلط فہمیاں پیدا کی جا رہی ہیں اور اس لیے میری خواہش ہے کہ یہ بات واضح ہو جانی چاہیے کہ مسلمان صرف اسی صورت میں مخلوط حلقۂ انتخاب اور تحفظ نشست کے اصول کو قبول کریں گے جب ہندو قرارداد دہلی کی دوسری تمام تجاویز پر صاد کر دیں۔ تجاویز یہ ہیں: سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے جداگانہ حیثیت دی جائے اور نئے صوبوں یعنی شمال مغربی سرحدی صوبے اور

بلوچستان میں بھی مکمل طور سے اصلاحات نافذ کی جائیں، انھوں نے کہا، اگر ہندو یہ تجاویز قبول کر لیں تب ہم تمام صوبوں میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط حلقہ ہائے انتخاب قبول کر لیں گے ـــــ پنجاب اور بنگال میں نمائندگی کا تناسب آبادی کی بنیاد پر ہونا چاہیے، مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ۳۳ فی صدی نشستیں ملنی چاہئیں۔ ـــــ اس پیشکش کو بحیثیت مجموعی منظور یا مسترد کیا جا سکتا ہے ـــــ جداگانہ انتخاب کے طریقے کو اسی صورت میں ختم کیا جا سکتا ہے کہ دونوں فریق کچھ قربانی دیں ـــــ میرا خیال ہے کہ اس نظام میں فائدہ بھی ہے اور نقصان بھی، تاہم میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ جداگانہ انتخاب سے نمائندہ حکومت کے قیام میں کوئی خاص رکاوٹ پڑے گی...... اس نازک مرحلے پر آپس میں تصفیے اور سمجھوتے میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔"

غالباً اس بیان کے نتیجے ہی میں خلافت کمیٹی نے جناح صاحب سے (جن کی کوششوں سے ایک اتحاد کمیٹی قائم ہوئی تھی) یہ درخواست کی کہ وہ اگست میں اتحاد کانفرنس کی صدارت کریں۔ ستمبر میں بمقام شملہ کمیٹی کا اجلاس ہوا لیکن کارروائی میں تعطل پیدا ہو گیا اور اجلاس کو غیر معیّنہ مدّت کے لیے ملتوی کر دینا پڑا۔ تاہم التوا سے پہلے کمیٹی نے جناح صاحب کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ ہندو مسلم مفاہمت کے لیے تمام ضروری اقدامات کر سکتے ہیں۔ کمیٹی نے اپیل جاری کی جس میں لوگوں پر زور دیا گیا کہ فسادات کی روک تھام اور فرقہ وارانہ کشیدگی ختم کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے۔"

اگرچہ قائدِ اعظم اس وقت مسلمانانِ ہند کے مقبول ترین رہنما تھے۔ تاہم وہ ابھی تک اسی نظریہ کے حامی تھے کہ ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے ہی جلد از جلد مؤثر طریقے سے آزادی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ان تمام حقیقتوں کے باوجود کچھ با اثر ہندو اخبارات اور

انتہا پسند ہندوؤں نے ان پر الزام لگایا کہ وہ ہندوستان کی آزادی اور اس کے اتحاد کے دشمن ہیں
تاریخ کے اوراق شاہد ہیں کہ قوم اور وطن کا درد رکھنے والوں پر ہمیشہ طرح طرح کے
الزامات لگائے جاتے رہے ہیں۔ جناح صاحب کے ساتھ ایسا ہونا کوئی نئی بات نہ تھی
وہ جب اخباروں میں اپنے خلاف بیانات اور عام جلسوں کی مخالفانہ تقاریر کا انداز دیکھتے
تو انھیں شر پسندوں کے اس رجحان پر تاسف ہوتا تاہم اپنے ہم وطنوں کی حالت پر اظہار
ہمدردی کے سوا وہ اور کیا کر سکتے تھے۔ لیکن تاریخ نے یہ سبق بھی دیا ہے کہ قوم کی خدمت
کرنے والے افراد کو کم درجے اور کم حیثیت رکھنے والے عناصر کے ہاتھوں تکالیف اٹھانی پڑتی
ہیں مگر جب یہ وقتی طوفان گزر جاتے ہیں تو آخر فتح و کامیابی انھیں کے قدم چومتی ہے۔

مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں جو کل جماعتی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس کی تجاویز
کے مطابق کانگریس کے اجلاس مدراس نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ جو بعد میں نہرو (موتی لال)
کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کمیٹی کو مسٹر جناح کی زیر صدارت منعقد ہونے والی کل
جماعتی کانفرنس کی تجاویز پر جنھیں مسلم تجاویز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، غور کرنا تھا۔
اس کے ساتھ ہی اسے فرقہ وارانہ اتحاد کمیٹی اور ہندو مہاسبھا کے فیصلوں کا بھی جائزہ
لینا تھا۔ ہندو مہاسبھا ایک انتہا پسند ہندو تنظیم تھی اور اس کی باگ ڈور ڈاکٹر مونجے
جیسے فرقہ پرست لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ نہرو رپورٹ میں مصالحانہ انداز نمایاں تھا اور
اس میں مسلم تجاویز کے بارے میں کہا گیا تھا کہ "ہندو لیڈروں کی جانب سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے
کہ سندھ کو جداگانہ حیثیت (بالخصوص فرقہ وارانہ بنیاد پر) نہ دی جائے اور دیگر صوبوں کے
بارے میں بھی یہی امر پیش نظر رکھا جائے۔ قرارداد کے الفاظ میں رد و بدل کے بعد یہ
اعتراض ختم ہو گیا اور قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔" رپورٹ میں مزید کہا
گیا تھا کہ فرقہ وارانہ اختلافات زیادہ اہمیت نہیں رکھتے لیکن ..... لوگوں کے ذہن میں
یہ اندیشہ یقیناً موجود ہے اور سیاسیات پر اس کا اثر پڑنا ناگزیر ہے ——— مسلمانوں کو

—— تشویش ہے کہ ممکن ہے اکثریت ان کے ساتھ انصاف نہ کرے۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لیے انھوں نے یہ تجویز پیش کی ہے کہ کم از کم ہندوستان کے کچھ حصّوں میں ان کی اکثریت ہونی چاہیے —— ہندوستان گیر اکثریت کے باوجود ہندو باشندے بنگال، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلمانوں سے خائف ہیں —— ہمیں یقین ہے کہ سندھ کے ہندو زیادہ ذہین اور مہم جو ہیں۔ سندھ کے یہ ہندو باشندے دور دراز ملکوں میں تجارت کر رہے ہیں اور اس طرح اپنے ہم وطن بھائیوں کو مالا مال کر رہے ہیں۔ سندھ کے ہندؤوں سے مہم جوئی کا یہ جذبہ کوئی نہیں چھین سکتا اور جب تک ان میں یہ جذبہ موجود ہے ان کا مستقبل محفوظ رہے گا —— ان تمام باتوں کے باوجود بھی اگر انھیں اندیشہ ہے تو یہ محض تحفّظِ حقوق کا معاملہ ہے اور اس بنیاد پر ایک جائز مطالبے کی مخالفت نہیں ہونی چاہیے۔" اس کے بعد رپورٹ میں مسلمانوں کے اس مطالبے پر بحث کی گئی تھی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔ کمیٹی نے یہ مطالبہ مسترد کرتے ہوئے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا "ہم نے اس اصول کو اپنایا ہے کہ جہاں کہیں مسلم اقلیت کے لیے نشستیں محفوظ کی جائیں، وہاں ان کی آبادی کے تناسب کو پیش نظر رکھا جائے۔ مسلمان، برطانوی ہند کی ایک چوتھائی آبادی سے بھی کم تعداد میں ہیں اور انھیں مرکزی اسمبلی میں اس تناسب سے زیادہ نمائندگی نہیں دی جا سکتی" اس طرح کمیٹی ہی میں اختلافِ رائے پیدا ہو گیا اور کمیٹی کے ایک مسلمان رکن شعیب قریشی نے استعفا دینے کے بعد نہرو رپورٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد کئی اتحاد کانفرنسیں ہوئیں جن میں مسلم تجاویز کی روشنی میں نہرو رپورٹ اور صورتِ حال کے اس جمود و تعطّل پر غور کیا گیا۔

جناح صاحب ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۲۸ء کو یورپ میں تعطیلات گزار کر رزمک نامی جہاز سے بمبئی واپس پہنچے اور ایک اخباری انٹرویو میں انھوں نے کہا کہ مجھے نہرو رپورٹ کے مطالعے

کے لیے کافی وقت نہیں ملا ہے۔ بظاہر وہ اس مسئلے پر اظہارِ خیال میں احتیاط برت رہے تھے۔ انھوں نے کہا "آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے میں لیگ کے آئندہ فیصلوں کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ـــــ دسمبر میں حسبِ معمول کانگریس اور لیگ کا اجلاس ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ ہم اب بھی اس مشکل ترین مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکال سکتے ہیں ـــــ میں مسلمانوں سے بطورِ خاص اپیل کرتا ہوں کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ انھیں اپنی تنظیم کرنی چاہیے اور وہ متحد رہیں" جب ان سے پوچھا گیا کہ ہندوستان کی مکمل آزادی یا برطانیہ کی زیرِ نگرانی ذمہ دار حکومت کے قیام کے اختلافی مسئلے پر ان کی رائے کیا ہے تو انھوں نے کہا مکمل آزادی کا مطالبہ انتہاپسندانہ مطالبہ ہے۔ اہلِ ہند یہ مطالبہ قبول نہیں کرا سکیں گے۔ اس لیے میں برطانیہ کی زیرِ نگرانی (ڈومینین) ذمہ دار حکومت کے قیام کے حق میں ہوں۔

۲۲ر دسمبر ۱۹۲۸ء کو کلکتہ میں کل جماعتی قومی کنونشن طلب کیا گیا۔ مسٹر جناح نے اس کنونشن میں شرکت سے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک لیگ کونسل نہرو رپورٹ پر غور و خوض نہ کر لے اور انھیں کنونشن میں شرکت کی اجازت نہ دے وہ شریک اجلاس نہ ہوسکیں گے" تاہم انھوں نے کہا کہ "اگر دونوں فریق فرقہ وارانہ تصفیے کے لیے تھوڑے سے صبر و تحمل سے کام لیں اور اس سلسلے میں کچھ اور کوشش کر لی جائے تو مجھے یقین ہے کہ بالآخر ہمیں کامیابی نصیب ہوگی۔ کیونکہ میرا خیال ہے کہ دونوں قوموں کو متحد کر کے ان کے اشتراک ہی سے ہندوستان ترقی کر سکتا ہے۔"

چند ہفتے پہلے نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے بمبئی صوبائی مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اجلاس میں رپورٹ کی تجاویز پر بڑی گرما گرم بحث ہوئی جناح صاحب نے صدرِ اجلاس کی حیثیت سے جب یہ محسوس کیا کہ ممبروں میں اتفاقِ رائے نہیں ہے تو انھوں نے اعلان کر دیا کہ جب تک لیگ کونسل اس معاملے پر غور نہ کر لے، اس

وقت تک کے لیے یہ سوال ملتوی کر دیا جائے۔ جس گروپ نے اس اجلاس میں نہرو رپورٹ کی تائید و حمایت کی تھی اس کے لیڈر ایم سی چھاگلہ تھے۔ جب کونسل نے نہرو رپورٹ کو مسترد کرنے کا فیصلہ کیا تو مسٹر چھاگلہ نے بمبئی لیگ کی سیکرٹری شپ سے استعفا دے دیا۔ کچھ عرصے تک مسٹر چھاگلہ لیگ اور کانگریس دونوں تنظیموں کے درمیان معلق رہے تاآنکہ وہ کانگریس میں شامل ہو گئے۔

دسمبر میں بمقام کلکتہ جناح صاحب کی زیرِ صدارت جب مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تو لیگ کی صفوں میں انتشار نظر آرہا تھا۔ اس موقع پر جناح صاحب نے محسوس کیا کہ مسلمان لیڈروں کو لیگ کے پرچم تلے متحد رکھنے کی ذمہ داری بھی خود ان پر عائد ہوتی ہے۔ چھاگلہ ایک بار پھر سرگرمِ عمل ہو گئے تھے۔ انھوں نے اس اجلاس میں ایک قرارداد پیش کی، کہ جناح صاحب کی سرکردگی میں ایک بااثر اور طاقتور کمیٹی کنونشن میں، جو عنقریب منعقد ہونے والا تھا، لیگ کی نمائندگی کرے۔ اجلاس نے چھاگلہ کی یہ قرارداد منظور کر لی۔

کنونشن میں اس معاملے پر خوب بحث ہوئی کہ نہرو رپورٹ میں مسلم تجاویز شامل کی جائیں یا رپورٹ جوں کی توں منظور کر لی جائے۔ جناح صاحب نے مسلمانوں کے موقف کو مستحکم بنانے کے لیے ایک ترمیم پیش کی اور کہا کہ مجموعی اعتبار سے پورے ہندوستان کے لیے یہ بڑا نازک وقت ہے۔ اس نازک مرحلے پر فرقہ وارانہ تصفیہ انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ انھوں نے کہا۔ کوئی ملک بھی اقلیتوں کے تحفظ کی ضمانت دیے بغیر نمائندہ ادارے قائم نہیں کر سکا۔ . . . . اکثریت ہمیشہ ظلم و ستم ڈھاتی رہی ہے اور اقلیتوں کو ہر لمحہ یہ اندیشہ رہا ہے کہ ان کے مفاد کو نقصان پہنچے گا اور اس کا تحفظ نہ ہو سکے گا۔" انھوں نے اپیل کی کہ جذبات سے بلند تر ہو کر میری پیش کردہ تجاویز قبول کر لی جائیں۔

مسٹر جناح نے نہرو رپورٹ میں جو ترمیمیں پیش کی تھیں ان میں اہم ترمیم یہ تھی کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو ایک چوتھائی نہیں (جیسا کہ نہرو رپورٹ میں تجویز کیا گیا تھا) بلکہ

ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔" انھوں نے کہا کہ اس سلسلے میں "ہماری تعداد کے علاوہ دیگر اہم اور جائز امور کو بھی پیش نظر رکھا جائے ـــــ ہماری دوسری تجویز یہ ہے کہ دستور اپنی نوعیت کے اعتبار سے وفاقی ہونا چاہیئے جس میں باقی ماندہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔ نہرو رپورٹ کی شق ۱۳ الف انتہائی نقصان دہ اور خطرناک ہے اسے منسوخ کیا جائے (اس شق کے تحت جملہ اختیارات صوبوں کے بجائے مرکز کو دیے گئے تھے) ـــــ سندھ اور شمال مغربی سرحدی صوبوں کی علیحدگی کی نسبت ہم اس بات سے اتفاق نہیں کرسکتے کہ ان صوبوں کی علیحدگی کا مسئلہ اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا جائے جب تک عام انتخابات کی بنیاد پر ہندوستان کے دستور کی تشکیل نہ ہو جائے۔" اختصار کے ساتھ مسلمانوں کے مطالبات کا ذکر کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا کہ ایسے مسئلوں پر غور و خوض ملتوی کیے جانے سے "ہم یہ سمجھتے ہیں کہ مسائل کو طاق پر رکھ دیا گیا ہے اور وہ قیامت تک طاق ہی کی زینت بنے رہیں گے۔"

جناح صاحب کے بعد سر تیج بہادر سپرو نے تقریر کی۔ انھوں نے مرکز میں ۲۷ فیصدی نمائندگی کے بجائے ۳۳ فیصدی نمائندگی کے متعلق مسٹر جناح کے مطالبے کی تائید کرتے ہوئے کہا: "میں چاہتا ہوں کہ آپ مسٹر جناح کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں انھیں پندرہ سال سے جانتا ہوں۔ اگر آپ انھیں ایک بگڑا ہوا ضدی بچہ سمجھتے ہیں تو جو کچھ وہ مانگتے ہیں دے دیجیے اور یہ قصہ ختم کیجیے۔ میں مسٹر جناح سے بھی کہتا ہوں کہ وہ اپنے مطالبوں میں ذرا سی نرمی اور رعایت سے کام لیں لیکن ہم کو یہ بھی لازم ہے کہ ہم حقیقت پسند سیاست دانوں کی طرح اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں اور اعداد و شمار سے گمراہ نہ ہوں۔"

سر تیج بہادر سپرو کے بعد مسٹر جیکر تقریر کرنے کھڑے ہوئے۔ ان کی تقریر کا لہجہ سخت مسلم بیزار اور فرقہ پرستانہ تھا۔ جیکر نے کہا: "میں بھی مسٹر جناح کو گزشتہ ۱۶ سال سے جانتا

ول میں نے قوم پرست تحریک میں ان کے ساتھ کام کیا ہے اور میں آپ کو یقین دلاتا
ں کہ وہ نہ تو ضدی بچے ہیں نہ بگڑے ہوئے بچے بلکہ آج وہ مسلمان اقلیت کے ایک
ے باک اور نڈر ترجمان کی حیثیت سے ہمارے سامنے آئے ہیں اور انھوں نے اپنی تقریر
ں اس کے مطالبات کو پیش کیا ہے۔ انھیں حق ہے جس طرح چاہیں اظہار خیال کریں۔
ے اُمید ہے کہ آپ سر تیج بہادر سپرو کی رائے کی روشنی میں ان کے دعوے کے متعلق غلط
ے قائم نہ کریں گے۔ ہمارے پیش نظر خاص معاملہ یہ ہے کہ مسٹر جناح کے دعوے کہاں
ے جائز ہیں اور کس حد تک ملک کے مفاد میں؟ دیکھنا یہ ہے کہ نہرو رپورٹ کی سفارشات
، یہاں تک مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے اور مسٹر جناح کے مطالبے کے مطابق ہم کس حد
ے انھیں مزید مراعات دے سکتے ہیں۔" جیکر نے اس نفاق انگیزی کے بعد کنونشن کو یاد
یا کہ مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر انصاری، سر علی امام اور ڈاکٹر کچلو جیسے مسلمان نہرو
پورٹ کی سفارشات کے مویدین میں شامل ہیں۔" اس لیے اگر یہ کوئی جرم نہ ہو تو میں کہوں گا
مسٹر جناح مسلمانوں کی صرف ایک معمولی تعداد کی نمائندگی کرتے ہیں ——— مسلمانوں
بیشتر تعداد سر محمد شفیع کے ساتھ ہے جو مشترکہ انتخابی اداروں کے سرے سے مخالف ہیں۔

جیکر کی تقریر مسلمانوں کے خلاف سراسر افترا پردازی تھی۔ جناح صاحب نے اس
جواب دینا ضروری سمجھا۔ انھوں نے کہا "میں اپنے دوست مسٹر جیکر کا سا انداز یا لہجہ
ختیار نہیں کروں گا ——— ان کی تقریر ایک الٹی میٹم کی حیثیت رکھتی ہے۔ سر
ج بہادر سپرو کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا: "انھوں نے جس جذبے سے یہ باتیں
ی ہیں اور دوسروں نے جس طفلانہ انداز میں ان کا ذکر کیا ہے میں اس سے واقف
وں، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا اور مجھے اُمید ہے کہ مسٹر جیکر اور
وسرے لوگ میرے اس بیان سے اتفاق کریں گے کہ ہر وہ ملک جو آزادی کی جدوجہد
ں مصروف ہے اور ہر وہ قوم جو جمہوری طرز حکومت کی خواہاں ہے اسے اقلیتوں کے

مسئلے کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے اور اقلیتیں اس وقت تک کسی بھی دستور کی حمایت نہیں کریں گی جب تک اس دستور اور حکومت کے زیر سایہ بطور ایک وحدت کے انھیں اپنے حقوق کے تحفظ کا یقین نہ ہو۔ خواہ یہ دستور کتنا ہی مثالی اور نظریاتی اعتبار سے کتنا ہی جامع کیوں نہ ہو اس سوال کا کہ آیا ایسا کوئی دستور کامیاب ہوگا یا نہیں، جواب یہ ہے کہ آیا اقلیتیں واقعتاً محفوظ ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو کوئی دستور بھی پائدار ثابت نہ ہوگا اور اس کا نتیجہ انقلاب اور خانہ جنگی کے سوا کچھ نہ ہوگا ——— آپ مسلم ہند کا تعاون چاہتے ہیں یا آپ کو یہ تعاون واشتراک درکار نہیں ہے؟ ——— اقلیتیں اکثریت کے لیے کوئی قربانی نہیں دے سکتیں۔ ——— میں ان ترمیمات کو قبول کرنے پر اصرار اس لیے نہیں کر رہا کہ میں ایک ضدی یا بگڑا ہوا بچہ ہوں ——— میرے مطالبے کی بنیاد یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے یہ بہترین اور منصفانہ طرز عمل ہے ——— ہم سب مادر وطن کے سپوت ہیں، ہمیں مل جل کر رہنا ہے ——— اگر ہم اتفاق رائے نہیں کر سکتے تو ہمیں اختلاف ہی پر اتفاق کرنے دیجیے۔ لیکن ہمیں دوستوں کی طرح ایک دوسرے سے جدا ہونا چاہیے۔"

اس کنونشن میں جناح صاحب نے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے سلسلے میں جتنی ترمیمات پیش کی تھیں، ان سب کو مسترد کر دیا گیا اور قائد اعظم کا یہ ارشاد ۱۹۴۷ء میں ایک ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آگیا کہ ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے سے جدا ہوگئے۔"

نہرو رپورٹ کی سفارش کے مطابق مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو صرف ۲۵ فی صدی نشستیں دی گئی تھیں جب کہ مسلمان ۳۳ فی صدی نشستیں چاہتے تھے۔ حقیقت پسند اور عاقبت اندیش ہندو لیڈروں کی دوربین نگاہوں نے اس کا انجام بھانپ لیا تھا انھوں نے زور دیا کہ مسلمانوں کا مطالبہ قبول کر کے اتحاد کی بات چیت ناکام نہ ہونے دی جائے۔

لیکن موتی لال نہرو اور ان کے حواریوں نے اس مسئلے کو اتحادِ ہند کے وسیع تر زاویے سے دیکھنے کے بجائے تنگ نظر ہندو زاویے سے دیکھا۔ وہ مرکزی اسمبلی میں ۲۷ فی صدی تک نمائندگی دینے پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن ۳۳ فی صدی کے مطالبے پر کسی طرح تیار نہ ہو سکے۔ ان کی نظر میں یہ بہت بڑی زیادتی تھی۔ الغرض مرکز میں ۶ فی صدی کم یا زیادہ نشستوں کے سوال پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد نہ ہو سکا اور آخر کار اس اختلاف نے ایک مستقل حدِ فاصل کی شکل اختیار کر لی۔ مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ۶ فی صدی کم نشستیں دینے کی جن لوگوں نے حمایت کی تھی وہ انتخابات میں تو کامیاب ہو گئے لیکن تاریخ میں اپنے لیے کوئی جگہ نہ بنا سکے۔ انھیں اس غلطی کا جو خمیازہ بھگتنا پڑا، وہ کبھی اس کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔ مسلمان کے جائز مطالبات کی مخالفت کرنے والوں میں پنڈت موتی لال نہرو پیش پیش تھے۔ جن کے متعلق گاندھی نے کچھ دن پہلے کہا تھا کہ "موتی لال نہرو باعزت تصفیہ کرا سکتے ہیں۔ ملک کو اس مصالحت کی ضرورت ہے اور اس کے لیے حالات بھی سازگار ہیں۔" گاندھی نے جس شخصیت اور جن حالات کو ہندو مسلم مصالحت کے لیے سازگار تصور کیا تھا ایسے نازک موقع پر نہ اس شخصیت نے ہندوستان کی توقعات پوری کیں نہ ان حالات نے۔ جناح صاحب، جنھوں نے اپنی تمام قوت و توانائی باعزت باوقار سمجھوتے کے لیے صرف کر دی تھی، اب مایوس ہو چکے تھے اور آہستہ آہستہ ہندوستان کے اتحاد کا شیرازہ منتشر ہو رہا تھا۔

مارچ ۱۹۲۹ء میں مرکزی اسمبلی میں نہرو کمیٹی کی رپورٹ پر غور و خوض شروع ہوا تو مسٹر جناح نے کہا کہ "رپورٹ کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے اختلافات بجنسہٖ موجود ہیں۔ بنا بریں ہندوستان کے لیے اتفاقِ رائے سے دستور کی تشکیل کا سوال مردہ ہو چکا ہے۔" اس موقع پر اسمبلی کے کئی ممبروں نے دعویٰ کیا کہ مسٹر جناح صرف اپنا خیال یا زیادہ سے زیادہ چند مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کر رہے ہیں۔ یہ تمام مسلمانوں کی

متفقہ رائے نہیں ہے۔ ہندو اخباروں نے بہت اوچھے اور گھٹیا ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دیے۔ اور وہ جناح صاحب کو دشمن قوم اور ہندوستان کی آئینی ترقی کا مخالف تک قرار دینے پر اتر آئے۔ جناح صاحب کے خلاف ہندو اخباروں کی یہ کینہ توزی اور شرانگیزی تقسیم برِصغیر (یعنی ۱۹۴۷ء) تک مسلسل جاری رہی اور تقسیم کے موقع پر ہندوؤں کو احساس ہوا کہ علیحدگی کا بیج تو کئی سال پہلے کانفرنسوں اور مذاکرات اتحاد کے دوران ہی بو دیا گیا تھا۔ سر چمن لال سیتل واد نے لکھا ہے کہ "پاکستان کی تخلیق کی ذمہ دار کانگریس ہے۔" انھوں نے حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے کہ "کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ ہندوستان میں فرقہ واریت کا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے اور اگر ایسا کوئی مسئلہ ہے بھی تو آزادی کے بعد اسے طے کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ آزادی کے حصول کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد لازمی ہے[1]۔"

جب مارچ ۱۹۲۹ء میں دہلی میں مسلم لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس منعقد ہوا تو اندرونی اختلافات کے سبب لیگ کا شیرازہ بری طرح منتشر ہو رہا تھا۔ سر محمد شفیع جنھیں سائمن کمیشن کے مقاطعہ کے سوال پر لیگ کے موقف سے اختلاف تھا مخالف گروہ کے سربراہ تھے۔ ان کے علاوہ لیگ سے ایک اور گروپ الگ ہو گیا تھا اور اس نے آغا خان کی قیادت میں مسلم کانفرنس کے نام سے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالی تھی۔ ایک تیسرا گروہ مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے سوال پر مسلم لیگ سے علیحدہ ہو چکا تھا۔ ان کے علاوہ مسلم لیگ سے ایک اور جماعت نے بھی علیحدگی اختیار کر کے مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کر لی تھی۔ یہ گروپ نہرو رپورٹ کی مکمل حمایت کر رہا تھا۔ اس کے سیکرٹری ٹی اے کے شیروانی

---

[1] ری کالکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ سر چمن لال سیتل واد۔

تھے۔ بعد میں ڈاکٹر انصاری کی شمولیت سے یہ گروپ مستحکم ہوگیا۔ جناح صاحب اور
ان کے ساتھی بہر طور ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں تھے لیکن اب وہ ہندو مسلم اتحاد
کی قیمت معقول اور مناسب حد سے زیادہ ادا کرنے پر تیار نہ تھے۔ نہرو رپورٹ کی مخالفت
سے یہ بات بخوبی ثابت ہوگئی تھی کہ صرف یہی گروپ مسلمانوں کے حقوق و مفاد کا سچا
علمبردار تھا اور یہی باضابطہ مسلم لیگ کی حیثیت سے موجود رہا۔

جناح صاحب مایوس ہو گئے تھے۔ انھوں نے یہ سوچ کر میدان سیاست میں
قدم رکھا تھا کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے لیے ایک رابطے کی حیثیت سے
کام کر سکیں گے۔ اس مقصد کے لیے پہلا ضروری قدم یہ تھا کہ مسلمانوں کو یک پلیٹ فارم
پر جمع کیا جائے۔ اس کوشش میں انھیں تقریباً کامیابی حاصل ہوگئی تھی لیکن یک لخت
حالات نے پلٹا کھایا۔ مسلم لیگ تشتت و افتراق کا شکار ہوگئی اور مسلمانوں کا اتحاد چٹان
سے ٹکرا کے پاش پاش ہو جانے والے جہاز کی طرح پارہ پارہ ہوگیا اور اب جناح مسلمانوں
کے صرف اس چھوٹے سے گروہ کے رہنما رہ گئے جس نے مسلم لیگ کو اپنا آخری سہارا سمجھ
کر اس کا دامن مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

نہرو رپورٹ پر غور کرنے کے لیے کلکتہ میں جو کل جماعتی قومی کنونشن ہوا تھا اس
میں شریک ہونے والے ۲۳ نمائندوں میں سے ایک نمائندے محمد افضل حق نے لکھا ہے۔
میرے پاس اس تاریخی اجلاس کے چند نوٹ موجود ہیں ـــــ لیگ کے اجلاس سے
ایک روز پہلے مسٹر جناح نے مختلف صوبوں کے مندوبین سے رات دن مذاکرات کیے تھے
جناح صاحب نے اپنی دلیلوں اور باریک بینی سے میدان سر کر لیا ـــــ مسلمانوں کے
موقف کو مسٹر جناح سے بہتر کوئی شخص پیش نہ کر سکتا تھا اور تمام مندوبین ان کے ہمنوا تھے
ـــــ ان ابتدائی مذاکرات کے بعد راجہ صاحب محمود آباد کی زیر صدارت لیگ کا
اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا کہ لیگ کو کنونشن میں شرکت کرنی چاہیے تاکہ

مقصد سے ۲۲ مندوبین منتخب کیے گئے جن کے نام یہ ہیں۔

۱۔ راجہ صاحب محمود آباد۔ ۲۔ مسٹر ایم۔ اے جناح۔ ۳۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو۔ ۴۔ مسٹر ایم سی چھاگلہ۔ ۵۔ ملک برکت علی۔ ۶۔ مولوی عبدالحمید۔ ۷۔ مولوی مجیب الرحمٰن۔ ۸۔ ڈاکٹر محمود۔ ۹۔ مسٹر حسام الدین۔ ۱۰۔ مولوی محمد اکرم خاں۔ ۱۱۔ مولانا ظفر علی خاں۔ ۱۲۔ سیٹھ یعقوب حسن۔ ۱۳۔ غازی عبدالرحمٰن۔ ۱۴۔ سید عبداللہ بریلوی۔ ۱۵۔ مسٹر تصدق احمد خان شیروانی۔ ۱۶۔ چودھری خلیق الزمان۔ ۱۷۔ نواب لیاقت علی خاں۔ ۱۸۔ مسٹر مظہر علی۔ ۱۹۔ شاہ محمد زبیر۔ ۲۰۔ مسٹر عبدالکریم۔ ۲۱۔ مسٹر محمد اسلم۔ ۲۲۔ مسٹر ایم عزیز الحق۔ ۲۳۔ مسٹر فیضی نور علی۔

مجھے آج تک یاد ہے کہ پنڈال میں داخل ہوتے وقت ہمارے جوش و خروش کا جو عالم تھا اس سے ہم سب کو یہ امید واثق تھی کہ قطعی طور پر سمجھوتہ ہو جائے گا ــــــ مسٹر جناح نے کنونشن میں انتہائی قابلیت اور جامعیت کے ساتھ مسلمانوں کا نقطۂ نظر پیش کیا۔ انھوں نے انتخابات کی نسبت مختلف النوع سیاسی مذاکرات کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کی نشاندہی کی کہ کم و بیش بیس سال سے مسلمانان ہند جداگانہ انتخاب کے حامی ہیں، اس کے بعد انھوں نے تمام فرقوں کے اختلافی خیالات کو مرتب کرنے کی ضرورت پر زور دیا تاکہ ان کی روشنی میں کسی طرح اتفاق رائے ہو سکے۔ جناح صاحب نے اعلان کیا کہ مسلمان تنگ نظر یا خود غرض نہیں ہیں، وہ ملک کا آئندہ دستور مرتب کرنے کے لیے جذبۂ تعاون کے ساتھ اس کنونشن میں شریک ہوئے ہیں۔ مسلمان اپنے متفقہ نظریات کے باوجود اس بات پر رضامند ہو گئے ہیں کہ مشترکہ انتخابی ادارے بنائے جائیں اور جہاں کہیں ضروری ہو ان کے لیے نشستیں محفوظ کی جائیں لیکن وہ مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نشستیں چاہتے ہیں۔ ان کا مطالبہ یہ بھی ہے کہ مرکزی اسمبلی میں ۳۰ فی صدی نشستوں کے بجائے انھیں ۳۳ ۱/۳ فی صدی نشستیں ملنی چاہییں۔ اس طرح دیگر فرقوں کو مجموعی طور پر ۷۰ فی صد کے بجائے ۶۶ ۲/۳ فی صدی

نشستیں ملیں گی۔ مسٹر جناح نے اس مطالبے کے حق میں تاریخی شواہد پیش کرتے ہوئے کینیڈا کے معاملے میں فرانسیسی اقلیت، اور مصر میں قبطیوں کے مسئلے کا ذکر کیا اور اپیل کی کہ دیگر ممالک میں جس غیر تحریری قانون کی رُو سے اقلیتوں کو تحفظات دیے گئے ہیں اس کا لحاظ رکھا جائے۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ہندوستان کی سیاسی آزادی کی جدوجہد میں جب تک ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان اشتراک و اعتماد کے جذبے سے بائیس کروڑ ہندوؤں کا ساتھ نہ دیں گے اس وقت تک کوئی دستور مفید ثابت نہ ہو گا۔ اس اعتراض کے جواب میں کہ خود مسٹر جناح جدوجہد آزادی میں عوام کی رہنمائی کیوں نہیں کرتے اور کسی شرط کے بغیر انھوں نے جداگانہ انتخاب کی حمایت کیوں نہیں کی، جناح صاحب نے برجستہ کہا کہ سوال میرے آگے بڑھنے کا نہیں ہے بلکہ یہ معاملہ تو سات کروڑ مسلمانوں کے پیش قدمی کرنے اور ہندوستان کے لیے ایک متفقہ اور قابل قبول دستور کی حمایت میں میرا ساتھ دینے کا ہے۔" مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات پر تبصرہ کرتے ہوئے محمد افضل حق نے لکھا ہے "یہ اختلافات ایک کمیٹی کے سامنے رکھے گئے جس کا فوراً اجلاس ہوا اور رات گئے تک جاری رہا۔ معاملے پر غور کرنے کے لیے ۳۰ کے لگ بھگ لیڈر جن میں مسٹر گاندھی، پنڈت موتی لال نہرو، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، مسٹر جے رام داس دولت رام، ماسٹر تارا سنگھ، ڈاکٹر چنتا منی اور دوسرے ممتاز لیڈر شامل تھے سر جوڑ کر بیٹھے۔ مسٹر جناح نے اس کانفرنس میں لیگ کا موقف پیش کیا۔ اجلاس کے موقع پر میں نے یادداشت کے طور پر جو نوٹ لکھے تھے ان میں مسٹر جناح کے بیان کے بارے میں یہ الفاظ درج تھے: "موثر لیکن جذبات سے بالاتر، شیریں زبانی تاہم مدلل، شائستہ اور متین تاہم انتہائی مخالف فرد کو بھی تدبر اور دانائی کے ساتھ مسکت جواب دینے والا" خاص معاملہ، مرکز میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تھا۔ آیا انھیں ۳۳ فی صدی نشستیں ملیں گی یا ۳۰ فی صدی۔ جب مسٹر جناح بیان دے چکے تو پنڈت مدن موہن مالویہ نے اپنی تقریر میں مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ اس مطالبے پر

زور نہ دیں کیونکہ لالہ لاجپت رائے جو نہرو کمیٹی کے سرگرم اور اولین ارکان میں سے تھے اور قومی کنونشن سے کچھ روز قبل جن کا انتقال ہو چکا تھا۔ نیز ہندو مہاسبھا کے لیڈر بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ ملک کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی موجودہ نمائندگی ہی ضرورت سے زیادہ ہے۔ بھائی پرمانند رام داس دولت رام نے مسلمانوں کے موقف کی سخت مخالفت کی۔ گاندھی نے جو کردار ادا کیا حق صاحب نے اپنے نوٹ میں اس کا یوں ذکر کیا ہے، "مسٹر گاندھی نے یہ کہہ کر کہ میں مسلمانوں کا مطالبہ قبول کر لینے کے حق میں ہوں، فرمایا البتہ سکھوں کے اعتراضات کے پیش نظر یہ ناممکن ہے۔ سنٹرل سکھ لیگ کی جانب سے یہ کہا گیا تھا کہ سکھ پنجاب میں مسلمانوں کو اکثریت کا درجہ دینے پر تیار نہیں ہیں۔ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کو "تہائی نشستیں" دینے کے معاملے پر گھنٹوں غور و خوض ہوتا رہا۔ شام سے رات ہو گئی لیکن اسمبلی میں تہائی نشستیں دینے کا معاملہ مسلمانوں کے حق میں طے نہ ہو سکا۔ آخر ہندوستان کے مستقبل کو ایک ایسے "تابوت میں مقفل کر دیا گیا جس پر "تہائی نشستیں" کندہ تھا۔ انجام کار مسلمان مندوبین کو کانفرنس سے کوئی قطعی اور حوصلہ افزا جواب نہ مل سکا۔ کانفرنس نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو مخلوط انتخاب قبول کرنا ہوگا اور آبادی کی بنیاد پر انھیں نمائندگی دی جائے گی۔ اس کے سوا انھیں کوئی رعایت نہیں مل سکتی۔" محمد افضل حق نے آخر میں لکھا ہے کہ:-

"ایک مندوب نے کنونشن سے باہر آتے ہوئے کہا "میرے ملک کا مستقبل تاریک ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ میرے نزدیک یہ میری سیاسی زندگی کا اختتام ہے۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ سیاسیات میں پھر قدم رکھوں۔"

اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی فضل حق کے الفاظ میں نہرو رپورٹ کے متعلق اس سے بہتر جملہ نہیں کہا جا سکتا: "ایک ایسا تابوت جس پر تہائی نشستیں کندہ تھا۔"

مارچ ۱۹۲۹ء میں بمقام دہلی مسلم لیگ کا ملتوی شدہ اجلاس منعقد ہوا تو یہ جماعت اندرونی خلفشار کی وجہ سے کافی کمزور ہو چکی تھی اور کچھ اخبار لیگ کی نمائندہ حیثیت کو

چیلنج کر رہے تھے۔ ان حالات میں جناح صاحب کو طوفانوں سے گزر کر لیگ کے بیڑے کو کامرانی کے ساحل تک پہنچانا تھا لیکن وہ نہ مایوس ہوئے نہ ہراساں۔ انھوں نے اپنی مخصوص حوصلہ مندی سے کام لے کر صورتِ حال کا مقابلہ کیا اور کسی بحران میں بھی جرأت کا دامن نہ چھوڑا۔ نامساعد و ناسازگار حالات کو بدلنے اور مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کی غرض سے انھوں نے لیگ کے عام اجلاس کے لیے مصالحتی قرارداد کا ایک مسودہ تیار کیا۔ اس قرارداد کے پیش لفظ میں جناح صاحب نے نہرو کمیٹی کی تشکیل کمیٹی کے کام اور کل جماعتی کنونشن کی وضاحت فرماتے ہوئے کہا "اور چونکہ کنونشن نے ترمیمات کے سلسلے میں آل انڈیا مسلم لیگ کے مندوبین کی معقول و معتدل تجاویز قبول نہیں کیں، اس لیے مسلم لیگ نہرو رپورٹ کو قبول نہیں کر سکتی"۔ قرارداد کے متن میں مسلمانوں کے حقوق و مفاد کے تحفظ کے ضمن میں چودہ بنیادی نکات پیش کیے گئے تھے۔ ان میں منجملہ دیگر امور کے یہ مطالبے بھی کیے گئے تھے کہ "مسلمانوں کو مرکزی مجلسِ قانون ساز میں ایک تہائی سے کم نمائندگی نہ دی جائے۔ جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا جائے۔ تمام فرقوں کو مذہبی آزادی دی جائے۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔ سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی ملے۔ مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دی جائے۔ ان کی زبان، مذہب اور شخصی قوانین کو فروغ دیا جائے۔ مسلمانوں کی تہذیب کے تحفظ کے لیے دستور میں مناسب ضمانت رکھی جائے۔ تمام مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے"۔

قرارداد میں اصرار کیا گیا تھا کہ ۱۹۰۶ء سے مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا جو حق ملا ہے وہ اس وقت تک قائم رہے گا جب تک خود مسلمان اس سے دستبردار ہونا نہ چاہیں۔ جب تک سندھ کو یقینی طور سے علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے گا اور شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں صحیح معنوں میں اصلاحات نافذ نہ کی جائیں گی مسلمان مخلوط

انتخاب قبول نہ کریں گے۔ اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کے لیے نشستیں محفوظ کرنے کے سوال پر بعد میں غور کیا جائے گا۔ یہ قرارداد بحث و تمحیص کے بعد ایک کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی جس میں مسٹر جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی، ملک برکت علی، نواب اسمٰعیل خان، ڈاکٹر شفاعت احمد خان اور ڈاکٹر کچلو شامل تھے۔

ایم نعمان نے لیگ کے اجلاس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔ بدقسمتی سے مسٹر جناح کی اپیل اور ان کی کوششوں کے باوجود مصالحت نہ ہو سکی۔ دوسرے روز صبح کو لیگ کا عام اجلاس ہونے والا تھا۔ مسٹر جناح اس مقصد کے لیے حکیم اجمل خان کے مکان پر مختلف نمائندوں سے صلاح مشورے میں مصروف تھے۔ نہرو رپورٹ کے حامیوں نے جنھیں صرف اس مقصد سے بھیجا گیا تھا کہ اجلاس میں نہرو رپورٹ منظور کرا لیں، ان کا انتظار بھی نہ کیا اور صدارت کے لیے ڈاکٹر محمد عالم کا نام پیش کر دیا۔ یہ دراصل ہنگامہ آرائی کی بنیاد تھی تمام حاضرین یک وقت اُٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر اور ڈنڈے لہرا کر ڈاکٹر عالم کے مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہونے کے خلاف احتجاج کیا۔ مگر ڈاکٹر عالم نے ہنگامے کو نظر انداز کر کے مسٹر عبدالرحمان غازی سے کہا کہ وہ قرارداد پیش کر دیں۔ عبدالرحمٰن غازی نے شور و شغب اور نعروں کے درمیان کسی تقریر کے بغیر اپنی قرارداد پیش کر دی۔ مسٹر ٹی اے کے شیروانی نے اس کی تائید کی (انھوں نے بھی تقریر نہ کی) اور اس کے فوراً بعد ڈاکٹر محمد عالم نے قرارداد منظور ہونے اور اجلاس کو معطل کر دینے کا اعلان کر دیا۔ اسی وقت مسٹر جناح پہنچ گئے اور جلسہ گاہ میں پھر سناٹا چھا گیا۔ مسٹر جناح نے اجلاس ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ایک بڑا ہنگامہ فرو ہو گیا۔[۱] اوپر جس قرارداد کا مفصل ذکر کیا گیا ہے اور جسے جناح صاحب نے مرتب کیا تھا۔ بعد میں وہ "جناح کے چودہ نکات" کے نام سے مشہور ہوئی۔

جب نہرو رپورٹ پر کانگریس نے غور و خوض شروع کیا تو گاندھی نے ایک قرارداد کا

۱۔ مسلم انڈیا۔ ایم نعمان

مسودہ تیار کیا اور اسے کانگریس سے منظور کرا لیا۔ اس قرارداد میں حکومت کو دھمکی دی گئی کہ نہرو رپورٹ چونکہ ہندوستان کے جذبات کی ترجمان ہے اس لیے ۳۱ ردسمبر ۱۹۲۹ء تک اگر برطانوی پارلیمنٹ نے رپورٹ کی تمام سفارشوں پر عملدرآمد نہ کیا تو پھر اس عدم تعاون کی تحریک شروع کر دی جائے گی۔

گاندھی نے اس قرارداد کی تائید میں ایک تقریر کی۔ اس میں کہا کہ جیسا کہ ڈاکٹر انصاری نے فرمایا ہے، اگر آپ رپورٹ کے مرکزی خیال پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو یہ دل پر وار کرنے کے مترادف ہوگا اور مرکزی خیال یہ ہے کہ ہندوستان کو ڈومینین کی حیثیت دی جائے۔ میں تجویز کرتا ہوں کہ آپ آزادی کے بجائے ڈومینین کا درجہ قبول کرنے کی سنگین غلطی نہ کریں اور دونوں باتوں کا موازنہ کر کے یہ تجویز کریں کہ ڈومینین قبول کرنے کا مطلب ذلّت و خواری اور آزادی کا مفہوم فتح و کامرانی ہے۔"

کانگریسی قیادت ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے مکمل آزادی حاصل کرنے کے بجائے نہرو کمیٹی کی رپورٹ منظور کرانے کی زیادہ خواہاں تھی۔

دسمبر ۱۹۳۰ء میں الہ آباد میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس کی صدارت علاّمہ اقبال نے کی۔ اس اجلاس میں آپ نے ایک تاریخی خطبہ پڑھا جس میں آپ نے ہندوستان کی آئندہ دستوری ترقی کا خاکہ پیش کیا۔ آپ نے بڑی دلیری سے اعلان کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اگر یہ یقین دلا دیا جائے کہ پنجاب، سندھ، سرحدی صوبے اور بلوچستان کو آپس میں ضم کر کے مسلمانوں کے لیے ایک اسلامی ریاست بنا دی جائے گی تو میں آزادی کے لیے ہر شے قربان کرنے کو تیار ہوں۔ انھوں نے فرمایا اس نظریے پر کسی دستور کی بنیاد رکھنا کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں اور اقوام میں ہم آہنگی موجود ہے یا برطانیہ کے جمہوری نظریات و احساسات کا ہندوستان پر اطلاق کرنا دراصل ہندوستان کو خانہ جنگی کی طرف دھکیلنے کی کوشش ہے..... ہندوستان کو

حکومتِ خود اختیاری برطانیہ کے زیرِ سایہ ملے یا اس سے باہر، مجھے یہ نظر آ رہا ہے کہ کہ شمال مغربی ہندوستان میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کا قیام مسلمانوں، یا کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کا مقسوم بن چکا ہے ـــــ اس لیے میں مطالبہ کرتا ہوں کہ ہندوستان اور اسلام کے مفاد کے پیشِ نظر ایک متحدہ اسلامی مملکت قائم کی جائے۔ اسی طرح ہندوستان میں امن و امان قائم ہوگا اور اندرونِ ملک طاقت کا توازن پیدا ہو جائے گا۔ علامہ اقبال نے لندن کی گول میز کانفرنس کے طویل مباحث کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "لیکن گول میز کانفرنس میں فرقہ واریت کے سوال پر مباحث سے یہ بات زیادہ واضح ہوگئی ہے کہ ہندوستان کی دو عظیم تہذیبی اکائیوں کے درمیان عدم مساوات موجود ہے۔ تاہم برطانوی وزیرِ اعظم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ ہندوستان کا مسئلہ ذہنی نہیں بلکہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ برطانیہ کی شمالی جمہوریت ایک ایسے ملک کے لیے کارآمد نہیں ہو سکتی جہاں کئی قومیں آباد ہیں۔"

مئی ۱۹۲۹ء میں انگلستان میں عام انتخابات ہوئے اور پہلی مرتبہ لیبر پارٹی برسرِ اقتدار آئی۔ نئی حکومت کے وزیرِ اعظم ریمزے میکڈونلڈ اور وزیرِ ہند کرنل ویج ووڈ بین تھے۔ قدامت پسند پارٹی (کنزرویٹو) کی شکست کے بعد لیبر پارٹی کو زمامِ اقتدار سونپنے سے پہلے لارڈ برکن ہیڈ نے ہندوستان کے دستوری مسئلے کی نسبت بعض مدبرانہ اور دور اندیشانہ اقدامات کیے، سائمن کمیشن اپنی رپورٹ پیش کر چکا تھا اور اب اس اہم رپورٹ کی نسبت لیبر پارٹی کو ملکِ معظم کی حکومت کی طرف سے آخری فیصلہ کرنا تھا۔ دریں اثنا کانگریس نے غیر ملکی کپڑے کے مقاطعہ کی ایک ملک گیر مہم شروع کر دی اور بمبئی اور احمد آباد کے مل مالکوں نے اس تحریک کی ہر ممکن اعانت کی۔ اسی کے ساتھ گاندھی کانگریس کی حد تک اچھوتوں کے خلاف منافرت اور تعصب ختم کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طرح لاکھوں ہریجنوں کو ہندومت کے دائرہ میں لایا جا سکے۔ کانگریس کی اس تحریک

سے اچھوت رہنماؤں نے محسوس کیا کہ اس موقع پر زیادہ سے زیادہ مطالبات پیش کیے
جا سکتے ہیں، چنانچہ انھوں نے مطالبہ کیا کہ مسلمانوں کی طرح انھیں بھی ایک علیحدہ اقلیت
قرار دے دیا جائے۔ اس مہم میں ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے اہم کردار ادا کیا۔

قائداعظم اپنی سیاسی مصروفیات کے سبب اکثر و بیشتر انگلستان جاتے رہتے
تھے اور لیبر وزیراعظم ریمزے میکڈونلڈ کو ذاتی طور پر جانتے تھے۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ
کی نسبت ہندوستانی مسلمانوں کے خیالات سے مسٹر میکڈونلڈ کو باخبر کرانے کے لیے مسٹر
جناح نے ۱۹ر جون ۱۹۲۹ر کو ان کے نام ایک خط لکھا اور درخواست کی کہ کمیشن
کی رپورٹ پر فیصلہ کرنے سے پہلے وہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر اور موقف پر سنجیدگی سے غور
کریں۔ اس خط میں جناح صاحب نے وزیراعظم کو خبردار کیا تھا کہ موجودہ صورت حال
ایک سنگین تعطل کے برابر ہے۔ اگر حالات نہ بدلے تو آگے چل کر یہ صورتِ حال تباہ کن
ثابت ہوگی۔ آگے چل کر انھوں نے اس مکتوب میں کہا تھا کہ کمیشن کے کانوں میں آغاز
سے انجام تک اہل ہند کی عدم شرکت سے اس کی پوزیشن بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔
میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ خواہ آپ کو کچھ ہی کیوں نہ بتایا جائے، یہ حقیقت
ہے کہ اگر سکیم کے مختلف مرحلوں پر عمل درآمد کیا گیا تو آپ کو سیاسی اعتبار سے ہندوستان
کا تعاون حاصل نہ ہوگا۔ انھوں نے وزیراعظم کو صاف صاف بتا دیا کہ "جہاں تک
ہندوستان کا تعلق ہے، کمیشن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں اور جب کمیشن کی رپورٹ
شائع ہوگی (خواہ یہ رپورٹ کیسی ہی کیوں نہ ہو) ہندوستان میں اس کی مذمت کی
جائے گی۔" وزیراعظم کے اس اعلان پر کہ گول میز کانفرنس کی رپورٹ پر پارلیمنٹ کے
حتمی فیصلے سے قبل ایک مشترکہ پارلیمانی کمیٹی غور کرے گی، اعتراض کرتے ہوئے جناح
صاحب نے اس خط میں لکھا تھا کہ اس مرحلے پر ہمیں مشترکہ کمیٹی سے یہ توقع نہیں ہے
کہ وہ کوئی اطمینان بخش ترمیم کرے گی ——— ہندوستان کو اب برطانیہ عظمیٰ کے دعدول

پر بھروسہ نہیں رہا ـــــ بعض لوگ کہتے ہیں کہ برطانیہ میں ایک نئی نسل اُبھری ہے جو ۱۹۱۷ء کے منشور کی اہمیت کو واضح کرنے کی خواہش مند ہے لیکن یہ لوگ دراصل برطانیہ عظمیٰ کے مفاد کے خلاف کام کر رہے ہیں اور ہندوستان اور انگلستان کے مشترکہ رشتوں کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں " انھوں نے صاف صاف لفظوں میں وزیر اعظم کو خبردار کیا کہ ۱۹۲۴ء کے بعد سے برطانیہ عظمیٰ نے جس پالیسی پر عمل کیا ہے اس کی نسبت ہر پارٹی اور لیڈر کا یہ گمان یقین میں تبدیل ہو گیا ہے کہ انھیں برطانیہ سے کسی قسم کے انصاف کی امید نہ رکھنی چاہیئے "یہ ہے حالات کا خلاصہ ـــــ اور میں آپ پر زور دوں گا کہ آپ وقت ضائع کیے بغیر ملک معظم کی طرف سے یہ اعلان کر دیں کہ برطانیہ عظمیٰ ہندوستان میں ڈومینین کے درجے کی مکمل ذمہ دار حکومت قائم کرنے کی پالیسی کا مخبر شدہ طور سے پابند ہے " انھوں نے یہ مکتوب اس تعمیری انداز فکر پر ختم کیا تھا "میں اس مسئلہ کا حل تجویز کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ یہ حل ہندوستان کے لیے قابل قبول ہو گا (حل یہ ہے کہ) برطانوی حکومت اپنی تجاویز مرتب کرنے سے قبل اور سائمن کمیشن کی رپورٹ اور حکومت ہند کے خیالات موصول ہونے کے بعد تجاویز مرتب کرنے کے سلسلے میں ہندوستان کے نمائندوں کو مدعو کرے جو اس سلسلے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں (کیونکہ اس وقت ہندوستان میں اس مسئلے پر اتفاق رائے ہونا ممکن نہیں ہے) اور ایک ایسا حل تلاش کرنے کی غرض سے سر جوڑ کر بیٹھیں جو (مسٹر اسمتھ کے الفاظ میں) ہندوستانی سیاست میں رضا و رغبت کا آئینہ دار ہو، اگر حکومت برطانیہ کی طرف سے وزیر اعظم اس قسم کا کوئی دعوت نامہ بھیجیں تو مجھے یقین ہے کہ اہل ہند سے مسترد نہ کریں گے اور اگر ایسی کوئی کانفرنس منعقد ہو جس میں ہندوستان کی ممتاز سیاسی شخصیات شریک ہوں تو بلا شبہ ایک ایسا حل تلاش کیا جا سکتا ہے جس سے برطانیہ اور ہندوستان دونوں مطمئن ہو سکیں "

لارڈ ارون چند مہینے تعطیلات گزارنے کے بعد اکتوبر ۱۹۲۹ء میں ہندوستان واپس پہنچے اور انھوں نے ایک بیان میں ان الزامات کی تردید کی کہ حکومت برطانیہ بد نیتی سے کام لے رہی ہے۔ وائسرائے نے بیان کے آخر میں کہا تھا کہ "برطانوی حکومت نے مجھے یہ واضح اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ حکومت کے نزدیک ۱۹۱۷ء کے منشور کے مطابق ہندوستان کی دستوری ترقی کے سلسلے میں ڈومینین کا درجہ ناگزیر حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے" لارڈ ارون کے بیان سے یہ بھی پتہ چلا کہ عنقریب ایک کانفرنس منعقد ہونے والی ہے جس میں برطانوی ہند اور ریاستوں کے نمائندوں سے مذاکرات کے بعد حکومت برطانیہ ایسی تجاویز مرتب کرے گی جن پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے ہو سکے اس کے بعد برطانوی حکومت مشترکہ پارلیمانی کمیٹی سے مشورے کے بعد تجاویز پر غور و فیصلہ کرے گی۔

وائسرائے کے اس بیان کے بعد جناح صاحب کی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستان کو یہ ایک زریں موقع ملا ہے نیز یہ کہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی میں انھیں زیادہ سے زیادہ حصہ لینا چاہیئے۔ انھوں نے بمبئی میں سر چمن لال سیتل واد کے چیمبرز میں ممتاز سیاسی لیڈروں کا ایک اجلاس منعقد کیا جس میں لارڈ ارون کے بیان پر غور کرنے کے بعد محتاط انداز میں ایک بیان جاری کیا گیا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ وائسرائے نے برطانوی حکومت کی طرف سے جو بیان جاری کیا ہے ہم نے اس پر بڑی احتیاط سے غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ اعلان حمایت بخش ہے کہ دستوری ترقی کے نتیجے میں ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دیا جائے گا۔ ہم اس طریق کار کو بھی نظر استحسان دیکھتے ہیں کہ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینے کی غرض سے برطانوی حکومت سے مذاکرات کے لیے ہندوستان کے نمائندوں کو مدعو کیا جائے گا تاکہ اتفاق رائے سے پارلیمنٹ کے سامنے تجاویز پیش کی جائیں۔ ہمیں یقین ہے کہ برطانوی

حکومت سے مذاکرات کے لیے جن ہندوستانی نمائندوں کو مدعو کیا جائے گا۔ انھیں ہندوستانی نمائندوں کو مدعو کیا جائے گا، انھیں ہندوستانی عوام کا اعتماد حاصل ہو گا" جناح صاحب کے علاوہ ایم سی چھاگلہ، مسز سروجنی نائیڈو، ایم آر جیکر اور چمن لال سیتل واد کے دستخط بھی مندرجہ بالا بیان پر ثبت تھے۔

اسی وقت دلّی میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا جس کے بعد اعلان کیا گیا کہ کانگریس صرف اس شرط پر گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کرے گی کہ پہلے ہندوستان کو درجہ نوآبادیات (ڈومینین سٹیٹس) دیا جانا طے کر لیا جائے، میز کانفرنس میں شریک ہندوستانی نمائندوں کی اکثریت کانگریسی ہو اور تمام سیاسی قیدیوں کو عام معافی دے دی جائے۔ کئی سال بعد جواہر لال نہرو نے ان حالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا کہ " کانگریسی اپنے آپ کو ایک ایسا ناگزیر عنصر گردانتے تھے جس کے بغیر (ہندوستان و برطانیہ کے درمیان) تعاون ممکن نہیں تھا یہ ان کی نظر میں کم سے کم مطالبات تھے ـــــ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ حکومت ہماری شرائط قبول کرنے کو تیار نہ ہو گی، اس طرح ہماری پوزیشن زیادہ مستحکم ہو جاتی تھی اور ہم بآسانی دائیں بازو کو اپنے ساتھ ملا سکتے تھے"۔[1]

جناح صاحب نے موتی لال نہرو سے ایک مکتوب میں اپیل کی کہ کانگریس اس پوزیشن سے جو سب کے لیے ناقابلِ قبول تھی، کچھ ہٹ جائے ورنہ لندن کی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا۔

وزیرِ اعظم کی پیشکش مسترد کر دینے سے کانگریس نے وائسرائے کو ایک تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار کر دیا۔ لارڈ ارون کا شمار ہندوستان کے ان وائسراؤں میں

---

[1] آٹو بائیوگرافی آف جواہر لال نہرو

ہوتا ہے جو محکوم ہندوستان کی شکایات کی نوعیت سے واقف تھے اور ان کی خواہش
تھی کہ مسٹر جناح، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور خاص طور سے گاندھی جی جیسے
ہندوستانی لیڈروں سے ان کی ملاقات ہونی چاہیے۔

ہندوستان کی دستوری ترقی جناح صاحب کا مقصد زندگی تھا۔ اس کے ساتھ
وہ یہ بھی محسوس کر رہے تھے کہ گاندھی جی نے کانگریس کو جس راستے پر ڈال دیا ہے وہ
ہندوستان کے عظیم تر مفاد کے لیے نقصان دہ ہے۔ اسی احساس کے پیش نظر انھوں
نے مرکزی اسمبلی کے صدر ولبھ بھائی پٹیل سے ملاقات کی اور دونوں احمد آباد کے قریب
گاندھی کے ہیڈ کوارٹر سابرمتی آشرم پہنچے۔ جہاں وہ انتہائی سادہ زندگی گزار رہے
تھے۔ جناح صاحب اور ولبھ بھائی پٹیل نے ۱۲ دسمبر کو گاندھی جی سے ملاقات کر کے
انھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان کا موقف ہندوستان کے لیے نقصان دہ ہے اور
یہ کہ وہ پہلے سے کوئی شرط رکھے بغیر لندن کی گول میز کانفرنس میں کانگریس کو شرکت
کی اجازت دے دیں کیونکہ حکومت برطانیہ کانفرنس میں کانگریس کی مشروط شرکت کسی
طرح منظور نہ کرے گی۔ لیکن گاندھی جی اس بات پر مصر رہے کہ برطانیہ پہلے یہ وعدہ کر
لے کہ ہندوستان کو ڈومینین (نوآبادیات) کا درجہ دے دیا جائے گا۔ اس طرح یہ مشن
ناکام رہا۔ مشن کی ناکامی کے بعد موتی لال نہرو کے ہمراہ یہ دونوں لیڈر دلی پہنچے تاکہ
لارڈ ارون سے ملاقات کریں۔ اس اثنا میں ہندوستان میں نوجوان انقلابیوں نے
شورش برپا کر رکھی تھی۔ اسی زمانے میں لارڈ ارون پر ٹرین میں دلی جاتے ہوئے قاتلانہ
حملہ کیا گیا۔ تشدد کا بھیانک دیو جاگ اٹھا تھا۔ اگرچہ گاندھی جی کا خیال تھا کہ عدم تعاون
کی تحریک میں تشدد سے کام نہ لیا جائے گا۔ بہرحال ۲۳ دسمبر کو جناح صاحب، ولبھ
بھائی پٹیل اور موتی لال نہرو تینوں نے وائسرائے سے ملاقات کی اور انھیں گاندھی
کے خیالات سے آگاہ کیا۔ لارڈ ارون یہاں تک تیار تھے کہ سیاسی قیدیوں کی رہائی کے

متعلق گاندھی کا مطالبہ قبول کریں مگر انھوں نے کہا کہ ہندوستان کو ڈومینین کا درجہ دینے کی ضمانت کا معاملہ میرے اختیار سے باہر ہے۔ گاندھی جی نہ تو جناح صاحب نہرو اور پٹیل جیسے لیڈروں کی درخواست قبول کرنے پر آمادہ تھے نہ وائسرائے کی ان یقین دہانیوں پر اعتبار کرنے کو تیار کہ میں ہندوستان کے مفاد کے تحفظ کے لیے اپنی بہترین کوششیں صرف کر دوں گا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی ان کی ضد کے سبب یہ مذاکرات ناکام ہو گئے۔

۳۱ر دسمبر کو کانگریس کے اجلاس لاہور میں جو فیصلہ کیا گیا اس کا لوگوں کو پہلے ہی سے اندازہ تھا۔ اس اجلاس نے ایک سخت قرارداد منظور کی جس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو دھمکی دی گئی تھی کہ کانگریس پورے ہندوستان میں محاصل کی عدم ادائیگی اور بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دے گی۔ جناح صاحب اس صورتِ حال سے بہت بددل تھے۔ انھوں نے ایک بیان میں کانگریس کے موقف پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی جنون کی تمام تر ذمہ داری صرف گاندھی پر عائد ہوتی ہے اور یہ کہ وہ "ذہنی اور خلقی اعتبار سے مسائل کو سمجھنے کے نا اہل ہیں۔" انھوں نے امید ظاہر کی کہ بہر حال ہندوستان کی رائے عامہ یہ موقع نہ گنوائے گی اور وائسرائے کی پیشکش قبول کر لی جائے گی۔

گاندھی نے کانگریس میں اپنے قدم اتنی مضبوطی سے جما لیے تھے کہ وہ معنوی اعتبار سے جماعت کے آمر بن چکے تھے۔ ان کی پیشگی منظوری کے بغیر نہ کوئی قرارداد پیش کی جا سکتی تھی اور نہ کوئی قرارداد منظور ہونے پاتی تھی لہٰذا وہ بآسانی جناح صاحب کے مشوروں اور ان کی رائے کو نظر انداز کر سکتے تھے۔ صلح کی بات چیت کو مسترد کرنے کی وضاحت میں گاندھی نے لکھا کہ نوکر شاہی سے جن خوفناک نتائج کا خطرہ ہے، میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں اس معاملے پر غور کر چکا ہوں۔" دونوں کو یہ اندازہ ہے

کہ اس کی کیا قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ مجھے علم ہے کہ مجھ جیسا ایک انقلابی جو عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے، اس کی حیثیت تشدد پرست انقلابیوں کے راستے میں ایک دیوار کی سی ہے ـــــ مجھے اپنے تضادات کا اعتراف ہے ـــــ جہاں تک میری قیادت کا تعلق ہے، اگر قیادت میرے ہاتھ میں آئی ہے تو اس کا سبب کوئی ذاتی مفاد نہیں بلکہ یہ میری بے لوث خدمات کا ثمرہ ہے اور چونکہ میں قوم کا ایک جزو لاینفک ہوں اس لیے میری تمام کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود قوم کو مجھ سے وابستہ رہنا پڑے گا مجھے اپنی بعض تقصیروں اور کوتاہیوں کا خود احساس ہے اور بعض کی طرف میرے مخلص نکتہ چیں مجھے توجہ دلاتے رہتے ہیں جس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں"

جناح صاحب اس شخص کے رویے سے انتہائی نالاں تھے جو اپنے ہاتھ میں اتنی زبردست سیاسی قوت رکھتا تھا مگر اس عظیم قوت کو اپنے متضاد طریقہ ہائے کار کے سبب ضائع کر رہا تھا۔ جب فروری میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا تو کونسل نے وائسرائے کے اعلان کا خیر مقدم کیا اور گول میز کانفرنس کے سلسلے میں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

اس کے برعکس کانگریس نے اسی مہینے میں سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی اور گاندھی نے بڑی گھن گرج کے ساتھ یہ الٹی میٹم دے دیا کہ اگر وائسرائے نے ایک ہفتے کے اندر اندر میرے گیارہ نکات منظور نہ کئے تو میں پورے ملک میں ستیہ گرہ کی تحریک شروع کر دوں گا۔ الٹی میٹم کی مہلت ختم ہو گئی۔ گاندھی کے گیارہ نکات منظور نہ کئے گئے اور وہ چند قوانین کی خلاف ورزی کی نیت سے پیدل ڈانڈی روانہ ہو گئے۔ دو مہینے بعد انھوں نے محسوس کیا کہ یہ مہم ان کی توقعات کے مطابق نہیں ہے اور لکھا کہ اس مہم کا مقصد آزادی حاصل کرنا نہیں بلکہ لوگوں کو آزادی کے حصول کے لیے طاقت سے لیس کرنا ہے۔"

سول نافرمانی کی تحریک کی وجہ سے ہندوستان میں افراتفری پھیلی ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مرکزی حکومت بے بس ہو کر رہ گئی ہے کہ اچانک دہشتی کو گاندھی کو گرفتار کر لیا گیا۔

اچھوتوں کے خلاف منافرت اور تعصب ختم کرنے کی جو تحریک گاندھی جی نے چلائی تھی اس کے نتیجے میں ہندومت کے اتحاد میں بلاشبہ اضافہ ہوا لیکن اس تحریک کے سبب ایک طرف تو اعلیٰ ذات کے ہندو ان کے خلاف ہو گئے، دوسری طرف ان کی کوششوں سے جو سماجی اصلاحی تحریکیں وجود میں آئیں۔ ان کا تعاون و اشتراک ان کو حاصل ہو گیا، ہریجنوں میں انتہائی بیداری پیدا ہو چکی تھی اور ان کے اسی قومی احیا کے دور میں ڈاکٹر امبیدکر ملک گیر اہمیت کے حامل سیاسی لیڈر کی حیثیت سے افق سیاست پر نمودار ہوئے۔

ایک نئی جماعت جس کا نام مسلم کانفرنس تھا اور جس کے صدر مولوی محمد یعقوب تھے، مجوزہ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے موقف پر غور کرنے کے لیے قائم ہوئی۔ علاوہ بریں سر تیج بہادر سپرو کی زیر صدارت، ایک کل جماعتی کانفرنس بھی طلب کی گئی۔

دریں اثنا مرکزی اسمبلی کے ایوان بالا، و ایوان زیریں کے ایک مشترکہ اجلاس میں وائسرائے نے گول میز کانفرنس میں ہندوستانی نمائندوں کی حیثیت و اختیارات اور کانفرنس کے مباحث کے دائرۂ کار کی وضاحت کے سلسلے میں ایک اعلان کیا۔ انھوں نے مرکزی مجلس قانون ساز کے اراکین کو یقین دلایا کہ ہندوستانی نمائندوں کی رائے پر اچھی طرح غور کیا جائے گا اور اس کے بعد برطانوی حکومت ہندوستان میں نافذ کی جانے والی اصلاحات کی سکیم کے متعلق اپنے فیصلے کا اعلان کرے گی۔ ہندوستان میں اس اعلان کا ملے جلے جذبات سے خیر مقدم کیا گیا اور مختلف سیاسی حلقوں نے

اس کے متعلق مختلف خیالات کا اظہار کیا۔ البتہ جناح صاحب اور ان کے رفقا
وائسرائے کی یقین دہانیوں سے مطمئن تھے اور اپنے رفقائے کار کے ہمراہ انھوں نے
لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کرنا قبول کر لیا۔

ملک معظم کی حکومت نے کانفرنس میں ہندوستانی ریاستوں کے وفد کے علاوہ
برطانوی ہند کی نمائندگی کے لیے ۷۵ لیڈر نامزد کیے جن میں ۱۶ لیڈر مسلمان تھے۔ ان
میں قائداعظم، آغا خان، مولانا محمد علی اور فضل الحق کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں۔
بیگم شاہنواز مسلم خواتین کی نمائندہ تھیں اور ہندو خواتین کی طرف سے مسز سبرائن کو نامزد کیا
گیا۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۳۰ء کو تاجدار برطانیہ نے دارالامرا کی رائل گیلری میں کانفرنس
کا افتتاح کیا۔

وزیراعظم انگلستان ریمزے میکڈونلڈ کو کانفرنس کا چیئرمین منتخب کیا گیا تھا۔
انھوں نے اپنی افتتاحی تقریر ان الفاظ پر ختم کی "ہمیں جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہیے
جس میں غلطی، عاقبت نااندیشی یا شرانگیزی کے زیر اثر جو کچھ کہا گیا ہے اس پر
پیٹھ کر وہ ساری باتیں فراموش کر دینا چاہئیں۔ تاریخ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اس
کا تعلق اس کانفرنس سے ہوگا۔ ہمیں اپنے عوام کی سیاسی فکر سے پورا پورا فائدہ
اٹھا کر کانفرنس کو کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہیے اور اس طرح دونوں ملکوں
کے عالمی وقار و احترام میں اضافہ کرنا چاہیے۔"

جناح صاحب نے بھی پہلے دن کے اجلاس میں تقریر کی۔ انھوں نے وزیراعظم
کے مخلصانہ جذبات پر تشکر و امتنان کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ہندوستان کو یہ توقع ہے
کہ ان اعلانات پر عمل کیا جائے گا ——— مجھے امید ہے ——— کہ تمام متعلقہ
فریق، ہمارے مقصد (کانفرنس) میں حتی الوسع باہمی اعتماد، دانش مندی اور تدبر کے
ساتھ شریک ہوں گے ——— مجھے خوشی ہے کہ ہم یہاں ہندوستان کی نئی ڈومینین

کی تخلیق کے شاہد کے طور پر موجود ہیں ــــــــ"

افتتاحی تقریب کے بعد مکمل اجلاس میں اس معاملے پر عام بحث شروع ہوئی کہ ہندوستان میں وفاقی حکومت ہو یا وحدانی ۔ ۲۰ نومبر کو جناح صاحب نے بحث میں حصہ لیا اور ان کی تقریر کے ابتدائی جملوں ہی سے یہ ظاہر ہو گیا کہ وہ کانفرنس میں برطانیہ سے کھری کھری باتیں کہنے آئے ہیں۔ جناح صاحب نے اس تقریر میں کہا کہ میں پہلے جس نکتے پر روشنی ڈالوں گا وہ برطانیہ عظمیٰ کے اخلاقی دعووں اور ان وعدوں کو نظر انداز کرنے اور ان کے ایفا سے پہلوتہی کرنے کے متعلق ہے ــــــــ اس کانفرنس میں ہمیں اپنا موقف بے باکی سے پیش کرنا چاہیئے ــــــــ اور یہ اندیشہ نہ کرنا چاہیئے کہ اس طرح کسی فرد کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔ میں چاہتا ہوں کہ آپس میں کوئی تلخی پیدا نہ ہو۔" اپنی پہلی تقریر ہی میں انھوں نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ برطانوی ہند کے وفد میں ایسے لوگ شامل ہیں جو جرأت مندی اور بے خوفی کے ساتھ ہندوستان کا موقف پیش کریں گے۔ لارڈ پیل کے ان اندیشوں کا ذکر کرتے ہوئے کہ کانگریس نے کانفرنس کا مقاطعہ کر رکھا ہے اور وہ اصلاحات کو کامیاب نہ ہونے دے گی۔ لہٰذا برطانیہ کو قدرے توقف سے کام لینا اور نئی دستوری سکیم مرتب کرنے سے پہلے کافی سوچ سمجھ لینا چاہیئے۔ انھوں نے کہا "میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں ــــــــ اور میں یہ بات ڈھکی چھپی رکھنا نہیں چاہتا کہ ــــــــ ہندوستان میں ایسا کوئی طبقہ موجود نہیں ہے جس نے یہ اعلان نہ کیا ہو کہ ہندوستان کو مکمل طور سے داخلی حکومت دی جائے جہاں تک اصلاحات کا تعلق ہے۔ ہمیں حقائق سے آنکھیں بند نہ کرنا چاہیئے ــــــــ ہم یہاں ایک ایسا آئین مرتب کرنے کی غرض سے جمع ہوئے ہیں جو ہندوستان کے عوام کو مطمئن کر سکے۔" داخلی معاملوں میں حکومت خود اختیاری کے بارے میں اپنے نظریے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا "یہ کوئی تجریدی جنس

نہیں ہے، یہ ایک بین دین ہے۔" انھوں نے ہندوستان کے لیے ایک مناسب و موزوں دستور کے سوال پر اپنے خیالات کا تفصیل سے اظہار کیا اور فرمایا "جب تک آپ ہندوستان کے حقوق و مفادات کا تحفظ نہ کریں گے، آپ کوئی دستور مرتب نہیں کر سکتے، سب سے پہلے تو آپ کو اقلیتوں کے معاملے پر غور کرنا ہوگا ——— اور جب تک آپ مملکت کے لیے اقلیتوں کا تعاون اور وفاداری حاصل نہیں کریں گے، آپ کا مرتب کردہ کوئی دستور کامیاب نہ ہوگا ——— مسلمان اپنے لیے تحفظات کا مطالبہ کرتے ہیں۔"

عام بحث کے بعد کانفرنس نے نو کمیٹیاں بنائیں جن میں سے جناح صاحب تین کمیٹیوں کے رکن تھے۔ یہ کمیٹیاں وفاقی وضع، دفاعی امور اور سندھ کے مستقبل کے متعلق تھیں۔ ان کمیٹیوں میں جو ہندوستان کے آئندہ دستور کی تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتی تھیں۔ جناح صاحب نے بڑی نمایاں خدمات انجام دیں۔

مجوّزہ اصلاحات کی رُو سے برطانیہ پہلی مرتبہ اس بات پر راضی ہو گیا تھا کہ بعض دفاعی معاملات ہندوستان کے کنٹرول میں دے دیے جائیں۔ جناح صاحب دفاع کے سلسلے میں کمیٹی کے انگریز اراکین کو اچھی طرح جکڑنا چاہتے تھے تاکہ ان سے ضروری مراعات حاصل کی جا سکیں۔ انھوں نے کہا "جناب والا! میں یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اس پیراگراف کے تحت جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ نے یہ کہا ہے کہ دفاع کی ذمہ داری گورنر جنرل پر ہو گی۔ میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہو گا کہ فوج پر گورنر جنرل کا کنٹرول ہو گا۔ لیکن لفظِ دفاع کے تحت کئی دوسرے مضمرات بھی پیدا ہوں گے۔ مثلاً دفاعی افواج میں کلّی طور سے اہلِ ہند کی شمولیت، فوج کی ازسرِ نو تشکیل و تنظیم، مالیاتی امور میں کمی بیشی اور فوج سے کام لینے کے معاملات، علاوہ ازیں دفاع سے متعلق قوانین اور پالیسی کا معاملہ۔ ان معاملات کو مجلس قانون ساز کے دائرہ اختیار

سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ایک عام لفظ دفاع کے ضمن میں جو مسائل آتے ہیں، انہیں دستور کے مجوزہ اداروں یعنی کابینہ، مجلس قانون ساز اور حکومت برطانیہ میں تقسیم کرنا ہوگا اور یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کے لیے ایک قطعی سکیم مرتب کرنا ضروری ہوگی۔ تاکہ مختلف ادارے اپنے مقاصد میں اشتراک و تعاون کر سکیں۔ اس پیراگراف کے بارے میں، مَیں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

وفاقی حکومت پر غور کرنے والی کمیٹی کی رپورٹ پر ۱۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو کانفرنس نے بحث شروع کی۔ اس موقع پر جناح صاحب نے گورنر جنرل کے اختیارات کی نسبت فرمایا "حضرات، اس پیراگراف کا گورنر جنرل کے خاص اختیارات سے تعلق ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس پیراگراف کے متعلق میرے تاثر پر غور کریں کہ گورنر جنرل کو آرڈیننس کے ذریعے قانون سازی کا کوئی اختیار نہ ملنا چاہیئے۔ گورنر جنرل کو صرف ایک اختیار ملنا چاہیئے اور وہ یہ کہ وہ ایسے ہنگامی حالات میں جن سے ملک کے امن و امان کو سنگین خطرہ ہو، مداخلت کر سکیں، اس کے علاوہ مجھے گورنر جنرل کے کسی دوسرے اختیار سے اتفاق نہیں ہے۔"

اُنھوں نے اس نکتے سے بھی اختلاف کیا کہ کرنسی اور سکّوں کے متعلق قوانین میں ترمیم کی غرض سے مرکزی اسمبلی میں کوئی بل پیش کرنے سے پہلے گورنر جنرل کی منظوری ضروری ہے۔ اُنھوں نے ریزرو بنک آف انڈیا کی تشکیل و قیام کے وقت تک گورنر جنرل کو اختیارات تفویض کرنے کی بھی مخالفت کی اور کہا، "مجھے اس سلسلے میں صرف اتنا ہی اور کہنا ہے کہ اگر آپ اس قسم کے تحفظات رکھنا چاہتے ہیں تو اس سے شک و شبہ اور بے اعتمادی پیدا ہوگی۔ اگر آپ سات ممبروں پر مشتمل ذمّہ دار کابینہ بنانا اور رپورٹ کی تجویز کے مطابق برطانوی ہند کے نمائندے منتخب کرنا چاہتے ہیں تو یہ صحیح ہے کہ آپ نے کوئی قطعی طریقۂ حق رائے دہی مقرر نہیں کیا، مگر میں بجا طور پر یہ کہہ سکتا ہوں کہ لوگوں

کی عام رائے یہ ہے کہ موجودہ طریقۂ انتخاب میں کوئی ردوبدل نہ کیا جائے۔ باایں ہمہ آپ حکومت ہند کی تمام مالی پالیسی میں گورنر جنرل کو مداخلت کے خصوصی اختیارات دینے پر مُصر ہیں تو مجھے یہ کہنا پڑے گا کہ اس طرح آپ ہم پر شک کرتے ہیں اور آپ کو ہم پر اعتماد نہیں ہے۔"

انھوں نے دو تہائی اکثریت سے وزارت برطرف کرنے کی دفعہ کی مخالفت کرتے ہوئے کہا "کابینہ میں عدم اعتماد کے ووٹ کے متعلق جو پیراگراف ہے میں اس کے سلسلے میں یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ دو تہائی اکثریت سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح تو آپ کی وزارت کو کبھی بھی ہٹایا نہیں جا سکے گا۔ بحث میں الجھے بغیر میں اس کی سخت مخالفت کرتا ہوں۔ ایک ممبر نے یہ نکتہ پیش کیا ہے کہ انھیں دو تہائی اکثریت کی تعداد سے اتفاق نہیں لیکن ایک خاص اکثریت ضرور ہونی چاہیئے۔ میرے لیے یہ بھی ناقابل قبول ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس بات کا فیصلہ محض چند ووٹوں کی گنتی کے بجائے ایک ذمہ دار مجلس قانون ساز پر چھوڑ دیجیے۔ میرا خیال ہے کوئی ذمہ دار مجلس صرف ایک ووٹ کے ذریعے کسی وزارت کو برخاست نہیں کرے گی۔" انھوں نے وزیراعظم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "جناب والا! مجھے نہیں معلوم کہ آپ کو... ایسا کوئی واقعہ یاد ہے کہ اس ملک میں صرف ایک ووٹ سے کوئی وزارت برطرف کی گئی ہو۔ عام حالات میں یہ امر ناقابل عمل ہے ـــــ زیربحث پیراگراف میں سب کمیٹی نے کہا ہے کہ ایسا کوئی طریقہ معلوم کیا جائے جس سے صرف ایک ووٹ کی شکست سے حکومت کو استعفا دینا نہ پڑ جائے اور یہ کہ اس موضوع پر مزید غور و خوض کیا جائے۔ جناب والا! میں دو تہائی اکثریت یا کسی بھی مخصوص اکثریت کو آئین میں شامل کرنے کے خلاف ہوں۔"

برما سے متعلق کمیٹی میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ میں اس بات سے متفق ہوں کہ برما کو علیحدہ حیثیت دی جائے کیونکہ برما کے عوام الگ ہونا چاہتے ہیں۔ انھوں نے

کہا۔ مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ جب یہ سب کمیٹی بنائی گئی تھی تو اس مسئلے کے متعلق ہمیں زیادہ معلومات حاصل نہ تھیں لیکن اب صورتِ حال خاصی مختلف ہے۔ ہمیں ذمہ دار ذرائع سے بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے میں سمجھتا ہوں کہ برما کے عوام برطانوی ہند سے الگ ہونا چاہتے ہیں اور اگر برما کے عوام یہ چاہتے ہیں تو میں ہندوستان کے نمائندے کی حیثیت سے اس کی مخالفت نہیں کر سکتا۔"

۱۹ر جنوری ۱۹۳۱ء کو پہلی گول میز کانفرنس حسب ذیل قرارداد پاس کر کے ختم ہو گئی:

کانفرنس نے اپنے مکمل اجلاس میں نو سب کمیٹیوں کی رپورٹیں اور ان سے متعلق آرا وصول کیں، اگرچہ ان رپورٹوں اور ان سے منسلک حواشی (نوٹس) کی حیثیت عبوری ہے تاہم یہ کانفرنس کے نزدیک ہندوستان کے لیے دستور کی تشکیل کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ان رپورٹوں سے یہ ظاہر ہے کہ بنیادی باتوں پر بڑی حد تک اتفاق رائے ہو گیا ہے اور بہت سے ایسے نکات موجود ہیں جن پر تفصیلی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔ کانفرنس کی رائے ہے کہ جس کام کا آغاز ہو چکا ہے اسے کسی مداخلت کے بغیر آگے بڑھانے کے انتظامات کیے جائیں۔ جن میں مسلمانوں، پست طبقوں، سکھوں اور دوسری اہم اقلیتوں کے لیے دستور میں مناسب تحفظات کی دفعہ بھی شامل ہے۔"

پہلی گول میز کانفرنس کے کچھ ممتاز مندوبین نے اپنے اختلافات ختم کرنے اور برطانوی وفد کے مقابلے میں ایک متحدہ محاذ بنانے کی پُرخلوص کوشش جاری رکھیں۔ قائدِاعظم اپنی بہن مس فاطمہ جناح کے ہمراہ رٹز ہوٹل لندن میں مقیم تھے اور اسی ہوٹل میں مسلمانوں کے وفد کے قائد آغا خان بھی قیام فرما تھے۔ بنابریں فیصلہ کیا گیا کہ اسی ہوٹل میں مسلم وفد کا ایک دفتر قائم کیا جائے۔ لندن میں نواب بھوپال کا مکان بھی موجود تھا۔ یہ مکان اور رٹز ہوٹل میں آغا خاں کا کمرہ تمام مصالحتی کوششوں کا مرکز بن گیا۔ مصالحت کے لیے مسلمانوں نے قائدِاعظم اور آغا خان کو نمائندگی کا اختیار دے رکھا تھا۔ مصالحت کی بات

چیت گھنٹوں جاری رہی اور انتہا پسند ہندؤوں کے سوا دیگر تمام جماعتوں نے اتفاق رائے کی غرض سے ہر معاملے پر مصالحانہ جذبے کا اظہار کیا۔ بظاہر ہندوستانی نمائندوں میں ہم آہنگی اور اتفاق رائے موجود تھا مگر دلوں میں اختلاف اور شکوک و شبہات کا غبار بھرا ہوا تھا۔ وفاق کے مسئلے پر خود مسلمانوں کے وفد میں بھی اختلاف رائے موجود تھا جو لوگ وفاق کے مخالف تھے ان کا خیال تھا کہ بعد میں جب ریاستیں اور رجواڑے اس وفاق میں شامل ہوں گے تو ہندؤوں کی غالب اکثریت کے آگے مسلمانوں کی حیثیت بالکل ختم ہو جائے گی اور اس طرح مسلمان اپنی موجودہ سیاسی اہمیت بھی کھو بیٹھیں گے۔ جناح صاحب وفاق کے نظریے کے مخالف تھے لیکن بعد میں مسلم وفد کی اکثریت کے خیال کے پیش نظر انھوں نے اس کی مخالفت ترک کر دی۔ اس سلسلے میں آغا خان نے لکھا ہے "مجھے اس خیال سے خوشی ہوتی ہے کہ جب مسلم وفد میں ہم نے وفاق کی حمایت کا اعلان کیا تو مسٹر جناح نے، جو وفاق کے انتہائی مخالف تھے اپنی مخالفت ترک کر دی اور بعد میں جو مذاکرات ہوئے ان کے سلسلے میں انھوں نے ہمیشہ ہماری معاونت کی"[1]

مسلمانوں کی جانب سے قائد اعظم اور آغا خاں نے ہندؤوں کو مطمئن کرنے کی انتہائی کوشش کی اور بیشتر ہندو نمائندوں نے بھی مصالحت و تعاون کے جذبے کا اظہار کیا۔ مسلمان اس بات پر بھی آمادہ تھے کہ وہ مخلوط انتخابات قبول کر لیں گے مگر جنگجو ہندو مندوب مسلمانوں کے جائز مطالبات قبول کرنے پر تیار نہ تھے۔ چمن لال سیتل واد نے ان مذاکرات کے سلسلے میں لکھا ہے "سپرو، شاستری اور ہیں یہ مطالبات قبول کر لیتے اور نہ مسلمانوں کو مخلوط انتخابات پر رضامند کر لیتے لیکن ہمیں جیکر اور موتجے کے رویے سے بڑی مایوسی ہوئی۔ ہم نے پہلے سندھ کو جداگانہ صوبائی حیثیت دینے کے معاملے پر غور

---

[1] میموائرز آف آغاخان۔ صفحہ ۲۱۷۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

شروع کیا۔ جیکر اور مونجے نے کچھ شرائط پیش کیں۔ ان کے خیال میں سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے سے پہلے ان شرطوں کا پورا ہونا ضروری تھا۔ صرف اسی ایک معاملے پر غور و خوض کرنے کے لیے ہم نے کئی شامیں بتا دیں[1]۔" ادھر آغا خاں نے اس بارے میں لکھا ہے "مجھے یقین ہے کہ سپرو اور شاستری مسلمانوں کی تجاویز قبول کرنے کے لیے بے چین تھے لیکن وہ اپنے ہندو رفقائے کار خاص طور سے مہاسبھا کے ردِ عمل سے خوف زدہ تھے[2]۔"

ہندو مسلم اختلافات کے سبب ترقی پسندانہ (سیاسی) اصلاحات کی کوئی بنیاد ہی موجود نہیں تھی۔ ہندو مہاسبھا نے وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دیا۔ آغا خاں نے لکھا ہے "چونکہ گول میز کانفرنس کی کارروائی کی بنیاد مضبوط و مستحکم ہونے کے بجائے خام اور بودی تھی۔ لہٰذا اس معاملے پر اتفاق رائے نہ ہونے کی وجہ سے ہمیں کانفرنس سے جو کچھ حاصل ہوا تھا وہ ہمارے لیے ضروری اور عملی اعتبار سے اہم نہ تھا[3]۔" سیتل واد نے اعتراف کیا ہے کہ "اس طرح ہم نے ایک بڑا موقع گنوا دیا۔ اگر میرے اور سپرو کے اختیار میں ہوتا تو ہم آغا خاں کے مطالبات فوراً قبول کر لیتے اور ان سے اور دوسرے مسلمان نمائندوں سے مخلوط انتخاب کے حق میں دستخط کرا لیتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو ہندوستان کی آئندہ سیاست اور تاریخ کے دھارے یقیناً کسی اور جانب بہتے ہوتے[4]۔"

۱۹۳۱ء میں جب دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی تو برطانوی حکومت میں تبدیلی واقع ہو چکی تھی۔ شاہ برطانیہ نے مالی اور اقتصادی بحران سے نمٹنے کے لیے ریمزے میکڈونلڈ سے قومی حکومت بنانے کی درخواست کی۔ اس وقت بھی لارڈ ارون ہندوستان

---

[1] ری کلکشنز اینڈ ری فلکشنز۔ چمن لال سیتل واد صفحہ ۳۸۵۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء
[2] دی میموائرز آف آغا خان صفحہ ۲۱۸۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء [3] محولہ بالا۔ صفحہ ۲۱۹
[4] ری کلکشنز اینڈ ری فلکشنز۔ چمن لال سیتل واد صفحہ ۳۸۵۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء

کے وائسرائے تھے اور وہ گاندھی کو دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت پر راضی کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ مسٹر گاندھی، کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے لندن روانہ ہوئے اور ایسٹ اینڈ میں اپنے ایک انگریز دوست مادیل لیسٹر کے ہاں ٹھہرے۔ سیتل واد نے ہندو لیڈروں کے اجلاس کا جس میں گاندھی جی بھی موجود تھے ایک دلچسپ واقعہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ایک اور موقع پر گاندھی نے جب کوئی ایسی بات کی جس کا زیر بحث موضوع سے کوئی تعلق نہ تھا تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۱۹ء کا مطالعہ کیا ہے؟ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ میں نے کہا تو پھر آپ اس بارے میں کس طرح کوئی رائے دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے موجودہ قانون سے واقفیت لازمی ہے۔[۱]"

۲۸ ستمبر ۱۹۳۱ء کو اقلیتوں کے متعلق کانفرنس کی کمیٹی کا اجلاس ہوا اور گاندھی جی کی درخواست پر یہ طے کیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے کیونکہ وہ اس معاملے پر قائداعظم اور آغا خان سے مذاکرات میں مصروف ہیں۔ ان مذاکرات کے متعلق آغا خان نے لکھا ہے۔

"ابتدائی بات چیت سے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے مزید مذاکرات کیے۔ عام طور پر یہ گفتگو آدھی رات تک رٹز ہوٹل میں میرے کمرے میں ہوتی۔ میزبان کی حیثیت سے میں ان نشستوں کی صدارت کرتا۔ ایک طرف مسٹر جناح اور سر محمد شفیع تھے تو دوسری طرف مہاتما گاندھی۔ ان مذاکرات کی داستان بڑی طویل مگر غیر سود مند ہے۔ یہ غیر رسمی بات چیت تھی لہٰذا اس کا کوئی ریکارڈ نہ رکھا گیا۔ میں بہت کم بولتا۔ بیشتر مسٹر جناح ہی کو گفتگو کرنی پڑتی ـــــــ کانگریس اپنے ایک قومی نظریے پر اڑی ہوئی تھی جو ہم جانتے تھے کہ تاریخی اعتبار سے بے وزن ہے۔[۲]"

۱۔ ریکلکشنز اینڈ ری فلکشنز۔ چمن لال سیتل واد۔ صفحہ ۳۶۵/۶۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء

۲۔ میموائرز آف آغا خان۔ صفحہ ۲۲۸۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

آغا خان کانگریس کے اس رویے سے بڑے بددل ہوئے۔ ڈاکٹر سیتا ریمیہ نے لکھا ہے۔ "وہ (گاندھی) مسلمان اور سکھ دوستوں سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور جب مرتب کیا جائے تو اس کی صرف اسی صورت میں حمایت کریں جبکہ وہ ہندوستانی قومیت پر مبنی ہو اور فرقہ واریت سے پاک ہو"۔ بظاہر یہ انتہائی طفلانہ موقف تھا اور یہ سوچنا نادانی تھا کہ مسلمان ایسے کسی نظریے کو تسلیم کر کے اپنی سیاسی موت کو خود دعوت دیں گے۔

دوسری گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے نمائندوں میں ڈاکٹر محمد اقبال بھی شامل تھے جب وہ تقریر کرنے اٹھے تو انھوں نے ہندوستان میں مسلم قوم کے مشن کے متعلق بڑی پُرمغز اور مدلّل تقریر کی۔ اقبال نے کہا "اس تصور پر ہندوستان کے دستور کی بنیاد رکھنا کہ وہاں ایک قوم آباد ہے یا ہندوستان پر برطانیہ کی جمہوری روایات کا اطلاق ہو سکتا ہے، اس ملک کو خانہ جنگی میں دھکیلنے کے مترادف ہے ——— میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ضم کر کے ایک مملکت بنا دی جائے ——— شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت میرے نزدیک مسلمانوں کا مقسوم بن چکی ہے۔"

اقبال کے رُفقا نے ان کے ان الفاظ کو حرزِ جاں بنا لیا اور ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے درمیانی زمانے کے ابتدائی سالوں ہی میں ان پر یہ حقیقت آشکارا ہو گئی کہ یہ کسی غیب داں کے الفاظ ہیں جو حالات کے رُونما ہونے سے پہلے ہی چشم بینا سے سب کچھ دیکھ سکتا ہے۔

گاندھی جی کا اصرار تھا کہ پیشتر اس کے کہ مسلمان کسی ضمانت کا مطالبہ کریں، انھیں

لے دی ہسٹری آف دی کانگریس، ڈاکٹر پتابھی سیتا ریمیہ۔ صفحہ ۸۵۹۔ مطبوعہ ۱۹۳۵ء

کانگریس کا یہ نظریہ قبول کر لینا چاہیئے کہ ہندوستان کو سوراج ماننا چاہیئے۔ جناح صاحب نے اس کے جواب میں کہا چونکہ گاندھی کانفرنس کے دوسرے ہندو نمائندوں پر یہ شرط عائد نہیں کر رہے، اس لیئے مسلمانوں سے یہ مطالبہ مناسب نہیں ہے۔ چند روز تک اسی طرح کی گفتگو ہوتی رہی۔ آغا خان رقم طراز ہیں "مہاتما گاندھی کو بخوبی اندازہ تھا کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملانے سے کتنا فائدہ ہوگا۔ کسے خبر ہے کہ شاید وہ ہمارے نقطۂ منظر کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہو گئے ہوں مگر پنڈت مالویہ اور ہندو مہاسبھا نے ہمارے خلاف دباؤ میں اضافہ کر دیا۔ انھوں نے جو دلائل دیئے وہ تجریدی سیاسیات کے اصول و عقائد پر مبنی تھے اور ۱۹۴۷ء کی تقسیم برصغیر سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ اصول ہندوستان کے حقائق سے قطعاً میل نہ کھاتے تھے۔"[1]

جب ۸ر اکتوبر کو اقلیتوں سے متعلق کمیٹی کا اجلاس ہوا تو گاندھی جی نے کہا "مجھے بڑے رنج و افسوس کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑ رہا ہے کہ بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔" انھوں نے تجویز پیش کی کہ کمیٹی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا جائے۔ پست اقوام کے ایک لیڈر ڈاکٹر امبیدکر نے گاندھی جی کی تجویز کے جواب میں کہا۔ مہاتما جی ہمیشہ یہ دعوے کرتے رہے ہیں کہ کانگریس پست اقوام کی حامی و حلیف ہے اور یہ کہ کانگریس میرے اور میرے رفقا سے زیادہ ان کی ترجمانی و نمائندگی کرتی ہے۔ اس دعویٰ کے سلسلے میں میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ غیر ذمہ دار لوگ اکثر و بیشتر جو دعوے کرتے رہتے ہیں ان میں یہ دعویٰ بھی شامل ہے، اگرچہ متعلقہ افراد بارہا ان دعاوی کی تردید کر چکے ہیں۔"

اجلاس ۱۳ر نومبر تک ملتوی ہو گیا۔ جب دوبارہ شروع ہوا تو آغا خان نے

---

[1] میموائرز آف آغا خان۔ صفحہ ۲۲۹۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء

مسلمانوں، اچھوتوں، عیسائیوں، اینگلو انڈین باشندوں اور انگریزوں کی جانب سے چیئرمین کو ایک یادداشت پیش کی جس میں اقلیتوں کے مسائل پر اتفاق رائے کا اظہار کیا گیا تھا۔ گاندھی جی نے فوراً اٹھ کر کہا کہ میں اور کانگریس اس یادداشت کو تسلیم نہیں کر سکتے لہٰذا ہم اسے مسترد کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس اس تجویز کی حمایت کرنے سے زیادہ یہ پسند کرے گی کہ سالہا سال تک ویرانوں میں بھٹکتی رہے۔"

پہلی گول میز کانفرنس جزوی طور پر کامیاب رہی تھی لیکن دوسری کانفرنس قطعی ناکام ثابت ہوئی۔ سوائے چند تقریروں اور معمولی سے اتفاق رائے کے مظاہرے کے اس کانفرنس سے اور کچھ حاصل نہ ہو سکا۔

ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں قائداعظم کی کوششیں بار آور نہ ہونے کا مانچسٹر گارجین نے جو سبب بیان کیا تھا شاید وہ بہترین تبصرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس اخبار نے لکھا تھا: "گول میز کانفرنس میں مسٹر جناح انوکھی پوزیشن کے مالک تھے۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ وہ فرقہ واریت کا شکار ہیں۔ مسلمان انھیں ہندوؤں کا حامی سمجھتے تھے۔ رجواڑوں کا خیال تھا کہ وہ حد سے زیادہ جمہوریت پسند ہیں اور انگریز انھیں انتہا پسند خیال کرتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہ رہے۔ انھیں کوئی شخص پسند نہ کرتا تھا۔"

قائداعظم نے دونوں (گول میز) کانفرنسوں میں جو خدمات انجام دیں، مس پرسنہ مہ دتی نائیڈو نے انھیں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ پرکشش شخصیت مؤثر انداز بیان اور متوازن و معتدل لہجہ — یہ تھے ان کے تین حربے۔ ان میں ایک ذہین وکیل کے تمام اوصاف موجود تھے اور گول میز کانفرنس نے انھیں اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کا موقع دیا تھا۔ دلائل پیش کرنے میں ان کی غیر معمولی ذہانت اور قوت فیصلہ اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب وہ کسی کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہوں۔

اس کے بعد تیسری گول میز کانفرنس ہوئی جو سرکاری طور پر جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ برطانوی پارلیمنٹ نے یہ کمیٹی مقرر کی تھی اور اس کے چیئرمین مارکوئیس آف لنلتھگو تھے۔ کمیٹی کا مقصد ہندوستان کے لیے وفاقی طرز کا دستور مرتب کرنا تھا۔ ۱۹۳۴ء کے موسم بہار میں لندن میں کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ قائد اعظم اس کمیٹی میں شامل نہ تھے اور کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قائد اعظم اور گاندھی جی جیسے دو افراد کی عدم شمولیت سے جو موثر انداز میں اپنا موقف پیش کر سکتے تھے، کمیٹی کو اپنے مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی اور اتفاق رائے کے ذریعے کوئی دستوری مسودہ تیار نہ ہو سکا۔ آغا خان نے اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کیا ہے۔ "میرے خیال میں یہ بڑی بدقسمتی تھی کہ ہم نے مسٹر جناح کو وفد میں شامل کرنے پر اصرار نہ کیا۔ اگر وہ وفد میں شامل ہوتے تو شاید ان کی کوششوں سے ان گول میز کانفرنسوں کے سلسلے میں انتہائی اہم اور قابل قدر نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ یہ ایک مشترکہ یادداشت تھی جس میں —— ہندوستان اور برطانیہ کے تعلقات کی تاریخ میں پہلی بار برطانوی حکومت کے سامنے تمام فرقوں کی جانب سے ایک متفقہ مطالبہ پیش کیا گیا تھا جس میں عملاً ہر ایک سیاسی نقطۂ نظر شامل تھا۔"[1]

آغا خان نے مزید لکھا ہے۔ "برطانوی حکام اور کانگریسی نمائندوں کے ساتھ سالہا سال کی بحث و تمحیص کے بعد مسلمان اپنی سیاسی امنگوں کو حق بجانب ثابت کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ مسلمانوں نے بجا طور پر جناح پر پورا پورا اعتماد کیا اور ان کی پیروی کی۔"[2]

---

[1] میموائرز آف آغا خان، صفحہ ۲۳۲ - مطبوعہ ۱۹۵۴ء

[2] دی میموائرز آف آغا خان۔ صفحہ ۲۹۵ - مطبوعہ ۱۹۵۴ء

کانگریس نے یہ مشترکہ یادداشت جس پر تمام غیر سرکاری ہندوستانی مندوبین نے دستخط کیے تھے، مسترد کر دی لہذا برطانوی حکومت کو یادداشت قبول نہ کر لینے کا بہانہ مل گیا۔ ادھر برطانوی حکومت ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا مسودہ تیار کرنے میں مصروف تھی جس میں کئی سقم تھے اور ان کی بنا پر برطانیہ ہندوستان کے نظم و نسق میں مداخلت کر سکتا تھا خواہ یہ معاملات حکومت ہند اور صوبائی حکومتوں کے دائرہ اختیار ہی میں کیوں نہ ہوں۔

وزیر اعظم انگلستان ریمزے میکڈونلڈ نے کانفرنس کا آخری اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں انھوں نے کہا۔ اگر آپ ہمیں ایک ایسا سمجھوتہ پیش نہیں کر سکتے جس پر تمام فریق متفق ہوں اور جس کی بنیاد پر کچھ کام کیا جا سکے تو ملک معظم کی حکومت کو مجبوراً ایک عبوری سکیم نافذ کرنی ہوگی۔ مطلب یہ کہ برطانوی حکومت کو خود یہ معاملہ طے کرنا ہوگا۔ برطانوی حکومت نہ صرف نمائندگی کی نسبت آپ کے مسائل حل کرے گی بلکہ یہ بھی طے کرے گی کہ اکثریتی حکومت کے ہاتھوں جمہوری اصولوں کے غلط اور نامناسب استعمال کو روکنے کے لیے دستور میں اقلیتوں کے تحفظ کے لیے کیا کیا ضروری اور مناسب دفعات رکھی جائیں۔"

۴ اگست ۱۹۳۲ء کو ریمزے میکڈونلڈ وزیر اعظم انگلستان نے لندن میں برطانوی حکومت کی جانب سے کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا۔ اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں کے لیے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں آبادی کی بنیاد پر نشستیں مخصوص کی گئیں اور پست اقوام کو بھی بعض مراعات دی گئیں۔ اس ایوارڈ میں منجملہ دیگر امور کے یہ بھی کہا گیا تھا کہ (۱) وزیر اعظم نے برطانوی حکومت کی جانب سے دسمبر میں گول میز کانفرنس کے دوسرے اجلاس کے آخر میں جو بیان دیا تھا (جس کی بعد میں پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں نے توثیق کی تھی) اس میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ اگر ہندوستان کے مختلف فرقے فرقہ دارانہ

مسئلے کے متعلق کوئی ایسا سمجھوتہ نہ کر سکیں جو تمام جماعتوں کے لیے قابلِ قبول ہو اور
جس کے حل میں کانفرنس کو ناکامی ہوئی ہے تو برطانوی حکومت نے یہ عزم کر لیا ہے
کہ وہ اس رکاوٹ کے سبب ہندوستان کی دستوری ترقی میں التوا اور تعویق نہ ہونے
دے گی بلکہ اس مزاحمت کو دور کرنے کے لیے خود ایک عبوری سکیم نافذ کرے گی (۲)
۱۹ مارچ کو برطانوی حکومت کو اطلاع دی گئی کہ چونکہ ہندوستانی فرقوں کے نمائندے کسی
متفقہ معاہدے پر پہنچنے میں ناکام رہے ہیں اور اس ناکامی سے نئے دستور کی تشکیل و
ترتیب کی راہ میں رکاوٹ پڑ رہی ہے۔ لہذا ملکِ معظم کی حکومت ان اختلافی معاملات
پر از سرِ نو غور کر رہی ہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب تک نئے دستور میں اقلیتوں
کے مسئلے کے کم سے کم چند پہلوؤں پر سمجھوتہ اور فیصلہ نہ ہو یہ ممکن نہیں کہ تشکیل دستور کا
کام آگے بڑھ سکے (۳) لہذا ملکِ معظم کی حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ وہ سکیم کو نافذ
کرنے کی غرض سے ہندوستانی آئین میں (جو عنقریب پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیا جائے گا
چند دفعات شامل کرے گی۔ اس سکیم کا دائرہ عمل دانستہ طور پر ایسے انتظامات تک
محدود رکھا گیا ہے جو صوبائی مجالسِ قانون ساز میں ہندوستانی فرقوں کی نمائندگی کے لیے
کیے جائیں گے۔ مرکزی اسمبلی میں نمائندگی کے معاملے پر ان اسباب کی بنا پر غور و خوض
ملتوی کر دیا گیا ہے جو ذیل کے پیراگراف نمبر ۲ میں بیان کیے گئے ہیں۔ سکیم کے دائرہ عمل
کو محدود کرنے کے فیصلے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دستور کی تشکیل میں اقلیتوں کے دیگر
اہم مسائل پر فیصلہ نہیں کیا جائے گا۔ درحقیقت یہ ایوارڈ اس توقع سے جاری کیا گیا ہے
کہ نمائندگی کے بنیادی سوال کے طریقۂ کار اور تناسب کے بارے میں اگر کوئی فیصلہ
کر لیا گیا تو ممکن ہے کہ خود اقلیتیں دوسرے فرقہ وارانہ معاملات پر کوئی سمجھوتہ کر سکیں
ان مسائل پر ابھی غور و خوض کرنے کی ضرورت ہے (۴) ملکِ معظم کی حکومت یہ واضح
کر دینا چاہتی ہے کہ حکومت کے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کے لیے از سرِ نو مذاکرات کیے گئے

تو وہ ان میں شامل نہیں ہوگی اور اس وقت تک کسی ایسے معاملے پر غور نہیں کرے گی
کا مقصد ایوارڈ میں ترمیم یا رد و بدل کرنا ہو جب تک کہ تمام فریق اس کی حمایت نہ
لیکن حکومت اس بات کی خواہش مند ہے کہ باہمی اتفاق رائے سے مسائل طے کر
کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔ لہذا اگر نئے قانونِ حکومت ہند (گورنمنٹ آف انڈیا ا
کے نفاذ سے پہلے حکومت اس بات سے مطمئن ہو گئی کہ متعلقہ فرقے کسی متبادل قابل
سکیم پر راضی ہو گئے ہیں (خواہ یہ سکیم کسی ایک صوبے سے تعلق رکھتی ہو یا چند صوبوں
سے یا پورے برطانوی ہند کا احاطہ کرتی ہو) تو حکومت پارلیمنٹ سے یہ سفارش کر
کو تیار ہوگی کہ متبادل سکیم کی منظوری دے دی جائے۔" جوں ہی یہ بیان جاری کیا
گاندھی جی نے وزیر اعظم کے نام ایک مکتوب لکھا جس میں دھمکی دی گئی تھی کہ اگر ان
خواہش کے مطابق اس ایوارڈ میں ترمیم نہ کی گئی تو وہ ۲۰ ستمبر کو بارہ بجے دوپہر سے
مرن برت شروع کر دیں گے۔

”میں منافقت پسند نہیں کرتا“

گول میز کانفرنس کے اختتام کے ساتھ ہی وائسرائے ہند کی حیثیت سے لارڈ
ن کے عہدے کی میعاد بھی ختم ہو گئی۔ لارڈ ارون کے بعد لارڈ ولنگڈن کو وائسرائے
کیا گیا۔ گول میز کانفرنس کے موقع پر جو باتیں کہی اور سنی گئیں وہ قائد اعظم کے لیے
تلخ تھیں۔ انھیں بخوبی اندازہ ہو گیا کہ ہندو کا مطمح نظر یہ ہے کہ اپنی قوت اور تعداد
منڈ پر ہندوستانی سیاسیات میں برتری حاصل کی جائے خواہ مسلمان اسے کتنا ہی ناپسند
نہ کریں۔ انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ برطانوی حکومت نئی دستوری اصلاحات کے
ے ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے میں اہم اور ٹھوس کردار ادا کرنے والی ہے۔ اب
فیصلے کا وقت آ گیا تھا کہ آیا وہ ہندوستان واپس چلے جائیں جہاں کی سیاسی فضا
ے انداز فکر سے میل نہ کھاتی تھی یا انگلستان ہی میں قیام پذیر رہیں۔ بالآخر انھوں نے
ستان میں قیام کا فیصلہ کیا اور پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کرنے کی غرض سے
ن کے وہائٹ ہال کورٹ میں سکونت اختیار کر لی۔ ۲۱ مارچ ۱۹۳۱ء کو قائد اعظم نے
ن سے آسام کے عبدالمتین چودھری کے نام ایک مکتوب ارسال کیا جس میں آپ نے
بحالات موجودہ میں یہاں زیادہ مفید کام کر سکتا ہوں۔ ہندوستانی سیاست کا مرکز
ہے اور دو تین سال میں ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے ڈرامے میں یہاں
ے اہم سرگرمیاں وقوع پذیر ہوں گی۔ بہرحال میں اگست میں ہندوستان آؤں گا اور
ت کا جائزہ لوں گا۔ آپ کے پاس گول میز کانفرنس کی روداد کی نقل تو ہو گی اس

سے آپ کانفرنس میں میرے رویّہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ میں نے کانفرنس میں حسب
ذیل نکات اٹھائے:۔

۱۔ اگر ہندو مسلم نزاع کا فیصلہ ہو جائے تو مرکزی حکومت کو ذمہ داریاں سونپی
جائیں۔

۲۔ مصنوعی اور ناقص وفاق کے بجائے صحیح اور حقیقی وفاق کی تشکیل کی جائے

۳۔ صرف ایسے تحفظات دیے جائیں جو ہندوستان کے مفاد کے لیے ضروری ہوں

۴۔ دفاع کے معاملے میں ایک ٹھوس اور جامع سکیم مرتب کی جائے جس کے تحت
ہندوستان مناسب وقت میں دفاعی امور کو خود سنبھال سکے۔

میں نے مجوزہ تحفظات یا موجودہ شکل میں کل ہندوستان وفاق کی تجویز سے اتفاق
نہیں کیا۔ ان دونوں معاملوں پر انتہائی احتیاط اور تدبر سے غور و خوض کرنا ہوگا۔ مجھے
خوشی ہے کہ اسمبلی کے بارے میں آپ اور دوسرے احباب میری رائے کا اتنا خیال
کرتے ہیں۔ مجھے اس ضمن میں اپنے جذبات کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے لیکن مجھے
خیال ہے کہ فی الوقت میں یہاں زیادہ مفید کام کر سکتا ہوں۔ آپ نے یہ خبر پڑھی
ہو گی کہ لندن میں وفاقی سب کمیٹی کا اجلاس موسم گرما میں منعقد ہوگا اور اس کے بعد
گول میز کانفرنس ہونے والی ہے۔ میرا خیال ہے مسلمان رہنما اگر غلط مشورے قبول
کریں تو انھیں کسی تاخیر کے بغیر مئی کے مہینے میں یہاں اجلاس منعقد کرنے پر رضا مند ہو
جانا چاہیے اور اس کے بعد گول میز کانفرنس میں شرکت کرنی چاہیے۔ ہمارے مخالفین
ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں اور اس معاملے کو ملتوی کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں ان کے
ہاتھوں میں کھلونا بننا نہیں چاہیے۔"

جناح صاحب ستمبر میں ہندوستان تشریف لائے اور بمبئی کے ایک جلسۂ عام میں
انھوں نے کہا: "میں پہلے ایک ہندوستانی اور پھر مسلمان ہوں۔ مگر اس کے ساتھ ہی

بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں کہ اگر کوئی ہندوستانی باشندہ مسلمانوں کے مفاد کو نظر انداز کرتا ہے تو وہ اپنے ملک کی خدمت نہیں کرتا کیونکہ مسلمانوں کو طاقتور بنا کر، انھیں متحد کرکے اور انھیں مملکت کے مفید شہری بنا کر ہی آپ ملک کی خدمت کر سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ مملکت کیا ہے؟ نمائندہ حکومت کسے کہتے ہیں؟ کیا اس کا مطلب ایک ایسے دستور کے تحت سات کروڑ مسلمانوں کو مجبور اور بے کس بنا دینا ہے جس میں ہندوؤں کا ایک خاص طبقہ ان پر زیادتیاں کر سکے اور اپنی مرضی کے مطابق ان سے پیش آئے؟ کیا ہم اسے نمائندہ حکومت کہہ سکتے ہیں؟ کیا یہی جمہوری حکومت ہے؟ ——— یقیناً نہیں۔"

انھوں نے ہندوؤں کو خبردار کیا کہ مسلمانوں اور اچھوتوں کو نظر انداز نہ کریں بلکہ ان سے فراخدلانہ برتاؤ کرکے انھیں اپنا دوست بنائیں۔ جناح صاحب نے کہا "میں کسی پارٹی کو بُرا نہیں سمجھتا۔ میں شہرت اور مقبولیت حاصل کرنے کا خواہاں نہیں ہوں بلکہ دیانت داری سے آپ کو بتا رہا ہوں کہ ہندوؤں نے موجودہ رویّہ اختیار کرکے حماقت، انتہائی حماقت کا ثبوت دیا ہے۔" انھوں نے کہا "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ گاندھی دوسری گول میز کانفرنس لندن میں شرکت کریں گے۔ میں بھی کانفرنس میں شریک ہوں گا۔ پہلی گول میز کانفرنس میں چند ہندو لیڈروں کے رویے کا ذکر کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا کہ بیشتر ہندو عقل و ہوش سے عاری ہیں۔ شاید آپ کو علم نہیں مگر میں اس سے بخوبی واقف ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب تک ہندو اپنے میں ہمت اور اعتماد پیدا نہ کریں گے ——— وہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہیں گے ——— ہندوستان کو سوراج نہ مل سکے گا۔ یہ مخلوط یا جداگانہ انتخاب یا پانچ اور دس نشستوں کا سوال نہیں ہے۔ ہندوؤں میں ہمت اور حوصلہ نہیں ہے اور وہ مسلمانوں سے خوفزدہ ہیں۔"

انھوں نے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کے معاملے پر ہندوؤں کے رویئے پر اظہارِ افسوس کیا "میں منافقت پسند نہیں کرتا. میرے منہ پر کہہ دیجیے کہ ہم آپ کو پنجاب اور بنگال میں اکثریت دینا نہیں چاہتے ——— ہندو یہ نہیں کہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ مخلوط انتخاب کے ذریعہ آپ اکثریت حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندو بخوبی جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان صوبوں میں صرف چالیس فیصدی ووٹ ملے ہیں۔"

ہندوستان میں مختصر قیام کے بعد انھوں نے پھر انگلستان کا قصد کیا اور ٹائمز آف انڈیا کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا "گول میز کانفرنس کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار بعض ہندو مسلم نزاع کے حل پر ہے۔ مجھے امید ہے کہ ہم آپس میں یہ معاملہ طے کر لیں گے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہر اقلیت کے مطالبے اس طرح پورے کیے جائیں گے کہ وہ خود کو محفوظ سمجھے، اور برضا و رغبت دستور کی وفادار رہے۔ ہندوستان کے آئندہ دستور کا مسئلہ انتہائی دشوار اور نازک مرحلہ ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ معاملہ طے نہ ہو سکے گا لیکن خیر سگالی اور عزم راسخ سے ہم اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں اور ہندوستان کے عوام کے لیے امن اور خوشحالی کے دروازے کھول سکتے ہیں۔ میرا جلد واپس آنے کا ارادہ نہیں ہے تاہم مجھے ہندوستان کی فلاح اور اس کی ترقی کا ہمیشہ خیال رہے گا۔ میں ہندوستان کی خدمت کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کروں گا۔"

وکالت ان کا پیشہ تھا اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد پریوی کونسل میں ان کی قانونی مصروفیات میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مگر ان کا دل ہندوستانی سیاسیات میں پڑا ہوا تھا جو انھیں حقیقی معنی میں عزیز تھی۔ ہندوستان سے دور وہ برابر مسلمانوں کے مستقبل اور ہندوستان کی آزادی کے بارے میں سوچتے رہے۔ ۲/ مارچ ۱۹۳۲ء کو انھوں نے لندن سے عبدالمتین چودھری کے نام ایک مکتوب میں اپنے انھیں جذبات کا اظہار کیا۔ انھوں نے لکھا "یکے بعد دیگرے مجھے آپ کے دو خط موصول ہوتے سب سے آپ کے

خط سے خوشی ہوئی اور اس احساس سے مسرت ہوتی ہے کہ آپ نے مجھے جملہ کوائف سے مطلع فرمایا ہے۔ ازراہِ کرم مجھے حالات سے مطلع کرتے رہا کیجیے۔ اگرچہ ہمیں ہندوستان کے متعلق روزانہ خبریں ملتی ہیں تاہم یہ خبریں مختلف نوعیت کی ہوتی ہیں، پھر بھی ان سے حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ مسلمانوں کے لیے اتحاد لازمی ہے اور میں سمجھتا ہوں اس مقصد کے لیے ایک جماعت ہونی چاہیئے۔ مجھے امید ہے کہ آپ انضمام کی سکیم میں کامیابی سے ہم کنار ہوں گے۔ اگر مسلم رہنما چال چلنا جانتے ہیں تو مجھے یقین ہے کہ قوم کو اپنے مقاصد میں کامیابی نصیب ہوگی۔ آپ صرف تحفظات کے سہارے زندہ نہیں رہ سکتے آپ کو اپنی صلاحیتوں اور جدوجہد کے سہارے زندہ رہنا ہوگا۔ مسلمان بہت پیچھے ہیں اور انھیں بہت کچھ کرنا ہے۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں انھیں غلط مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ تحفظات کے بارے میں مسلمانوں کی بات نہ مانیں ہندو خود اپنے حق میں کانٹے بو رہے ہیں اور ہندوستان کی منزلِ آزادی کو دور سے دور تر کیے جا رہے ہیں اور حکومتِ خود اختیاری کے مخالفین کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ تاہم اب بھی وقت ہے۔ مسلمانوں کے لیے اب صرف ایک راستہ رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ وہ متحد ہو کر چودہ نکات کی تائید و حمایت کریں اور کسی کے آلۂ کار نہ بنیں۔ ذمہ دار مرکزی حکومت اسی صورت میں منظور کی جائے جب ہمارے تحفظات دستور میں درج ہوں۔ لیکن اس جال میں نہ پھنسیے کہ پہلے صوبوں کو خود مختاری دی جائے گی بعد میں ذمہ دار مرکزی حکومت کے معاملے پر غور کیا جائے گا۔ انگریزوں کو ہمارے تعاون اور مدد کی ضرورت ہے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہمارے تحفظات اور ذمہ دار مرکزی حکومت کے قیام کے مطالبات منظور کیے جائیں۔ اگر ہندوؤں کو ہمارا اشتراک و تعاون درکار ہے تو اس کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ ہمارے تحفظات اور برطانوی دولتِ مشترکہ کے تحت حکومتِ خود اختیاری کے سوال پر سمجھوتہ کر لیں، ہم ان شرائط کے سوا کسی بات

پریشان نہ ہوں گے۔ اگر کسی فریق کو ہمارا تعاون درکار نہیں ہے تو پھر جو کچھ اس کے جی میں آئے کرے، ہمارا کسی بات سے تعلق نہ ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ آٹھ کروڑ مسلمانوں کو خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ ہم متحد ہوں گے، نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ میری اور میری ہمشیرہ کی جانب سے تسلیمات۔ ڈینا اسکول گئی ہوئی ہے۔"

قائداعظم کی لندن میں رضاکارانہ جلاوطنی کے دوران میں عبدالمتین چودھری سے ان کی جو خط وکتابت ہوئی اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ہندوستان کی صورت حال کے درست اور غیر جانبدارانہ جائزے کے سلسلے میں وہ چودھری صاحب پر دوسروں سے زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ ۵رمئی ۱۹۳۲ء کو انھوں نے عبدالمتین چودھری کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا۔ "آپ کے گرامی نامے مورخہ ۱۶راپریل کے لیے شکر گزار ہوں۔ میں ہندوستان کی صورتِ حال کے بارے میں آپ کی اطلاعات کا انتظار کروں گا۔ ان اطلاعات کی صحت کے بارے میں، میں آپ پر دوسروں سے زیادہ بھروسہ کر سکتا ہوں۔ آپ نے اب تک جو خطوط تحریر کیے ہیں، وہ بہت مفید ثابت ہوئے ہیں اور مجھے توقع ہے کہ آپ یہ سلسلہ جاری رکھیں گے۔

میں نے کچھ عرصہ پہلے جو کچھ تحریر کیا تھا اس کے سوا اور کوئی امر قابلِ ذکر نہیں ہے۔ حکومت برطانیہ وقت گزار رہی ہے اور تینوں کمیٹیوں کی رپورٹ کا انتظار ہو رہا ہے۔

سردیاں بیت چکی ہیں اور آج کل موسم بڑا خوشگوار ہے۔ میں یہاں آرام سے ہوں۔ کام کر رہا ہوں مگر دل ہندوستان میں اٹکا ہوا ہے۔"

یکم دسمبر ۱۹۳۲ء کو جناح صاحب نے ویسٹ ہیتھ ہاؤس (ویسٹ ہیتھ روڈ ہیمپسٹڈ) سے ایک مکتوب میں لکھا۔ "آپ کے خط کا شکریہ۔ یہ میرے لیے بہت مفید ثابت ہوا —— آپ نے بڑی تفصیل سے تمام باتوں کی وضاحت کر دی ہے ——

مجھے حالات سے باخبر رکھیے —— مس جناح اور میری جانب سے آداب۔"

ایلن کیمپبل جانسن نے لکھا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ہمراہ ہندوستان آنے سے قبل میں اس دیس کے سیاسی حالات کے پس منظر سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سلسلہ میں انگلستان کے بہت سے افراد سے ملاقات کی۔ ان میں سر جارج شوسٹر بھی شامل تھے جو ہندوستان کے وائسرائے لارڈ ہیلی فیکس کی انتظامیہ کونسل میں فائننس ممبر رہ چکے تھے۔ سر شوسٹر سے ملاقات کا حوالہ دیتے ہوئے کیمپبل جانسن نے لکھا ہے۔ "ان کے خیال میں سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں اعلیٰ پائے کی قیادت موجود نہ تھی۔" انھوں نے کہا کہ ۱۹۳۰ء کی گول میز کانفرنس میں جناح بری طرح ناکام رہے —— حتیٰ کہ اس کے کچھ عرصے بعد تک وہ ہندوستان واپس آنے پر آمادہ نہ تھے۔ بلکہ سکاٹ لینڈ میں اپنی بہن کے ساتھ رہنے لگے۔ شوسٹر نے اسکاٹ لینڈ میں ان سے کئی بار ملاقات کی۔[1] عبدالمتین چودھری کے نام قائداعظم کے مکاتیب سے یہ واضح ہو گیا کہ اس وقت وہ سکاٹ لینڈ میں نہیں بلکہ لندن میں قیام پذیر تھے اور پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کر رہے تھے۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۴ء تک قائداعظم کی رہائش کے متعلق شوسٹر کی معلومات اسی قدر غلط ہیں جتنا کہ ان کی قیادت کی اہلیت، صلاحیت اور گول میز کانفرنس میں ان کی خدمات کے متعلق اس کا اندازہ۔

دریں اثنا مسلمانوں کو قائداعظم کی غیر موجودگی شدت سے محسوس ہو رہی تھی کیونکہ مسلمانوں کا قومی اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ کئی گروہ بن چکے تھے اور سرکردہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھا۔ صرف قائداعظم مسلمانانِ ہند کو متحد رکھ سکتے تھے۔ اس موقع پر عبدالمتین چودھری نے قائداعظم سے ہندوستان واپس آنے،

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن۔ صفحہ ۳۳۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ رابرٹ ہیل لمیٹڈ۔ لندن

مسلمانوں کی قیادت کا بار سنبھالنے اور انھیں ایک پلیٹ فارم پر متحد کرنے کی درخواست کی۔ قائدِ اعظم نے ان کے مکتوب کے جواب میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو تحریر فرمایا کہ "میری جانب سے مبارک باد قبول کیجیے۔ مجھے از حد مسرت ہوئی کہ آپ نے پارٹی کے نائب صدر کا انتخاب کر لیا۔

"جہاں تک دوسرے معاملوں کا تعلق ہے، میں شکر گزار ہوں کہ آپ نے مفید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ جی ہاں، مجھے تار مل گیا۔ میں لیگ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں مگر دسمبر سے قبل ہندوستان واپس نہیں آ سکتا۔ اس کے علاوہ میں نہیں سمجھ سکا کہ بحالاتِ موجودہ میں وہاں کیا کر سکتا ہوں۔ آپ نے بجا فرمایا کہ میں اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لوں مگر ہندوستان میں کام کرنے کی کیا واقعی گنجائش ہے؛ یہ سوال ہیں جن کے پیشِ نظر میں اب بھی سوچا کرتا ہوں کہ ہندوستان کو میری خدمات کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یہ بات دہراتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے مگر حقیقت ہے کہ جب تک ہندو صحیح صورتِ حال کا اندازہ نہیں لگائیں گے، ہندوستان کو بچانے کے لیے کچھ نہ کیا جا سکے گا۔ صورتِ حال کی تبدیلی ہندو کے اختیار میں ہے۔ رجعت پسند طاقتوں کا عروج لازمی ہے اور ان کی سرگرمیوں اور دائرۂ کار میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کو ہانکا جا رہا ہے اور ان کا مخالفین کے ہاتھ میں کھلونا بن جانا لازمی امر ہے۔ کنجی ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور وہی دانش مندی اور جرأت کے ساتھ حالات کو تبدیل کر سکتے ہیں۔ آئندہ دستوری ترقی کے متعلق صورتِ حال واضح ہے ـــــ یعنی صرف صوبائی خود مختاری ملے گی اور وفاق کا قیام معطل رہے گا۔ ہندوؤں کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے لیکن کوئی سکیم اگر اتفاقاً منظور کر لی گئی تو وہ موجودہ صورتِ حال سے بھی بدتر ہوگی اور جو لوگ آج اس کی تائید کر رہے ہیں وہ محسوس کریں گے کہ انھیں دھوکا دیا گیا ہے۔

"آپ کی اس تجویز کا شکریہ کہ چونکہ سر ابراہیم مستعفی ہو رہے ہیں اس لیے میں
تخاب لڑوں۔ میں دسمبر میں ہندوستان آؤں گا۔ اس سے قبل کچھ نہیں کہہ سکتا۔
ہند نیک تمنائیں اور رسمی۔

"میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ ہندوؤں کے رویے میں تبدیلی ہو رہی ہے،
س کی رفتار بہت سست ہے لیکن یہاں حالات بڑی تیزی سے بدل رہے ہیں اور
رہم نے ان کا ساتھ نہ دیا تو بہت دیر ہو جائے گی۔

"لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں اپنی کوششوں میں ناکامی ہوئی ہے اور ہمارے راستے میں
دست رکاوٹ موجود ہے لیکن اس وقت صورتِ حال کو کسی طرح سنبھالا نہیں جا
تا ہم تیز تر عمل کرنے کے قابل نہیں۔ اس کا سبب ہے معاشرے کی بدنظمی اور سیاسی
کا اختلاف۔ تاہم مجھے حالات سے مطلع کرنے کے لیے آپ کے خطوط پر از معلومات
تے ہیں اور مفید بھی۔"[۱]

عبدالمتین چودھری نے ایک دفعہ پھر انھیں لکھا تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت آپ
واپسی کی خواہاں ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے ۲۷ اپریل ۱۹۲۳ء کو تحریر کیا
"ہندوستان بلایا جا رہا ہے مگر کس لیے؟ وہاں کوئی ٹھوس چیز موجود نہیں ہے۔"

بہرحال اپریل ۱۹۲۴ء میں قائدِ اعظم ہندوستان واپس آئے اور آتے ہی سیاست
سرگرمی سے حصہ لینا شروع کر دیا۔ پیارے لال رقم طراز ہیں، "جناح سے، جو دوسری
ل میز کانفرنس کے بعد سیاست سے سبکدوش ہو گئے تھے اور انگلستان میں پریوی کونسل
مقدمات کی پیروی کر رہے تھے مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے ہندوستان واپس آنے کی درخواست کی گئی۔"[۲]

۱۔ مندرجہ بالا خطوط "ایسٹرن ہیرالڈ" سلہٹ۔ مورخہ ۲۸ دسمبر ۱۹۶۳ء سے لیے گئے ہیں۔

۲۔ مہاتما گاندھی، پیارے لال، صفحہ ۷۹۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء۔ نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد۔

اسی مہینے میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ اپنے اختلافات بھول کر مسلم لیگ میں شامل ہو جائیں کیونکہ یہی جماعت مسلم قوم کے حقوق و مفاد کا تحفظ کر سکتی ہے۔ کونسل کے اس اجلاس میں یہ طے ہونا تھا کہ کمیونل (فرقہ دار) ایوارڈ کی بابت کیا موقف اختیار کیا جائے۔ کونسل کی متعلقہ قرار داد میں یہ کہہ کر کہ "جب تک اس کے کسی اور نعم البدل پر مختلف فرقوں اور جماعتوں کا اتفاق نہ ہو جائے" ایوارڈ کو قبول کر لیا گیا۔ قائد اعظم نے مسلمانانِ ہند کے روز افزوں سیاسی شعور کو سراہتے ہوئے اور اس بات کا حوالہ دیتے ہوئے کہ مسلمانوں نے ایوارڈ کے خلاف ناپسندیدگی کا اظہار کیا ہے ایک بیان میں کہا "اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان پر اس ایوارڈ کے تسلط کو کس طرح روکا جائے۔ جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہ ہوں گے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مکمل تعاون اور دوستی کا جذبہ پیدا کرنے سے زیادہ میں کسی اور بات سے خوش نہ ہوں گا ـــــ اس سلسلے میں مجھے پورے ملک کے مسلمانوں کی تائید و حمایت حاصل ہے۔ قومی حکومت خود اختیاری کے قیام کے سلسلے میں مسلمان کسی فرقے سے پیچھے نہیں ہیں۔ لہٰذا اس مسئلے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ کیا ہم مسلمانوں کو پوری طرح یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ جن تحفظات کو وہ اتنی اہمیت دے رہے ہیں وہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں شامل ہوں گے۔"

اصلاحات کے اعلان سے قبل انگریزوں پر دباؤ ڈالنا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک مشترک پلیٹ فارم پر لانے کی غرض سے جناح صاحب نے کچھ ہندو لیڈروں سے بات چیت کی۔ لیکن ان کوششوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ بُری طرح مایوس ہو گئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف جو تلخی موجود ہے اس کے پیش نظر ہندوستان کا مستقبل تاریک ہی رہے گا کیونکہ ہندو انگریزی اقتدار کو مسلمانوں کے مطالبات قبول کرنے کی نسبت ترجیح دیں گے ـــــ

ان حوصلہ شکن حالات سے بددل ہو کر وہ پھر انگلستان چلے گئے۔"

۱۹۳۴ء کے آخر میں مرکزی اسمبلی کے لیے دوبارہ انتخابات ہوئے۔ کانگریس کا بایاں بازو خاصا طاقتور تھا۔ نوجوان مختنی اور سوشلسٹ نظریات کے حامل جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بھوس کانگریسی سیاست میں آگے آگئے تھے۔ گاندھی جی اسمبلی کی ممبری کے بجائے سماجی اور اقتصادی فلاح پر توجہ دے رہے تھے۔ کانگریس افتراق اور انتشار کا شکار تھی۔ اس موقع پر ہندو مہا سبھا ایک طاقتور قوت کی حیثیت سے ابھری اور اس نے اسمبلی کے لیے اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا فیصلہ کیا۔ پنڈت مدن موہن مالویہ اور اینے کمیونل ایوارڈ کے مسئلے پر اختلافات کی بنا پر کانگریس سے الگ ہو گئے اور اسمبلی کے انتخابات کے لیے انھوں نے خود اپنی پارٹی بنانے کا کام شروع کر دیا۔

کمیونل ایوارڈ کے مطابق پست طبقوں کو جداگانہ نمائندگی کا حق دیا گیا تھا۔ اس کے خلاف ۱۹۳۲ء میں گاندھی جی نے مرن برت شروع کیا تھا۔ مرن برت کے پانچویں روز کانگریس اور ہندو لیڈروں نے کمیونل ایوارڈ کے معاملے پر پست اقوام سے مفاہمت کی کوششیں کی تھیں۔ پونا میں ایک کانفرنس طلب کی گئی تھی جس میں کانگریس، ہندو اور اچھوت لیڈروں بالخصوص ڈاکٹر امبیدکر کے درمیان ایک سمجھوتہ ہو گیا تھا جو میثاق پونا کے نام سے مشہور ہے۔ اس سمجھوتے کے تحت اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہو کر چند تحفظات کے ساتھ ہندوؤں کے عام حلقوں سے انتخاب لڑنے کا حق دیا گیا تھا برطانوی حکومت نے میثاق پونا کو منظور کر لیا اور گاندھی نے مرن برت کی دھمکی سے اچھوتوں کو سیاسی طور پر ہندوؤں کا طفیلی بنا لیا۔

ہندوستان کی سیاسی بے چینی میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا۔ ور حکومت عوامی جذبات کی صریحاً خلاف ورزی کرتے ہوئے آرڈیننسوں کے ذریعے کاروبار حکومت چلا رہی تھی۔ چند کانگریسی لیڈروں نے محسوس کیا کہ اسمبلیوں کے بائیکاٹ سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ جون

جوں جوں ۱۹۳۷ء کے عام انتخابات قریب آرہے تھے، وہ شدت کے ساتھ یہ سوچ رہے تھے کہ کانگریس کو اسمبلیوں کے انتخاب میں حصّہ لینا چاہیئے تاکہ عوام دشمن حکومت کا مقابلہ کرسکیں۔ اس مقصد کے پیش نظر کانگریس نے فیصلہ کیا کہ جو کانگریسی اراکین اسمبلیوں کی رکنیت کے حامی ہیں وہ آل انڈیا سوراج پارٹی کی تشکیل کریں اور دو مسائل پر انتخاب لڑیں۔ ایک تو یہ کہ تمام ظالمانہ قوانین منسوخ کیے جائیں اور دوسرے یہ کہ قرطاس ابیض کو مسترد کردیا جائے۔ آخر کار عام انتخابات میں کانگریس پارٹی نے ۴۴ اور کانگریس نیشنلسٹ پارٹی نے ۱۱ نشستیں جیت لیں۔

مسلمان دو گروہوں میں منقسم تھے اور دونوں ایک دوسرے کے مخالف۔ ایک گروپ تھا آل انڈیا مسلم لیگ اور دوسرا آل انڈیا مسلم کانفرنس۔ مسلمانوں کو اس صورتِ حال کے نتائج کا احساس ہُوا اور شملہ میں دونوں تنظیموں کے سرکردہ رہنماؤں کا اجلاس منعقد ہُوا تاکہ مشترکہ طور پر انتخابات میں حصّہ لینے کے لیے ایک پلیٹ فارم بنایا جاسکے۔ چنانچہ مشترکہ انتخابی منشور مرتب کیا گیا جس کے ذریعے ہندوستان بھر کے مسلمانوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ متحد ہوکر جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کریں، سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی ناکافی نمائندگی کے خلاف احتجاج کریں، سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیے جانے کے مطالبے پر زور دیتے رہیں اور بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ قبول کرانے کی جدوجہد کریں۔

مسلمان متحد ہوچکے تھے اور سوال یہ تھا کہ اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا فرض کس کو سونپا جائے۔ اس موقع پر ہندوستان کے اُفق سیاست سے جناح صاحب کی غیر موجودگی کو تمام باشعور مسلمان محسوس کر رہے تھے۔ چند المتین چودھری نے قائداعظم سے ہندوستان واپس آنے اور مسلمانوں کی قیادت کرنے کی درخواست کی تھی، چند دیگر مسلم رہنماؤں نے بھی قائداعظم سے یہی درخواست کی جن میں لیاقت علی خاں بھی شامل تھے۔ لیاقت علی خاں نے اس سلسلے میں لندن جاکر قائداعظم سے بات چیت بھی کی۔ بمبئی میں ان کے حلقہ انتخاب

کے اراکین کی دلی خواہش تھی کہ وہ اسمبلی میں ان کی نمائندگی کریں۔ اس غرض سے ابوبکر بیگ محمد کے مکان پر ممتاز مسلم باشندوں کا ایک جلسہ ہوا اور فیصلہ کیا گیا کہ قائداعظم کی منظوری حاصل کرنے کے لیے انھیں تار بھیجا جائے تاکہ بروقت ان کے کاغذات نامزدگی داخل کیے جا سکیں۔ قائداعظم نے یہ درخواست قبول کر لی۔ ۱۱؍اکتوبر ۱۹۳۴ء کو جب کاغذات نامزدگی کی جانچ پڑتال کی گئی تو معلوم ہوا کہ ان کے سوا کسی اور نے اس حلقۂ انتخاب سے نامزدگی کے کاغذات داخل نہیں کیے۔ اس طرح قائداعظم بلامقابلہ مرکزی اسمبلی کے رکن منتخب قرار دے دیے گئے۔

بیشتر مسلمان منتخب ممبر انڈی پنڈنٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے۔ پارٹی کے ممبروں کی کل تعداد ۲۲ تھی جس میں سے ۱۸ مسلمان تھے۔ قائداعظم کو پارٹی کا لیڈر چن لیا گیا۔ حکومت ہند بڑی مشکل صورت حال سے دوچار تھی کیونکہ اسے زیادہ سے زیادہ ۵۵ ممبروں کی حمایت حاصل تھی۔ ہندوؤں، کانگریس اور کانگریس سوراج پارٹی کو بھی کم و بیش اتنے ہی اراکین کی حمایت حاصل تھی۔ بنابریں ۲۲ اراکین پر مشتمل انڈی پنڈنٹ پارٹی کو نئی اسمبلی میں کلیدی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ایوان میں جو معاملہ زیر غور ہوتا اس کے فیصلہ کا دارومدار اس بات پر تھا کہ انڈی پنڈنٹ پارٹی کیا موقف اختیار کرتی ہے۔

اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا تو حکومت کی طرف سے سر این سرکار نے تحریک پیش کی کہ ہندوستان کے لیے دستوری اصلاحات کی بابت مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ پر غور کیا جائے۔ مختلف پارٹیاں سرگرم عمل ہو گئیں اور گروپوں اور پارٹیوں میں مصالحتی بات چیت شروع ہو گئی۔ کانگریس پارٹی کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی نے تحریک میں کئی ترمیمیں پیش کیں۔ انھوں نے خاص طور سے یہ نکتہ اٹھایا کہ اصلاحات کی سکیم کے مطابق انگریزوں سے اہل ہند کو اقتدار کی منتقلی کے سلسلے میں کوئی حقیقی اقدام نہیں کیا گیا اور اس

کا مقصد محض یہ ہے کہ حکومت اہلِ ہند کے بڑھتے ہوئے شعور اور بیداری کو ختم کرنے کے لیے انھیں تھپکنا چاہتی ہے۔

انڈی پنڈنٹ پارٹی کی جانب سے قائدِ اعظم نے چند ترمیمات پیش کیں جن کا مقصد یہ تھا کہ جب تک ہندوستان کے مختلف فرقے کسی حل پر متفق نہ ہو جائیں اس وقت تک کمیونل ایوارڈ منظور کر لیا جائے۔ ان ترمیمات میں صوبائی حکومت کی اسکیم پر اظہار ناپسندیدگی کیا گیا اور گورنروں کے خصوصی اختیارات اور نظم و نسق کے محکمے کو گورنروں کی راست نگرانی میں دینے اور اس طرح صوبائی اسمبلیوں کو غیر موثر بنانے کی مذمت کی گئی تھی۔ فیڈریشن کے متعلق ترمیم میں کہا گیا تھا "مرکزی حکومت کی سکیم کے بارے میں جسے 'کل ہند وفاق' کا نام دیا گیا ہے۔ اس ایوان کی واضح رائے یہ ہے کہ بنیادی طور پر نامناسب ہے اور برطانوی ہند کے عوام کے لیے ناقابلِ قبول۔ لہٰذا یہ اسمبلی حکومتِ ہند سے سفارش کرتی ہے کہ حکومتِ برطانیہ سے کہا جائے کہ اس سکیم کی بنیاد پر کوئی مسودۂ قانون پیش نہ کیا جائے۔ یہ اسمبلی اس بات پر زور دیتی ہے کہ برطانوی ہند میں حقیقی معنی میں مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کی فوری تدبیریں کی جائیں اور کسی تاخیر کے بغیر ہندوستانی عوام کے صلاح مشورے سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لیے کارروائی کی جائے۔"

جناح صاحب نے یہ ترمیم پیش کرتے وقت واضح کیا کہ میری پارٹی کمیونل ایوارڈ اس لیے قبول کر رہی ہے کہ کوئی دوسرا متفقہ اور متبادل حل موجود نہیں ہے۔ جوں ہی کوئی حل تلاش کر لیا گیا، ہم ایوارڈ کو مسترد کر دیں گے۔ جب تک ہم خود کوئی سکیم مرتب نہ کر لیں، میری خودداری مطمئن نہ ہوگی۔ میری بات کو نظر انداز نہ کیجیے۔ اسے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔"

۷ر فروری ۱۹۳۵ء کو مرکزی اسمبلی میں اپنی پیش کردہ ترمیمات پر تقریر کرتے ہوئے

جناح صاحب نے کہا "مجھے گول میز کانفرنس کی آخری نشستوں میں مدعو نہیں کیا گیا تھا کیونکہ میں (وفاقی) اسکیم کا سخت ترین مخالف تھا" اس امر کی وضاحت کرتے ہوئے کہ کانگریس جس سکیم کو قبول کرنے پر آمادہ تھی وہ ان کے لیے کیوں قابلِ قبول نہیں ہے۔ انھوں نے فرمایا "اگر ہوم ممبر یا حکومت کی مصلحت ہوتی ہے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ کانگریس پورے ہندوستان کی نمائندہ ہے اور اگر ان کی مصلحت نہیں ہوتی تو اسے باغی اور ملک کی محض اقلیت قرار دے دیا جاتا ہے بھلا میں کس شمار و قطار میں ہوں!" ہندوستان کے جو نمائندے مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کے حق میں تھے۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا کہ جن ہندوستانی باشندوں کو مشترکہ پارلیمانی کمیٹی میں شامل کیا گیا تھا میں ان میں سے کسی کے حُبِ وطن کو چیلنج نہیں کرتا۔ میں ان اصحاب کی عزت کرتا ہوں خواہ ان سے مجھے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو۔ انھوں نے اپنی سی کوشش کر لی ہے۔" اپنی تقریر کے اختتام پر انھوں نے کانگریس سے مخلصانہ اپیل کی کہ صوبائی سکیم میں ردوبدل کیا جائے۔ مرکزی حکومت کے سلسلے میں جو اسکیم پیشِ نظر ہے اسے منسوخ کر دیا جائے اور برطانوی ہند میں مکمل ذمہ دار حکومت کے قیام کے لیے مسلمانانِ ہند کے صلاح مشورے سے صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے۔"

بحث کے اوّل روز ہی سے کانگریس اور انڈی پنڈنٹ پارٹی (جس کے بیشتر اراکین مسلمان تھے) کے اختلافات منظرِ عام پر آگئے۔ جناح صاحب نے ان مذاکرات میں انتہائی تدبر اور پارلیمانی مہارت سے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کی نمائندگی کی۔ اسمبلی کی ہر رائے شماری میں کانگریس کو شکست ہو گئی۔ جناح صاحب نے مطالبہ کیا کہ ان کی پیش کردہ تینوں ترمیموں پر علیحدہ علیحدہ رائے شماری کرائی جائے۔ ایوان نے اسے قبول کر لیا اور تینوں ترمیمیں منظور ہو گئیں۔ اس طرح مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے ایک اہم موڑ پر جناح صاحب کو زبردست ذاتی فتح حاصل ہوئی۔ اس بحث میں انھوں نے ثابت

کر دیا کہ مسلمان ایک مضبوط چٹان کی طرح مسلم لیگ کے ساتھ ہیں اور کانگریس کو اپنے جائز مطالبات کا مخالف سمجھتے ہیں۔

اسمبلی نے کمیونل ایوارڈ کے متعلق جناح صاحب کی پیش کردہ ترمیمات منظور کر لیں۔ اسی موضوع پر کانگریس کی ترمیم منظور نہ ہو سکی۔ قائد اعظم کی پیش کردہ ترمیم کی دوسری اور تیسری دفعہ پر شق وار رائے شماری کرائی گئی۔ اس کے حق میں ۶۸ اور مخالفت میں ۱۵ ووٹ آئے۔ امور قانون کے نگران رکن (لا ممبر) سر سرکار نے آخری دو پیراگرافوں پر تقریر کرتے ہوئے کہا "جناب والا میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ میرے دوست مسٹر ڈیسائی نے موضوع کو دیانت داری کے ساتھ براہ راست ہدف تنقید بنایا۔ اس کے برعکس مسٹر محمد علی جناح نے اس پر دو رُخی اور بالواسطہ تنقید کی۔ فرق صرف طریقہ کار کا ہے ورنہ مقصد دونوں صاحبان کا ایک ہی ہے۔ میرے دوست مسٹر جناح بخوبی جانتے ہیں کہ بظاہر اغراض معاملہ زیر غور کے خلاف تھے پر ہے تاہم حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح اور کانگریسی لیڈروں کی پیش کردہ ترمیموں میں کوئی فرق نہیں ہے۔"

اب کانگریس کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمانوں سے مفاہمت کس قدر اہمیت رکھتی ہے، کیونکہ گول میز کانفرنس کے مذاکرات اور اسمبلی کے مباحث سے کانگریسی اراکین کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے نقطہ نظر کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کانگریس کے صدر بابو راجندر پرشاد نے قائد اعظم سے گفت و شنید شروع کی تاکہ ایک ایسی سکیم مرتب کی جا سکے جو کانگریس اور لیگ دونوں کے لیے قابل قبول ہو۔ جنوری، فروری ۱۹۳۵ء میں دونوں رہنماؤں کے درمیان اتحاد کے لیے بات چیت ہوئی۔ دونوں رہنما اور ان کے بیشتر احباب دل سے اس اتحاد کے خواہاں تھے لیکن بنگال اور پنجاب کے ہندوؤں نے جن کو سکھوں کی تائید حاصل تھی، اپنے مفاد کو خطرے میں دیکھ کر اتحاد کی اس بات چیت کو ناکام بنا دیا اور اس طرح دونوں تنظیمیں ایک دوسرے سے اور دور ہو گئیں۔ اس ناکامی پر ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیہ نے

ان الفاظ میں تبصرہ کیا "اس سے ملک کو بڑی مایوسی ہوئی"

اسمبلی میں جناح صاحب کامیاب ہو گئے تھے مگر ایوان سے باہر انھیں مخالف اخبارات کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ اخبار کانگریس کے پُرجوش حامی تھے اور بعض مسلمانوں نے بھی اس اندیشے کا اظہار کیا تھا کہ اسمبلی میں کمیونل ایوارڈ پر بحث میں مسٹر جناح نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ دانشمندانہ نہیں ہے۔ دہلی کے ایک جلسہ عام میں جناح صاحب نے اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میں ہندو مسلم اتحاد کا علمبردار ہوں اور اس مقصد کے حصول کے لیے مسلسل خدمات انجام دیتا رہا ہوں ——— "یقین کیجیے اگر ہندو اور مسلمان متحد ہو جائیں تو ملک کی آزادی کی آدھی جنگ جیتی جا سکتی ہے۔ جب تک ہندو اور مسلمان متحد نہ ہوں گے ہندوستان کی آزادی کی کوئی امید نہیں ہے۔ دونوں قومیں بدستور غیر ملکی حکمرانوں کی غلام رہیں گی" ایک دوسرے موقع پر بمبئی میں ایک جلسے سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ مجھے یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ کچھ کانگریسی اصحاب مسلمانوں کی حب الوطنی پر شک کرتے ہیں مگر میں انھیں یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ حقیقت کا منہ چڑانے کے مترادف ہے۔ "ہندو مہا سبھا نے مسلمانوں اور کانگریس کو مشکل میں ڈال دیا ہے" انھوں نے کہا کہ ہندوؤں کو اپنی ذہنیت تبدیل کرنی ہوگی۔ جب یہ عظیم ملک آزاد ہوگا تو کیا ہم ہندوؤں کے محکوم نہیں ہوں گے؟ ——— اس ملک میں ہندوؤں کی حکومت نہیں بلکہ ہندوستانی حکومت قائم ہوگی جس میں مسلمانوں کو نہ صرف اپنا منصفانہ اور جائز حصہ ملے گا بلکہ انھیں ہندوؤں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔" کانگریسی اخبار بدستور ان کے خلاف شرانگیزی اور افترا پردازی کی مہم میں مصروف رہے اور انھیں ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا دشمن قرار دیتے رہے۔ اپریل ۱۹۳۵ء کی آخری تاریخوں میں قائداعظم پریوی کونسل میں مقدمات کی پیروی کی غرض سے دوبارہ اطالوی جہاز کانتے وردے سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

جناح صاحب انگلستان میں تھے کہ حکومت برطانیہ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کو قانونی درجہ دے دیا اور ۲ جولائی ۱۹۳۵ء کو اس کو شاہی منظوری حاصل ہو گئی۔ جناح صاحب کی نظر میں یہ عوام دشمن قانون ہندوستان کی جدوجہد آزادی کے حق میں سخت مضر تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ برطانیہ کی قدامت پسند حکومت نے جس میں سر سموئیل ہور وزیر ہند تھے، تیسری گول میز کانفرنس میں جن ہندوستانی لیڈروں کو مدعو کیا تھا ان میں قائداعظم کا نام شامل نہ تھا۔ سر چمن لال سیتل واد نے اس کا سبب یہ بیان کیا ہے، "جناح کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت اس لیے نہ دی گئی کہ حکومت کو معلوم تھا کہ وہ اوروں کی طرح شاستری، ر چنتامنی اور میں حکومت کے سامنے نہیں جھکیں گے"۔[1]

قائداعظم نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا مطالعہ کیا تو پتہ چلا کہ آغا خان کی سرکردگی میں برطانوی ہند کے وفد نے جو مشترکہ یادداشت پیش کی تھی، برطانوی حکومت نے اسے قطعاً نظر انداز کر دیا ہے۔ یادداشت کے مطابق مجوزہ قانون کے دیباچے میں یہ دفعہ شامل ہونی چاہیے تھی کہ ہندوستان کے سیاسی دستور کا مقصد ملک کو مکمل ڈومینین کا درجہ دینا ہے۔ انگریز اہل ہند کی امنگوں اور خواہشات کو کچلنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ چنانچہ کہا گیا کہ اس مقصد کے لیے ۱۹۱۹ء کے قانون کے مقاصد کافی ہیں۔ برطانوی پارلیمنٹ نے ۱۹۱۹ء کا ایکٹ منسوخ کرتے مگر اس کے مقاصد بحال رکھنے کی عجیب و غریب کارروائی کر کے ۱۹۳۵ء کے قانون کے مقاصد متعین کرنے کی دستوری ضرورت کو نظر انداز کر دیا۔ اس قانون میں ہندوستان کے مفاد کے خلاف دیگر امور کے علاوہ ایسی دفعات بھی تھیں جن سے ہندوستان میں انگریزوں کے تاجرانہ

---

[1] ریکلیکشنز اینڈ ریفلکشنز۔ سر چمن لال سیتل واد، صفحہ ۲۸۳ مطبوعہ ۱۹۴۶ء

مفادات کا مناسب و معقول تحفظ موجود تھا اور اس سلسلے میں ہندوستان کی اسمبلیوں کو ایسا کوئی قانون منظور کرنے کے حق سے محروم کر دیا گیا تھا جس سے برطانیہ کے تجارتی مفاد کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔

یہ تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے محتاط انداز میں قرطاس ابیض کا جائزہ لینے کے بعد اسے مکمل طور پر مسترد کر دیا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے کمیونل ایوارڈ کی شدید مذمت کی اور واضح انداز میں اس پر غم و غصے کا اظہار کیا۔ متعلقہ قرارداد میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس قرطاس ابیض کا واحد نعم البدل یہ ہے کہ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر منتخب اسمبلی ایک دستور مرتب کرے۔۔۔۔ قرطاس ابیض کی میعاد پوری ہوتے ہی کمیونل ایوارڈ کی میعاد بھی خود بخود ختم ہو جائے گی۔" مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ شائع ہوئی تو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اسے قرطاس ابیض کی تجاویز سے بھی بدتر قرار دیا۔

قائداعظم ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۳۵ء کو انگلستان سے بمبئی واپس پہنچے اور انھوں نے اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا: "گورنمنٹ آف انڈیا بل اب قانون بن گیا ہے اور ہم سب کو علم ہے کہ یہ دستور ہندوستان پر مسلط کیا گیا ہے۔ اس موقع پر مختلف لیڈروں کا فرض ہے کہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور دستور کے سلسلے میں واضح اور مشترک پالیسی تیار کریں۔" ہندوستانی سیاسیات کو انھوں نے جس مقام سے چھوڑا تھا۔ وہیں سے پھر کوششیں شروع کر دیں اور مسلم رہنماؤں اور دیگر افراد سے فوراً رابطہ قائم کیا۔ وہ حسب معمول پورے جوش و خروش سے مرکزی اسمبلی کے رکن کی حیثیت سے دوبارہ اپنے فرائض انجام دینے لگے اور جب بھی موقع ملتا سرکاری پالیسیوں پر اعتراض اور نکتہ چینی میں پیش پیش نظر آتے۔ کینیڈا میں اوٹاوا کے مقام پر شاہی ترجیحات کانفرنس منعقد ہونے والی تھی۔ کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی کا فرض ایک

غیر سرکاری وفد کو انجام دینا تھا۔ قائداعظم کو اندیشہ تھا کہ اوٹاوا سمجھوتے سے ہندوستان کے تجارتی اور اقتصادی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ بنابریں انھوں نے ہندوستان کو یہ سمجھوتہ قبول کر لینے پر مجبور کرنے کی بابت حکومت برطانیہ کی شدید مذمت کی۔

دریں اثنا لاہور میں چند ایسے واقعات رُو نما ہوئے جن سے انتہائی افسوسناک فرقہ وارانہ صورتِ حال پیدا ہو گئی اور مسلمانوں اور سکھوں کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف منافرت اور کدورت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ لاہور کی ایک مسجد شہید گنج سکھوں کے قبضے میں تھی اور مسلمان اس مسجد کو سکھوں سے واپس لینا چاہتے تھے۔ فرقہ وارانہ جذبات شباب پر تھے اور صورتِ حال انتہائی افسوسناک اور خطرناک رُخ اختیار کر رہی تھی۔ جناح صاحب دونوں فرقوں میں صلح صفائی کرانے کی غرض سے فوراً لاہور پہنچے۔ انھوں نے مسلمانوں کو خبردار کیا کیا ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے نفاذ کے بعد مسلمانوں کو بہر طور متحد رہنا چاہیئے اور اپنی تمام تر توجہ سیاسی مسائل پر مرکوز کر دینی چاہیئے۔ انھوں نے مسلمانوں کے جذبات سے اظہار ہمدردی کیا۔ انھیں بخوبی احساس تھا کہ مسجد شہید گنج کے معاملے میں مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر سول نافرمانی کی تحریک کیوں شروع کی تھی۔

جناح صاحب نے حکومت اور سکھوں سے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے گفتگو کی۔ ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ مسجد شہید گنج کے ایجی ٹیشن کے سلسلے میں جن لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے انھیں رہا کر دیا جائے تاکہ معقول و مناسب بنیاد پر مصالحت ہو سکے۔ حکومت اس بات پر راضی ہو گئی کہ ان لوگوں کے سوا جو تشدد کے مجرم تھے دیگر قیدیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ مسلم اخبارات کے خلاف جو کارروائی کی گئی تھی وہ بھی منسوخ ہونے والی تھی اس طرح مذاکرات کے لیے سازگار فضا پیدا ہو گئی۔ اس پر مسلمانوں نے تحریک سول نافرمانی ختم کر دی اور صوبے میں حالات معمول پر آنے لگے۔

اس مصالحتی فضا کے سلسلے میں جناح صاحب نے کہا "میں ذاتی طور پر حکومت اور گورنر پنجاب کا شکر گزار ہوں کہ مجھے ہر قسم کی امداد فراہم کی گئی"۔ بادشاہی مسجد میں مسلمانوں کے ایک زبردست اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔ "اگرچہ ہم شہید گنج کے سلسلے میں اپنے حق سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تاہم ہم اپنے برادر فرقہ (سکھوں) سے آبرومندانہ سمجھوتا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے اور آئینی اور پُرامن طریقوں سے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں گے"۔ اس کے بعد شہید گنج مصالحتی کمیٹی بنائی گئی جس میں تینوں فرقوں کے نمائندے شامل تھے۔ جناح صاحب ۷ مارچ ۱۹۳۶ء کو مرکزی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور سے روانہ ہو گئے۔ روانگی کے وقت انھوں نے ایک بیان میں دونوں فرقوں سے پھر اپیل کی کہ صوبے میں امن و امان برقرار رکھیں۔ انھوں نے کہا "یہ دو افراد کا نہیں بلکہ دو عظیم فرقوں کا تنازعہ ہے۔ اور لوگوں کی خواہش اور مرضی معلوم کرنے کے لیے کچھ وقت لگے گا"۔ اس مصالحتی کمیٹی میں مسلمانوں کے نمائندوں کی حیثیت سے علامہ اقبال اور نواب احمد یار خاں دولتانہ شامل تھے۔ مصالحتی کمیٹی کے تقرر کے وقت پنجاب کے گورنر نے اعتراف کیا کہ "صورتِ حال کو بہتر بنانے میں مسٹر جناح نے جو نمایاں خدمات انجام دی ہیں میں اس پر ان کا شکر گزار ہوں۔ انھوں نے جو کام کیا ہے اور جو کام کر رہے ہیں، اس پر میں ان کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں"۔

کانگریس کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ، مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت اسے اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لینا چاہیے یا نہیں، جب کہ وہ کمیونل ایوارڈ کو پہلے ہی مسترد کر چکی ہے۔ کانگریس عرصے تک اس معاملے میں ڈانواڈول رہی۔ بالآخر وہ اسمبلیوں کے انتخابات لڑنے پر آمادہ نظر آنے لگی۔ جناح صاحب پر یہ ذمہ داری تھی کہ مسلمانوں کی جانب سے اس سلسلے میں کسی موقف کا اظہار کریں۔ وہ

پہلے ہی مجوزہ فیڈریشن کے خلاف اپنے بے لاگ تاثرات بیان کر چکے تھے۔ انھوں نے اس ایکٹ کے چند دیگر پہلوؤں پر بھی نکتہ چینی کی تھی۔ انھوں نے کہا "حکومت نے یہ اصلاحات تمام فریقوں کی مرضی کے خلاف مرتب کی ہیں، کیونکہ اہل ہند متحد نہیں ہیں اور وہ اپنے داخلی تنازعے حل نہیں کر سکتے ہیں" اگرچہ اب وقت نہ تھا تاہم انھوں نے تمام سیاسی پارٹیوں سے پھر اپیل کی کہ آپس کے جھگڑے طے کر کے متفقہ طور پر ایک سکیم تیار کرنے کی کوشش کریں جسے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بجائے نافذ کیا جا سکے۔ انھوں نے کہا "کوئی دستور مستقل حیثیت نہیں رکھتا، قانون انسان کی تیار کردہ دستاویز ہے، دستور نے انسان نہیں بنائے ـــــ جب تک ہم اس قانون کے بجائے ایک مناسب اور صحیح دستور نافذ نہ کر لیں، ہم اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے" انھوں نے مسلمانوں پر زور دیا کہ اگر وہ دوسرے فرقوں کی نظروں میں عزت و وقار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو انھیں متحد ہو جانا چاہیے۔ "اپنے آپ کو منظم کیجیے اور اپنا کردار ادا کیجیے طعن و تشنیع کی فکر نہ کیجیے، میں آٹھ کروڑ عوام کے ساتھ ہوں ـــــ"

بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا تو جناح صاحب نے ایک قرارداد پیش کی جس میں ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کو ہندوستان پر مسلط کیے جانے کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ تاہم قرارداد میں مسلمانوں پر زور دیا گیا تھا کہ اس سکیم میں صوبوں کے متعلق جو حصہ ہے اس کو غنیمت جان کر منظور کر لیں۔ قرارداد میں ایکٹ کے تحت فیڈریشن سے تعلق رکھنے والے حصے کی مذمت کی گئی تھی۔ قرارداد ان الفاظ پر ختم ہوتی تھی۔ "لیگ کا خیال ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نئے اجلاس کے افتتاح سے قبل مرکزی حکومت کی سکیم پر اب بھی غور کر سکتی ہے۔ اسے صورت حال کا از سر نو جائزہ لینا چاہیے۔ بصورت دیگر مسلم لیگ کو یقین ہے کہ موجودہ سکیم سے امن قائم نہ ہو گا اور لوگ مطمئن نہ ہوں گے۔ اس کے برعکس اگر یہ سکیم اہل ہند پر مسلط کی گئی تو تباہ کن نتائج برآمد ہوں گے۔

کیونکہ یہ ہندوستان اور اہل ہند کے مفاد کے سرتاسر خلاف ہے"۔

جناح صاحب نے قرارداد پیش کرتے ہوئے حکومت خود اختیاری کے قیام کے سلسلے میں گزشتہ بیس سال کی جدوجہد کا حوالہ دیا اور کہا کہ اس جدوجہد کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ جیسے عوام دشمن قوانین نافذ کیے جا رہے ہیں جس میں ہندوستان کو صرف دو فی صدی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور ۹۸ فیصد ذمہ داری گورنر جنرل کے اختیارات خصوصی اور تحفظات کے پردے میں حکومت ہی کے ہاتھ میں رہے گی۔ انھوں نے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ یہ دستور اتنا مفلوج ہے کہ اس کے تحت ایوان زیریں میں کوئی مفید قانون اصلاحات کا کوئی متوازن پروگرام بھی منظور نہیں ہو سکتا۔ ایوان بالا میں پوزیشن اس سے بھی بدتر ہے۔ تاہم انھوں نے ملک کی سیاسی جماعتوں کو اس خرابی کا ذمہ دار ٹھہرایا اور کہا کہ یہ سیاسی جماعتیں بلیوں کی طرح لڑنے جھگڑنے کے بعد ایک چالاک بندر (انگریزوں) کے پاس گئیں تاکہ وہ ان کے درمیان ثالثی کرے۔ یہ دستور ایک فریب ہے اور ہندوستان کے وقار کے منافی۔ لیکن ان حالات میں مسلمان کیا کر سکتے ہیں؟ اگر مجھے یہ دستور قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو میں صدائے احتجاج بلند کرنے کے بعد اسے قبول کر لوں گا۔ میں یہ سوچوں گا کہ میں اسے کس طرح استعمال کر سکتا ہوں۔ جرمنوں کو جب معاہدہ ورسیلز پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا تو انھوں نے دستخط کر دیے۔ اگر مجھے بھی اس دستور کے ساتھ وہی سلوک کرنا پڑا جو جرمنوں نے معاہدہ ورسیلز کے ساتھ کیا تھا تو میں اس کے پرزے پرزے کر دوں گا اور ہم اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے تب تک کہ اس کی جگہ کوئی قابل قبول دستور نافذ نہ کیا جائے۔

اس سلسلے میں کانگریس کے رویے پر نکتہ چینی کرتے ہوئے جناح صاحب نے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے جیسے کانگریس مسلمانوں سے کہہ رہی ہو۔ اگر آپ ہمارا ساتھ دینا چاہتے ہیں تو خوشی دے سکتے ہیں ورنہ آپ چاہیں تو اس تعاون کی بھی ضرورت نہیں۔

ہم غیر جانب دار رہیں گے اور ہم اپنی منزلِ مقصود کی جانب قدم بڑھاتے رہیں گے، لیکن کانگریس کو اس وقت تک اپنے مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوگی جب تک وہ مسلمانوں سے تعاون کی درخواست نہ کرے۔"

اس اجلاس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے جناح صاحب کو مرکزی الیکشن بورڈ مقرر کرنے اور صوبائی بورڈوں سے الحاق کا اختیار دیا گیا۔ یہ قرارداد راجہ غضنفر علی خاں نے پیش کی اور اس میں مسلمانوں پر زور دیا گیا کہ وہ ایک پارٹی کی حیثیت سے خود کو منظم کریں جس کے پیش نظر ایک ترقی پذیر سیاسی پروگرام ہونا چاہیے۔ اس قرارداد کے ذریعے مسلمانوں نے پہلی مرتبہ ایک منظم جماعت کی حیثیت سے انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

اپریل ۱۹۳۶ء میں لارڈ لنلتھگو ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے، ہندوستان پہنچتے ہی انھوں نے ایک بیان میں اہلِ ہند پر زور دیا کہ نئے دستور پر عملدرآمد کر کے دیکھیں کیونکہ اس کے ذریعے تمام سیاسی جماعتوں کو یہ موقع فراہم کیا گیا ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسی ترقی کے لیے کام کریں۔

قائداعظم نے وائسرائے کے بیان کا انتہائی مدلل و مبسوط جواب دیا ــــ وائسرائے نے سیاسی جماعتوں کی سرگرمیوں کی آڑ میں قانون شکنی کے روز افزوں رجحان کو ختم کرنے کی غرض سے ضابطۂ فوجداری میں ترمیم کا جو جواز پیش کیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا۔ "وائسرائے کو ان اسباب و علل پر توجہ دینی چاہیئے جن سے نقضِ امن پیدا ہوتا ہے اور یہ فرض نہیں کر لینا چاہیئے کہ اچانک ہندوستان کے عوام کی بہت بڑی تعداد مجرم بن گئی ہے۔ اس لیے عام عدالتی طریقۂ کار کو نظرانداز کر کے عوام دشمن کارروائیوں، انتظامیہ کے احکام، اور مقدمے کے بغیر نظربندی کے ذریعے اس سے نمٹا جائے۔" ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مطابق صوبائی اور وفاقی سکیموں پر وائسرائے کی منظوری کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا: "مجھے یقین ہے کہ ہز ایکسیلنسی کو یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ نام نہاد صوبائی

خود مختاری عوام کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے اور رائے عامہ کے ہر طبقے نے کُل ہند
فاق کی مذمت اور مخالفت کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ نے یہ
ستور ہندوستان پر مسلط کیا ہے اور اس لیے ہمیں لازم ہے کہ ہم اسے منظور کر لیں۔ ہندوستان
ے تعاون کے متعلق وائسرائے کی اپیل کے جواب میں انھوں نے کہا: "مجھے امید ہے ہز ایکسیلنسی
عاون اور خیر سگالی کے عام معنی نہ لیں گے جس کا مطلب ہے سر تسلیم خم کیجیے اور ہمارے
کم پر عمل کیجیے۔"

مسلم لیگ نے صرف اس وقت تک کے لیے کمیونل ایوارڈ کی حمایت کی تھی جب
ے اس کے بجائے کسی اور مسودۂ قانون پر تمام فرقوں کے مابین اتفاق رائے نہ ہو جائے
م نے صوبائی حکومتوں اور وفاق سے متعلق سکیموں پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔
دو اخباروں نے مسلم لیگ پر کیچڑ اچھالنا شروع کر دی۔ ان اخباروں نے خاص طور سے
اح صاحب کو نشانہ بنایا۔ ———— ان پر الزام لگایا گیا کہ ل ہند کے اتحاد کو
ہ پارہ کرنے کے ذمہ دار وہ خود ہیں۔ اس موقع پر قائد اعظم نے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے
قف سے آگاہ کرنے اور انتخابات کے لیے لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کر کے قوم کو ایک
چم کے تحت منظم کرنے کی غرض سے ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کیا۔ ایسا محسوس
تا تھا جیسے مسلمان ایک غیر متجانس ہستی ہیں کیونکہ ہر علاقے کے مسلمانوں نے مختلف موقف
ختیار کر رکھا تھا اور ان میں سے اکثر کانگریس اور ہندوؤں کے ہاتھوں میں کھیل رہے
تھے۔ پنجاب میں مسلمانوں کے لیڈر سر فضل حسین نے ہندوؤں سے مل کر یونینسٹ پارٹی بنائی تو
ندھ میں بہت سے مسلمان سر عبداللہ ہارون کی قیادت میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی میں شامل
و گئے۔ بنگالی مسلمانوں کی اکثریت بھی کرشک پرجا پارٹی کے ساتھ تھی جس کے ممبر ہندو
سلمان دونوں تھے۔ سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کھُل کر قائد اعظم
ور مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ البتہ مسلمانوں کے اقلیتی صوبوں میں مسلم لیگ کے حامی موجود تھے۔

اس ضمن میں یوپی اور بمبئی خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

جناح صاحب نے مسلم لیگ پارٹی کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کے لیے انتخابی مشینری قائم کر کے پنجاب میں اس کا پہلا تجربہ کیا۔ جون ۱۹۳۶ء میں انھوں نے بمقام لاہور پارلیمانی بورڈ کے اجلاس کی صدارت کی۔ پنجاب آنے سے پہلے قائداعظم کو علامہ اقبال نے کئی حوصلہ افزا خطوط تحریر کیے تھے۔ علامہ نے ۲۳ مئی ۱۹۳۶ء کو قائدِ عظم کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا تھا: مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ آپ کا کام آگے بڑھ رہا ہے۔ مجھے امید ہے کہ پنجاب کی پارٹیاں —— بالخصوص احرار اور اتحادِ ملت پارٹیاں —— یقیناً تھوڑے ردوقدح کے بعد آپ سے تعاون کرنے لگیں گی۔" ۹ جون کو علامہ اقبال نے ایک اور مکتوب تحریر کیا جس میں آپ نے لکھا تھا: "اس کو (مسلم لیگ کو) ہندوستان کے مسلمانوں کو خبردار کر دینا چاہیئے کہ اگر موجودہ سکیم قبول نہ کی گئی تو مسلمان گزشتہ پندرہ سال میں حاصل کردہ تمام حقوق و مراعات سے محروم ہو جائیں گے۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت کی مسلم سیاسیات کے دو بطلِ عظیم یعنی قائدِ اعظم اور شاعرِ پاکستان علامہ اقبال بخوبی یہ اندازہ کر چکے تھے کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے بارے میں مسلمانانِ ہند کو کیا موقف اختیار کرنا چاہیئے۔ اسی مکتوب میں علامہ اقبال نے قائداعظم کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ نئی اصلاحات کے متعلق پنجاب میں آپ جو بیان دیں اس میں درج ذیل امور ضرور شامل ہونا چاہئیں:۔

۱۔ مرکزی اسمبلی کے بالواسطہ انتخاب سے یہ انتہائی ضروری ہو گیا ہے کہ صوبائی اسمبلیوں کے مسلمان اراکین ایک کُل ہند مسلم پالیسی اور پروگرام کے پابند ہوں تاکہ وہ مرکزی اسمبلی میں صرف ایسے مسلمان اراکین کو بھیج سکیں جو ہندوستان کی دوسری عظیم قوم کی حیثیت سے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کی حمایت کرنے کا عہد کریں۔ آج جو لوگ صوبائی پالیسیوں اور پروگراموں کی حمایت کر رہے ہیں، ان ہی لوگوں کو دستور کے تحت مرکزی

اسمبلی کے لیے بالواسطہ طریقۂ انتخاب منظور کرانے کے لیے آگے بڑھایا گیا تھا کیونکہ یہ بات غیر ملکی حکومت کے مفاد میں تھی۔ اب جب کہ قوم انتخاب کے لیے کل ہند سلیم (ایک سکیم) کی تجویز پیش کر کے اس بدقسمتی (بالواسطہ انتخاب) سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے تو یہی افراد ایک مرتبہ پھر غیر ملکی حکومت کی شہ پر آگے بڑھے ہیں اور قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

۴۔ شہید گنج سے پیدا شدہ قانونِ اوقاف، تہذیب، زبان، مساجد اور قانونِ شریعت۔

اجلاس کے بعد پارلیمانی بورڈ نے لاہور میں ایک بیان جاری کیا جس میں انتخابات سے متعلق پروگرام پیش کیا گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے اسمبلیوں کے نمائندوں کی ذمہ داریوں کی صراحت کی گئی تھی اور اس بات کی پوری پوری وضاحت کر دی گئی تھی کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی نسبت مسلم لیگ کا موقف کیا ہے۔ بورڈ کے اجلاس کے بعد جناح صاحب نے دوبارہ ہندوستان کا دورہ شروع کیا۔ وہ مسلمانانِ ہند کو لیگ کے پرچم تلے منظم کرتے رہے اور علامہ اقبال برابر انھیں پنجاب کی صورت حال سے آگاہ کرتے رہے۔ دونوں رہنماؤں کی خط و کتابت بعض اہم احوال و مسائل پر تبادلۂ خیال کا وسیلہ بھی ثابت ہوئی۔ ۲۵ مئی کو علامہ اقبال نے جناح صاحب کے نام ایک مکتوب میں تحریر فرمایا: "سر سکندر حیات ایک دو روز ہوئے لاہور سے باہر گئے ہیں۔ میرا خیال ہے وہ آپ سے بمبئی میں ملاقات کریں گے اور چند اہم معاملوں پر گفتگو کریں گے۔ کل شام دولتانہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ انھوں نے کہا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان مندرجہ ذیل اعلان کرنے کو تیار ہیں۔

"کل ہند اقلیت کے طور پر مسلمانوں سے متعلق تمام معاملوں میں وہ لیگ کے فیصلوں کے پابند رہیں گے اور صوبائی اسمبلی میں غیر مسلم گروپ سے کوئی معاہدہ نہ کریں گے۔

بشرطیکہ مسلم لیگ (صوبائی) مندرجہ ذیل اعلان کرے کہ:
لیگ کے ٹکٹ پر اسمبلی کے منتخب ممبر اس پارٹی یا گروپ سے تعاون کریں گے
جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔
"براہ کرم مجھے اس سلسلے میں اپنی رائے سے جلد از جلد مطلع کیجیے۔ نیز سر سکندر حیات سے اپنی گفتگو کے نتائج سے بھی باخبر کیجیے۔ اگر آپ انھیں قائل کر سکے تو شاید وہ ہمارے ساتھ ہو جائیں" علامہ اقبال یہ کوشش کر رہے تھے کہ سر سکندر حیات پنجاب کے لیڈروں کو مسلم لیگ کی غیر مشروط حمایت کرنے کی اجازت دے دیں۔ یوں نظر آتا تھا کہ وہ مشکلات سے دوچار ہیں کیونکہ یونینسٹ اپنی پارٹی ختم کرنے اور مسلم لیگ میں شامل ہونے پر آمادہ نہ تھے۔ ۲۳ اگست ۱۹۳۶ء کو علامہ اقبال نے قائد اعظم کو لکھا "مجھے امید ہے کہ آپ کو بیراحظ ملاہو گا پنجاب پارلیمانی بورڈ اور یونینسٹ پارٹی میں مفاہمت کی بات چیت ہو رہی ہے۔ کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ آپ مصالحت کے بارے میں مجھے اپنے خیالات سے آگاہ کریں اور مصالحت کی شرائط تجویز فرمائیں۔ اخباروں میں یہ خبر چھپی ہے کہ آپ نے بنگال پرجا پارٹی اور پارلیمانی بورڈ میں مصالحت کرادی ہے۔ میں اس مصالحت کی شرائط سے آگاہ ہونا چاہتا ہوں۔ چونکہ پرجا پارٹی یونینسٹ پارٹی کی طرح فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے کہ اس لیے ممکن ہے کہ بنگال کا سمجھوتہ آپ کے لیے مفید ہو۔"

جناح صاحب جس وقت ہندوستان کے طول و عرض کا دورہ کر رہے تھے، علامہ اقبال نے اپنی تمام تر توجہ پنجاب کے مسلمانوں پر مرتکز کر رکھی تھی تاکہ کم از کم اکثریتی صوبوں کے مسلمان بھی مضبوط طریقے پر لیگ کی حمایت کریں۔ ۱۹۳۷ء کے آغاز میں علامہ اقبال کی آنکھ میں تکلیف ہو گئی۔ اس کے باوجود وہ برابر جناح صاحب کو خطوط لکھتے اور انھیں اپنے خیالات سے آگاہ کرتے رہے۔ ۲۰ مارچ ۱۹۳۷ء کو انھوں نے لکھا: "میں اپنے ایک دوست سے یہ خط تحریر کرا رہا ہوں کیونکہ میری بینائی کمزور ہو گئی ہے۔" شاعر پاکستان

خرابیٔ صحت کے باوجود مسلم قوم کے اتحاد کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس مکتوب میں
انھوں نے لکھا تھا کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کی وہ تقریر پڑھ لی ہو گی جو آل انڈیا
نیشنل کنونشن کے موقع پر کی گئی ہے اور جہاں تک مسلمانانِ ہند کا تعلق ہے، آپ اس
تقریر کے بین السطور سے بھی باخبر ہو گئے ہوں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے
بھی بخوبی واقف ہوں گے کہ نئے دستور سے مسلمانوں کو اپنی تنظیم کرنے کا ایک نادر موقع
دستیاب ہوا ہے تاکہ ہندوستان اور مسلم ایشیا کے آئندہ سیاسی حالات میں وہ ایک وحدت
کی حیثیت سے اپنا کردار ادا کر سکیں۔ اگرچہ ہم ملک کی دیگر ترقی پسند پارٹیوں سے تعاون
کے لیے تیار ہیں۔ تاہم ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایشیا میں ایک
سیاسی و اخلاقی قوت کی حیثیت سے اسلام کا تمام مستقبل ہندوستانی مسلمانوں کی ایک
مستقل تنظیم سے وابستہ ہے۔ لہٰذا میری تجویز ہے کہ آل انڈیا نیشنل کنونشن کو مدلل جواب
دیا جائے۔ آپ کسی تاخیر کے بغیر دہلی میں آل انڈیا مسلم کنونشن طلب کریں جس میں صوبائی
اسمبلیوں کے نئے ممبروں اور دیگر ممتاز مسلم رہنماؤں کو مدعو کیا جائے۔ اس کنونشن میں آپ
وضاحت کے ساتھ ملک کی ایک نمایاں سیاسی اکائی کی حیثیت سے مسلمانانِ ہند کے سیاسی
مقاصد کی صراحت کریں۔ ہندوستان کے اندر اور بیرونِ ملک لوگوں کو یہ بتانا ضروری
ہے کہ اقتصادی مسئلہ ہی ملک کا واحد مسئلہ نہیں ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے بیشتر مسلمانوں
کے لیے تہذیبی و ثقافتی مسائل کہیں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اور ہندوؤں کے تہذیبی اور
ثقافتی مسئلے اقتصادی مسئلے سے کسی طرح کم اہمیت نہیں رکھتے۔ اگر آپ نے یہ کنونشن طلب
کیا تو وہ اسمبلیوں کے ان مسلمان ممبروں کو بھی بے نقاب کر دے گا جنھوں نے ہندوستانی
مسلمانوں کی امنگوں اور مفاد کے خلاف پارٹیاں بنا رکھی ہیں۔ یہ کنونشن ہندوؤں پر یہ بھی
واضح کر دے گا کہ مسلمانانِ ہند کو کسی سیاسی حربے سے ان کی ثقافتی وحدت سے محروم
نہیں کیا جا سکتا۔ میں چند روز تک دہلی آ رہا ہوں اور توقع ہے کہ آپ سے

پر گفتگو کروں گا۔ میں افغانستان کے قونصل خانے میں قیام کروں گا۔ اگر آپ کچھ وقت نکال سکیں تو وہاں ملاقات ہو سکتی ہے۔ براہِ کرم جلد از جلد اس مکتوب کے جواب میں ایک دو سطور ہی لکھ دیں۔"

۲۱ اپریل ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے جناح صاحب کو خبردار کیا کہ صورت حال تشویشناک ہو رہی ہے اور پنجاب کے مسلمان تیزی سے کانگریس کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ اس کے اسباب کی وضاحت غیر ضروری ہے۔"

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت فروری ۱۹۳۷ء میں پہلے عام انتخابات ہوئے اور کانگریس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل ہو گئی جب کہ مسلم لیگ نے کوئی خاص پوزیشن حاصل نہ کی۔ مسلمانوں کو بڑی تشویشناک صورت حال کا سامنا تھا۔ کانگریس اپنی طاقت کے نشے میں سرشار تھی۔ علامہ اقبال نے محسوس کیا کہ جب تک مسلم عوام لیگ میں شامل نہ ہوں گے وہ ہندوستانی سیاست میں اپنی جائز اہمیت نہیں منوا سکتے۔ انھوں نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے خط میں قائد اعظم کو لکھا: "یاد آوری کا شکریہ۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے دستور میں تبدیلیوں اور مسلم لیگ کے پروگرام کے متعلق جو کچھ تحریر کیا تھا آپ اس کا خیال رکھیں گے۔ مجھے اس باب میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے آپ کو صورت حال کی شدت کا پورا پورا اندازہ ہے۔ لیگ کو آخر کار یہ طے کرنا ہوگا کہ آیا وہ اعلیٰ طبقے کے ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندہ تنظیم رہے گی یا اس میں عام ہندوستانی مسلمانوں کو بھی شامل کیا جائے گا جنھوں نے اب تک تنظیم سے کوئی دلچسپی ظاہر نہیں کی ہے۔ ذاتی طور پر میرا خیال ہے کہ کوئی ایسی سیاسی تنظیم عام مسلمانوں کو راغب نہیں کر سکتی جو ان کے حالات سنوارنے کے عزم کا اعلان نہ کرے۔

نئے دستور کے تحت اعلیٰ عہدے، اعلیٰ طبقے کے افراد کو اور چھوٹے عہدے،

وزیروں کے دوستوں یا عزیزوں کو ملتے ہیں۔ دوسرے معاملات میں بھی ہمارے سیاسی اداروں نے عام مسلمانوں کے حالات سنوارنے کی طرف کوئی توجہ مبذول نہیں کی ہے۔ پیٹ بھرنے کا مسئلہ روز بروز سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان یہ سوچنے لگے ہیں کہ پچھلے دو سال سے وہ پست سے پست تر ہو رہے ہیں۔ عام احساس یہ ہے کہ مسلمانوں کی غربت و فلاکت کا سبب ہندو مہاجنی یا سرمایہ داری ہے۔ یہ تصور کہ اس کا سبب غیر ملکی حکومت بھی ہے۔ گو ابھی پوری طرح واضح نہیں ہو سکا ہے مگر ایک نہ ایک دن واضح ہو کر رہے گا۔ اس کا امکان کم ہے کہ جواہر لال کا ملحدانہ سوشلزم مسلمانوں میں مقبول ہوگا۔ لہٰذا اب سوال یہ ہے کہ آخر مسلمانوں کے افلاس کا مسئلہ کیونکر حل کیا جائے؟ لیگ کے تمام تر مستقبل کا انحصار اس مسئلے کا حل پیش کرنے میں ہے۔ اگر مسلم لیگ اس قسم کا کوئی وعدہ نہ کر سکی تو مجھے یقین ہے کہ عام مسلمان لیگ سے حسب سابق بے تعلق رہیں گے۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ سے یہ مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اسلامی قانون کو اگر جدید نظریات کی روشنی میں رائج کیا جائے تو بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اسلامی قانون کے طویل اور محتاط مطالعے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اگر اس طریقہ قانون کو مناسب انداز میں سمجھا اور اس پر عمل کیا جائے تو ہر شخص کو کم از کم اپنا وجود برقرار رکھنے کا موقع تو مل جائے گا۔ لیکن ایک آزاد اسلامی مملکت کے بغیر اس ملک میں شریعت کا نفاذ ناممکن ہے۔ مدت سے میرا یہ پختہ عقیدہ ہے اور اب بھی مجھے یہ یقین ہے کہ مسلمانوں کو پیٹ بھر روٹی فراہم کرنے اور ہندوستان میں امن قائم کرنے کا صرف یہی ایک ذریعہ ہے۔

اگر ہندوستان میں یہ نظام ناقابل عمل ہے تو اس کا متبادل صرف خانہ جنگی ہے جو دراصل کچھ عرصے سے ہندو مسلم فسادات کی صورت میں جاری ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ملک کے بعض علاقوں (شمال مغربی سرحد) میں شاید فلسطین کی کہانی دہرائی جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ہندوستان کے جدید سیاست میں جواہر لال کے نظریۂ سوشلزم کی آمیزش

کے سبب خود ہندوؤں کے درمیان قتل و خونریزی کا بازار گرم ہو جائے۔ سماجی جمہوریت اور برہمن مت میں وہی فرق ہے جو برہمن مت اور بدھ مت میں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا ہندوستان میں سوشلزم کا بھی وہی حشر ہو گا جو بدھ مت کا ہوا مگر یہ واضح ہے کہ اگر ہندو مت نے سماجی جمہوریت (سوشل ڈیمو کریسی) تسلیم کر لی تو ہندو مت لازماً ختم ہو جائے گا۔ اس کے برعکس اسلام میں سماجی جمہوریت کو مناسب شکل میں اور اسلامی اصولوں کے مطابق تسلیم کر لینے سے کوئی انقلاب رونما نہ ہو گا بلکہ اسلام کی ابتدائی اور حقیقی شکل ظاہر ہو جائے گی۔ اس لیے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کے لیے موجودہ مسائل کا حل کہیں زیادہ آسان ہے۔ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے مسلم ہند کو مسائل حل کرنے کا موقع دینے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کی از سرِ نو تقسیم کی جائے اور قطعی اکثریت کے ساتھ ایک یا زائد اسلامی مملکتیں قائم کی جائیں۔ کیا آپ یہ نہیں سمجھتے کہ اس قسم کا مطالبہ کرنے کا وقت آ پہنچا ہے؟ شاید جواہر لال کے نظریہ سوشلزم کا اس سے بہتر جواب ممکن نہیں۔

"بہر حال میں نے اس توقع کے ساتھ آپ کو اپنے خیالات سے آگاہ کیا ہے کہ آپ ان پر سنجیدگی سے غور کریں گے اور اپنی کسی تقریر یا لیگ کے آئندہ اجلاس میں مزید روشنی ڈالیں گے۔ مسلمانان ہند کو امید ہے کہ اس نازک موقع پر آپ موجودہ مشکلات کا کوئی حل تلاش کر لیں گے۔"

اس کے کچھ عرصے بعد ایک اور مکتوب میں علامہ اقبال نے جناح صاحب کو لکھا کہ "اس وقت ہندوستان میں صرف آپ ہی ایک ایسے مسلمان ہیں جس کی ذات سے قوم بجا طور پر یہ توقع کر سکتی ہے کہ شمال مغربی ہند بلکہ پورے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے جو طوفان آ رہا ہے۔ اس میں آپ اس کی رہنمائی فرمائیں گے۔ میں آپ کو بتاؤں، کہ ہم در حقیقت خانہ جنگی کی سی حالت میں رہ رہے ہیں۔"

علامہ اقبال، پنجاب کی صورتِ حال سے کم و بیش مطمئن ہو گئے تھے اور شاید انھیں امید بندھ چلی تھی۔ اس کا اظہار ۱۱ر اگست کے مکتوب سے ہوتا ہے: "پنجاب میں لیگ سے لوگوں کی دلچسپی میں اضافہ ہو رہا ہے اور مجھے یقین ہے کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس، لیگ کی تاریخ میں ایک اہم موڑ اور عوامی رابطے کے سلسلے میں اہم اقدام ہوگا۔"

بدقسمتی سے قائداعظم کے جوابی مکاتیب محفوظ نہیں ہیں یا شائع نہیں ہوئے۔ اس لیے مسلم سیاست کے اس نازک موڑ پر ان کے خیالات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کیونکہ اس وقت اقبال ہی ایسے شخص تھے جن سے جناح صاحب کھل کر اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر سکتے تھے۔ تاہم ۳۰ر اکتوبر ۱۹۳۷ء کو علامہ اقبال نے قائداعظم کو پھر تحریر کیا۔ "ہمیں جماعتی کام زیادہ سرگرمی سے جاری رکھنا چاہیے۔ جب تک پانچ صوبوں میں مسلم حکومتیں قائم نہ ہو جائیں اور بلوچستان کے لیے اصلاحات منظور نہ کر لی جائیں ہم چین سے نہ بیٹھیں گے۔ افواہ گرم ہے کہ یونینسٹ پارٹی کا ایک بازو لیگ میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔ اب تک سر سکندر حیات اور ان کے ساتھیوں نے لیگ کے عہد نامے پر دستخط نہیں کیے ہیں۔[1]"

۱۹۳۲ء کے کمیونل ایوارڈ کے سلسلے میں ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ ایوارڈ میں یہ واضح نہ کیا گیا تھا کہ مرکزی اسمبلی میں کتنی نشستیں مسلمانوں کو دی جائیں گی۔ یہ معاملہ مزید غور و خوض کے لیے جوں کا توں چھوڑ دیا گیا تھا۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی اور اسے علیحدہ صوبہ قرار دیے جانے کا معاملہ بھی اس وقت تک کے لیے ملتوی کر دیا گیا تھا جب تک کہ سندھ کے مالی وسائل کے متعلق اطمینان نہ ہو جاتے۔ لیکن اس ایوارڈ کے مطابق بنگال

---

[1] ان خطوط کے اقتباسات "لیٹرز آف اقبال ٹو جناح" مطبوعہ شیخ محمد اشرف لاہور ۱۹۶۲ء سے لیے گئے ہیں۔

ہیں گنتی کے یو. پی باشندوں کی نشستوں کی تعداد کسی شرط کے بغیر متعین کر دی گئی تھی.
لکھنؤ میں منعقدہ کل جماعتی مسلم کانفرنس نے پنڈت الویہ کی یہ تجویز قبول کر لی کہ مشترکہ
طور پر بنگال کے یو. پی باشندوں سے کہا جائے کہ وہ اپنی چند نشستوں سے دستبردار
ہو جائیں. اس سلسلے میں ایک مشترکہ وفد کلکتہ روانہ کیا گیا. دریں اثنا وزیر ہند سر سیموئیل ہو
نے اعلان کیا کہ حکومت برطانیہ نے مرکزی اسمبلی میں برطانوی ہند کی ⅓ ۳۳ نشستیں مسلمانوں
کے لیے مخصوص کرنے اور سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دینے کا فیصلہ کیا ہے اور نئے صوبے کو
ابتدائی مالی مشکلات پر قابو پانے کے لیے مرکز مناسب امداد دے گا. بابو راجندر پرشاد
نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مختلف فرقے مفاہمت کی جو کاوشیں کر رہے تھے
انھیں انتہائی ظالمانہ انداز میں کچل دیا گیا."

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے اعلان کے بعد سے کانگریس اور مسلم لیگ کی دشمنی میں
اضافہ ہو رہا تھا. تاہم اس بات کی کوشش کی جا رہی تھی کہ دونوں تنظیموں کے درمیان جو
تلخی اور کدورت موجود ہے آیا اسے کسی متفقہ حل کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے، آیا
دستور کو خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو کسی طرح کام میں لایا جا سکتا ہے یا کوئی
اطمینان بخش دستور مرتب کیا جا سکتا ہے. اس مقصد کے پیش نظر کانگریس کی طرف سے
بابو راجندر پرشاد نے جولائی ۱۹۳۷ء میں قائد اعظم سے دہلی میں ملاقات کی. مذاکرات
ناکام رہے اور راجندر پرشاد نے ایک بیان میں سمجھوتے کی پیش کش کی تو قائد اعظم نے
سمجھوتے کے اس طریقے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا اور جوابی بیان میں کہا: "کمیونل ایوارڈ
کا کوئی ایسا نعم البدل جو مسلمانوں کے لیے قابل قبول ہو، اگر تجویز کیا گیا تو یقیناً یہ تجویز
صرف ہندو اور سکھ لیڈر (جو ایوارڈ کے مخالف ہیں) پیش کر سکتے ہیں. کانگریس نے
مختلف طریقوں سے یو. پی میں مسلم لیگ کی صفوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی.
جناح صاحب نے ان ہتھکنڈوں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: "اخباروں میں

یوپی کے چند مسلمانوں کے متعلق خبر شائع ہوئی ہے کہ اگر ہیں بابو راجندر پرشاد کی بات تسلیم نہ کروں تو وہ لیگ سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ با عزت سمجھوتے کا یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے بلکہ یہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے، مسلم لیگ میں انتشار پیدا کرنے اور مسلمانوں کے اس اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش ہے جس کے لیے میں سرگرم عمل ہوں۔" اُنھوں نے کہا کہ کانگریس کی خواہش ہے کہ مسلمان کانگریس میں غیر مشروط طور پر شامل ہو جائیں اور کانگریس کے عہدنامے پر دستخط کر دیں۔ کانگریس نے چھ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل کرنے کے بعد دانستہ طور پر مختلف صوبائی اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارٹیوں کو نظر انداز کرنے اور ان سے تعاون نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور وزارتوں کی تشکیل کے وقت کانگریس نے اقلیتوں سے اس انصاف اور حسن سلوک کا مظاہرہ نہ کیا جس کا مہاتما گاندھی نے پچھلے دنوں وعدہ کیا تھا اور جس پر وہ اس قدر زور دیتے رہے تھے۔ اس مقصد کے لیے کانگریس نے مختلف اسمبلیوں میں تحریص و ترغیب سے کام لیا اور اکا دکا مسلمانوں کو وزارت کے بدلے راتوں رات وفاداری تبدیل کرنے پر تیار کر لیا۔"

قائداعظم نے جواہر لال نہرو کے خلاف اظہار ناراضی کیا جنھوں نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مسلمانوں، مسلم لیگ اور قائداعظم کے خلاف اشتعال انگیز بیان دیا تھا۔ قائداعظم نے فرمایا "میں ایسے صدر کے متعلق کیا کہہ سکتا ہوں ــــــ، وہ پوری دنیا کا غم اُٹھائے پھر رہے ہیں اور اپنے کام کے سوا ہر بات میں ٹانگ اڑانا اپنا حق سمجھتے ہیں۔" قائداعظم نے کہا کہ فرقہ وارانہ سمجھوتے کے لیے میں نے مسٹر گاندھی سے بھی رابطہ قائم کیا تھا مگر انھوں نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا۔ بیان کے آخر میں انھوں نے ان مسلمانوں کو متنبہ کیا جو کانگریس کے دام تحریص میں پھنسنے والے تھے۔ انھوں نے فرمایا "آخر میں میں مسلمانوں سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ وہ ڈھلمل یقین لوگ جو عہدوں کی حرص میں لیگ سے بے وفائی کرنے کو تیار ہیں ان کو کوئی بہانہ تلاش نہیں کرنا چاہیے۔

اگر ان کا ضمیر بالکل ہی مردہ نہیں ہو گیا ہے تو وہ استعفا دے کر کانگریس کے ٹکٹ پر ان نشستوں کے لیے دوبارہ انتخاب لڑیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایسے افراد کا نکل جانا مسلم لیگ کے لیے سُود مند ثابت ہو گا۔ شکست خوردہ ذہنیت کے لوگوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ توصلے اور ہمت سے کام لیجیے ــــ ہنوز دِلّی دُور نیست ــــ میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں سے اپیل کرتا ہُوں کہ وہ منظم اور متحد رہیں۔ کوئی عظیم مقصد حاصل کرنے اور ملک کی قومی زندگی میں اپنا مناسب مقام حاصل کرنے سے قبل خدمت اور قربانی کا جذبہ پیدا کرنا لازمی ہے۔"

قائداعظم مرکزی اسمبلی کے ممبروں و مسلم لیگ کے عہدیداروں کے ساتھ (۱۹۳۶ء)، آپ کی دائیں جانب مولانا شوکت علی ہیں۔

"ایک تیسری جماعت بھی ہے"

گول میز کانفرنس کے دوران میں برطانوی حکومت نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اگر ہندوستان کے مختلف فرقے اتفاق رائے سے فرقہ وار مسئلے کا کوئی حل تلاش نہ کر سکے تو حکومت ہر ذمہ داری سے مبرا ہو گی اور وہ ہندوستان کے لیے دستوری اصلاحات کی سکیم پر عمل درآمد ملتوی نہ کرے گی۔ کانفرنس میں کچھ انتہا پسند ہندو لیڈروں نے جو افسوسناک رویہ اختیار کیا تھا اس سے متفقہ حل کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا اور وزیر اعظم برطانیہ نے اگست ۱۹۳۲ء میں اس وعدے کے ساتھ کمیونل ایوارڈ کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے مختلف فرقے اگر باہمی رضامندی سے بعد میں کوئی سمجھوتہ کر لیں تو اس کے مطابق ایوارڈ میں ترمیم کی جا سکے گی یا ایوارڈ واپس لے لیا جائے گا۔ تاہم دستوری اصلاحات کی سکیم ایوارڈ کے اعلان کے بعد پارلیمنٹ میں منظوری کے لیے پیش نہ کی گئی اور اس معاملے پر برطانوی کابینہ اور پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں طویل بحث کے بعد جون ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ کیا گیا۔

گاندھی جی اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح ایوارڈ کو کانگریس کی خواہشات کے مطابق ڈھال دیا جائے۔ اپنا مطالبہ منظور کرانے کے لیے انھوں نے مرن برت شروع کر دیا۔ گاندھی جی کے مرن برت کے نتیجے میں میثاق پونا عمل میں آیا جس کے مطابق ہندوؤں اور پست طبقوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہو گیا۔ لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا، ایوارڈ میں ان کی حیثیت وہی رہی یعنی ـــــ "اقلیت" گاندھی جی جیل میں

تھے کہ پنڈت مالویہ نے مولانا شوکت علی سے ملاقات کی اور کوئی متفقہ حل تلاش کرنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ ایوارڈ سے پیچھا چھڑایا جا سکے۔ اس پر مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ یا تو گاندھی جی کو رہا کر دیا جائے یا انھیں جیل میں گاندھی سے سمجھوتے کی بات چیت کے لیے سہولتیں مہیا کی جائیں۔ مولانا شوکت علی کے اس طرزِ عمل پر کل جماعتی مسلم کانفرنس کے اراکین میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی اور کانفرنس نے ۷ راکتوبر ۱۹۳۲ء کو ایک بیان کے ذریعے مولانا کو کانفرنس کی قیادت سے الگ کرنے کے اعلان کے ساتھ اس امر کا بھی اعلان کیا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے حق اور ایوارڈ کے تحت دوسرے تحفظات سے دستبردار نہ ہوں گے۔ ان تحفظات سے دستبرداری صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ خود اکثریت مسلمانوں کو مساوی ضمانتوں اور دستوری تحفظات کی پیشکش کرے۔ ۲۷ راکتوبر کو وائسرائے نے مولانا شوکت علی کو لکھا کہ گاندھی جی جب تک اپنی تحریکِ سول نافرمانی سے لاتعلقی کا اعلان نہ کریں گے، جیل میں ان سے ملاقات کی درخواست پر غور نہیں کیا جا سکتا۔

۱۶ راکتوبر کو لکھنؤ میں کل جماعتی مسلم کانفرنس کا اجلاس ہوا اور اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندوؤں اور سکھوں سے فرقہ وار مسئلے پر گفت و شنید کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی جائے۔ نومبر میں بمقام الٰہ آباد ایک اتحاد کانفرنس بھی منعقد ہوئی لیکن کوئی مفید مطلب نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ جناح صاحب نے گول میز کانفرنس میں ہندوؤں اور کانگریس کی جانب مسلمانانِ ہند کی طرف سے دوستی کا جو ہاتھ بڑھایا تھا، کانگریس اور ہندو اسے خاطر میں نہ لائے لیکن اب انھیں معلوم ہوا کہ انھوں نے ایک زریں موقع گنوا دیا تھا۔

اکتوبر ۱۹۳۴ء میں بمبئی میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا لیکن اجلاس نے کمیونل ایوارڈ کے بارے میں کوئی واضح موقف اختیار نہ کیا اور معاملہ جوں کا توں رہا۔ اس

اجلاس کی کارروائی صرف اس قدر تھی کہ اس نزاعی معاملے پر کانگریس نے اپنے موقف کو پُر پیچ لفظوں اور قراردادوں کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی ـــــ اس کے بعد جب مرکزی اسمبلی کا انتخاب ہُوا تو ایوارڈ کے بارے میں کانگریس کے غیر واضح رویے پر بڑی لے دے ہوئی۔ اس معاملے پر کانگریس میں سنگین اختلافات موجود تھے۔ بنگال سے جو نمائندے کانگریس کے ٹکٹ پر منتخب ہُوئے تھے انھیں کھُلی چھٹی دے دی گئی کہ وہ ذاتی طور پر جو موقف چاہیں اختیار کریں۔

۱۹۳۵ء میں قائدِ اعظم اور کانگریس کے صدر کے درمیان دوبارہ اِتحاد مذاکرات کا اعلان کیا گیا۔ قائدِ اعظم سمجھوتے کے پیشِ نظر ہر معقول مطالبے کو قبول کرنے کو تیار تھے۔ کانگریس نے اس کا غلط مطلب لیا اور ایسے نامناسب مطالبات پر اتر آئی جو اس کی کٹر ہندو نواز ذہنیت کے آئینہ دار تھے۔

گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد اپریل ۱۹۳۶ء میں بمقام بمبئی آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ اس میں حکومتِ برطانیہ کی اس پالیسی کی شدید مذمت کی گئی تھی کہ وہ عوام کی خواہشات کے خلاف ہندوستان پر ایک دستور مسلط کر رہی ہے۔ تاہم لیگ کے اس اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ صوبائی بنیاد پر نئی اصلاحات کی سکیم مرتب کی جائے باوجودیکہ یہ اصلاحات مسلمانانِ ہند کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں کیونکہ ان کے تحت صوبائی گورنروں کو خاص اختیارات تفویض کر دیے گئے تھے اور یوں صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کا حقیقی کنٹرول اور ذمہ داری بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ مسلم لیگ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے وفاقی حصے کی بھی مذمت کی اور کہا کہ یہ قوانین مسلمانانِ ہند کے مفاد کے منافی ہیں۔ اجلاس میں ایک اور قرارداد کے ذریعے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا تقرر کیا گیا اور اسے انتخابی منشور جاری کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اسی انتخابی منشور کی بنیاد پر لیگ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت صوبوں

میں ہونے والے پہلے عام انتخابات میں حصّہ لینے کا فیصلہ کیا۔ مسلم لیگ کے انتخابی منشور میں کہا گیا تھا کہ مختلف قانون ساز اسمبلیوں میں ہمارے نمائندے حسب ذیل اصول پر کام کریں گے :۔ (۱) موجودہ صوبائی آئین اور مجوزہ مرکزی آئین کی جگہ فوری طور پر جمہوری اور مکمل حکومتِ اختیاری قائم کی جائے۔ (۲) دریں اثنا مسلم لیگ کے نمائندے اسمبلیوں میں رہ کر اس بات کی کوشش کریں گے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لیے آئین سے زیادہ سے زیادہ فوائد حاصل کر سکیں۔ جب تک جداگانہ انتخاب کا طریقۂ کار موجود ہے، اس وقت تک مسلم لیگ پارٹی کی تشکیل منطقی نتیجے کے طور پر ناگزیر ہوگی لیکن ہم ایسے کسی بھی گروپ یا گروپوں سے آزادی کے ساتھ تعاون کریں گے جس کے مقاصد اور نظریات لیگ پارٹی کے مماثل ہوں ۔

انتخابی منشور میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ اسمبلیوں میں لیگ پارٹیاں مسلمانوں کے مذہبی حقوق کا تحفظ کریں گی اور ایسی تدابیر اختیار کریں گی جن سے مسلمانوں کی عام زندگی سنور سکے۔ منشور میں حلقۂ انتخاب سے یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ اسمبلیوں میں مسلم لیگ پارٹیاں ان تمام تجاویز کی تائید و حمایت کریں گی جن کا مقصد ظالمانہ قوانین کو منسوخ کروانا، ہندوستان کے مفاد اور عوام کے بنیادی حقوق کے خلاف منصوبوں کی مخالفت کرنا، ہندوستان کا اقتصادی استحصال ختم کرانا، نظم و نسق کا خرچ کم کرنا، دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور صوبائی بجٹ میں قومی تعمیری سرگرمیوں کے لیے زیادہ رقم منظور کرانا اور ہندوستان کے عوام کے فائدے کے لیے صنعتیں قائم کرنا ہوگا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم لیگ نے انتخابی منشور کی بنیاد پر عام انتخابات میں اپنے امیدوار نامزد کیے۔ کانگریس نے بھی اپنے امیدواروں کا انتخاب کیا اور ۱۹۳۶-۳۷ء کے موسم سرما میں منعقد ہونے والے انتخابات میں دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو گئیں۔ مسلم لیگ اور کانگریس کی پارٹی پوزیشن مندرجہ ذیل جدول

سے ظاہر ہے۔

صوبہ جات	جملہ نشستیں	نشستیں جو کانگریس نے جیتیں	مسلمانوں کی کل نشستیں	نشستیں جو مسلم لیگ نے جیتیں	دیگر مسلم گروہوں کی حاصل کردہ نشستیں
مدراس	۲۱۵	۱۵۹	۲۸	۱۱	۱۷
بمبئی	۱۷۵	۸۶	۲۹	۲۰	۹
بنگال	۲۵۰	۵۴	۱۱۷	۴۰	۷۷
یوپی	۲۲۸	۱۳۴	۶۴	۲۷	۳۷
پنجاب	۱۷۵	۱۸	۸۴	۱	۸۳
بہار	۱۵۲	۹۸	۳۹	—	۳۹
سی پی	۱۱۲	۷۰	۱۴	—	۱۴
شمال مغربی سرحدی صوبہ	۵۰	۱۹	۳۶	—	۳۶
آسام	۱۰۸	۳۳	۳۴	۹	۲۵
اڑیسہ	۶۰	۳۶	۴	—	۴
سندھ	۶۰	۷	۳۵	—	۳۵
کل تعداد	۱۵۸۵	۷۱۴	۴۸۴	۱۰۸	۳۷۶

اس طرح کانگریس کو مدراس، بہار، یوپی، سی پی اور اڑیسہ میں مکمل اکثریت حاصل ہوگئی۔ بمبئی اور سرحد کے چند آزاد امیدوار کانگریس پارٹی میں شامل ہو گئے اور اس طرح کانگریس نے ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں بھی اکثریت حاصل کر لی۔ اس کے برعکس مسلم لیگ کو کسی صوبے میں اکثریت حاصل نہ ہوتی تھی۔ مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد میں مسلمانوں کی ۲۷۲ نشستوں میں سے صرف ۴۱ نشستیں مل سکیں۔ بنابریں ہندوستان کے کسی صوبے میں لیگ کی وزارت

کی تشکیل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ادھر کانگریس کو گیارہ میں سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل تھی۔ کانگریس نے فیصلہ کیا کہ جب تک اسمبلی میں کانگریس پارٹی کو یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ گورنر اپنے مداخلت کے خصوصی اختیار استعمال نہ کریں گے یا دستوری سرگرمیوں کے سلسلے میں اپنے وزیروں کے مشورے کو نظر انداز نہ کریں گے، کانگریس وزارتیں قبول نہ کرے گی۔ گورنروں نے اس ضمن میں کوئی یقین دہانی کرانے سے انکار کر دیا جس سے ان صوبوں میں آئینی بحران پیدا ہو گیا۔ کانگریس نے جو یقین دہانی طلب کی تھی اس کا تعلق گورنر کی ان مخصوص ذمہ داریوں سے تھا جن میں صوبے میں امن و امان کا قیام، پبلک سروس کے اراکین اور ان کے خاندان کے حقوق اور جائز مفادات کا تحفظ، انگریزوں اور برطانوی اداروں کے خلاف امتیازی سلوک کی روک تھام، ریاستوں اور ان کے فرمانرواؤں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت اور گورنر جنرل کے احکامات کی تعمیل قابلِ ذکر ہیں۔ علاوہ ازیں گورنروں کی خصوصی ذمہ داریوں میں یہ امر بھی شامل تھا کہ مسلمانوں سمیت تمام اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔

مسلمانوں کو یہ اندیشہ تھا کہ ممکن ہے ہندو باشندوں کے دباؤ میں آکر کانگریسی وزارت مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچائے۔

اس معاملے پر کانگریس اور وائسرائے کے درمیان کچھ عرصے تک مذاکرات ہوتے رہے اور بالآخر جولائی ۱۹۳۷ء میں یہ تعطل ختم ہو گیا۔ کانگریس نے سات صوبوں میں وزارتیں قبول کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ وہ چار صوبوں میں مسلم لیگ کے کچھ اراکین کو پھانسنے کی کوشش کر رہی تھی اور انھیں وزارت کا لالچ دے رہی تھی۔ لیگ کا موقف یہ تھا کہ چونکہ مسلمان وزیر، مسلم آبادی کے نمائندے ہوں گے، نیز کابینہ میں وہ ذاتی حیثیت سے شامل نہ ہوں گے اس لیے اسمبلی کے مسلمان ممبروں کی اکثریت کی رائے ہی سے یہ معاملہ طے ہوگا کہ کابینہ میں کس شخص کو شامل ہونا چاہیے۔ یو پی میں صورت حال قدرے

مختلف تھی۔ جہاں انتخابات سے پہلے کانگریس اور مسلمانوں کے درمیان مفاہمت ہو گئی تھی مگر انتخابات کے بعد کانگریس اس سے منحرف ہو گئی۔ رچرڈ سائمنڈز نے لکھا ہے۔ لیکن ہندو اکثریت کے صوبوں میں (جہاں مسلم لیگ کو خاصی تعداد میں مسلم نشستیں مل گئی تھیں) امید تھی کہ لیگ کو کانگریس کے ساتھ مخلوط حکومتیں بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ بات خاص طور سے یوپی کے بارے میں درست تھی جہاں لیگ اور کانگریس کے امیدواروں نے ایک ہی پلیٹ فارم سے انتخاب لڑا تھا۔ لیگ کو کسی دوسری پارٹی کے مقابلے میں زیادہ مسلم نشستیں ملی تھیں اور اسے انتخابات سے پہلے مخلوط وزارت کی واضح یقین دہانی کرائی گئی تھیں۔ انتخابات کے نتائج کے بعد جب مجموعی اعتبار سے تمام صوبوں میں کانگریس کو اکثریت حاصل ہو گئی تو اس نے مسلم لیگ کے سامنے کچھ ایسی شرائط رکھیں جو کوئی آزاد سیاسی جماعت ہرگز قبول نہ کر سکتی تھی۔[1] کانگریس کی خواہش تھی کہ مسلم لیگ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے نظر انداز کر دیا جائے اور کانگریسی لیڈر اس مقصد کے حصول کے لیے لیگ کے اراکین کو حرص و طمع کے دام میں پھانسنا چاہتے تھے اور انھیں توقع تھی کہ لیگی اراکین عہدے کی خاطر اپنی وفاداری کانگریس کو منتقل کر دیں گے۔ سائمنڈز رقم طراز ہے "قیام پاکستان کے اسباب میں یہ واقعہ سب سے بڑا سبب ثابت ہوا۔ خلیق الزماں جیسے لوگوں (جو یوپی میں مسلم لیگ کے لیڈر تھے اور گزشتہ بیس سال سے کانگریس اور لیگ دونوں جماعتوں کے رکن تھے) کے سامنے اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ رہ گیا کہ وہ دونوں میں سے کسی ایک جماعت کا انتخاب کریں۔ کانگریسی لیڈروں کی ان حرکتوں سے انھیں احساس ہوا کہ ان سے دغا کی گئی ہے۔"[2] اس مسئلے پر راجندر پرشاد نے ان الفاظ

---

[1] دی میکنگ آف پاکستان، رچرڈ سائمنڈز، صفحہ ۵۳ مطبوعہ ۱۹۵۰ء، فیبر اینڈ فیبر، لندن

[2] محولہ بالا، صفحہ ۵۴

میں روشنی ڈالی ہے ۔ بمبئی اور یو پی میں کانگریس نے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی[1]۔" کانگریس کے موقف کے دفاع میں راجندر پرشاد رقم طراز ہیں کہ کانگریس نے یہ پالیسی اختیار کرتے وقت یہ مسلّمہ آئینی اصول پیش نظر رکھا تھا کہ صوبوں میں متجانس و متحد الخیال وزارتیں بنائی جائیں جو خود اس (کانگریس) کے ممبروں پر مشتمل ہوں ۔ اس کے برعکس پیارے لال نے تحریر کیا ہے " کانگریس ہائی کمان کا یہ فیصلہ، جو گاندھی جی کے فیصلے کے خلاف تھا، بہت بڑی شاطرانہ غلطی ثابت ہوا[2]۔"

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو قائداعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں لیگ کے موقف کی وضاحت کی ۔ انھوں نے کہا "۱۲ اپریل ۱۹۳۶ء کے اجلاس میں جو فیصلہ ہوا تھا اس کے مطابق لیگ نے عوامی رابطے کا پروگرام شروع کیا اور فیصلہ کیا کہ عام انتخابات میں اپنے امیدوار نامزد کیے جائیں ۔ لیگ نے جن نشستوں کے لیے انتخاب لڑا ان میں سے اسے ۶۰ ۔ ۷۰ فی صدی نشستیں حاصل ہوئیں ۔ کانگریس کی موجودہ قیادت ۔ خاص طور سے گزشتہ دس سالہ قیادت، جو خالص ہندو نواز پالیسی پر عمل پیرا ہے ۔ مسلمانانِ ہند کو الگ تھلگ رکھنے کی ذمّہ دار ہے، اور جب سے اس نے ہندو اکثریتی صوبوں میں وزارتیں بنائی ہیں وہ بڑھ چڑھ کر اپنے الفاظ، افعال اور پروگرام سے یہ ظاہر کر رہی ہے کہ مسلمانوں کو اس سے کسی انصاف کی توقع نہ رکھنی چاہیئے ۔ کانگریس جہاں کہیں اکثریت میں ہے اور جہاں اس نے مناسب خیال کیا ۔ مسلم لیگ اسمبلی پارٹیوں سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ وہ غیر مشروط طور پر اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں ۔"

---

[1] انڈیا ڈوائڈیڈ ۔ بابو راجندر پرشاد ۔ صفحہ ۱۴۵ مطبوعہ ۱۹۴۷ء ہند کتاب لمیٹڈ بمبئی ۔

[2] مہاتما گاندھی ۔ پیارے لال ۔ صفحہ ۸۰ ۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد ۔

انھوں نے حکومت برطانیہ پر الزام لگایا کہ وہ گورنروں کی خصوصی ذمہ داریوں سے دستبردار ہوگئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریسی وزارتیں مسلم دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں، مسلمانوں کو ہندی پڑھنے، بندے ماترم گانے، کانگریسی ترنگے کو سلامی دینے اور اسی قسم کی دوسری باتوں پر مجبور کیا جارہا ہے۔ تمام ہندوستان میں مسلمانوں کے جذبات کانگریس کی ان حرکتوں سے بری طرح مجروح ہورہے ہیں۔ قائد اعظم نے باآواز بلند کہا "میں چاہتا ہوں کہ مسلمان خود اپنے اوپر بھروسہ کریں اور اپنے مستقبل کا فیصلہ خود کریں۔ ہمیں ایسے افراد کی ضرورت ہے جو حوصلہ مند اور پختہ عزم کے مالک ہوں، جو اپنے اصول کے لیے تنہا جدوجہد کرسکیں خواہ پوری دنیا ہمارے خلاف کیوں نہ ہو۔ ہمیں قوت اور اتحاد درکار ہے اور یہ قوت عوام کے اشتراک اور اتحاد کے ذریعے ہی حاصل ہوسکتی ہے۔"

انھوں نے اپنا خطبۂ صدارت ان الفاظ پر ختم کیا "ہر صوبے، ضلع، تحصیل اور قصبے کے مسلمانوں سے مجھے یہ کہنا ہے کہ آپ کا اولین فرض عوام کی فلاح و بہبود کے لیے ایک تعمیری پروگرام مرتب کرنا اور مسلمانوں کی سماجی، معاشی اور سیاسی بھلائی کے طریقے معلوم کرنا ہے۔ ہم صوبوں یا ملک کی فلاح و ترقی کے ہر عملی اور تعمیری پروگرام میں کسی پارٹی یا گروہ کے ساتھ تعاون کرنے سے گریز نہ کریں گے۔ میں ہر مرد، عورت اور بچے سے اپیل کرتا ہوں کہ ایک مشترکہ پلیٹ فارم کے گرد آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہوجائیں۔ جس قدر جلد ممکن ہوسکے بھاری تعداد میں آپ آل انڈیا مسلم لیگ، صوبائی مسلم لیگ اور ضلع مسلم لیگ کے رکن بن جایئے۔ خود کو منظم کیجیے اور پوری طرح متحد رہیے۔ تربیت یافتہ اور منظم سپاہیوں کی طرح ہر وقت چوکس رہیے۔ اپنی صفوں میں سپاہیانہ سپرٹ اور مل جل کر کام کرنے کا جذبہ پیدا کیجیے۔ اپنے ملک اور اس ملک کے عوام کی تندہی اور فرض شناسی کے جذبے کے ساتھ خدمت کیجیے۔ محنت، مصائب اور قربانیوں کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

لوگ آپ کو ڈرائیں گے، بہلائیں گے، پھسلائیں گے اور شاید آپ کو مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑے مگر یاد رکھیے کہ آگ میں تپ کر ہی لوہا کندن بنتا ہے۔ ظلم و ستم، دھمکیاں، ترغیبات اور حرص و طمع کے دام میں نہ آیئے، اپنے ارادے پر اٹل رہیے اور ہمیشہ یاد رکھیے کہ رنج و آلام کے اس دور کے بعد ایک ایسی قوم نمودار ہوگی جو اپنی گزشتہ عظمت اور تاریخ کے شایانِ شان ہوگی اور اس عظمت میں چار چاند لگانے کے لیے زندہ رہے گی جو نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام دنیا کی تاریخ کو عظیم تر بنا دے گی۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں کو ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کا مستقبل ان کے ہاتھ میں ہے۔ وہ ایک ٹھوس، مربوط، منظم اور متحد قوت کی طرح ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور اپنے موقف اور نصب العین کا دفاع کرنے کے اہل ہیں۔ فیصلہ کیجیے اور فیصلہ کرنے سے پہلے سو بار سوچ لیجیے۔ لیکن ایک بار جو فیصلہ کر لیں اس پر اٹل رہیے۔ اپنے نصب العین پر قائم رہیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کامیاب ہوں گے۔"

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں جناح صاحب کی شرکت سے قبل انھیں علامہ اقبال کا ایک مکتوب ملا تھا۔ علامہ اقبال نے تحریر کیا تھا "ہمیں مشکل حالات درپیش ہیں اور مسلمانانِ ہند کو توقع ہے کہ آپ کا خطبۂ صدارت قوم کے مستقبل سے متعلق تمام امور میں ان کی ہر ممکن رہنمائی کرے گا۔" سیاسی لیڈر نے شاعر کا مشورہ قبول کر لیا۔ انھوں نے کھرے انداز میں کانگریس کے ہٹلرازم کی مذمت کی اور مسلمانوں کو خبردار کیا کہ کانگریس آپ کے رہنماؤں کو ترغیبات دے کر آپ کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی جو چالیں چل رہی ہے ان سے ہوشیار رہیے۔ علامہ اقبال نے قائداعظم کے نام ایک اور مکتوب میں لکھا "ہمیں زیادہ سرگرمی کے ساتھ تنظیم کے کام میں لگ جانا چاہیے اور اپنی کوششیں اس وقت تک جاری رکھنا چاہئیں جب تک پانچوں صوبوں میں مسلمانوں کی وزارتیں نہ بن جائیں اور بلوچستان کے لیے اصلاحات نافذ نہ کی جائیں۔" مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں قائداعظم نے اپنے

خطبۂ صدارت میں ان دو مسئلوں پر بھی روشنی ڈالی جو مسلمانانِ ہند کو درپیش تھے۔ قائداعظم نے علامہ اقبال سے کہا کہ وہ پنجاب کے وزیراعلیٰ سر سکندر حیات کو لیگ کے عہد نامے پر دستخط کرنے اور پنجاب میں مسلم لیگ کی وزارت بنانے پر آمادہ کریں۔ غالباً اسی سلسلے میں علامہ اقبال نے ۱۰ر نومبر ۱۹۳۷ء کو قائداعظم کو لکھا تھا کہ سر سکندر حیات اور ان کے دوستوں سے بات چیت کے بعد مجھے اب یہ یقین ہو چلا ہے کہ سر سکندر پنجاب اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر مکمل کنٹرول سے کم کسی بات پر تیار نہیں ہیں ——— میرے خیال میں اس کا مطلب مسلم لیگ پر قبضہ کرنا اور اسے ختم کر دینا ہے۔ ——— میں مسلم لیگ کو سر سکندر اور ان کے دوستوں کی تحویل میں دینے کی ذمہ داری نہیں لے سکتا۔"

قائداعظم کا یہ خطبۂ صدارت مسلم لیگ کے ایک اہم اعلان کی حیثیت رکھتا تھا۔ دل کہہ لیجیے کہ یہ خطبہ مسلم لیگ کی آئندہ سیاسیات اور سرگرمیوں کے بنیادی اصول کا ایک خاکہ تھا۔ گاندھی جی جیسے زیرک شخص نے بھانپ لیا کہ مسلم لیگ خود کو مسلمانانِ ہند کی واحد ترجمان کی حیثیت سے منوانا اور اس طرح کانگریس کو اس کے صحیح روپ میں یعنی محض ایک ہندو تنظیم بنا کر الگ کر دینا چاہتی ہے۔ گاندھی جی نے جناح صاحب کو لکھا: "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں آپ کی پوری تقریر اعلانِ جنگ ہے۔"

کانگریسی وزارتوں کی تشکیل کو آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔ مسلم لیگ کو کانگریسی اکثریت کے صوبوں سے بے شمار خطوط موصول ہو رہے تھے جن میں ہندوؤں اور کانگریسیوں کی زیادتیوں اور ناانصافیوں کی شکایت کی گئی تھی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے ان شکایات پر غور کیا اور ۲۰ر مارچ ۱۹۳۸ء کو راجہ صاحب پیرپور کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ کمیٹی کے ممبروں سے کہا گیا تھا کہ وہ کانگریسی اکثریت کے صوبوں کا دورہ کریں اور شکایات کی چھان بین کر کے آل انڈیا مسلم لیگ کو رپورٹ دیں۔ ۱۵ر نومبر ۱۹۳۸ء

کو پیرپور کمیٹی نے اپنی رپورٹ پیش کر دی جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو بندے ماترم پڑھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ شکایت درست تھی کیونکہ پیرپور رپورٹ کی اشاعت کے چند روز بعد کانگریس نے فیصلہ کیا کہ اس ترانے کے صرف دو بند پڑھے جائیں اور باقی وہ بند، جن سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچتی ہے نہ گائے جائیں۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ کانگریسی پرچم کو، جو دراصل ہندو پرچم ہے، سلامی دیں۔ ظاہر ہے کہ مسلمان اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ رپورٹ میں کانگریس کی اس تحریک کی بھی مذمت کی گئی تھی جو اس نے مسلم عوام سے رابطہ قائم کرنے کے سلسلے میں شروع کی تھی اور جس کا درحقیقت مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں پھوٹ ڈال کر انھیں کمزور کیا جائے۔ کانگریس نے ابتدائی تعلیم کے بارے میں وردھا سکیم کے نام سے جو تحریک شروع کر رکھی تھی، پیرپور رپورٹ میں اس پر بھی کڑی نکتہ چینی کی گئی تھی۔ یہ سکیم گاندھی جی کے ذہن کی پیداوار تھی اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے انھوں نے ہی ایک کانفرنس بلائی تھی۔ بدقسمتی سے دو ممتاز مسلمان ماہرینِ تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیّدین اس کانفرنس میں شریک تھے اور کانگریس نے اس بنیاد پر کہ دو ممتاز مسلم ماہرینِ تعلیم نے نہ صرف سکیم کے سلسلے میں اشتراک کیا تھا بلکہ وہ اس سے متفق تھے، اس کا خوب ڈھنڈورا پیٹا۔ پیرپور رپورٹ میں ودیا مندر سکیم کو بھی ہدفِ ملامت بنایا گیا تھا۔ یہ اسکیم سی پی میں نافذ کی گئی تھی اور اس کا مقصد ناخواندگی ختم کرنے کی آڑ لے کر مسلمان بچّوں کو بُت پرستی پر مجبور کرنا تھا۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ بیشتر مقامات پر جو فرقہ وارانہ فسادات ہوتے ہیں، ان کی ذمہ داری ہندوؤں پر ہے۔ رپورٹ میں بطور مثال بتایا گیا تھا کہ بہار میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر کتنے بہیمانہ مظالم کیے ہیں۔ رپورٹ میں متعلقہ ہائی کورٹ کے فیصلے کے اقتباسات پیش کرنے کے بعد کہا گیا تھا کہ صوبے کے وزیرِ اعلیٰ کو یا تو خودکشی کر لینی چاہیے یا سیاسی زندگی

سے ریٹائر ہو جانا چاہیئے۔" پیرپور رپورٹ میں اس امر پر بھی روشنی ڈالی گئی تھی کہ کانگریسی
ارتیں، ہندی کو فروغ دینے کے پردے میں اُردو کو مٹانے کی کوشش کر رہی ہیں۔
کانگریس ہائی کمان بظاہر ان الزامات کی تردید کرتا۔ لیکن اندرونی طور پر
ملیوں کی حالت بڑی خستہ ہو رہی تھی۔ گاندھی جی اور کانگریس کے صدر سبھاش چندر
س نے پیرپور رپورٹ کی روشنی میں مسلمانوں کی شکایات کے بارے میں مسلم لیگ کے صدر
ے سمجھوتے کی بات چیت کی ذمہ داری اپنے سر لی۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے بوس
۔ قائداعظم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو انھوں نے اس سلسلے میں ایک بیان جاری کیا
ں میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی فرمایا کہ "ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ کانگریس ہندو مسلم
لے پر مسلم لیگ سے مذاکرات کے لیے تیار ہے اور دوسری طرف کہا جاتا ہے کہ مسلم لیگ
مانوں کی نمائندگی نہیں کرتی۔ اس سے زیادہ مضحکہ خیز بات کیا ہو گی؟ اس کے باوجود
ریس کے صدر مسٹر سبھاش چندر بوس یہ دعوی کرتے ہیں کہ کانگریس ہی واحد جماعت
۔ جو نہ صرف ملک کی بہتری کے لیے کام کر سکتی ہے بلکہ ہندوستان کے مسئلے کے قطعی حل
لیے حکومت برطانیہ سے بات چیت کی اہل بھی ہے۔"

بہر حال کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر یہ طے کرنے کے لیے بیٹھے کہ ان مذاکرات
بنیاد کیا ہونی چاہیئے۔ جناح صاحب نے اصرار کیا کہ مذاکرات کی بنیاد یہ ہو گی کہ "کانگریس
مسلمانانِ ہند کی با اختیار اور نمائندہ جماعت آل انڈیا مسلم لیگ ہندو مسلم نزاع کو طے
نے کے لیے آپس میں ایک معاہدہ کرنے پر تیار ہو گئی ہیں۔" اس سے یہ واضح کرنا مقصود
کہ مسلم لیگ ہی واحد اور با اختیار سیاسی جماعت ہے جسے ہندوستان کے مسلمانوں
جانب سے مذاکرات میں شرکت کا حق حاصل ہے۔

۴ مئی ۱۹۳۸ء کو بوس نے ایک مکتوب کے ذریعے قائداعظم کو بڑے نزاعی
املات کے متعلق کانگریس کے موقف سے آگاہ کیا۔ قائداعظم نے بوس سے کہا کہ میں یہ معاملہ

مسلم لیگ کونسل میں پیش کروں گا اور پھر اس پر گفتگو ہو سکے گی۔ جون میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا اور مندرجہ ذیل قراردادیں منظور کی گئیں جو کانگریس کے صدر کو بھیج دی گئیں :-

قرارداد ۱: "آل انڈیا مسلم لیگ کی ایگزیکٹو کونسل نے کانگریس کے صدر مسٹر سبھاش چندر بوس کی اس یادداشت پر غور کیا ہے جو ۱۴ مئی ۱۹۳۸ء کو کانگریس کی جانب سے لیگ کے صدر مسٹر جناح کو پیش کی گئی۔ کونسل نے کانگریس کے صدر کے مکتوب محررہ ۵ مئی ۱۹۳۸ء پر بھی غور کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ اس بنیاد کے سوا کانگریس سے کسی دوسری بنیاد پر ہندو مسلم اختلافات کے بارے میں مذاکرات نہیں کر سکتی کہ مسلم لیگ مسلمانانِ ہند کی با اختیار اور نمائندہ سیاسی جماعت ہے۔"

قرارداد ۲: "کونسل نے مسٹر گاندھی کے مکتوب مورخہ ۲۲ مئی ۱۹۳۸ء پر بھی غور کیا اور یہ طے کیا ہے کہ کانگریس کی مجوزہ کمیٹی میں کسی مسلمان نمائندے کی شمولیت مناسب نہیں ہے۔"

قرارداد ۳: "کونسل یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی یہ پالیسی ہے کہ تمام دوسری اقلیتوں کے حقوق اور مفادات کا بھی تحفظ ہونا چاہیئے تاکہ ان میں سلامتی کا احساس پیدا ہو اور ان کا اعتماد حاصل کیا جا سکے۔ بنابریں مسلم لیگ ان اقلیتوں اور ضروری ہوا تو دوسرے فرقوں کے نمائندوں سے بھی صلاح مشورہ کرے گی۔"

کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ کی قراردادوں پر غور کیا اور بوس نے ۲۵ جون ۱۹۳۸ء کو قائداعظم کے نام ایک مکتوب میں انھیں ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں کی بابت مطلع کیا۔ ورکنگ کمیٹی نے مسلم لیگ کی مخصوص حیثیت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کانگریس کے اس فیصلے سے کانگریس کے ساتھ تصفیے کے بارے میں جناح صاحب کی رہی سہی امیدیں بھی ختم ہو گئیں۔ کانگریس نے یہ کہہ کر دوسری قرارداد بھی مسترد کر دی کہ "کانگریس

ورکنگ کمیٹی کے لیے اس خواہش کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے۔" تیسری قرارداد کا کانگریس نے یہ جواب دیا کہ "ورکنگ کمیٹی اس کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ جہاں تک کمیٹی کا تعلق ہے وہ مسلم لیگ کو خالص طور سے ایک فرقہ وارانہ تنظیم سمجھتی ہے۔"

۲ راگست کو بمبئی سے جناح صاحب نے بوس کو لکھا کہ "مسلم لیگ کونسل نے آپ کے مکتوب پر غور کیا ہے اور کونسل کے خیال میں صرف مسلم لیگ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد با اختیار اور نمائندہ سیاسی تنظیم ہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان میثاق لکھنؤ میں یہ پوزیشن تسلیم کی گئی تھی اور ۱۹۲۵ء کے جناح راجندر پرشاد مذاکرات تک اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔ لہٰذا آل انڈیا مسلم لیگ کو کانگریس کی جانب سے کسی منظوری کی ضرورت نہیں۔ مسلم لیگ اس بات پر بھی اصرار نہ کرے گی کہ کانگریس لیگ کی ایگزیکٹو کونسل کے اجلاس بمبئی کی قرارداد منظور کرے لیکن اس حقیقت کے پیش نظر کہ کانگریس کے اس وقت کے صدر پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک بیان میں لیگ کی پوزیشن بلکہ ——— اس کے وجود پر اعتراض کیا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں یعنی حکومت برطانیہ اور کانگریس ——— اس لیے ایگزیکٹو کونسل نے یہ ضروری سمجھا کہ کانگریس کو دونوں تنظیموں کے درمیان ممکنہ مذاکرات کی بنیاد سے مطلع کردے۔" اس مکتوب میں جناح صاحب نے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ لیگ کے خیال میں وہ گنے چنے مسلمان جو کانگریس کے ساتھ ہیں "مسلمانوں کی نمائندگی یا ترجمانی کے مجاز نہیں رہے ہیں۔" جناح صاحب نے اپنے مکتوب میں مسلمانوں کی ان دیگر سیاسی تنظیموں کا بھی ذکر کیا جن کا حوالہ بوس نے دیا تھا اور کہا "اگر یہ تنظیمیں جداگانہ طور سے یا مشترکہ طور پر ہندو مسلم نزاع پر گفت و شنید کی اہل ہوتیں تو کانگریس کے صدر اور مسٹر گاندھی مسلم لیگ سے اس مسئلے پر مذاکرات کی تحریک نہ کرتے۔ للہٰذا کونسل اس امر کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی ہے کہ کانگریس اپنی طرف سے مصالحتی کمیٹی میں کسی مسلمان کو رکن نامزد

کرے ـــــــ تاہم مسلم لیگ دوسری غیر مسلم اقلیتوں کے نمائندوں سے اس مسئلے پر بات چیت کے لیے آمادہ ہے:

بوس نے ۱۶ اگست کو جناح صاحب کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے فیصلے سے مطلع کیا۔ انھوں نے تحریر کیا کہ "کانگریس ورکنگ کمیٹی مذاکرات کی بنیاد کے بارے میں مسلم لیگ کونسل سے اتفاق نہیں کرتی اور اس لیے ہندو مسلم نزاع کے تصفیے کے بارے میں مسلم لیگ سے بات چیت کا معاملہ مزید آگے بڑھانے کی پوزیشن میں نہیں ہے"

کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس سے خط و کتابت جاری تھی کہ قائداعظم نے ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو گاندھی جی کو ایک مکتوب میں لکھا "ہم ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو گئے ہیں جہاں کسی شک و شبہے کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ آل انڈیا مسلم لیگ کو ہندوستان کے مسلمانوں کی واحد نمائندہ اور بااختیار سیاسی تنظیم تسلیم کر لیں تو ہم بھی یہ قبول کریں گے کہ آپ کانگریس اور پورے ہندوستان کے ہندوؤں کے نمائندے ہیں، صرف اسی بنیاد پر ہم آگے بڑھ سکتے ہیں اور کچھ طے کر سکتے ہیں۔"

گاندھی جی نے نہ صرف جناح صاحب کی تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ کانگریس پر بھی دباؤ ڈالا کہ لیگ کا فارمولا مسترد کر دیا جائے اور یوں اتحاد کی بات چیت ختم ہو گئی۔

۱۹۴۰ء میں تقسیم ہند سے پہلے کانگریس کو مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے کا شاید یہ آخری موقع ملا تھا۔ تاریخ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ کانگریس نے ۱۹۳۸ء میں جو بات قبول کرنے سے انکار کر دیا، ۱۹۴۷ء میں اسے وہی بات ماننے بن پڑی اور آل انڈیا مسلم لیگ کے اسی مطالبے کے نتیجے میں پاکستان کی نئی مملکت قائم ہوئی کہ لیگ مسلمانان ہند کی واحد

---

[1] مسٹر جناح اور بوس کی خط و کتابت کے یہ اقتباسات "سبھاش بوس اینڈ ہز آئیڈیاز" از جگت ایس برائٹ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ انڈین پرنٹنگ ورکس لاہور سے لیے گئے ہیں۔

نمائندہ تنظیم ہے۔ اس طرح کانگریس کو تقسیم ہند کی سکیم کا فریق بننا ہی پڑا۔ اس دور میں لیگ کے ساتھ کانگریس کے رویئے پر فرینک موریس نے ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "اگر کانگریس انتخابات کے بعد لیگ کے ساتھ زیادہ فراست سے پیش آتی تو شاید پاکستان کبھی نہ بنتا کانگریس کی وجہ سے ہندوستان دو ہندو مسلم مملکتوں میں تقسیم ہوگیا۔ یقیناً جناح نے پاکستان بنوایا مگر کانگرس نے بھی اپنی غلط کاریوں سے پاکستان کے قیام میں مدد دی۔ انتخابات میں مسلم لیگ کی ناکامی کا غلط مطلب لے کر کانگریس نے مخلوط وزارتوں کے متعلق لیگ کی پیشکش ٹھکرادی (مسلم لیگ کے امیدواروں کو مسلمانوں کے کل ووٹوں میں سے پانچ فی صدی سے بھی کم ووٹ ملے اور ایسے مسلمانوں کی اکثریت کے علاقے فرنٹیر سے ایک نشست بھی نہ مل سکی تھی) اس سے لیگ سیاسی گمنامی کے غار میں نہیں گری بلکہ جناح کے ہاتھ مضبوط ہوگئے اور وہ مسلمانوں کے مطالبوں اور حقوق کے صف اوّل کے علمبردار بن گئے"۔

موریس نے مزید لکھا ہے "سیاسی مدبر کی حیثیت سے انھیں (مسٹر جناح) سب پر فوقیت اور برتری حاصل تھی ——— وہ کانگریس کی ہر غلطی کو فوراً محسوس کرلیتے اور اس کا توڑ کر دیتے اس زمانے میں کانگریس نے کئی غلطیاں کیں"

اس زمانے میں جواہر لال نہرو کانگریسی سیاست میں اہم کردار ادا کر رہے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس میں گاندھی جی کے بعد اگر کسی کی کوئی اہمیت تھی تو وہ نہرو تھے مگر ان پر ضرورت سے زیادہ اپنی اہمیت کا احساس غالب تھا۔ ان میں جنگجوئی، اشتعال، غرور اور خود نمائی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ اسی جوش میں انھوں نے یہ چیلنج دے دیا تھا کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں ——— کانگریس اور حکومت برطانیہ؛ قائداعظم نے یہ چیلنج قبول کرلیا اور کہا "یہ غلط ہے ——— ہندوستان میں

لہ جواہر لال نہرو۔ فرینک موریس، صفحہ ۲۰۰، مطبوعہ ۱۹۵۶ء   ٹہ محولہ بالا صفحہ ۲۶۸/۲۶۹

تیسری پارٹی بھی موجود ہے ——— یعنی مسلمان۔ ہم کسی کے محکوم نہیں رہیں گے۔
——— ہم کسی پارٹی کے دست نگر نہ ہوں گے"

گاندھی جی نے اجلاس لکھنؤ کے موقع پر جناح صاحب کے خطبۂ صدارت کو اعلان جنگ سے تعبیر کیا تھا۔ دوسری طرف قائد اعظم نے جواہر لال نہرو کے اس طعن کو کہ ہندوستان میں صرف دو پارٹیاں ہیں اعلان جنگ سمجھ کر قبول کر لیا۔ دونوں تنظیموں اور ان کے لیڈروں کے قدم جس راستے کی طرف اٹھ گئے تھے اس سے واپس آنے کا اب کوئی سوال ہی نہ تھا۔

دریں اثنا یورپ پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ دونوں ڈکٹیٹر ——— ہٹلر اور مسولینی ایک طوفان کی طرح یورپ کے منظرِ شہود پر نمودار ہوئے۔ ستمبر ۱۹۳۶ء میں روم برلن محور قائم ہو گیا اور یورپ کی سیاست اسی محور کے گرد گھومنے لگی۔ اسپین میں کئی مہینے سے خانہ جنگی کے شعلے بھڑک رہے تھے۔ اسپینی قوم پرستوں نے مارچ ۱۹۳۷ء میں گوادلاژارا کے مقام پر مسولینی کی فوجوں کو شکست دی۔ اس کے بعد جرمن فوج، اٹلی کے فاشی ڈکٹیٹر کی مدد کو آئی اور مسولینی ہٹلر کا حاشیہ بردار بن گیا۔ جولائی ۱۹۳۷ء میں جاپان نے لیگ آف نیشنز کے فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے چین پر حملے شدید کر دیئے۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز تک اس نے چین کے بیشتر علاقوں پر قبضہ جما لیا اور چور کے بھائی گرہ کٹ کے مصداق وہ بھی روم برلن محور میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۳۸ء کے وسط میں ہٹلر کی فوجوں نے پیش قدمی شروع کر دی۔ ستمبر ۱۹۳۸ء میں برطانیہ کے وزیر اعظم نیویل چیمبرلین نے میونخ میں صلح کے ایک سمجھوتے پر دستخط کر کے یورپ میں امن قائم کیا اگرچہ انہیں اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں اچانک جرمنوں نے چیکوسلاویکیہ پر حملہ کر دیا اور دارالحکومت پراگ پر جرمن فوج کا قبضہ ہو گیا۔ ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ مسولینی نے البانیہ پر حملہ کر دیا۔ چیکوسلاویکیہ کی فتح سے ہٹلر کا حوصلہ بلند ہو چکا تھا۔ اب اس کی فوج ڈنزگ اور پولینڈ میں داخل ہو گئی۔ یکم ستمبر کو محسوس ہونے لگا کہ یورپ میں جنگ عظیم کی آگ بھڑک اٹھنے والی

ہے جو کہ برِّ اعظم کو جلا کر خاک کر دے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ محوری طاقتوں کے خلاف
برطانیہ کے اعلانِ جنگ سے دوسری جنگِ عظیم چھڑ گئی جس کی تباہ کاریوں کی داستانیں
سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آئینی اعتبار سے برطانیہ کے اعلانِ جنگ کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان بھی روم برلن
محور کے خلاف برسرِ پیکار ہو گیا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کو چند
سال ہی گزرے تھے اور یہ حقیقت ثابت ہو گئی کہ یہ قانون، ہندوستان کے وقار اور احترام
کا تحفظ کرنے میں ناکام رہا ہے۔ اعلانِ جنگ سے قبل مرکزی اسمبلی میں منتخب عوامی نمائندوں
کے ذریعے اہلِ ہند سے مشورہ کرنا چاہیئے تھا۔ مگر اس وقت تاجِ برطانیہ کے مفاد کو خطرہ
درپیش تھا۔ برطانیہ کو اس کی فکر کیوں ہوتی کہ ہندوستان کو برضا و رغبت جنگ میں شامل
کیا جائے۔ اتنا کافی تھا کہ چونکہ برطانیہ حالتِ جنگ میں ہے اس لیے ہندوستان کا فرض
ہے کہ جنگ میں اسے ہر قسم کی مدد دے ——— یہ تھا ہمارے غیر ملکی حکمرانوں کا اندازِ فکر
جنگ کے مسئلے پر ہندوستانی رائے عامہ دو حصوں میں بٹ گئی۔

جنگی کارروائیوں کی بابت اتفاقِ رائے سے ہندوستان کا موقف طے کرنے کے
لیے ۱۹۳۹ء کے آخر میں کانگریس اور مسلم لیگ میں گفت و شنید شروع ہوئی مگر اس بات چیت
کا کوئی مفید نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان مذاکرات کے متعلق کہ
"چونکہ بے انتہا دشواریاں اور رکاوٹیں ہمارے رستے میں موجود ہیں لہٰذا یہ نظر آتا ہے کہ
ہم بدقسمتی سے ان مسائل پر مناسب انداز میں غور بھی نہ کر سکیں گے ——— چونکہ یہ
دشواریاں کسی صورت ختم ہوتی نظر نہیں آتیں اور ان پر مزید مشکلات کا اضافہ ہوتا جا رہا
ہے۔ اس لیے میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ حقیقی مسئلہ سیاسی نصب العین اور مقاصد میں
اختلاف کا مسئلہ ہے۔"

مسلم لیگ نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے اس حصے پر نا بند...

کا اظہار کیا تھا جس کا تعلق وفاقی حکومت سے تھا۔ اس لیے جب ایکٹ کے تحت ۔۔
سے متعلق قوانین نافذ کیے گئے تو وفاقی قوانین کا نفاذ نہ کیا گیا۔ مسلم لیگ بدستور یہ مطالبہ
کرتی رہی کہ ان قوانین کو کُلیتہً منسوخ کر دیا جائے۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے جنہ
لارڈ لنلتھگو نے اعلان کیا کہ جب تک جنگ ختم نہ ہو، وفاقی قوانین کی سکیم پر عمل درآمد
نہ کیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں سرکاری پالیسی
پر اظہار اطمینان کیا گیا مگر کمیٹی نے مطالبہ کیا کہ اس سکیم کو مکمل طور سے منسوخ کیا جائے او
ہندوستان کے دستوری مسئلے کا فوری جائزہ لیا جائے۔ قائداعظم کی مرتب کردہ قرارداد میں
یہ مطالبہ بھی کیا گیا تھا کہ "یہ یقین دلایا جائے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی منظوری اور رضا و رغبت
کے بغیر ہندوستان کی آئینی ترقی کے متعلق کوئی اعلان نہ کیا جائے گا اور نہ لیگ کی
منظوری اور رضا و رغبت کے بغیر حکومت برطانیہ اور برطانوی پارلیمنٹ کوئی دستور مرتب
اور منظور کرے گی۔" وائسرائے نے اس کا حوصلہ افزا جواب دیا اور فوراً ہی قائداعظم
اور وائسرائے کے درمیان اس موضوع پر بات چیت ہوئی۔ بات چیت کے متعلق سرکاری
اعلان میں کہا گیا تھا کہ "ہز ایکسیلنسی نے مسٹر جناح کو یقین دلایا ہے کہ حکومت تمام اقلیتوں
کے جائز مفادات کے تحفظ کی ضرورت سے پوری طرح باخبر ہے اور یہ اندیشہ بے بنیاد ہے
کہ حکومت مسئلے کی اہمیت کو نظرانداز کر دے گی۔" جناح صاحب کے خیال میں یہ بیان
تسلی بخش نہ تھا۔ ۲۳ فروری ۱۹۴۰ء کو وائسرائے کے نام ایک مکتوب میں انھوں نے
لکھا: "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس سے مسلم لیگ کے پیش کردہ نکات کی
صراحت نہیں ہوتی کیونکہ اس طرح ہندوستان کے نوکروڑ مسلمانوں کی پوزیشن بس یہ رہ گئی
ہے کہ ان سے صلاح مشورہ تو کیا جائے گا مگر برطانوی ہند کے مستقبل کے بارے میں
قطعی فیصلہ برطانیہ عظمیٰ کرے گا۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم یہ پوزیشن تسلیم نہیں کر سکتے۔
ہماری منظوری اور رضامندی کے بغیر کسی پارٹی سے ہندوستان کے آئندہ دستور یا کسی

عبوری حل کے متعلق کوئی وعدہ نہ کیا جائے " اس بے نتیجہ بات چیت کی گونج دارالامرا
میں سنائی دی اور یکم اپریل ۱۹۴۰ء کو وزیر ہند نے اس سلسلے میں ایک بیان دیا اور
انھوں نے جو یقین دہانیاں کرائی تھیں ، وائسرائے نے جناح صاحب کو ان سے مطلع
کیا۔ وزیر ہند کے بیان اور وائسرائے کے مکتوب پر غور کرنے کے لیے مسلم لیگ کی ورکنگ
کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اس کے بعد ۲۱ اپریل کو جناح صاحب اور وائسرائے کے درمیان
ایک اور ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے بعد قائد اعظم نے یکم جولائی کو وائسرائے کو
مندرجہ ذیل نکات تحریر کیے۔

۱۔ حکومت ایسا کوئی بیان نہیں دے گی جو شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں مسلم
ریاستوں کے قیام کے متعلق قرارداد لاہور کے بنیادی اصولوں کے منافی ہو۔

۲۔ حکومت مسلم لیگ کی پیشگی منظوری اور رضامندی کے بغیر کوئی عبوری یا قطعی
سکیم نافذ نہیں کرے گی۔

۳۔ حکومت برطانیہ کی جنگی کوششوں میں ہاتھ بٹایا جائے گا بشرطیکہ حکومت مسلم
قیادت کے ساتھ مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مساویانہ سلوک کرے۔

۴۔ دوران جنگ تک وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کی جائے تاکہ مسلمانوں
کو ہندوؤں کے مساوی نمائندگی مل جائے ، بشرطیکہ کانگریس کونسل میں شرکت پر آمادہ
ہو ، ورنہ کونسل میں مسلمانوں کی اکثریت ہونی چاہیے۔

۵۔ وائسرائے کی صدارت میں کم از کم پندرہ ممبروں پر مشتمل جنگی کونسل بنائی جائے۔
اس کونسل میں مسلمانوں کو ہندوؤں کے برابر (سات) نشستیں دی جائیں۔ اگر کانگریس جنگی
کونسل میں شرکت پر آمادہ نہ ہو تو مسلمانوں کو ہندوؤں سے زیادہ نشستیں دی جائیں۔

۶۔ صرف مسلم لیگ ہی مسلمانان ہند کی واحد نمائندہ تنظیم کی حیثیت سے تمام مسلمان نمائندوں
کا انتخاب کرے گی۔

۶ر جولائی ۱۹۴۰ء کو وائسرائے نے ایک بیان جاری کیا جس میں مسلم لیگ کے مطالبات کو کم و بیش مسترد کر دیا گیا تھا۔ تاہم انھوں نے حکومت برطانیہ کی جانب سے یہ وعدہ کیا کہ جنگ ختم ہونے پر نیا دستور مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنائی جائے گی جس میں ہندوستان کی قومی زندگی کے تمام عناصر کو نمائندگی دی جائے گی۔ بعد میں مسٹر ایمری نے دارالعوام میں ہندوستان کی صورتِ حال اور جناح وائسرائے مذاکرات کے متعلق ایک جامع بیان میں مسلم لیگ کے مطالبات پر برطانوی حکومت کے موقف کی وضاحت کی۔

مسٹر ایمری کے بیان اور وائسرائے کی یقین دہانیوں پر غور کرنے کے لیے مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا اور کمیٹی نے طے کیا کہ آئندہ دستور کی بابت وائسرائے کا اعلان تسلی بخش ہے مگر کمیٹی نے وائسرائے کی یہ پیش کش مسترد کر دی کہ لیگ ایگزیکٹو کونسل کے لیے چار ممبروں کے جو نام تجویز کرے گی ان میں سے صرف دو ممبروں کو کونسل کا رکن بنایا جائے گا۔ ورکنگ کمیٹی نے جنگی کونسل کے متعلق بھی اسی قسم کی پیشکش مسترد کر دی۔ جناح صاحب اور وائسرائے میں مزید گفت و شنید ہوئی مگر کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۲۹ر ستمبر ۱۹۴۰ء کو قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ایک اجلاس میں اس بات کی صراحت کی کہ برطانوی حکومت اقتدار سے دستبردار ہونا نہیں چاہتی، اور وہ نو کروڑ مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ انھوں نے کانگریس اور انگریزوں کو متنبہ کیا کہ اب مسلمانوں کو علیحدہ "قوم" کی حیثیت سے اپنا وجود منوانا ہی پڑے گا۔

۱۹۴۰ء کے آخری ایام میں کانگریس نے حکومت سے جنگی سرگرمیوں اور ہندوستان کی دستوری ترقی کے سلسلے میں اپنی شرائط منوانے کی غرض سے انفرادی نوعیت کی تحریک سول نافرمانی شروع کر دی۔ قائداعظم کو اندیشہ تھا کہ انگریزوں کو چونکہ اس تباہ کن جنگ کے دوران میں بہرطور ہندوستان کی مدد درکار ہے اس لیے کہیں وہ حکومت اطلوعاً و کرہاً کانگریس کے دباؤ میں نہ آجائیں۔ قائداعظم کی صدارت میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد

ہوا اور کونسل نے طے کیا کہ تحریک سول نافرمانی کا مقصد حکومت کو سمجھوتہ کرنے پر مجبور کرنا ہے تاکہ جو کچھ طے ہو اس میں صرف کانگریس اور برطانوی حکومت فریق ہوں اور اس طرح مسلم لیگ کو سرے سے نظرانداز کر دیا جائے۔ کونسل نے حکومت کو متنبہ کیا کہ اگر اس نے کانگریس کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے تو مسلم لیگ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرنے کے لیے جوابی کارروائی سے دریغ نہ کرے گی۔

۱۹۳۷ء میں کانگریس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں قطعی اکثریت حاصل ہو گئی تھی اور دو صوبوں میں چند ہندو جماعتوں اور دوسرے افراد کے تعاون سے وہ اکثریتی پارٹی بن گئی تھی۔ کانگریس کے ہاتھ میں ترپ کے پتے تھے اور کانگریسی دورِ اقتدار میں مسلمانوں کو اس سے کئی سنگین شکایتیں پیدا ہو گئی تھیں۔ بنگال اور پنجاب میں اگرچہ دو مسلمان، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان، وزرائے اعلیٰ کے منصب پر سرفراز تھے تاہم ان کی وزارتیں لیگی وزارتیں نہ تھیں۔ ایوان میں اکثریت حاصل کرنے کی غرض سے انھیں ہندو ممبروں کی تائید وحمایت کی ضرورت تھی اس لیے وہ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوئے۔ لیکن عام انتخابات کے بعد مسلم لیگ، مسلمانوں میں بڑی تیزی سے مقبول ہو رہی تھی اور ان دونوں اہم صوبوں کے عوام مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہو رہے تھے۔ مگر ایوان سے باہر جو حالات ہوتے ہیں ایوان پر انھیں منطبق نہیں کیا جا سکتا۔ بنابریں اس حقیقت کے باوجود کہ مسلمان جوق در جوق مسلم لیگ میں شامل ہو رہے تھے، اسمبلیوں میں ان کے نمائندوں کا تعلق ایسی جماعتوں سے تھا جن میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔

اکتوبر ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں مسلم لیگ کا اجلاس منعقد ہوا اور پنجاب۔ اور بنگال کی قانون ساز اسمبلیوں کے متعدد مسلم نمائندوں نے اس میں شرکت کی۔ اب کسی شک وشبہے کے بغیر یہ کہا جا سکتا تھا کہ مسلم لیگ ایک نئی قوت کی حیثیت سے ہندوستانی سیاسیات کے افق پر ابھر رہی ہے۔ اگرچہ ان دونوں صوبوں کے وزرائے اعلیٰ مسلم لیگ کے باضابطہ رکن نہ

تھے تاہم انھوں نے لکھنؤ اجلاس میں شرکت کی۔ مسلم لیگ کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہو رہا تھا۔ قائدِ اعظم دونوں صوبوں کے وزرائے اعظم کی حمایت حاصل کرنے میں سرگرم تھے، اور بالآخر مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات نے اپنے حامیوں کے ساتھ مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کر دیے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ وہ قانون ساز اسمبلیوں میں اپنی اپنی غیر فرقہ وارانہ پارٹیاں توڑ کر مسلم لیگ اسمبلی پارٹیاں بنائیں گے۔ قائدِ اعظم اور ان کے درمیان چند امور پر اتفاق رائے ہو گیا تھا اور بحالات موجودہ یہی بہت تھا۔

بنگال میں مولوی فضل الحق کے ساتھ شہید سہروردی اور خواجہ ناظم الدین کل ہند قائدین کی حیثیت سے اُبھر رہے تھے۔ بعد میں ان تینوں نے نہ صرف بنگال کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کے پرچم تلے یکجا کیا بلکہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

صوبہ سرحد میں خان برادران، ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کا رجحان واضح طور پر کانگریس کی طرف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی اکثریت کے صوبے سرحد میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگریسی وزارت قائم ہو گئی۔

مسلمانوں کے ایک اور اکثریتی صوبہ سندھ میں ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد صورت حال مبہم اور غیر یقینی تھی۔ انتخابات لڑنے کے لیے سر شاہنواز بھٹو اور حاجی سر عبداللہ ہارون نے پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرز پر سندھ یونائیٹڈ پارٹی بنائی تھی۔ اس نے اسمبلی کی ساٹھ نشستوں میں سے ۲۲ نشستیں جیت لیں، لیکن پارٹی کے لیڈر اور ڈپٹی لیڈر یعنی سر شاہنواز بھٹو اور سر عبداللہ ہارون ہار گئے۔ کانگریس کو صرف سات نشستیں ملیں مگر بعد میں کچھ آزاد ہندو ممبروں کی شمولیت کے بعد کانگریس کے ممبروں کی تعداد گیارہ ہو گئی۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کی مسلم پولیٹیکل پارٹی کو تین اور شیخ عبدالمجید سندھی کی آزاد پارٹی کو بھی تین نشستیں ملیں۔ سندھ کے گورنر نے سر غلام حسین ہدایت اللہ کو وزارت بنانے کے لیے کہا اور ۲۷ اپریل ۱۹۳۷ء کو سندھ اسمبلی کا پہلا اجلاس منعقد ہوا۔ پہلے دن ہی یہ ظاہر

ہو گیا کہ ان کی وزارت کا کوئی واضح پروگرام یا پالیسی نہیں ہے۔ خان بہادر اللہ بخش کی قیادت میں سندھ یونائیٹڈ پارٹی اور کانگریس پارٹی دونوں مخالف بنچوں پر تھیں۔ سر غلام حسین نے یونائیٹڈ پارٹی کی حمایت حاصل کرنا چاہی اور معاوضے میں اسے دو وزارتوں کی پیشکش کی۔ مگر اس نے تین وزارتوں کا مطالبہ کیا۔ بات چیت ناکام ہو گئی اور سر غلام حسین کو وزارت اعلیٰ سے ہاتھ دھونا پڑے۔ سندھ یونائیٹڈ پارٹی اور کانگریس کے مشترک عمل سے سر غلام حسین کی وزارت ختم ہو گئی تو سندھ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر اللہ بخش کو نئی حکومت بنانے کی دعوت دی گئی۔ کانگریس اس وزارت سے الگ رہی مگر اس نے اللہ بخش کی حکومت کی تائید کا وعدہ کر لیا۔ اس حمایت کے عوض اللہ بخش کو کانگریس کی متعدد شرطیں پوری کرنی پڑیں اور لہٰذا اب ان میں ایک اور کانگریسی وزیر اعلیٰ میں کوئی امتیاز باقی نہ رہا۔ اللہ بخش کی وزارت کو مضبوط بنانے کے لیے سردار پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد نے سندھ کا دورہ کیا اور یوں حکومت سندھ کے پالیسی سازی کے شعبے میں کانگریس کا اثر و نفوذ بڑھ گیا۔

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں لیگ کے صدر محمد علی جناح کو مرکزی اسمبلی میں جلد از جلد مسلم لیگ پارٹی بنانے کے لیے ضروری اقدامات کرنے کا اختیار دیا گیا تھا نیز انھیں اس کا مجاز بھی کیا گیا تھا کہ وہ ہر ایسی پارٹی یا گروپ سے اشتراک عمل کر سکتے ہیں جس کی پالیسی کم و بیش آل انڈیا مسلم لیگ کی پالیسی کے مماثل ہو۔ صوبائی اسمبلیوں کے سلسلے میں بھی لیگ کا صدر اسمبلی پارٹیاں بنانے کا مجاز تھا۔

کچھ عرصے بعد قائد اعظم نے مسلم لیگ کے اجلاس کلکتہ کی صدارت کرتے ہوئے اس ضمن میں فرمایا: "گیارہ صوبائی اسمبلیوں میں سے سات میں مسلم لیگ اسمبلی پارٹیاں موجود ہیں۔ ساتوں اسمبلیوں کے مسلمان ممبروں کی بھاری اکثریت مسلم لیگ پارٹیوں کے ساتھ ہے اور ان پارٹیوں کے اراکین کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ مسلم لیگ کو مختلف صوبوں میں قانون ساز اسمبلیوں کے ضمنی انتخاب میں شاندار کامیابی حاصل ہوتی ہے۔"

اکتوبر ۱۹۳۸ء میں جناح صاحب سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس کے اجلاس کی صدارت کے لیے کراچی تشریف لائے تو انھوں نے سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کی تشکیل کی تاکہ کم از کم ایک صوبے ہی میں پرا عتبار سے مسلم لیگی وزارت بنائی جاسکے۔ اس وقت خان بہادر اللہ بخش سندھ کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ انھوں نے قائدِاعظم سے ملاقات کی اور بنگال اور پنجاب کے وزرائے اعلیٰ مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات کی موجودگی میں مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کردیے۔ انھوں نے یہ بھی قبول کرلیا کہ وہ استعفا دے دیں گے۔ لیگ پارٹی اتفاق رائے سے اسمبلی میں اپنا کوئی لیڈر منتخب کرے۔ اگر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو جناح صاحب وزیرِ اعلیٰ نامزد کرسکتے ہیں مگر کانگریس ہائی کمان نے اللہ بخش پر دباؤ ڈالا اور دوسرے دن ہی وہ اس سمجھوتے سے منحرف ہوگئے۔ انھوں نے سمجھوتہ قبول کرنے کے لیے یہ شرط عائد کی کہ مسلم لیگ پہلے یہ قبول کرے کہ وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے میں بدستور کام کرتا رہوں گا۔ قائدِاعظم ہر قیمت پر مسلمانوں کا اتحاد چاہتے تھے۔ ان کی ہدایت پر اسمبلی کے ۲۷ مسلمان ممبروں نے اللہ بخش کی یک طرفہ شرائط قبول کرلیں۔ تاہم اللہ بخش پر کانگریس کا دباؤ اتنا زیادہ تھا کہ انھوں نے مسلمان ممبروں کی یہ پیشکش بھی مسترد کردی۔ کراچی سے روانہ ہوتے وقت قائدِاعظم نے کہا: "جہاں تک ہمارا تعلق ہے، مجھے خوشی ہے کہ ہم نے سندھ اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی بنالی ہے۔"

اسمبلی کے جن ۲۷ ممبروں نے مسلم لیگ کے عہد نامے پر دستخط کیے تھے، ان میں سے ۲۰ مسلم لیگ سے علیحدہ ہوکر اللہ بخش کی پارٹی میں شامل ہوگئے۔ صرف سات ممبر مسلم لیگ کے وفادار رہے۔ خان بہادر کھوڑو، شیخ عبدالمجید سندھی، جی ایم سیّد، مسز جے جی الانا اور سیّد خیر شاہ لیگ کے وفادار ممبروں میں شامل تھے۔ رفتہ رفتہ مسلم لیگ پارٹی کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا اور جلد ہی خان بہادر اللہ بخش کی وزارت کو شکست ہوگئی۔ اس طرح صوبہ سندھ میں مکمل لیگی وزارت نے، جو ہندوستان کے تمام صوبوں میں واحد وزارت تھی، حلف اٹھالیا۔

پٹنہ میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا تو اس میں علامہ اقبال، مولانا شوکت علی اور کمال اتاترک کے انتقال پر تعزیتی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جناح صاحب نے علامہ اقبال کے متعلق تعزیتی قرارداد پر تقریر کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا اور کہا۔ "ان کی موت مسلمانانِ ہند کے لیے ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ وہ میرے ذاتی احباب میں سے تھے اور ان کا شمار دنیا کے بہترین شعراء میں ہوتا ہے۔ جب تک اسلام زندہ ہے، ان کا نام بھی زندہ رہے گا۔ ان کی شاعری مسلمانوں کی حقیقی امنگوں کی ترجمان ہے اور ہم اور ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس سے وجدان حاصل کرتی رہیں گی۔" اپنے خطبۂ صدارت میں انھوں نے کانگریسی وزارتوں کی ان ناانصافیوں کا ذکر کیا جو مسلمانوں کے ساتھ کی گئی تھیں اور کہا کہ یہ ناانصافیاں مظالم سے کسی صورت کم نہیں۔ لیکن مسلمان اس سے مرعوب نہیں ہوں گے۔ "مسلمانوں اور مسلم لیگ کی حامی اور مددگار صرف اور صرف مسلمان قوم ہے...... مسلمان زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں بیداری پیدا ہو رہی ہے...... اگر آپ اپنی توانائیوں سے کام لیں اور ایک منظم فوج کی طرح اپنی طاقت کو بروئے کار لائیں تو آپ کامیاب و کامران ہوں گے۔"

مسلمان برابر آگے بڑھ رہے تھے اور اب خود کو اقلیت سمجھ کر تحفظات و مراعات کی بھیک نہیں مانگ رہے تھے۔ ان کا سیاسی فکری افق واضح تر ہو گیا تھا اور ان کے سیاسی مقاصد میں کوئی ابہام نہ رہا تھا۔ یہ بات صاف تھی کہ اگر نو کروڑ مسلمان متحد ہو جائیں تو وہ ایک عظیم قوت بن سکتے ہیں۔ قائداعظم ان کے مستقبل سے پُرامید تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ مسلمانوں کی قیادت ان کا مقدر بن چکی ہے۔ اب ان میں ایک نئی قوت اور ایک نیا ایقان پیدا ہو گیا تھا۔ وہ اس خلوص اور لگن کے ساتھ، جو کسی صاحبِ مشن کو دوسرے لوگوں سے ممتاز کرتی ہے، حصولِ مقصد کے لیے سرگرمِ عمل ہو گئے۔

مسلمان ایک قوم ہیں

تاریخ کے اہم اور دور آفریں واقعات کی تشکیل ان پیش رو اسباب و وقائع کے طویل سلسلے کی رہینِ منت ہوتی ہے جو، غیر محسوس طور پر، ان واقعات کی طرف تاریخ کے دھارے کا رخ موڑتے رہتے ہیں۔ عبوری دور میں، ہو سکتا ہے کہ، منزلِ مقصود ہی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے لیکن تاریخی تسبیب و تعلیل کی اندھی طاقتوں کی پیش قدمی برابر جاری رہتی ہے اور منزل کے گم ہو جانے کا یہ احساس، جو بسا اوقات انسانی ذہن کو جکڑ لیتا ہے، اچانک منزل تک پہنچنے کی شعوری کوشش کا روپ دھار لیتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریکیوں کے بادل چھٹ گئے ہیں اور امید کا چمکتا دمکتا سورج اپنے جلو میں مسرت و شادمانی لیے طلوع ہو گیا ہے ——— برّ صغیر کے مسلمانوں کی اس جد و جہد نے، کہ انھیں ایک علیحدہ قوم کا درجہ دیا جائے اور جس کے نتیجے میں پاکستان قائم ہوا، کئی نشیب و فراز دیکھے اور ان گنت رستے اختیار کیے۔ اس راہ میں بارہا مشکل مقام بھی آئے اور امید افزا بھی۔

ہندوستان میں آغازِ اسلام ہی سے مسلمانوں کو مشکل صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا وہ اسی سرزمین کے فرزند بن گئے تھے اور اس کی وفاداری اُن کا فرض تھا مگر مقامی اکثریتی آبادی اس قدر سخت گیر اور تنگ نظر تھی کہ مسلمانوں کو محسوس ہوا کہ نسلی برتری کے احساس کے شکار معاشرہ میں ان کے لیے کوئی باعزت مقام موجود نہیں ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد محض ایک تاریخی اتفاق تھا جس نے بعد میں اس سرزمین کو فتح کرنے کی خواہش کا روپ دھار لیا جہاں دولت کی ریل پیل تھی۔ اسلامی لشکر اور ہندو افواج میں جنگ ہوئی۔ مقامی حکومتیں ان یلغاروں کا مقابلہ نہ کر سکیں اور غیر ملکی حکمرانوں نے ان کی جگہ لے لی۔ اسلام چونکہ ایک تبلیغی مذہب تھا لہٰذا اس سرزمین پر اس کی تیزی سے نشو و نما ہوئی اور

قائدِ اعظم اور اراکین مجلس عاملہ، لاہور میں ایک نجی ظہرانہ کے موقع پر۔ قرارداد پاکستان اسی روز منظور ہوئی تھی۔

مقامی باشندے جوق در جوق دائرۂ اسلام میں شامل ہونے لگے۔ دونوں فرقوں کے درمیان خلیج وسیع تر ہوتی رہی اور یہ خلیج بڑھتے بڑھتے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک بحر بیکراں بن گئی۔ مسلمانوں کی ابتدائی فتوحات کے بعد کچھ ہندو سلطنتوں اور خاندانوں نے شکست کا انتقام لیا اور کئی مسلمان خاندان ان کے زیر نگین آگئے۔ اس طرح باہمی عناد کا جذبہ پروان چڑھا اور سترھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے داخلی حالات نے مغربی طاقتوں کے لیے ہندوستان کے اقتصادی استحصال اور مسلح لشکر کشی کا موقع فراہم کردیا۔

اس میدان میں خاص طور پر انگلستان، فرانس اور پرتگال ایک دوسرے کے رقیب تھے۔ بالآخر انگریز اپنی تجارتی برتری قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے سیاسی غلبہ، اقتدار کا راستہ ہموار کرلیا۔ خانہ جنگیوں، خاندانی رقابتوں اور روایاتی عداوتوں کے نتیجے میں ہندوستان انگریزوں کے اقتدار کے خلاف مزاحمت نہ کرسکا اور آخرکار برطانوی مقبوضہ بن گیا۔ انگریزوں نے یہاں جو نظام حکومت رائج کیا اس کے بموجب ہندوستان بظاہر ایک سیاسی وحدت تھا جس کو انھوں نے سیاسی ادارے قائم کر کے مضبوط کیا اور یوں ہندوستان پر تاج برطانیہ کے تسلط کی مہر لگ گئی۔ محکوم قوم سے انگریزوں کو توقع تھی کہ وہ طوق غلامی کی شان میں قصیدہ خواں ہوگی اور سامراجی آقاؤں کے پیچھے کتوں کی طرح دم ہلانے والے غلام تلاش کرلینا کچھ مشکل نہ تھا۔ وقتاً فوقتاً ان کے خلاف اکا دکا صدائے احتجاج بلند ہوتی تو اس کو نہایت بیدردی سے ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جاتا۔ محب وطن عناصر کو غیر ملکی اقتدار کے سامنے سر جھکانے سے انکار کے بدلے ظلم و ستم، قید و بند اور لیا اوقات سولی نصیب ہوتی۔

اس سلسلے میں مسلمان دو محاذوں پر جدوجہد کر رہے تھے۔ ایک طرف یہ مزاحمت برطانوی سامراج کے خلاف تھی اور دوسری طرف جنگجو ہندوؤں کی اس روزافزوں خواہش کے خلاف کہ اکثریتی اقتدار کے پردے میں مسلمانوں کو اپنا محکوم بنایا جائے۔ انگریزوں نے جو سیاسی ادارے قائم کیے تھے وہ ہندوؤں کی حوصلہ افزائی کر رہے تھے۔ عددی، سماجی، اقتصادی اور سیاسی

تنظیم و قوت، کی برتری کی وجہ سے ہندو ہر شعبۂ زندگی میں مسلمانوں پر چھا گئے تھے اور یوں دونوں فرقوں کے درمیان مستقل تنازع پیدا ہو گیا۔ دور اندیش مسلم مفکروں اور سیاسی رہنماؤں نے محسوس کیا کہ انگریزوں نے ہندوستان میں جس طرز کی جمہوریت قائم کی ہے اس کے تحت مسلمان متحدہ ہندوستان میں پروقار اور باعزت مقام حاصل نہ کر سکیں گے۔ ان میں سے چند رہنماؤں کو یہ اندیشہ تھا کہ ان حالات میں مسلمان صرف اسی حیثیت سے زندہ رہ سکتے ہیں کہ وہ اپنی مخصوص انفرادیت ختم کر دیں اور مستقلاً اقلیت کی حیثیت منظور کر کے اپنی وحدت کو ہندوستانی قومیت میں ضم کر دیں۔

یہ تھی وہ بحرانی کیفیت جس سے مسلمان سیاسی مفکرین دوچار تھے اور اس تنگ و تاریک گلی سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے تھے جس پر اقلیت کا بورڈ لگا تھا۔ تقریباً سو سال تک اس الجھن و پریشانی کا کوئی حل نہ مل سکا اور پھر سرگوشیاں ہونے لگیں، مسلمانوں کو ان خطرات سے آگاہ کیا گیا، کبھی کبھی خوف و ہراس کی ان فصیلوں کے پیچھے سے ایک آواز بلند ہوتی کہ مسلمانوں کو علیحدہ قوم تسلیم کر کے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ مستقل بنیاد پر حل کیا جائے —— اور بالآخر قائداعظم کی قیادت میں لاکھوں مسلمانوں نے بیک آواز یہ نعرہ بلند کر دیا: "ہم پاکستان چاہتے ہیں"۔ ہزاروں مسلمان، مسلم لیگ کا پرچم لیے، سڑکوں پر گشت کرنے لگے۔ ملک بھر میں اس نعرہ کی گونج سنائی دینے لگی جس کا مطلب مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن —— پاکستان تھا۔

ہندوستان پر حکومت کے دوران میں انگریزوں نے جب کبھی اصلاحات کے نشست دو طریقۂ کار پر عمل کیا، انھیں ہندو مسلم مسئلے کا سامنا کرنا پڑا اور ۱۹۰۹ء میں پہلی بار انھوں نے اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے ایسے حلقہ ہائے انتخاب قائم کیے جن میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ اس طریقۂ کار نے آگے چل کر جداگانہ انتخاب کے نام سے شہرت پائی مگر ۱۹۰۹ء سے کافی عرصہ پہلے چند برطانوی مدبرین نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ برطانوی اقتدار اور طرزِ جمہوریت کے تحت ہندوستان کو متحد کر لینا اس بدقسمت برصغیر کے مسائل کا کوئی قطعی حل نہیں ہے۔

اس ضمن میں پارلیمانی روایات کے بطلِ عظیم جان برائٹ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ۲۴ جون ۱۸۵۸ء کو اس نے دارالعوام میں ایک تقریر میں کہ "آخر انگلستان ہندوستان پر کب تک حکومت کرتا رہے گا؟ اس سوال کا جواب کوئی شخص نہیں دے سکتا۔ مگر خواہ یہ عرصہ پچاس برس ہو یا سو یا پانچ سو برس، کیا کوئی معمولی عقل و خرد کا شخص بھی اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ اتنے بڑے ملک کو جس میں بیسیوں مختلف قومیتیں آباد ہیں اور جہاں بیسیوں زبانیں بولی جاتی ہیں ایک اکائی کی حیثیت میں متحد رکھا جا سکتا ہے؟ اور میرا خیال ہے کہ یہ کبھی ممکن نہ ہوگا"[1]

پانچ سو برس تو بہت دور کی بات ہے، دارالعوام میں جان برائٹ کے بیان کے سو سال سے بھی کم عرصے میں ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم ہونا پڑا ——— پاکستان اور ہندوستان۔

جہاں تک تقاریر اور بیانات کی صورت میں تاریخی شواہد کا تعلق ہے۔ سرسید احمد غالباً پہلے مسلمان تھے جنھوں نے برِکوچک کی اس تقسیم کا اندازہ لگا لیا تھا۔ وہ مسلم ہند کی تعلیمی نشاۃ ثانیہ کے بانی تھے۔ مگر انھیں مسلمانوں کی سیاسی ترقی سے بھی یک گونہ دلچسپی تھی۔ تعلیمی ترقی کے بارے میں مسلمانوں کے نام ان کی اپیل کی بنیاد سیاسی مسائل پر تھی۔ اور یہ محض اتفاق نہیں تھا کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بعد منطقی اور ناگزیر نتیجے کے طور پر مسلم لیگ عالمِ وجود میں آئی۔ ۱۸۶۷ء میں سرسید نے کہا تھا۔ "ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے ایک قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا اب ممکن نہیں ہے۔" ہندوستان میں مسلمانوں کے مستقبل سے ان کی پالیسی کا ان الفاظ سے اظہار ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں لدھیانہ میں طالب علموں کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ مسلمان

---

[1] بحوالہ رورڈکٹ آن انڈیا۔ بیورلے نکولس۔ صفحہ ۱۹۲۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔ تھیکر اینڈ کمپنی۔ بمبئی۔

ایک قوم ہیں" اسلام کے دائرہ میں شامل تمام افراد "مسلم قوم ہیں ——— یاد رکھیے۔ کہ یہ اسلام سے وابستگی ہی ہے جو ہمیں ایک قوم کا درجہ دیتی ہے" یہ اس امر کا پہلا صاف اور واضح اعلان تھا کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔

اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ آیا سر سید احمد کے اس اعلان کا مسلمانوں اور غیر مسلموں نے کوئی اثر لیا کہ نہیں مگر ان کی دُور رس نگاہیں برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کے سیاسی اتحاد کا حشر دیکھ رہی تھی۔ انھوں نے ۱۸۸۷ء میں دوبارہ کہا "جب ہمارے ہندو بھائی ——— کوئی ایسی تحریک کرنا چاہیں جس سے ہمیں نقصان پہنچے یا ہماری قوم کی تذلیل ہوتی ہو تو ہم دوستی کے جذبے سے کام نہیں لے سکتے اور ہمارا فرض ہے کہ اپنی قوم کا تحفظ کریں"

سر سید احمد کو مسلمانوں کے مقسوم پر کامل اعتقاد تھا اور ۱۸۹۳ء میں ایک بار پھر انھوں نے پائنیر الہ آباد میں یہ لکھا کہ "ایسے طرز حکومت میں جس کا دارومدار اکثریت کی مرضی و منشا پر ہو، یہ ضروری ہے کہ لوگوں کو قومیت کے باب میں کوئی اختلاف نہ ہو ...."

ممتاز مسلمان عالم و مورخ اور "سپرٹ آف اسلام" کے مصنف سر سید امیر علی نے ۱۹۱۰ء میں لندن میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا "اس امر کو ذہن میں رکھ کر کہ دونوں عنصر (ہندو اور مسلمان) مساوی توجہ و غور و فکر کے مستحق ہیں اور یہ کہ ملک کے نظم و نسق میں دونوں عناصر کی اہمیت امر لازم ہے، نیز دونوں قوموں کے مخصوص طبائع کو سمجھ کو اور کسی ایک قوم کے مفاد یا خواہشات کو دوسری قوم پر فوقیت نہ دے کر ہی آپ مجوزہ اصلاحات کو کامیاب بنا سکتے ہیں"[1]

جس وقت دارالعوام میں مورلے منٹو اصلاحات پر بحث ہو رہی تھی۔ لارڈ مورلے

---

[1] بحوالہ فائل نیز جمیل الدین احمد۔ صفحہ ۱۱۷، مطبوعہ ۱۹۶۴ء۔ شائع کردہ مصنف۔ کراچی

وزیر ہند تھے (۱۹۰۵ از تا ۱۹۱۰ء) لارڈ مورلے اعلیٰ پایہ کے عالم تھے اور انھوں نے ہندوستان کی فرقہ وارانہ کشیدگی کا بغائر مطالعہ کیا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مشکل کوئی بات شترک ہے اور انگریزوں کے مسلّط کردہ سیاسی اتحاد ہی کے سبب دونوں فرقے مل جل کر رہتے ہیں۔ ایک موقع پر انھوں نے کہا تھا "ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اسلام اور ہندومت کے درمیان صرف مذہبی عقائد و اصولوں ہی کا فرق نہیں ہے۔ دونوں مذاہب میں طرز زندگی، روایات، تاریخ اور ان سماجی امور کا فرق ہے جس سے کوئی فرقہ متشکل ہوتا ہے۔ ہمیں یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ ہندو مسلمانوں کے مسئلے کا ذکر کرتے وقت ہمارے پیش نظر عظیم تاریخی اختلافات ہیں۔ ہمیں اُن زبردست قوتوں کا سامنا ہے جنھوں نے صدیوں پُر عظمت مملکتوں کی تقدیریں اور لاکھوں انسانوں کی قسمتیں بنائی ہیں۔"

وزیر اعظم انگلستان کی حیثیت سے اسکوتھ نے جداگانہ انتخاب کی منظوری کے وقت بحث کے دوران میں کہا تھا "ہندو مسلمانوں میں صرف مذہب ہی مابہ الامتیاز نہیں ہے۔ بلکہ اس کی تہہ میں تاریخی ماضی کی روایات موجود ہیں۔"

پہلی جنگ عظیم شباب پر تھی اور ہر طرف تباہ کاری کار فرما تھی اور ۱۹۱۷ء میں اسٹاک ہوم میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کے ایجنڈے میں یہ بات خاص طور سے شامل تھی کہ دنیا میں امن کے قیام کے لیے کیا تدابیر اختیار کی جائیں اور اس امن کو کیونکر پائیدار بنایا جائے۔ کانفرنس میں ہندوستان کی نمائندگی چار طالب علموں، ویریندر ناتھ چٹوپادھیہ، ایم اچاریہ، جبّار خیری اور ستار خیری نے کی۔ اوّل الذکر دو حضرات نے کہا کہ ہم ہندوستان کے انقلابی گروپوں کی نمائندگی کرتے ہیں اور انگریزوں سے مکمل آزادی کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے کہا کہ عالمی امن کے سلسلے میں اگر کوئی بین الاقوامی کانفرنس منعقد ہو تو ہندوستان کی نمائندگی ایک ایسا وفد کرے جسے اہل ہند کا مکمل اعتماد حاصل ہو۔

جبار خیری اور ستار خیری نے جو خیری برادران کے نام سے مشہور ہیں، کانفرنس کے شرکا میں "مسلم محبان ہند" کی مرکزی کمیٹی کی طرف سے ایک یادداشت کی نقلیں تقسیم کیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ جب تک تمام ممالک آزاد نہیں ہوتے، جنگ ختم ہونے کے بعد مستقل اور پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔ انگریزوں کو اہل ہند پر ظلم و ستم روا رکھنے اور ایک ایسے ملک کو غلام بنائے رکھنے کا کوئی حق نہیں ہے جس کی آبادی ساڑھے تین کروڑ یعنی دنیا کی مجموعی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔ خیری برادران نے کہا کہ ہندوستانی عوام خود حکومت کرنے کے اہل ہیں اور ہندوستان کی آزادی کے خلاف یہ دلیل کہ یہ سرزمین کئی مذاہب و زبانوں کا گہوارہ ہے، ہندوستان کو اس کے بنیادی حق سے محروم رکھنے کا محض ایک بہانہ ہے۔" خیری برادران نے جس طرزِ حکومت کی وکالت کی تھی وہ وفاقی طرز کی حکومت تھی جس میں مختلف آزاد و خود مختار صوبے شامل تھے۔ یادداشت کے آخر میں کہا گیا تھا۔ "حق و انصاف کی سربلندی و برتری کے لیے یہ ضروری ہو گا کہ کچھ مسلم ریاستیں، جنھیں ختم کر دیا گیا ہے، از سر نو قائم کی جائیں۔ مثلاً بنگال، اودھ، سندھ، کرناٹک، مدراس، میسور وغیرہ کی اسلامی ریاستیں ——— اور اس سلسلے میں دہلی کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے[1]۔"

خیری برادران نے جس آزاد ہندوستان کے منصوبے کی وضاحت کی تھی وہ مطالبہ پاکستان سے مختلف النوع تھا۔ انھوں نے وفاقِ ہندوستان کی حمایت کی تھی جو نظریۂ پاکستان سے بالکل مختلف نظریہ تھا مگر انھوں نے وفاقِ ہندوستان کے نظریے میں یقیناً آزاد اور خود مختار اسلامی ریاستوں کو شامل کیا تھا اور ان کی یادداشت سے یہ واضح ہے کہ انھیں یہ گوارا نہ تھا کہ مسلمانوں

---

[1] مذکرہ بالا بیان سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس منعقدہ ۱۹۱۷ء کے سیکرٹری جنرل کامل ہوئیس مان کی فرانسیسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ یہ کتاب اس کانفرنس کی کارروائی کی رُوداد پر مبنی ہے۔

کو ہندوستان میں اقلیت کی حیثیت تسلیم کر لینا چاہیئے

جنگ کے بعد ستار خیری ہندوستان واپس آئے۔ پولس سائے کی طرح ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور یورپ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے انھوں نے جن سیاسی خیالات کی تشہیر کی تھی، اس کی پاداش میں انھیں بڑی مصیبتیں جھیلنا پڑیں۔ تاہم وہ علی گڈھ یونیورسٹی میں چند برس تک جرمن اور فرانسیسی زبانوں کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور بعد میں مسلم لیگ کی شاخ علی گڈھ کے صدر ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر محبِ وطن کو غیر ملکی حاکموں کے خلاف آواز بلند کرنے کی جو قیمت ادا کرنی پڑتی ہے وہ ایک انعام کی حیثیت رکھتی ہے۔ جن لوگوں نے بے خوفی اور جرأت کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی حمایت کی تھی، انگریزوں نے انھیں جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں ٹھونس دیا اور ستار خیری بھی بے خوف محبِ وطن افراد کے اسی خانوادہ سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں انھیں دو سال تک ڈیرہ دون جیل میں نظر بند رکھا گیا جہاں پنڈت جواہر لال نہرو بھی قید تھے۔ پروفیسر ستار خیری کا قیامِ پاکستان سے دو سال پہلے ستمبر ۱۹۴۵ء میں انتقال ہوا۔

مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کا تصور علامہ اقبال کے ذہن سے ایک لمحے کے لیے بھی محو نہ ہوا اور ان کی تحریر، تقاریر اور کلام میں ہر جگہ یہ موضوع موجود ہے۔ یوں ظاہر ہوتا ہے کہ ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کے وجود کا نظریہ جو سیاسی اعتبار سے ہندوستان کے دوسرے فرقوں سے بالکل الگ ہو، رفتہ رفتہ ان کے ذہن میں قطعی صورت اختیار کر رہا تھا۔ عظیم خوابوں اور نظریات کی تکمیل میں کچھ وقت درکار ہوتا ہے اور تکمیل تک تلاش تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ اقبال نے اپنے ہم عصروں کے مقابل کہیں زیادہ واضح انداز میں مسلمانوں کے مستقبل کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اس نظریے کو الفاظ کا روپ دینے میں انھیں کچھ وقت لگا اور ۱۹۳۰ء میں انھوں نے کل ہند مسلم لیگ

کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچا دیا۔ علامہ نے اس موقع پر اپنے خطبۂ صدارت میں کہا کہ پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کے مسلم اکثریت والے صوبوں کو ملا کر شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک وطن بنایا جائے جہاں وہ ایک ممتاز قومی وحدت کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں اور ان پر ہندو تسلط کا اندیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ یہ امر مشکوک ہے کہ اس وقت لوگوں کی غالب تعداد نے اقبال کے نظریے پر سنجیدگی سے غور کیا ہوگا۔ تاہم جب بھی موقع ملا وہ یہ نظریہ پیش کرتے رہے تا اینکہ انھیں گول میز کانفرنس میں مدعو کیا گیا۔ کانفرنس میں اپنی ایک تقریر میں انھوں نے اعلان کیا کہ انگریز اگر ہندوستان میں اکثریت کی حکومت کی راہ ہموار کر کے یہاں سے جانا چاہتے ہیں تو وہ اس ملک کو خونریز خانہ جنگی کے رحم و کرم پر چھوڑ جائیں گے۔ اگر اس صورت حال کو روکنا مقصود ہے تو مسلمانوں کے وطن کا قیام ناگزیر ہے۔

۱۹۳۰ء میں بمقام الٰہ آباد انھوں نے جو خطبۂ صدارت پڑھا، اس میں مسلم قومیت کا تصور نمایاں ہے۔ علامہ اقبال نے فرمایا:۔ "اس کے مذہبی نصب العین کا تعلق بنیادی طور پر اس سماجی نظام سے ہے جو اسلام نے تشکیل دیا ہے۔ ایک بات کو مسترد کرنا دوسری بات کو مسترد کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے قومی بنیاد پر کوئی ایسی مملکت بنانا جس کا مطلب اسلامی اصولِ اتحاد میں کتر بیونت کرنا ہے، ایک مسلمان کے لیے ناقابلِ تصور ہے ـــــ لہٰذا ہندوستانی قوم کے اتحاد کو نفی میں نہیں بلکہ باہمی میل جول اور تعاون میں تلاش کرنا چاہیے ـــــ اور اس سلسلے میں اتحاد کی بنیاد کی تلاش ہی پر ہندوستان اور ایشیا کے مستقبل کا انحصار ہے۔"

انھوں نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا: "مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر یہ اصول کہ ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے وطن میں اپنی تہذیب و روایات کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہے، فرقہ وارانہ کشیدگی کے مستقل حل کے طور پر تسلیم کر لیا جائے تو

ہندوستانی مسلمان ہندوستان کی آزادی کے لیے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے کو تیار ہوں گے۔

ایک دور اندیش مدبّر کی حیثیت سے انھوں نے کہا۔ ہندوستانی معاشرہ کی اکائیاں یورپی ملکوں جیسی علاقائی نوعیت نہیں رکھتیں مختلف فرقوں کے وجود کو تسلیم کیے بغیر، یورپی جمہوریت کے اصولوں کا اطلاق ہندوستان پر نہیں کیا جا سکتا اس لیے مسلمانوں کا یہ مطالبہ قطعی جائز ہے کہ ہندوستان میں مسلم ہند کی تشکیل کی جائے۔ —— میں چاہتا ہوں کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنائی جائے —— انبالہ ڈویژن اور کچھ ایسے ضلعوں کو خارج کرنے سے جہاں غیر مسلم غالب تعداد میں ہیں، اس ریاست میں مسلمانوں کی زیادہ اکثریت ہو جائے گی۔ اس طرح شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو ہندوستان کے جسدِ سیاسی میں ترقی کرنے کا پورا موقع ملے گا اور وہ بیرونی حملے کی صورت میں ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے خواہ یہ فوجی یلغار ہو یا نظریاتی —— میرے خیال میں خود مختار ہندوستان میں وحدانی طرزِ حکومت ناقابلِ تصوّر ہے خصوصی اختیارات خود مختار ریاستوں کو تفویض کر دینے چاہئیں اور مرکزی وفاقی ریاست کو صرف ان اختیارات کا استعمال کرنا چاہیئے جو وفاقی ریاستوں نے برضا و رغبت اسے سونپے ہوں۔"

جس وقت لندن میں گول میز کانفرنس ہو رہی تھی، کیمبرج میں ایک نوجوان مسلم طالب علم زیرِ تعلیم تھا۔ اس کا نام چودھری رحمت علی تھا۔ اس کا بیشتر وقت ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی مستقبل پر غور و فکر میں گزرتا۔ کانفرنس میں شرکت کے لیے جو مسلمان زعما لندن آئے، چودھری رحمت علی نے اُن سے ملاقات کی اور اس سلسلے میں اقبال نے اسے بہت متاثر کیا۔ عام خیال ہے کہ لفظ پاکستان کی ترتیب و تدوین چودھری رحمت علی کی کاوش کا نتیجہ ہے تاہم کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ چونکہ اقبال نے سب سے پہلے یہ خاکہ پیش کیا تھا لہٰذا اس کا سہرا ان کے سر بندھنا چاہیئے۔

ترک ادیبہ خالدہ ادیب خانم نے لندن اور پیرس میں ۱۹۳۶ء میں چودھری رحمت علی سے ملاقات کی تھی۔ اس وقت رحمت علی کی عمر تیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ خالدہ ادیب چودھری رحمت علی کے بارے میں لکھتی ہیں: "چودھری رحمت علی نے انگلستان میں تعلیم مکمل کی۔ انھوں نے کیمبرج اور ڈبلن سے امتیاز کے ساتھ ایم اے اور ایل ایل بی کیا۔ وہ ایک ذہین قانون دان تھے اور انھیں تاریخِ سیاست سے گہری دلچسپی تھی مگر قانون دانی کے پیشے کو ترک کر کے انھوں نے ۱۹۳۳ء میں پاکستان نیشنل موومنٹ کی داغ بیل ڈالی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رحمت علی کو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کی بہت فکر ہے۔ یہ فیصلہ کرنا بڑا دقت طلب ہے کہ آیا پاکستان نیشنل موومنٹ عملی طور پر ہندو مسلم نزاع کو ختم کر سکے گی۔ مگر موجودہ ہندوستان کے ایک غیر جانبدار طالب علم کو یہ مسئلہ پیشِ نظر رکھنا ہی پڑے گا۔ کیونکہ جن قوتوں نے ہندوستان میں دو قوموں کا نظریہ بلند کر رکھا ہے انھیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"[1]

خالدہ ادیب نے رحمت علی سے پاکستان نیشنل موومنٹ کا ماخذ دریافت کیا تو انھوں نے جواب دیا۔ اس امر کے اطمینان بخش جواب کے لیے مجھے گزشتہ اسی برس کی تاریخ بیان کرنا ہوگی ——— پہلی بات یہ کہ پاکستان یعنی پنجاب، مغربی سرحدی صوبہ (جسے افغان صوبہ بھی کہا جاتا ہے) کشمیر، سندھ اور بلوچستان مسلمانوں کا وطن تھا۔ میں نے پاکستان کا نام ان ہی پانچ صوبوں کے نام سے اخذ کیا ہے۔ مسلمان ان علاقوں میں بارہ سو سال سے زیادہ عرصے سے رہتے آئے ہیں اور ان کی اپنی تاریخ، تہذیب اور تمدن ہے ——— خاتون، میں چاہتا ہوں کہ آپ یہ بنیادی نقطہ اچھی طرح سمجھ لیں ——— پاکستان اور ہندوستان (برکوچک) کا فرق ہمیشہ اظہر من الشمس رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔" چودھری

---

[1] ان سائڈ انڈیا۔ خالدہ ادیب، صفحہ ۳۵۲ مطبوعہ ۱۹۳۷ء۔ جارج ایلن اینڈ انون لمیٹڈ لندن۔

رحمت علی نے وضاحت کے ساتھ خالدہ ادیب کو بتایا کہ گول میز کانفرنس میں وفاق ہند کے سوال پر سنجیدگی سے غور کیا گیا ہے۔ "اس طرح پاکستانی، ہندوستانی قوم کی ایک اقلیت بن کر رہ جائیں گے اور ہندوستان کی برتری کے تسلط کا شکار ہو جائیں گے ہمارے قومی وجود کے لیے اسی سنگین خطرہ نے ہمیں پاکستان نیشنل موومنٹ کے قیام پر آمادہ کیا ہے جو اس نظریہ پر مبنی ہے جسے صدیوں سے نظر انداز کیا جاتا رہا ہے ——— ہم نے گول میز کانفرنس اور ہندو نمائندوں کو یہ تجویز بھیجی اور آخر میں مشترکہ پارلیمانی سیلیکٹ کمیٹی کے سامنے یہ تجویز پیش کی۔ مگر انگریزوں اور ہندوؤں نے قومی احترام اور انصاف کے متعلق ہمارا مطالبہ مسترد کر دیا۔ تاہم ہم نے آخر دم تک جدوجہد جاری رکھنے کا عزم کر رکھا ہے ——— مجھے اعتراف ہے کہ اس جدوجہد میں ہمیں سخت جاں گسل مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا مگر ہم جانتے ہیں کہ اسی سرزمین پر ہمارے آباواجداد نے نسبتاً کہیں مشکل اور پیچیدہ صورت حال کا کامیابی سے مقابلہ کیا۔ ہمارے لیے یہ زندگی اور موت کا مسئلہ ہے اور ہمیں علم ہے کہ پاکستان ہمارا مقدر ہے۔"

خالدہ ادیب نے چودھری رحمت علی سے دریافت کیا کہ ان کی تحریک حصول پاکستان کے لیے کیا خدمات انجام دے رہی ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ سارے پاکستان میں ہماری تحریک کی شاخیں موجود ہیں، ہم کتابچے اور ایک ہفت روزہ "پاکستان" شائع کرتے ہیں۔ "ممکن ہے کہ حال سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہو مگر میں نے اپنی توقعات مستقبل سے وابستہ کر رکھی ہیں، جو ہمارے اس مقدس نصب العین کا ساتھ دے گا۔" ہندو مسلم نظریات کے تصادم کے متعلق چودھری رحمت علی نے خالدہ ادیب کو بتایا: "یہ تصادم نہ تو مذہبی تصادم ہے اور نہ اقتصادی۔ حقیقت یہ ہے کہ دو قوموں کی اُمنگوں کے درمیان ایک بین الاقوامی ٹکراؤ ہے ——— مسلمان اپنی بقا کے لیے کوشاں ہیں اور ہندو اپنی برتری کے لیے ——— وقت آنے پر بھائی بھائی بھی جدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ احساس بڑا تکلیف دہ ہے تاہم ملت

کا مفاد تمام چیزوں پر مُقدم ہے۔"

خالدہ ادیب نے رحمت علی سے دریافت کیا کہ کیا "ایک متحدہ قومیت" کا نظریہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے ؟ انھوں نے جواب دیا: "نہیں یا ناممکن ہے ۔ ہم ہندوستانی نہیں ہیں، ہم پاکستانی ہیں ——— ہندوستان کو متحد کرنا الگ بات ہے اور پاکستان کو غصب کر لینا علیحدہ بات ——— لہٰذا "ایک متحدہ قوم" کی خاطر اپنی قوم کے نصیبے پر مہر لگا دینا ہماری خوش حالی کے حق میں غداری، اپنی تاریخ سے بے وفائی اور انسانیت کے خلاف ایک جرم ہوگا۔"[۱]

چند سال بعد مس ای برام نے کولنڈیل نیوز پیپرز ریفرینس لائبریری، برٹش میوزیم اور دیگر کتب خانوں میں جا کر اس امر کی تحقیق کی کہ لفظ پاکستان کا ماخذ کیا ہے اور یہ لفظ کس شخص کے ذہن کی تخلیق ہے ۔ اس تحقیق کے نتیجے میں انھیں معلوم ہوا کہ ۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے "ناؤ آر نیور" (اب یا کبھی نہیں) نامی کتابچے میں پہلی بار لفظ پاکستان استعمال کیا تھا۔ اس کتابچے کا ضمنی موضوع تھا "ہمیں زندہ رہنا ہے یا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانا ہے ؟" یہ کتابچہ کسی لائبریری میں موجود نہ تھا۔ اس تحقیق میں بوڈلین لائبریری کی مس سی ایم برگس، پشتو کے ممتاز عالم سر اولیف کارو، ڈاکٹر پرسیول اسپیر اور ایماینوں کالج کے ای ویلیوں نے مس ای برام کی مدد کی۔ ہزار کوشش کے باوجود انھیں "ناؤ آر نیور" کی کاپی نہ مل سکی۔ ان اصحاب کی مشترکہ کاوش کے نتیجے میں "نوٹس اینڈ کویریز" لندن کے اپریل ۱۹۶۰ء کے شمارے میں لفظ پاکستان کی تشریح کے متعلق ایک مقالہ شائع ہوا۔ اس مقالے میں کہا گیا تھا "لفظ پاکستان بنیادی طور پر چند حروف کا خوش آہنگ مرکب ہے بظاہر چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۳ء سے قبل یہ اختراع کی تھی اور انھوں نے "ناؤ آر نیور"

---

[۱] ان سائڈ انڈیا۔ خالدہ ادیب صفحات ۳۵۲ تا ۳۶۲ ۔ مطبوعہ ۱۹۳۷ء

نامی سائیکلو اسٹائل کتابچے میں یہ لفظ استعمال کیا تھا جو جنوری ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا تھا۔ برطانیہ اور دیگر ممالک کے کتب خانوں میں اس کتابچے کی تلاش بے سود رہی۔[لے]

ان محققین کی مدد کے لیے پندرہ روزہ "الاسلام" کے مدیر خواجہ اے وحید نے "ناؤ آر نیور" کا ایک نسخہ نوٹس اینڈ کوئیریز کو ارسال کیا اور انھیں کتابچے کا عکسی نسخہ بوڈلین لائبریری میں رکھنے کی اجازت دے دی۔ خواجہ وحید نے اس رسالے کو لکھا کہ یہ کتابچہ پندرہ روزہ اسلام لاہور کے اپریل ۱۹۲۸ء کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے بعد میں خواجہ صاحب نے یہ کتابچہ چودھری رحمت علی کے شائع کردہ دیگر کتابچوں اور نقشوں کے ساتھ پاکستان کے قومی عجائب گھر کراچی کو دے دیا۔

"ناؤ آر نیور" ۱۹۳۳ء میں پاکستان نیشنل موومنٹ، ۱۶ ہانٹنگ ڈن روڈ کیمبرج نے شائع کیا تھا اور اس کے طابع میسرز ڈوائٹسز اینڈ جیگ کیمبرج تھے۔ چودھری رحمت علی نے پاکستان نیشنل موومنٹ کے بانی کی حیثیت سے یہ کتابچہ تقسیم کیا تھا۔ مطبوعہ کتابچے کے آخر میں جن اصحاب نے دستخط کیے تھے وہ چودھری رحمت علی، آکسفورڈ کے ایک طالب علم خان محمد اسلم خان خٹک، صاحب زادہ شیخ محمد صادق، لندن میں قانون کے ایک طالب علم اور لندن کے ایک ویٹرنیری کالج کے طالب علم خان عنایت اللہ خان تھے۔ کتابچے کے پیش لفظ میں پاکستان کا ذکر کیا گیا ہے۔ پیش لفظ میں لکھا ہے "میں پاکستان کے ان تین کروڑ مسلمانوں کی طرف سے یہ اپیل جاری کر رہا ہوں جو ہندوستان کے پانچ شمالی یونٹوں ——— پنجاب، شمال مغربی سرحدی (افغان) صوبے، کشمیر، سندھ اور بلوچستان میں آباد ہیں۔ اس اپیل میں ان کا یہ مطالبہ پیش کیا گیا ہے کہ پاکستان کو مذہبی، سماجی اور تاریخی بنیادوں پر ایک علیحدہ وفاقی آئین دے کر ان کی قومی حیثیت کو، جو ہندوستان کے

لے نوٹس اینڈ کوئیریز، صفحہ ۱۲۴۔ اپریل ۱۹۶۰ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس لندن۔

دوسرے باشندوں سے بالکل الگ ہے تسلیم کیا جائے۔"

آگے چل کر کتابچے میں کہا گیا ہے "ہندوستانی تاریخ کی اس متبرک ساعت کے موقع پر جب کہ برطانوی اور ہندوستانی نمائندے، برِصغیر کے لیے وفاقی طرز کے دستور کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔ اپنے مشترکہ ورثے کے نام پر اور پاکستان میں آباد اپنے تین کروڑ مسلمان بھائیوں کی جانب سے ہم آپ کے نام یہ اپیل جاری کر رہے ہیں اور ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ سیاسی تصلیب اور قومی استیصال کے خلاف جدوجہد میں ہماری حمایت کی جائے[1]۔"

اس کتابچے میں چودھری رحمت علی اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا کہ "موجودہ صورت میں ہندوستان کسی ایک ملک کا نام نہیں، نہ یہ سرزمین کسی ایک قوم کا گہوارہ ہے۔ درحقیقت یہ اس ریاست کا نام ہے جو تاریخ میں پہلی بار انگریزوں نے تخلیق کی ہے۔ اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی مرحلے میں بھی ہندوستانی قوم کا جزو نہ تھے بلکہ جو تاریخ کے آغاز سے انگریزوں کی آمد تک اپنی مخصوص و ممتاز قومیت کے حامل رہے ہیں۔

"انہی قوموں میں سے ایک ہماری قوم ہے۔ یہ ٹھوس سچائیاں ہیں، تاریخی حقائق ہیں۔ ہم چیلنج کرتے ہیں کہ کوئی شخص انھیں غلط ثابت کر سکتا ہو تو کرے۔ ہم ان حقائق کی بنیاد پر بلا خوفِ تردید یہ کہتے ہیں کہ پاکستان کے مسلمان، ہندوستان کے ہندو سے بالکل مختلف اور ممتاز قومیت کے حامل ہیں۔ ہندو باشندے ہندو قوم کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے وسیع رقبے میں آباد ہیں اور انھیں زندہ رہنے کا حق حاصل ہے۔ ہم بھی اس کے حق دار ہیں اور یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ پاکستان کو ہندوستان کے باقی حصے سے الگ کر کے اور اُسے

---

[1] "ناؤ آر نیور" چودھری رحمت علی و دیگر اصحاب، مطبوعہ ۱۹۳۳ء۔ فوائنٹر اینڈ جیگ، کیمبرج۔

ایک وفاقی دستور دے کر ہماری قومی حیثیت کو تسلیم کیا جائے،" کتابچے کے آخر میں کہا گیا تھا۔ ہمیں اس باب میں کوئی غلطی نہ کرنا چاہیئے۔ یہ مسئلہ ابھی طے کیا جائے ورنہ کبھی طے نہ ہوگا۔ یا تو ہم زندہ رہیں گے یا دائمی طور پر ختم ہو جائیں گے — ہمارا مستقبل دیوتاؤں کے ہاتھ میں نہیں — خود ہمارے ہاتھ میں ہے بشرطیکہ ہم اپنے عقیدے پر ثابت قدم رہیں۔ صرف ہم ہی اپنا مستقبل سنوار سکتے ہیں اور ہم ہی اسے تباہ کر سکتے ہیں۔ گزشتہ ایک صدی کی تاریخ ہمارے لیے ایک انتباہ ہے اور یہ انتباہ نہایت واضح ہے۔ کیا ہمارے متعلق یہ کہا جائے گا کہ ہم نے تمام تنبیہوں کو نظر انداز کر دیا، وفاق ہند کی خاطر اپنی قدیم قومیت سے غداری کے مرتکب ہوئے اور پورے برصغیر میں اپنے اسلامی ورثے کو تباہ کر دیا۔"

مسلمانوں کے علیحدہ وطن کے طور پر پاکستان کا تصور پہلی مرتبہ عام لوگوں کے سامنے آیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ مذہبی، سماجی اور تاریخی بنیاد پر علیحدہ وفاقی دستور" کا عوامی مطالبہ پیش کیا گیا تھا۔ چودھری رحمت علی اور ان کے ساتھیوں نے گول میز کانفرنس کے انگریز اور ہندوستانی شرکا میں کتابچے کی نقول تقسیم کیں اور کچھ نمائندوں سے ملاقات کر کے وضاحت کے ساتھ انھیں اپنا نقطۂ نظر سمجھایا۔ طالب علموں کے اس کتابچے میں ایک انوکھا تصور پیش کیا گیا تھا لہٰذا اس سکیم پر کسی نے سنجیدگی سے غور نہ کیا مگر گول میز کانفرنس کے ایک برطانوی مندوب سر ریگنالڈ کریڈاک نے اس کا نوٹس لیا۔ اس بات کی تصدیق ان استفسارات سے ہوتی ہے جو انھوں نے کانفرنس میں شریک مسلمان مندوبین سے کیے تھے:

"سوال ۹۵۹۸۔ سر ریگنالڈ کریڈاک:۔ کیا کوئی مندوب یا کوئی شاہد میرے سوال کا جواب دینا پسند کرے گا، کیا کوئی صاحب مجھے یہ بتائیں گے کہ آیا پاکستان کے تحت صوبوں کے وفاق کی کوئی سکیم موجود ہے؟"

جواب ۹۵۹۸۔ عبداللہ یوسف علی سی بی ای :۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ محض ایک طالب علم کی سکیم ہے۔ اسے کسی ذمہ دار شخص نے پیش نہیں کیا۔"

سر ریجنیالڈ کریڈاک :۔ درست ہے کہ کسی ذمہ دار شخص نے اب تک ایسی کوئی سکیم پیش نہ کی۔ لیکن آپ کے کہنے کے مطابق آپ ہندوستان میں بڑی تیزی سے ترقی کرتے ہیں اور شاید ایسا ہو جب یہ طالب علم پختہ عمر ہوں گے تو یہ سکیم پیش کی جائے گی۔ کسی نہ کسی صورت میں لوگوں کے ذہن میں یہ سکیم ضرور موجود ہو گی۔

ظفر اللہ خان :۔ آپ کا سوال کیا ہے؟

سر ریجنیالڈ کریڈاک :۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا آپ لوگ 'پاکستان' سے متعلق کسی سکیم سے واقف ہیں؟"

ظفر اللہ خان :۔ ہمیں اس کا جواب مل گیا ہے کہ ایک طالب علم کی تجویز ہے اور اس میں کوئی قابلِ غور بات نہیں ہے"

"دوسرا سوال کیا ہے؟"

سوال ۹۵۹۹۔ آنرک فوٹ :۔ "پاکستان کیا ہے؟"

جواب ۹۵۹۹۔ ظفر اللہ خان۔ جہاں تک ہم نے اس پر غور کیا ہے، ہمارا خیال ہے کہ یہ محض ایک قیاسی اور ناقابلِ عمل تجویز ہے۔ اس کا مقصد بعض صوبوں کا وفاق بنانا ہے۔"

سوال ۹۶۰۰۔ سر ریجنیالڈ کریڈاک :۔ مجھے کچھ خطوط موصول ہوئے ہیں جن میں پاکستان کے تحت بعض مسلم صوبوں کو یکجا کرنے کی تجویز کا ذکر ہے۔"

جواب ۹۶۰۰۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین :۔ غالباً یہ کہنا کافی ہو گا کہ اب تک کسی نمائندہ فرد یا تنظیم نے ایسی کسی سکیم پر غور نہیں کیا ہے[1]۔"

---

[1] ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے متعلق مشترکہ کمیٹی کے روبرو شہادتوں کی روداد جلد دوم صفحہ ۱۴۹۶ مطبوعہ اسٹیشنری آفس۔ لندن ۱۹۳۴ء سے ماخوذ۔

اپنی کتاب "پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن" مطبوعہ ۱۹۴۰ء میں چودھری رحمت علی نے لکھا ہے "اس اعلان (ناؤ آر نیور ۱۹۳۳ء) میں مَیں نے پہلی مرتبہ اپنے وطن کے لیے لفظ پاکستان استعمال کیا۔ یہ نام میں نے اپنے مشترکہ ہندوستانی اور ایشیائی وطن کے لیے ایجاد کیا تھا ——— (صفحہ ۲۲۵) یہاں تک تو لفظ پاکستان کا ذکر تھا اب اس کی تشکیل کے متعلق بھی سن لیجیے۔ پاکستان فارسی اور اردو زبانوں کا لفظ ہے۔ اسے "ہندوستان اور ایشیا" میں واقع ہمارے وطنوں کے مختلف علاقوں کے حروف سے مرتب کیا گیا ہے یعنی پنجاب، افغانیہ (شمال مغربی سرحدی صوبہ) کشمیر، ایران، سندھ (بشمول کچھ و کاٹھیاواڑ) افغانستان اور بلوچستان ——— اس کا مطلب ہے پاک لوگوں کی سرزمین ——— یعنی روحانی طور پر پاکیزہ اور صاف ستھرے۔"[1]

پاکستان نیشنل موومنٹ کے بانی کی حیثیت سے چودھری رحمت علی نے ۱۹۴۰ء میں ایک اور کتابچہ شائع کیا۔ انھوں نے لکھا کہ پاکستان کے متعلق میری سکیم کی بڑی حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اس طرح نہ صرف اس میدان میں ہماری کاوش جاری رہے گی بلکہ ہم پروگرام کا دوسرا مرحلہ بھی جس کا تعلق بنگال اور عثمانستان (حیدرآباد دکن) سے ہے، شروع کر سکیں گے۔"[2] آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "کیونکہ اگر ہم ان کے انڈیا میں رہنے پر آمادہ ہو گئے تو دائمی طور پر انڈین ازم (ہندیت) میں پڑے سڑتے رہیں گے۔"[3]

رحمت علی نے یہ دلیل پیش کی کہ ہندوستان کی علاقائی وحدت کو تسلیم کر لینے کا مطلب ملت (کے کاندھے) پر ہندیت کے جوئے کو مضبوطی سے باندھنے کے مترادف ہوگا۔ بنابریں

---

[1] پاکستان دی فادر لینڈ آف دی پاک نیشن۔ مطبوعہ ۱۹۴۷ء۔ فواشٹر اینڈ جیگس کیمبرج۔

[2] دی ملت آف اسلام اینڈ دی مینس آف انڈین ازم۔ مطبوعہ ۱۹۴۰۔ صفحہ ۱۔ فواشٹر اینڈ جیگس کیمبرج۔

[3] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۴۔

اُنھوں نے پاکستان، بنگاسانستان اور عثمانستان کی وکالت کی۔ انھوں نے لکھا کہ "جب یہ مقصد حاصل ہو جائے تو ہمیں تین آزاد ریاستوں، پاکستان، بنگال اور عثمانستان کی ٹھوس اور مستحکم بنیادوں پر تشکیل کرنی ہوگی، تاریخ کی کسی بھی ریاست سے وسیع تر اور زیادہ طاقتور ریاستیں ہوں گی۔"[1]

چودھری رحمت علی نے ہندوستان کے نقشے پر مختلف رنگوں کی پنسلوں سے کچھ لکیریں کھینچ دیں۔ ان کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ایک علیحدہ اور خود مختار ریاست کی حیثیت سے مطالبۂ پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ یہ نقشہ اور ان کے کچھ دوسرے کتابچے، پاکستان کے قومی عجائب خانے میں محفوظ ہیں۔ بابو راجندر پرشاد نے چودھری رحمت علی کے متعلق لکھا ہے۔ "مصنف (رحمت علی) دو قومی نظریے کے ایک انتہائی سخت گیر مبلغ ہیں۔"[2]

چودھری رحمت علی نے ۱۹۳۷ء میں خالدہ ادیب سے کہا تھا کہ شاید پاکستان کو میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ سکوں مگر میں اس کے لیے جدوجہد جاری رکھوں گا ——— لیکن پاکستان ان کی حیات ہی میں قائم ہُوا اور انھوں نے آزاد اور خود مختار اسلامی ریاست کو قائم ہوتے دیکھ لیا۔

وہ ۱۹۴۸ء میں پاکستان آئے اور لاہور میں کچھ عرصے گمنامی کی زندگی بسر کرنے کے بعد نامعلوم وجوہ پر انگلستان روانہ ہوگئے اور پھر کبھی واپس نہ آئے۔ ۱۹۵۱ء کے لگ بھگ انگلستان میں ان کا انتقال ہوگیا۔ ایم انوار نے ان کے انتقال اور تجہیز و تکفین کے متعلق لکھا ہے۔ "وہ ووکنگ میں دفن ہیں اور ان کی قبر پہ لوحِ مزار تک نہیں ہے، پاکستان کا یہ سپوت، جو جلاوطنی میں پاکستان کے لیے جدوجہد کرتا رہا اپنے وطن سے دُور دفن ہے۔"

---

[1] دی ملت آف اسلام اینڈ دی مینیس آف انڈین ازم۔ صفحہ ۱ مطبوعہ ۱۹۴۰ء۔ فوانشر اینڈ جیگس کیمبرج۔

[2] انڈیا ڈیوائیڈڈ۔ بابو راجندر پرشاد۔ صفحہ ۱۰۵، مطبوعہ ۱۹۴۷ء۔ ہند کتابس لمیٹڈ بمبئی۔

پاکستان کے اس فرزند کو وطن کی سرزمین کا کوئی گوشہ ملنا چاہیے۔ کیا ہم اپنے "بھلائے ہوئے ہیرو" کی یاد تازہ کریں گے اور تاریخ پاکستان میں اس کے شایانِ شان یادگار قائم کر سکیں گے؟[1]

۱۹۴۰ء کے بعد "ایک پنجابی" نے ہندوستان میں کنفڈریشن کی سکیم پیش کی۔ انھوں نے کہا کہ (۱) دریائے سندھ کے علاقوں کا وفاق بنایا جائے جس میں پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، بہاول پور، امب، دیر، سوات، چترال، خیرپور، قلات، لس بیلہ، کپورتھلہ اور مالیر کوٹلہ شامل ہوں۔ اس علاقے میں مسلمان تقریباً ۶۲ فی صدی، سکھ ۶ فی صدی اور ہندو ۳۰ فی صدی ہوں گے (۲) ہندو انڈیا کا وفاق قائم کیا جائے جس میں یوپی، سی پی، بہار، اڑیسہ، آسام، مدراس، بمبئی اور ہندوستان کی کچھ ریاستیں شامل ہوں۔ اس وفاق میں ہندوؤں کی آبادی ۸۳ اعشاریہ ۲۷ فی صدی اور مسلم آبادی گیارہ فی صدی ہوگی (۳) راجستھان وفاق بنایا جائے جس میں راجستھان اور وسطی ہند کی مختلف ریاستیں شامل ہوں۔ اس میں ہندوؤں کی آبادی ۸۶ اعشاریہ ۹۳ فی صدی، مسلمانوں کی آبادی آٹھ اعشاریہ ۰۹ فی صدی ہوگی (۴) حیدرآباد، میسور اور بستر کی ریاستوں پر مشتمل ریاستہائے دکن کا وفاق بنایا جائے جہاں مسلم آبادی ۸ اعشاریہ ۹۰ فی صدی اور ہندو آبادی ۸۵ اعشاریہ ۸۲ فی صدی ہوگی (۵) مشرقی بنگال، آسام کے گوال پاڑہ، اور سلہٹ کے ضلع تری پورہ اور مشرقی بنگال کے آس پاس مسلم اکثریت کے علاقوں پر مشتمل وفاق بنگال قائم کیا جائے۔ اس وفاق میں مسلمانوں کی آبادی ۶۶ اعشاریہ ایک فیصدی اور ہندو آبادی ۳۲ اعشاریہ ۶ فی صدی ہوگی۔ یہ پانچوں وفاق مل کر ایک کنفڈریشن بنائیں گے۔

علی گڑھ کے پروفیسر سید ظفر الحسن اور پروفیسر محمد افضل حسین قادری نے ایک اور

---

[1] دی فارگاٹن ہیرو۔ ایم انوار۔ پاکستان ٹائمز لاہور ۲۳ مارچ ۱۹۶۴ء

سکیم پیش کی جو علیگڈھ کے پروفیسروں کی سکیم کے نام سے مشہور ہے۔ اس سکیم کے مطابق ہندوستان کو خاص طور سے چھ آزاد و خودمختار ریاستوں میں تقسیم کرنا تھا۔ ریاستیں یہ تھیں۔ (۱) پاکستان، جس میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ، بلوچستان، کشمیر اور جموں، مانڈی، چمبا، سکٹ، سمیتی، کپورتھلہ، مالیر کوٹلہ، چترال، دیر، اتلات، لوہارو، بہاولپور، تمہ، بہاول پور وغیرہ شامل ہوں گی۔ یہاں مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۶۰ اعشاریہ ۳ فی صدی ہوگی (۲) بنگال، جس میں بہار کا ضلع پورنیا اور آسام کا سلہٹ ڈویژن بھی شامل ہوگا۔ اس کی مسلم آبادی ۵۷ فی صدی ہوگی (۳) ہندوستان، باقی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں پر مشتمل علاقہ، مسلم آبادی ۹ اعشاریہ ۳ فی صدی (۴) حیدرآباد، حیدرآباد، بیور اور کرناٹک پر مشتمل علاقہ، مسلم آبادی ۷ اعشاریہ ۵ فی صدی (۵) دہلی، دہلی، میرٹھ ڈویژن روہیل کھنڈ ڈویژن اور ضلع علی گڈھ پر مشتمل علاقہ، مسلم آبادی ۲۸ فی صدی (۶) ملابار، ملابار اور جنوبی کنارا پر مشتمل علاقہ، مسلم آبادی ۲۷ فی صدی۔ اس سکیم میں تجویز کیا گیا تھا کہ ہندوستان کے یہ چھ یونٹ آپس میں کنفڈریشن بنائیں۔

اس کے بعد حیدرآباد دکن کے ڈاکٹر سید عبداللطیف نے ایک سکیم پیش کی۔ انھوں نے اپنی کتاب "دی مسلم پرابلم ان انڈیا" میں اس سکیم کی وضاحت کرتے ہوئے دعویٰ کیا تھا کہ یہ سکیم اس انداز پر پیش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں ہندوستان ثقافتی بنیاد پر متحد ہو جائے گا اور کم و بیش کینیڈا کے نمونے پر ہندوستان میں یکساں تہذیب و تمدن کی ریاستیں متحدہ ہندوستان قائم کرنے کے لیے وفاق بنائیں گی۔ انھوں نے کینیڈا کی مثال دیتے ہوئے بتایا تھا کہ وہاں دو مختلف نسلیں، جن کی زبان بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے، مل جل کر رہتی ہیں۔ ڈاکٹر لطیف نے کہا تھا مسلمانوں کے لیے ہندوستان کو ایسے چار ثقافتی علاقوں میں تقسیم کیا جائے جن کی تہذیب و تمدن مشترک ہو۔ ہندوؤں کے لیے گیارہ علاقے رکھے جائیں۔ ریاستوں کو جغرافیائی نسبتوں کی بنا پر مختلف علاقوں کے ساتھ شامل کر دیا جائے۔

ہر علاقے میں ایک متجانس ریاست کی تشکیل ہوگی اور یہ تمام علاقے باہم مل کر ایک کُل ہند وفاق بنائیں گے"[1]

ڈاکٹر لطیف کی سکیم کے مطابق مسلمانوں کے ثقافتی علاقے یہ تھے :۔ (۱) سندھ، بلوچستان، پنجاب، سرحدی صوبہ، خیرپور اور بہاول پور پر مشتمل "شمال مغربی بلاک" مسلم آبادی اندازاً ڈھائی کروڑ۔ (۲) مشرقی بنگال (بشمول کلکتہ و آسام) پر مشتمل "شمال مشرقی بلاک" مسلم آبادی تین کروڑ (۳) "دہلی لکھنؤ بلاک" اور (۴) "دکن بلاک"۔ ہندوؤں کے گیارہ تہذیبی علاقے یہ تھے۔ (۱) بنگال کا باقی ماندہ حصّہ (۲) اڑیسہ (۳) مغربی بہار اور یوپی (ہمالیہ سے جنوب میں وندھیا تک دہلی لکھنؤ بلاک کی سرحد تک کا علاقہ) (۴) راجپوت ریاستیں (۵) گجرات (۶) مراٹھاس (۷) کنارہ (۸) آندھرا (۹) تامل علاقہ (۱۰) ملایالی اور (۱۱) ہندو سکھ بلاک (شمال مغربی مسلم بلاک میں کشمیر کے کچھ حصّے کے ساتھ)۔ ڈاکٹر ایس اے لطیف کی سکیم میں باہمی رضامندی سے ہندو مسلم آبادی کا تبادلہ بھی شامل تھا۔ انھوں نے تمام علاقوں میں جداگانہ طرزِ انتخاب جاری رکھنے کی بھی تائید کی تھی۔

ڈاکٹر لطیف کی سکیم پر کڑی نکتہ چینی کی گئی کیونکہ اس میں ہندوستان کے سیاسی اتحاد کی حمایت کی گئی تھی اور پورے ہندوستان میں مسلمان رفتہ رفتہ اس نظریے سے دست بردار ہو رہے تھے۔ نتیجتاً ڈاکٹر لطیف نے ۱۹۴۳ء میں جب "دی پاکستان اِشو" نامی کتاب لکھی تو متحدہ ہندوستان کے لیے علاقائی سکیم کی حمایت کرنے پر معذرت خواہ ہوئے۔ اس کتاب میں انھوں نے لکھا "میں پاکستان یا شمال مغرب اور شمال مشرق میں خودمختار ریاستوں کے قیام کا مخالف نہیں ہوں جہاں مسلمانوں کی بھاری اکثریت ہے۔ یہ امر تمام لوگوں پر واضح ہوجانا چاہیئے"[2]۔ ۱۰ رجنوری ۱۹۴۰ء کو ڈاکٹر لطیف نے پنڈت جواہر لال نہرو کو ایک خط لکھا

---

[1] دی مسلم پرابلم اِن انڈیا۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف۔ صفحہ ۳۰۔

[2] دی پاکستان اِشو۔ ڈاکٹر ایس اے لطیف صفحات VI تا VII۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ شیخ محمد اشرف لاہور

اور ان پر زور دیا کہ وہ علاقائی سکیم منظور کر لیں۔ ڈاکٹر لطیف نے لکھا، نظریۂ پاکستان کی نسبت تہذیبی علاقوں کا نظریہ معتدل ہے۔ اگر آج آپ کوئی ایسا آئین نہ بنا سکے جو پورے ملک کے لیے قابلِ قبول ہو تو کل یہ نظریہ طاقِ نسیاں کی نذر ہو جائے گا اور آپ کو پاکستان کا سامنا کرنا پڑے گا۔[1]

اس سلسلے میں سر سکندر حیات نے بھی "وفاقِ ہند کی سکیم کا خاکہ" نامی کتابچے میں ایک سکیم پیش کی۔ اس کے تحت ہندوستان کو سات علاقوں یعنی (۱) آسام اور بنگال (۲) بہار اور اڑیسہ (۳) یو پی (۴) مدراس، ٹراونکور، کورگ اور مدراس کی ریاستیں (۵) بمبئی، حیدر آباد، میسور اور سی پی کی ریاستیں (۶) راجپوتانہ کی ریاستیں (۷) پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبہ، بلوچستان، بیکانیر، جیسلمیر، کشمیر اور پنجاب کی ریاستوں پر مشتمل علاقوں میں تقسیم کرنا مقصود تھا۔ سکیم میں مجوزہ وفاق کی سرحدوں کی نشان دہی کرنے کے بعد قانون ساز اسمبلیوں، گورنروں اور وائسرائے کے اختیارات اور ملازمتوں اور اسمبلیوں میں مختلف اقوام کی نمائندگی پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی تھی۔

۷ / اکتوبر ۱۹۳۸ء کو کراچی میں قائداعظم کی زیرِ صدارت سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ہندوستان کے تمام علاقوں سے آنے والے ممتاز لیڈروں نے اس سوال پر غور کیا کہ مسلمانوں کے مفاد کے مطابق آئندہ دستوری اصلاحات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟ حاجی سر عبداللہ ہارون اس کانفرنس کی روحِ رواں تھے اور مسلم سیاسیات کے بارے میں پُرخلوص اور ٹھوس رائے رکھتے تھے۔ ان رہنماؤں کی کاوش کے نتیجے میں کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی، جس کے الفاظ یہ تھے، یہ کانفرنس ہندوستان کے اس عظیم خطۂ ارض میں پائدار امن کے قیام اور ہندو اور مسلمانوں کے نام سے موسوم دو قوموں کی باقاعدہ و ہموار ثقافتی ترقی،

---

[1] دی پاکستان اشو۔ ڈاکٹر ایس اے لطیف۔ صفحہ ۲۵۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ شیخ محمد اشرف لاہور۔

ان کی اقتصادی وسماجی فلاح اور سیاسی حق خود اختیاری کے مفاد کے پیش نظر یہ لازمی سمجھتی ہے کہ آل انڈیا مسلم لیگ سے اس پورے مسئلے کا جائزہ لینے اور از سر نو اس پر غور کرنے کی سفارش کرے کہ ہندوستان کے لیے مناسب دستور کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے جس سے دونوں قوموں کو باعزت اور جائز مقام مل سکے۔ اس لیے یہ کانفرنس آل انڈیا مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایک ایسی سکیم مرتب کی جائے جس کے تحت مسلمان مکمل آزادی حاصل کرسکیں "۔

شیخ عبدالمجید سندھی نے یہ قرارداد پیش کی اور نواب گورمانی نے اس کی تائید کی۔ حاجی عبداللہ ہارون اور سی پی کے سید عبدالرؤف شاہ نے اس کی مزید تائید کی۔

اس وقت جو مختلف سکیمیں پیش کی گئی تھیں ان کا ذکر کرتے ہوئے سر عبداللہ ہارون کمیٹی سکیم کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس سکیم کے مطابق دو مسلم ریاستیں قائم ہونی جاہئیں تھیں۔ ایک اسلامی ریاست شمال مغرب میں جس میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۶۳ فی صدی تھی اور دوسری شمال مشرق میں جہاں مسلمانوں کی آبادی تخمیناً ۵۴ فی صدی تھی۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء تک کے آخری ایام میں تمام سیاسی لیڈر اور جماعتیں یہ محسوس کرنے لگی تھیں کہ مسلمان اقلیتی فرقے کی حیثیت سے رہنا پسند نہیں کرتے اور ان کی آئندہ سیاسی حیثیت کے سوال پر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا۔ کانگریس کے علاوہ جو پارٹی اس وقت مسلم لیگ کے مطالبے کی مخالف تھی وہ ہندو مہا سبھا تھی۔ اسلام اور مسلم دشمنی میں ہندو مہا سبھا کی کوئی حریف تنظیم موجود نہ تھی۔ اس پارٹی کے کچھ اہم ممبروں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ہندوستانی مسلمان اس ملک کے باشندے نہیں ہیں اور انھیں شہریت کے مکمل حقوق نہیں ملنے چاہئیں۔ اس وقت ہندو مہا سبھا کی باگ ڈور وی ڈی ساورکر کے ہاتھ میں تھی۔ دسمبر ۱۹۳۹ء میں ہندو مہا سبھا کے ایک اجلاس میں ساورکر نے اپنے خطبۂ صدارت میں کہا "ہمیں ان ناگوار حقائق کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہیئے۔ ہندوستان

یہں دو قومیں آباد ہیں ـــــ ہندو اور مسلمان ''۔ اخباروں نے ساورکر پر کڑی نکتہ چینی کی اور خود اس کے ساتھیوں نے اس کی رائے سے اتفاق نہ کیا۔ ساورکر کو کیا خبر تھی کہ تاریخ اس کے الفاظ پر مہر توثیق ثبت کردے گی اور ۱۹۴۷ء میں اس کے یہ الفاظ عملی جامہ پہن لیں گے یعنی ہندوستان دو آزاد اور خود مختار ریاستوں میں منقسم ہو جائے گا۔

دریں اثنا ۱۹۳۷ء میں جن کانگریسی وزارتوں نے اقتدار سنبھالا تھا وہ حکومت کی تمام تر مشنری کے بل پر مسلمانوں کو ہر نقصان پہنچانے کے درپے تھیں۔ کانگریس کی "زیادتیوں" کے خلاف مسلم لیگ کے احتجاج صدا بصحرا ثابت ہوئے اور جب دسمبر ۱۹۳۸ء میں پٹنہ کے مقام پر لیگ کا سالانہ اجلاس ہوا تو قائد اعظم نے اپنے خطبۂ صدارت میں گاندھی جی کو کانگریس کا ایک موذی عبقری (EVIL GENIUS) ٹھہرایا۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی ہندو مسلم اتحاد کے اُس آدرش کو تباہ کرنے کے درپے ہیں جس کی بنیاد پر کانگریس وجود میں آئی تھی۔ گاندھی نے کانگریس کے نظریے کو اپنی پسند کے مطابق ایک نئی شکل دے دی ہے اور خوب صورت و دلآویز الفاظ کے پردے میں وہ یہ خواہش کرتے ہیں کہ کانگریس "ہندوستان میں ہندو راج" قائم کرے۔ ان کی اس تقریر سے مسلم لیگ کو کانگریس کی زیادتیوں کے خلاف راست عمل کی قرارداد منظور کرنے کی تحریک ہوئی۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں مالیات کے بل پر تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا: "ہم حکومت کی حمایت نہیں کر سکتے کیونکہ برطانوی حکومت ہمارے بنیادی حقوق شہریت تک کا تحفظ کرنے میں ناکام رہی ہے اور گورنروں اور گورنر جنرل کے یہ خصوصی اختیارات کہ وہ اقلیتوں کے مفاد اور حقوق کا تحفظ کریں گے ایک فریب ـــــ بلکہ فریب سے بھی بدتر شے ثابت ہوئے ہیں۔"

تقریباً اسی وقت پنجاب کے وزیر اعلیٰ کی حیثیت سے سر سکندر حیات خاں نے جنگی تیاریوں اور دوسرے معاملات سے متعلق بیان جاری کیے۔ کانگریس نے فوراً سر سکندر حیات کے ان خیالات کو قبول کر لیا اور ہندو اخباروں نے اُسے خوب خوب اچھالا

اور کہا کہ سر سکندر حیات خان مسلم لیگ کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس شاطرانہ چال کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ کانگریس ہائی کمان برابر یہی کہتی آ رہی تھی کہ مسلمان متحد نہیں ہیں اور مسلم لیگ صرف چند مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ مزید یہ کہ لیگ کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلمانانِ ہند کی واحد ترجمان ہے بے معنی اور لغو ہے۔ جناح صاحب نے اپنے اور اپنی تنظیم کے خلاف یہ توہین آمیز بیان پڑھے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس مرحلے پر کچھ اہم فیصلے کیے۔ ستمبر ۱۹۳۹ء میں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا نے قدیم سے خطاب کرتے ہوئے جو باتیں کہیں، ان سے ان کی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے فرمایا "لفظ قومیت اور قوم پرست کی تعریف اور ماہیت میں کتنی تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ کچھ لوگوں نے ان الفاظ کو اپنی پسند کے مطابق نت نئے معنی پہنا لیے ہیں ——— میں ہر مسلمان کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسلام آپ سب سے انفرادی اور اجتماعی صورت میں اپنا فرض ادا کرنے کی توقع کرتا ہے اور اس امر کا متقاضی ہے کہ آپ سب ایک قوم کی صورت میں متحد ہو جائیں۔"

کانگریسی وزارتیں مشکلات میں مبتلا ہونے لگی تھیں کیونکہ کچھ صوبوں کے گورنروں نے ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی بابت کانگریس کی رائے تسلیم کرنے اور اس کے مطابق عمل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۹ء کو کانگریس وزارتوں نے استعفا دے دیا اور دفعہ ۹۳ کے تحت اسمبلیاں معطل کر دی گئیں۔ جناح صاحب نے مسلمانانِ ہند کے نام ایک اپیل جاری کی اور کہا کہ ۲۲ر دسمبر کو "کانگریسی اقتدار کا خاتمہ ہونے پر یومِ نجات منایا جائے اور شکرانہ ادا کیا جائے۔" ہندوستان بھر میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ ان کی اپیل پر مسلمانوں نے لبیک کہی۔ گاندھی جی کو اس بات سے بڑا صدمہ ہوا۔ انھوں نے اپنے ہفتہ وار اخبار "ہریجن" میں اس سلسلے میں ایک مضمون لکھا اور یہ شمارہ قائدِ اعظم کو بھیج کر ان سے تبصرہ کرنے کی درخواست کی۔ جناح صاحب نے یکم جنوری ۱۹۴۰ء کو گاندھی جی کے نام

ایک مکتوب میں فرمایا کہ آپ عملی سیاسیات کے اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنے "دل کی آواز" کے مطابق عمل کر رہے ہیں۔ "ہندوستان ایک برصغیر ہے جہاں مختلف قومیتیں آباد ہیں۔ ہندو اور مسلمان ان میں سے دو بڑی اقوام ہیں ــــ آپ کسی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور خالص مذہبی کام کو مختلف خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ میرے نزدیک انسان دوستی ہر مذہب کا لازمی جزو ہے ــــ"

فرقہ وارانہ کشیدگی اور لیگ اور کانگریس کے درمیان مخالفت کی اس فضا میں ۲۲ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ پنجاب میں اب تک یونینسٹ پارٹی برسرِ اقتدار تھی مگر عوام مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے حامی ہو گئے تھے۔ اجلاس کے پہلے روز نواب سر شاہنواز خاں ممدوٹ نے سپاس نامہ پڑھا اور حالیہ واقعات، خاص طور سے پنجاب کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔ اس موقع پر ہندوستان کے تقریباً تمام ممتاز مسلم رہنما موجود تھے۔ سیاسی حالات پر غیر رسمی مذاکرات کے لیے بند کمرے میں اجلاس ہوا۔ ان مذاکرات میں قائداعظم کو خصوصی حیثیت و اہمیت حاصل تھی۔ ان کا ہمیشہ یہ یقین رہا تھا کہ ہندوستان کو ہندو مسلم اتحاد ہی کی صورت میں آزادی نصیب ہو سکتی ہے اور آزادی کے حصول کے بعد مختلف قوموں کے آپس کے اختلافات طے کیے جا سکتے ہیں۔ مگر برس ہا برس سیاسی زندگی میں سرگرمِ عمل رہنے کے بعد آخر وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس اتحاد کا جو کچھ مطلب ان کے ذہن میں تھا وہ ہندو کانگریس کے نظریات سے میل نہیں کھاتا۔ ان کے نزدیک اتحاد کا مطلب یہ تھا کہ اس طرح مسلمانوں کو ایک باعزت مقام مل جائے گا جبکہ ہندوؤں کے نزدیک اس اتحاد کا مقصد ملکی سیاسیات پر اپنی گرفت مضبوط کرنا تھا۔ کانگریسی وزارتوں کی حرکتوں کے مشاہدے کے بعد مسلم رہنما شدید مایوس ہوئے تھے اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ تمام کانگریسی بہ باطن ہندو ہیں۔
اب قائداعظم نے محسوس کر لیا تھا کہ مسلمان اس وقت تاریخ کے ایک اہم اور نازک دور سے

گزر رہے ہیں اور اب یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے کیا قدم اٹھانا چاہیے ؟

گزشتہ ایام میں ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن پاکستان کے متعلق بہت کچھ کہا گیا تھا۔ کیا مسلمان متّحدہ ہندوستان میں ایک قوم کی حیثیت سے باعزت زندگی گزار سکتے ہیں۔ اس متّحدہ ہندوستان میں جہاں مرکز اور صوبوں میں اکثریتی فرقے کی حکومت ہو گی ؟ کانگریسی وزارتوں نے اپنے طرزِ عمل سے اس سوال کا جواب دے دیا تھا۔ لہٰذا قائداعظم اور ان کے ساتھیوں نے پرانا اندازِ فکر ترک کر دیا اور بلا جھجک یہ مطالبہ پیش کیا کہ مسلمان ایک الگ قوم ہیں اور ان کی قومی امنگیں پوری کی جائیں۔ اسی اندازِ فکر کے پس منظر میں لاہور کے تاریخی اجلاس میں پیش کرنے کے لیے مسلم لیگ کے زعما نے، قائدِاعظم کی رہنمائی میں ایک ایسی قرارداد مرتب کی جس میں واضح طور پر مسلمانوں کی سیاسی منزلِ مقصود کی نشاندہی کی گئی تھی۔

اس اجلاس میں قائدِاعظم نے جو خطبۂ صدارت پڑھا وہ لگے بندھے اصولوں کے مطابق تیار شدہ کوئی تقریر نہ تھی۔ غالباً وہ یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ مسلمانوں کے مطالبات سے متعلق قرارداد کی آخری شکل کیا ہو گی ؟ انھوں نے اپنی تقریر کے آغاز میں لیگ کی ان کامیابیوں کا تذکرہ کیا جو اسے پٹنہ کے اجلاس کے بعد حاصل ہوئی تھیں۔ ہر صوبے میں لیگ کی شاخیں قائم ہو چکی تھیں۔ مسلم لیگ نے کم و بیش تمام ضمنی انتخابات جیت لیے تھے۔ مسلم لیگ میں خواتین کا ایک شعبہ بنایا جا چکا تھا۔ اس کی وجہ قائدِاعظم نے یہ بیان کی "میرے خیال میں یہ امر لازم ہے کہ ہم اپنی خواتین کو اپنی جدوجہد میں شرکت کا ہر موقع فراہم کریں۔" انھوں نے کانگریسی وزارتوں کے مسلم دشمن رویے پر روشنی ڈالی اور کہا "ہمیں کئی سبق ملے ہیں اس لیے اب ہم بہت محتاط ہیں اور کسی شخص پر اعتماد نہیں کر سکتے ——— میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ کانگریس اتنی اوچھی اور گھٹیا حرکتوں پر اتر آئے گی ———"

انھوں نے یاد دلایا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ وائسرائے ہند نے انھیں گاندھی جی کے ہمراہ صلاح مشورہ کے لیے دعوت دینے کا خیال کیا۔ آخر وائسرائے کے رویے میں اس تبدیلی کا سبب کیا ہے ؛ اور پھر فرمایا کہ اس کا جواب آل انڈیا مسلم لیگ ہے جس کا میں صدر ہوں: آئندہ دستور کے مسئلے پر اظہار خیال فرماتے ہوئے انھوں نے کہا۔ ہمارا موقف یہ ہے کہ جوں ہی حالات اجازت دیں یا جنگ ختم ہوتے ہی، ہندوستان کے آئندہ دستور کے تمام مسائل کا جائزہ لیا جائے اور ۱۹۳۵ء کا ایکٹ یک قلم منسوخ کیا جائے۔" گاندھی جی کا تمسخر اڑاتے ہوئے، جنھوں نے ہندوستان کے دستور کی تشکیل و تدوین کے لیے دستور ساز اسمبلی کے قیام کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جناح میرے بھائی ہیں، قائد اعظم نے کہا ——— فرق بس اتنا ہے کہ گاندھی بھائی کے پاس تین اور میرے پاس صرف ایک ووٹ ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے ہندوستان کی آئندہ سیاسی ترقی سے متعلق مختلف افراد اور تنظیموں کی پیش کردہ دستوری سکیموں کا ذکر کیا۔ انھوں نے کہا۔ غلطی سے اس بات کو مان لیا گیا کہ مسلمان ایک اقلیت ہیں اور اتنے طویل عرصے تک یہ تذکرہ ہوتا رہا ہے کہ بعض اوقات اسے غلط ثابت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ مسلمان صحیح معنوں میں ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں ——— ہم اس ملک کے بڑے علاقے میں آباد ہیں، جہاں ہم اکثریت میں ہیں ——— مثلاً بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان ——— ہندوستان کے مسئلے کی نوعیت فرقہ وارانہ نہیں ہے بلکہ اس کی نوعیت بین الاقوامی ہے اور اسی انداز سے اس مسئلے پر غور کرنا چاہیئے ——— اگر برطانوی حکومت کی پُر خلوص خواہش حقیقتاً یہ ہے کہ اس برصغیر کے عوام امن و امان سے رہیں اور خوش حال ہوں تو ہم سب کے لیے صرف یہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ بڑی اقوام کو جداگانہ ملک دیے جائیں۔ اس مقصد کے لیے ہندوستان کو خود مختار قومی ریاستوں میں منقسم کرنا پڑے گا۔ ایسی دو قوموں (ہندو مسلمان) کو زبردستی ایک ریاست

میں شامل کیے دیکھنے سے جس میں ایک قوم کو تعداد کے لحاظ سے اکثریتی اور دوسری کو اقلیتی حیثیت حاصل ہو۔ بے اطمینانی میں اضافہ ہوگا اور انجام کار اس قسم کی ریاست میں حکومت کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا ——— مسلمانانِ ہند ایسا کوئی دستور قبول نہیں کر سکتے جس کے نتیجے میں ہندو اکثریتی حکومت قائم ہو جائے ———"

آخر میں انھوں نے دانشوروں سے اپیل کی ہے "کیا آپ یہ محسوس کرتے ہیں کہ صرف دلائل کے ذریعے آپ آزادی حاصل نہیں کر سکتے؟ مجھے ملک کے دانشوروں سے اپیل کرنی ہے۔ ہر ملک کے دانشور، آزادی کی تمام تحریکوں میں دوسروں سے آگے رہے ہیں، مسلمان دانشوروں نے کیا لائحہ عمل تجویز کیا ہے؟" انھوں نے دانشوروں پر زور دیا کہ وہ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں اور مسلمانوں کی بھلائی کے لیے کام کریں۔[1]

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو بنگال کے وزیرِ اعلیٰ مولوی فضل الحق نے درج ذیل قرارداد پیش کی جسے اتفاق رائے سے منظور کر لیا گیا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس دستور کے معاملے پر لیگ کونسل اور ورکنگ کمیٹی کی قراردادوں مورخہ ۲۷ اگست، ۱۷ اور ۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر ۱۹۳۹ء اور ۳ فروری ۱۹۴۰ء کے مطابق کونسل اور ورکنگ کمیٹی کی کارروائی کی منظوری دیتا ہے اور ان کی توثیق کرتا ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پر زور انداز میں پھر یہ اعلان کرتا ہے کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے مطابق وفاق کی سکیم اس ملک کے حالات کے قطعی غیر مناسب اور ناقابلِ عمل ہے اور مسلمانانِ ہند کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

"یہ اجلاس پر زور الفاظ میں اس خیال کا اظہار کرتا ہے کہ ملک معظم کی حکومت کی

---

[1] مندرجہ بالا اقتباسات "اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح" از جمیل الدین احمد۔ صفحات ۴۳؛ جلد ا مطبوعہ ۱۹۶۰ء شیخ محمد اشرف لاہور سے ماخوذ ہیں۔

جانب سے وائسرائے کے ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء کے اعلان کے اس حصے سے مسلمانانِ ہند مطمئن ہیں کہ جس پالیسی اور منصوبے کی بنیاد پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء مرتب کیا گیا ہے، ہندوستان کی اقلیتوں اور مختلف پارٹیوں کے صلاح مشورے سے اس پر ازسرِ نو غور کیا جائے گا مگر مسلمانانِ ہند اس وقت تک مطمئن نہ ہوں گے جب تک پورے دستوری منصوبے پر ازسرِ نو غور نہ کیا جائے اور یہ کہ نظرِ ثانی کیا ہوا منصوبہ اگر مسلمانوں کی مرضی سے تیار نہ کیا گیا تو وہ ان کے لیے ناقابلِ قبول ہوگا۔

"آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس تجویز کرتا ہے کہ جب تک دستوری منصوبے میں درج ذیل بنیادی اصول شامل نہ کیے جائیں گے اس پر اس ملک میں عملدرآمد نہیں ہو سکتا۔ اور وہ مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہ ہوگا: یعنی جغرافیائی اعتبار سے متصل و ملحق یونٹوں پر مشتمل علاقوں کی حد بندی کی جائے اور ضروری علاقائی ردوبدل کیا جائے، یہ کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں کی طرح جن علاقوں میں تعداد کے لحاظ سے مسلمان اکثریت میں ہیں، انھیں "خود مختار ریاستیں" قرار دیا جائے جس میں ملحقہ یونٹ خود مختار اور آزاد ہوں گے۔

" یہ کہ ان یونٹوں کی اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دیگر حقوق اور مفادات کے تحفظ کے لیے ان کے صلاح مشورے سے دستور میں مناسب، موثر اور واضح انتظامات رکھے جائیں اور ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں ان کے اور دیگر اقلیتوں کے صلاح مشورے سے ان کی مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی اور دیگر حقوق و مفادات کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ اختیار تفویض کرتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک سکیم مرتب کرے جس میں انجام کار متعلقہ علاقے دفاع، امورِ خارجہ، مواصلات، کسٹم اور دیگر ضروری معاملوں میں مکمل اختیارات حاصل کر سکیں:

چودھری خلیق الزماں نے قرارداد کی تائید کی اور دیگر اصحاب کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، سردار اورنگ زیب خاں، حاجی سر عبداللہ ہارون، نواب اسمٰعیل خان، قاضی محمد عیسیٰ اور آئی آئی چندریگر نے بھی اس کی حمایت کی۔ ۲۳ مارچ کو لاہور میں اس قرارداد کی منظوری سے ہندو اور کانگریس کے دل دہل گئے۔ انھیں نوشتۂ تقدیر نظر آ رہا تھا اور انھیں یقین ہو گیا تھا کہ مسلم لیگ ہندوستان کو "خود مختار ریاستوں" میں تقسیم کرنے کی وکالت کر رہی ہے۔ ہندوؤں اور کانگریس کے غیظ و غضب کی انتہا نہ رہی۔ ہندو اخباروں نے قرارداد کی مذمت میں ان گنت اداریے لکھ مارے اور ہندو لیڈروں نے اس کے خلاف خوب دل کی بھڑاس نکالی، اس کا مذاق اڑایا اور خاص طور سے قائداعظم کو نشانہ بنایا مگر انھوں نے اپنی پیشانی پر شکن نہ آنے دی۔ انھیں خوشی تھی کہ مسلمان صحیح راستے پر گامزن ہو گئے ہیں۔ ہندو اس قرارداد کی مذمت کرتے اور حقارت کے ساتھ کہتے کہ اس قرارداد میں پاکستان کا مطالبہ کیا گیا ہے جو دیوانے کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں اور انھوں نے اسے "۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاکستان" کا نام دے دیا۔

قرارداد منظور ہونے کے بعد قائداعظم نے اپنے سیکرٹری ایچ ایم سید کو بتایا "آج اقبال نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو انھیں خوشی ہوتی کہ ہم نے ان کی خواہش پوری کر دی۔"[1]

گاندھی اور راج گوپال اچاریہ نے کہا کہ قرارداد لاہور کا مقصد ہندوستان کی "چیر پھاڑ" اور "جسم کے دو ٹکڑے کر دینا" ہے۔ جناح صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا "ہندوستان قدرتی طور پر منقسم ہے ـــــ کس ملک کو تقسیم کیا جا رہا ہے؟ کس قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا رہا ہے؟ ـــــ ہندوستانی قوم اور مرکزی حکومت کا کوئی

---

[1] محمد علی جناح" ایم۔ ایچ سید۔ صفحہ ۶۹۹۔ مطبوعہ ۱۹۴۵ء۔ شیخ محمد اشرف لاہور۔

وجود نہیں ہے ـــــ'

مسلمانوں کا مطالبۂ پاکستان شدید سے شدید تر ہوتا گیا اور لیگ پہلے سے زیادہ منظم ہوگئی۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں وزیر ہند کی حیثیت سے مسٹر ایمرے کو دارالعوام میں طوعاً وکرہاً یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ''ہمارا آدرش بدستور ہندوستان کو متحد رکھنا ہے ـــــ مگر عنقریب ہندوستان کی تقسیم عمل میں آجائے گی اور یہ ملک آزاد ہوجائے گا اور پھر مختلف عناصر لاچاری ومحرومی کا شکار ہوکر ہمیشہ ہم سے اور آپس میں دست بگریبان رہیں گے۔''

دو سال بعد گاندھی جی نے جناح صاحب کو لکھا کہ مسلمان اور ہندو دو قومیں نہیں بلکہ ایک قوم ہیں۔ انھوں نے لکھا کہ جناح صاحب کی دلیل سراسر غیر حقیقی ہے۔ ''مجھے تاریخ میں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی کہ کچھ لوگ اپنا مذہب تبدیل کریں اور پھر وہ اور ان کی اولاد خود کو اپنے آباواجداد سے مختلف قوم قرار دینے لگیں۔'' جناح صاحب نے اس کے جواب میں فرمایا: ''مسلمان اور ہندو ہر تعریف اور ہر اعتبار سے دو بڑی قومیں ہیں ـــ بین الاقوامی قانون کے ہر نکتے سے مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔''

قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد اخباروں میں یہ مطالبات پیش ہونے لگے کہ جناح صاحب قرارداد کے مطابق سکیم کی تفصیلات اور پیچیدگیوں کی وضاحت کریں۔ قائداعظم نے یہ بات ماننے سے انکار کردیا۔ ان کا کہنا تھا پہلے علیحدگی کا اصول تسلیم کرلیا جائے۔ تفصیلات کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے اس پر کہا: ''اگر کوئی سکیم موجود ہے تو مسلم لیگ کے صدر کا تفصیلات بتانے سے گریز سمجھ میں نہیں آتا۔'' قائداعظم خاموش رہے اور انھوں نے اس سلسلے میں کچھ کہنے سے انکار کردیا۔

۱۹۴۳ء میں بیورلے نکولس اپنی ایک تصنیف کے سلسلے میں ہندوستان آئے اور ہندوستانی لیڈروں سے ملاقات کے بعد انھوں نے لکھا: ''میں نے ایشیا کی ایک اہم شخصیت مسٹر جناح، سے ملاقات کی ہے۔'' بیورلے نکولس نے قائداعظم سے ایک انٹرویو میں کہا کہ

آپ کے خلاف خاص طور پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ لیگ پاکستان کے نظریہ کی وضاحت نہیں کر سکی۔ قائداعظم نے فرمایا "برطانیہ سے آئرلینڈ کی علیحدگی کے شرائط کی دستاویز مکمل دس سطروں پر مشتمل تھی۔ —— تمام تفصیلات مستقبل کے لیے چھوڑ دی گئی تھیں اور مستقبل اکثر انتہائی عمدگی اور خوب صورتی کے ساتھ تمام تنازعے طے کر دیتا ہے۔ میں نے ان لوگوں کو دس سطور سے زیادہ مواد فراہم کر دیا ہے تاکہ پاکستان کے اصولوں اور لائحہ عمل کا اندازہ لگا سکیں مگر پیشگی تفصیلات فراہم کرنا ہر شخص کے بس سے باہر ہے۔ —— گول میز کانفرنس میں جب برما کی علیحدگی کا سوال طے ہوا تھا تو کسی نے "تفصیلات" کا ذکر نہ کیا۔ بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کے موقع پر بھی کسی نے اس سلسلے میں کچھ نہ کہا —— اہم نکتہ یہ تھا کہ علیحدگی کا اصول تسلیم کر دیا گیا اور دیگر امور خود بخود طے ہو گئے"۔ بیورلے نکولس نے قائداعظم سے دریافت کیا کہ آپ پاکستان کے متعلق اہم اصولوں کو کس طرح بیان فرمائیں گے؟ قائداعظم نے جواب دیا۔ "پانچ الفاظ میں، ہندوستانی مسلمان ایک قوم ہیں"۔ انھوں نے کہا۔ ہندوستان میں انگریزوں کی موجودگی کا سبب متحدہ ہندوستان کا مہمل تصور ہے۔ جس کی تبلیغ گاندھی کرتے ہیں۔ میں اپنے الفاظ دہراتا ہوں کہ اس تصور (متحدہ ہندوستان) کو انگریزوں نے جنم دیا —— یہ ایک خام خیالی ہے۔ —— جس سے مستقل نزاع پیدا ہو جائے گا۔ جب تک یہ نزاع رہے انگریز اس کو بہانہ بنا کر یہاں موجود رہیں گے"۔ نکولس نے ان سے دریافت کیا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ انگریز "ملک تقسیم کر دیں اور یہاں سے چلے جائیں؟" اس کے جواب میں جناح صاحب نے فرمایا "آپ نے بڑی عمدہ بات کہی ہے"۔[1]

ہندوستان کے حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد بیورلے نکولس نے لکھا۔ اعداد و شمار سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو یہ اعداد قائل کرنے کے لیے کافی ہیں۔ گزشتہ سات سال

---

[1] ورڈکٹ آن انڈیا۔ بیورلے نکولس۔ صفحات ۱۸۹ تا ۱۹۳۔ مطبوعہ ۱۹۴۴ء۔ تھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

میں ہندوستان میں مسلمانوں نے جن ضمنی انتخابات میں حصّہ لیا ان میں سے سوائے ایک کے باقی سب مسلم لیگ کے امیدواروں نے جیت لیے۔ یہ امیدوار سو فی صدی پاکستان کے حامی تھے۔ ان کے پروگراموں میں مصالحت یا ذومعنویت کا شائبہ تک نہ تھا۔ ہر جگہ انھوں نے بھاری اکثریت سے انتخاب جیتا۔ بنگال، آسام، شمالی مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور حقیقت ہر صوبے میں جو انجام کار پاکستان میں مدغم ہوگا، انھوں نے بھاری اکثریت حاصل کی، مرکزی اسمبلی تک میں مسلمانوں کی تیس نشستوں میں سے ۲۸ نشستیں مسلم لیگ کے قبضے میں ہیں[1]۔"

قائداعظم کی قیادت میں مسلمان برابر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہندوستان کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک، شہروں اور دیہات میں، کھیتوں اور کارخانوں میں، لاکھوں مسلمان مرد، عورتیں اور بچّے نعرے لگا رہے تھے۔ "ملک تقسیم کرو اور چلے جاؤ۔ پاکستان زندہ باد۔"

---

[1] ورڈکٹ آن انڈیا۔ بیورلے نکولس، صفحات ۱۹۶ اور ۱۹۷۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ء۔ ٹھیکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

ہم متحد ہیں

۱۹۴۰ء کے ابتدائی تین مہینوں کے دوران میں اتحادیوں کو جنگ میں بری طرح زک اٹھانی پڑی۔ ہٹلر اور مسولینی نے یورپ کا ایک بڑا علاقہ فتح کر کے انھیں روم برلن محور کا باجگذار بن جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ برّاعظم یورپ میں جمہوریت کا آخری چراغ فرانس، دم توڑ رہا تھا اور اس کی بقا خطرے میں تھی۔ انجام کار فرانس پر بھی نازی فوج نے جون میں قبضہ کر لیا اور برطانوی افواج کو افراتفری کے عالم میں پسپا ہونا پڑا۔ یہ پسپائی سانحہ ڈنکرک کے نام سے مشہور ہے۔ جزائر برطانیہ کو ہر وقت نازی حملے کا خطرہ درپیش تھا اور ایک آزاد ملک کی حیثیت سے برطانیہ کا وجود خطرے میں پڑ گیا تھا۔ ونسٹن چرچل نیویل چیمبرلین کی جگہ انگلستان کے وزیر اعظم مقرر ہوئے اور ایل ایس ایمرے، مارکوئس آف زیٹ لینڈ کی جگہ وزیر ہند بنائے گئے۔ صورتِ حال اس قدر تشویشناک ہو گئی کہ برطانوی پارلیمنٹ نے ہر ممکن صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے بعجلت ہندوستان اور برما (ہنگامی دفعات) ایکٹ منظور کر لیا۔ اس ایکٹ کے تحت یہ طے ہوا کہ مواصلات کا سلسلہ منقطع ہو جانے کی صورت میں وائسرائے ان تمام اختیارات کو بروئے کار لانے کا اہل ہو گا جو اب تک وزیر ہند کے ہاتھ میں تھے۔

ہندوستان کے آئندہ حالات کے متعلق چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں اور کانگریس نے، جس کی وزارتیں قبل ازیں مستعفی ہو گئی تھیں، حکومت سنبھالنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی تھی لیکن گاندھی جی نے کہا کہ کانگریس "برطانیہ کو تباہ کر کے آزادی کی خواہاں نہیں ہے" اور جواہر لال

نے فاشی ڈکٹیٹروں کی مذمت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا "ہندوستان انگلستان کی مشکلات سے
فائدہ نہیں اٹھائے گا۔" قائداعظم نے مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے ایک بیان میں کہا۔
"اس وقت تک ہم نے برطانوی حکومت کے لیے نہ کوئی مشکل پیدا کی ہے نہ اسے کسی الجھن
میں ڈالا ہے۔ جن صوبوں میں مسلم لیگ کا اثر ہے۔ انھیں برطانوی حکومت سے تعاون کرنے
کی آزادی دے دی گئی ہے۔" ۱۷ر جون ۱۹۴۰ء کو بمبئی میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس
منعقد ہوا اور ایک قرارداد کے ذریعے جناح صاحب کے اس بیان کی توثیق کی گئی۔ تاہم
اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ دنیا کی موجودہ نازک صورتِ حال کا تقاضا ہے کہ ہر ہندوستانی
باشندہ۔ اپنے ملک کی دفاعی کوششوں میں بھرپور حصہ لے...... جب تک کل ہند
بنیادوں پر حکومت، مسلم لیگ اور ان دوسری پارٹیوں کے درمیان جو ملک کو درپیش خطرے
میں دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہیں، قریبی تعاون کے لیے کسی اطمینان بخش اساس
پر سمجھوتہ نہیں ہوگا حقیقی مقصد پورا نہ ہوگا۔"

وائسرائے کو مزید خصوصی اختیارات حاصل ہو گئے تھے۔ وہ صورتِ حال کا جائزہ
لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ اگرچہ کانگریس وزارتیں قبول نہ کرے گی تاہم وہ جنگی تیاریوں
کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ مسلم لیگ بھی جنگ سے متعلق امور میں کوئی مزاحمت نہ کرے گی۔
وائسرائے نے برطانوی کابینہ کو ملکی حالات سے پوری طرح باخبر رکھا۔ تاہم وزیرِ ہند ایمرے
کی خواہش تھی کہ کچھ نہ کچھ طے ہونا چاہیے۔ وہ دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے اس غیر جانبدارانہ
رویے سے کچھ خوش نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چند منتخب لیڈروں پر مشتمل ایک کمیٹی
دستوری اصلاحات کے معاملے یعنی صوبائی خود مختاری اور کل ہند وفاق کے مسئلوں کا جائزہ لے۔
وائسرائے کی تجویز تھی کہ اگرچہ صوبائی حکومتیں صرف مسلمانوں کی وجہ سے چل رہی ہیں اور
ہندوستانی فوج میں مسلمانوں کی تعداد ساٹھ فی صدی سے زیادہ ہے تاہم ہندوستانی لیڈروں
اور جماعتوں کو سیاسی جھگڑوں اور رسہ کشی میں مبتلا کرنے کے لیے یہ موزوں وقت نہیں ہے۔

اس خط وکتابت کے نتیجے میں وائسرائے کو جناح صاحب، گاندھی جی اور دوسرے سیاسی لیڈروں سے بات چیت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے صدر کو وائسرائے سے ملاقات کا اختیار دے دیا اور قائداعظم نے ۲۷ جون کو اور گاندھی جی نے ۲۹ جون کو وائسرائے سے ملاقات کی۔

"قائدِاعظم نے وائسرائے کو بتایا کہ لیگ حکومت کی مدد کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ اسے صوبائی اور مرکزی وزارتوں میں مؤثر انداز میں شریک کیا جائے اور یہ کہ وائسرائے لیگ کی کسی شرط کو کانگریس کی منظوری سے مشروط نہ کرے۔ انھوں نے وائسرائے کو صحیح صورتِ حال سے باخبر کیا اور مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے لیے آئندہ جو دستوری اصلاحات مرتب کی جائیں وہ دو آزاد اور خودمختار مملکتوں کے لیے ہونی چاہئیں۔ اس ملاقات کے بعد قائداعظم نے وائسرائے کے نام ایک تحریری یادداشت میں یہ مطالبہ دُہرایا اور کہا کہ اس معاملے کو اس طرح حل نہ کیا جائے جس سے "دوقومی نظریے کو نقصان پہنچے، جو پورے ملک کے مسلمانوں کا عقیدہ بن چکا ہے۔" انھوں نے اس بات پر بھی زور دیا کہ مسلم لیگ کی پیشگی منظوری اور رضا و رغبت کے بغیر عبوری یا قطعی طور پر اس معاملے کو حل نہ کیا جائے۔ وائسرائے نے اپنے جوابی مکتوب میں اس بات سے اتفاق نہ کیا کہ توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل میں صرف مسلم لیگ کے نامزد نمائندے لیے جائیں البتہ وہ اس بات پر آمادہ ہوئے کہ وہ ایگزیکٹو کونسل اور مجوّزہ جنگی کونسل کے لیے تجویز کردہ ناموں پر غور کریں گے۔

کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے ۸ جولائی کو دلّی میں سر سکندر حیات خاں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کی غرض سر سکندر حیات کو مسلم لیگ کی حمایت سے باز رکھنا تھا جس نے کھُل کر ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔ قائداعظم نے سر سکندر حیات کو تار بھیجا کہ وہ کسی فرد یا پارٹی سے کوئی معاملت نہ کریں اور یہ کہ صرف مسلم لیگ ہی اس کی مجاز ہے۔ اس پر مولانا آزاد نے جناح صاحب کے نام تار میں دریافت کیا کہ کیا لیگ کا

موقف یہ ہے کہ وہ ایسا کوئی عبوری سمجھوتہ تسلیم نہ کرے گی جس کی بنیاد دو قومی نظریے پر۔ جو بہ
قائد اعظم نے مولانا آزاد کو جواب دیا کہ "میں آپ سے اس معاملے پر تحریری یا بالمشافہ بات
چیت کرنے پر آمادہ نہیں ہوں کیونکہ آپ کو مسلمانانِ ہند کا ذرہ بھر اعتماد حاصل نہیں ہے۔
کیا آپ کو یہ احساس نہیں کہ کانگریس نے محض یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ وہ ایک قومی تنظیم
ہے آپ کو اپنا صدر بنایا ہے تاکہ وہ دوسرے ملکوں کو دھوکہ دے سکے۔ آپ نہ ہندوؤں
کی نمائندگی کرتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی۔ کانگریس ایک ہندو جماعت ہے۔ اگر آپ میں ذرا
سی بھی خودداری ہے تو مستعفی ہو جائیے۔"

اس کے بعد مسلم لیگ کے زیر انتظام پبلک جلسوں میں مولانا آزاد کو "کانگریسی شو
بوائے" کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

مختلف سیاسی لیڈروں سے وائسرائے کی بات چیت کے متعلق رپورٹ کا مطالعہ
کرنے کے بعد وزیر ہند نے ایک بیان بھیجا۔ حکومت برطانیہ کی جانب سے وائسرائے کو یہ
بیان جاری کرنا تھا۔ وائسرائے نے ۸ اگست کو یہ بیان جاری کیا جو "اگست والی پیشکش" کے
نام سے مشہور ہے۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کو متحد رکھنا ازبس ضروری ہے۔
"تاکہ یہ ملک تشدد اور جارحانہ کارروائیوں کے خلاف عالمی جدوجہد میں مؤثر کردار ادا کر
سکے۔" اس پیشکش میں اس امر کا اظہار کیا گیا تھا کہ انجام کار ہندوستان کو ڈومینین (داخلی
خودمختاری) کی حیثیت دی جائے گی اور یہ کہ وائسرائے اور مختلف سیاسی جماعتوں کے درمیان
اگر اتفاق رائے نہ ہوا تب بھی وائسرائے کونسل کی توسیع کی کارروائی ملتوی نہ کریں گے۔ وائسرائے
کونسل کی توسیع اور جنگ کی مشاورتی کونسل کے قیام کی تجویز پر عملدرآمد کریں گے۔ اقلیتوں کے
متعلق تحفظات کی نسبت اس بیان میں کہا گیا تھا کہ حکومت برطانیہ انھیں ایسا نظام حکومت
قبول کرنے پر مجبور نہ کرے گی جس پر انھیں شدید اعتراضات ہوں۔

جب اس پیشکش کے مندرجات شائع ہوئے تو گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا کہ

انھیں اس سے رنج ہوا ہے اور اس کی پیچیدگیوں نے مجھے ڈرا دیا ہے“۔ جناح صاحب نے ۱۱ اور ۱۳ اگست کو وائسرائے سے ملاقات کی اور اس سے مزید وضاحت چاہی۔ ایمرے نے ۱۴ اگست کو دار العوام میں ایک تقریر کے دوران میں کہا ”مستقبل کے آزاد ہندوستان میں کئی اقوام کی گنجائش ہونی چاہیے“۔ ”مکمل آزادی کے متعلق کانگریس کے مطالبے کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ مطالبہ کانگریس کے نزدیک پسندیدہ ہے مگر اقلیتوں نے اسے مسترد کر دیا ہے“۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے ستمبر میں بمقام بمبئی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا اور راج گوپال اچاریہ نے ایک ”معقول پیشکش“ کی جس کا مقصد مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنا تھا۔ ان کی پیشکش کے مطابق ”اگر حکومت برطانیہ ہندوستان میں ایک عبوری مرکزی قومی حکومت قائم کرنے پر رضامند ہو گئی تو وہ اپنے ساتھیوں پر دباؤ ڈالیں گے کہ وہ مسلم لیگ کو وزیر اعظم نامزد کرنے کی دعوت دیں جو اپنی مرضی کے مطابق حکومت کی تشکیل کرے“۔ آل انڈیا کانگریس نے فیصلہ کیا کہ ”برطانیہ نے وائسرائے کے ذریعے جو پیشکش کی ہے، وہ درخورِ اعتنا نہیں ہے“۔

۳۱ اگست سے ۲ ستمبر تک بمبئی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ ”مسلمانانِ ہند کی جانب سے مسلم لیگ نے ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق جو موقف اختیار کیا ہے، ان اعلانوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے سمجھنے کی خواہش موجود ہے۔ ورکنگ کمیٹی اس امر پر بھی اطمینان ظاہر کرتی ہے کہ حکومت برطانیہ نے خاص طور سے مسلم لیگ کا یہ مطالبہ مان لیا ہے کہ اس باب میں واضح یقین دہانی کرائی جائے کہ برطانوی حکومت لیگ کی منظوری کے بغیر کوئی عبوری یا قطعی دستور منظور نہ کرے گی“۔ ایک اور قرار داد کے ذریعے ورکنگ کمیٹی نے خیال ظاہر کیا کہ ”وائسرائے کے بیان اور وزیر ہند کی تقریر میں قومی اتحادِ خیال کے نظریے کے متعلق (جس کا کوئی وجود ہی نہیں ہے) جو باتیں کہی گئی ہیں وہ تاریخی اعتبار سے غلط ہیں اور خود اپنی تردید کر دیتی ہیں۔ ان باتوں سے مسلمانانِ ہند کے ذہن میں شکوک و شبہے پیدا ہوں گے اور بنا بریں کمیٹی اس امر کا اعادہ اور اپنے موقف کو

پھر واضح کرنا چاہتی ہے کہ وہ قرارداد لاہور اور اس کے بنیادی اصولوں پر قائم ہے، جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ہندوستان کی تقسیم کی جائے اور ملک کے شمال مغربی اور مشرقی علاقوں میں، جہاں مسلم اکثریت ہے آزاد ریاستیں قائم کی جائیں۔ کمیٹی اپنے اس عزم کا بھی اظہار کرتی ہے کہ ہندوستان کے دستور کے انتہائی صبر آزما اور پیچیدہ مسئلے کا یہی ایک حل ہے کہ ملک تقسیم کر دیا جائے۔ کمیٹی کو خوشی ہے کہ برطانوی پارلیمنٹ کو اس سوال کی اہمیت اور حقیقی پہلو کا احساس ہے اور حکومت برطانیہ نے صورت حال کے حقائق کا مکمل طور پر اندازہ لگا لیا ہے۔

"مسلم لیگ اپنی اس پوزیشن کو پھر واضح کرتی ہے کہ مسلمانانِ ہند ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور اپنا حق خود اختیاری بروئے کار لائیں گے اور وہ اپنے مستقبل کے خود مالک و مختار ہیں۔"

جناح صاحب نے ۲۴ ستمبر کو وائسرائے سے طویل گفتگو کی مگر ان مذاکرات کا کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ ۲۶ اکتوبر کو انھوں نے وائسرائے کو لکھا کہ وہ اس اہم معاملے پر لیگ کا نقطۂ نظر نہیں سمجھ سکے ہیں یعنی "بعد میں اگر کسی پارٹی نے جنگ کے دوران تعاون اور امداد کے لیے ایگزیکٹو کونسل میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا تو اسے صرف ان شرائط پر کونسل میں شامل کیا جائے جو مسلم لیگ پارٹی منظور اور قبول کرے کیونکہ ہم ایک طرح سے ایک معاہدۂ جنگ کے شریک بن رہے ہیں۔"

ستمبر کے آخر میں دہلی میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کا اجلاس منعقد ہوا اور مندرجہ ذیل بنیادوں پر "اگست کی پیشکش" کو مسترد کر دیا گیا:

"آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۲ ستمبر ۱۹۴۰ء کو بمقام بمبئی اپنے اجلاس میں گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی مجوزہ توسیع اور جنگ کی مشاورتی کونسل کے قیام سے متعلق پیشکش کے بارے میں لیگ کے صدر کے نام وائسرائے کے مکتوب مورخہ ۱۴ اگست ۱۹۴۰ء

پر غور کرنے کے بعد وائسرائے سے درخواست کی تھی کہ وہ اس معاملے کا دوبارہ جائزہ لیں
اور اپنے صدر کو یہ اختیار دیا تھا کہ وہ خاص طور سے قراردادوں کے نکات کے بارے میں
مزید گفتگو کریں اور وضاحت طلب کریں جس کے بعد کمیٹی اس پیشکش پر غور کرے گی۔ وائسرائے نے
جب یہ قراردادیں بھیجی گئیں تو انھوں نے لیگ کے صدر کو ۲۴ ستمبر کو ملاقات کی دعوت دی
دوران قراردادوں کے نکات پر مکمل اور آزادانہ گفت و شنید کے بعد وائسرائے نے ۲۵ ستمبر
باضابطہ جواب ارسال کیا تھا۔ کمیٹی، جنگ کے دوران میں حکومت کی مدد کرنے اور ملک کے
دفاع میں ہاتھ بٹانے کی ابتدا ہی سے خواہش مند ہے۔ اس کے باوجود وہ پورے معاملے پر
انتہائی خلوص و توجہ سے غور کرنے کے بعد اظہار افسوس کرتی ہے کہ وہ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا
موجودہ پیشکش قبول نہیں کر سکتی:۔

۱۔ گورنر جنرل کی مجوزہ توسیع شدہ ایگزیکٹو کونسل میں، جس میں ارکان کی کل تعداد یا مزید
اراکین کی تعداد کے بارے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی گئی ہے۔ لیگ کے صرف دو نمائندے
شامل کیے جائیں گے جس سے اسے مرکزی حکومت میں حقیقی اور مناسب حصہ نہیں ملے گا۔"

۲۔ اس بات کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے کہ بعد میں اگر کوئی پارٹی جنگ سے متعلق
کوششوں میں تعاون کا فیصلہ کرے اور حکومت اسے ایگزیکٹو کونسل میں شامل کرنے پر رضامند ہو جائے
(جس سے انتظامیہ میں کافی رد و بدل ہو گا) تو مسلم لیگ کی پوزیشن کیا ہو گی؟"

۳۔ حکومت نے اب تک اُن صوبوں میں غیر سرکاری مشیر مقرر کرنے کی کوئی تجویز پیش
نہیں کی ہے جن کا انتظام گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کے تحت
گورنروں کے ہاتھ میں ہے۔ کمیٹی کا خیال ہے کہ ان صوبوں کے نظم و نسق میں مسلمانوں کی شمولیت
کے بغیر حقیقی معنوں میں اور مؤثر طور پر مسلمانوں کا تعاون حاصل نہیں کیا جا سکتا۔"

۴۔ مجوزہ جنگی مشاورتی کونسل ابھی تک محض ایک خاکہ ہی ہے اور اس کی تشکیل اور
ذمہ داریوں کے متعلق اب تک کچھ طے نہیں کیا گیا ہے سوائے اس کے کہ اس میں غالباً ۲۰ اراکین

ہوں گے اور کونسل کے قیام کے بارے میں ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کے بعد غور کیا جائے گا۔"

جب لیگ اور کانگریس نے "اگست کی پیشکش" مسترد کر دی تو وائسرائے نے انفرادی حیثیت میں ایسے مسلمانوں کی تلاش شروع کی جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل اور جنگی مشاورتی کونسل میں شامل ہونے پر آمادہ ہو سکیں۔ مگر وی پی مینن رقم طراز ہیں "وائسرائے کو مسلم لیگ کا ایسا کوئی لیڈر ملنے کی توقع نہ تھی جو لیگ کے فیصلے کی خلاف ورزی کرنے پر تیار ہو جاتا۔"[1] اس اعتراف سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر لیگ کی گرفت کتنی مضبوط ہو چکی تھی۔

۲۰ نومبر کو وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے مرکزی اسمبلی کے دونوں ایوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ چونکہ بڑی سیاسی جماعتوں نے حکومت برطانیہ کی پیشکش قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے اس لیے یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ اس پیشکش کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ اگلے روز وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ وائسرائے کی بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔ انھوں نے اہل ہند سے اپیل کی کہ ہندوستان اور دنیا کو جو مسائل درپیش ہیں اُن پر مزید غور و خوض کریں۔ ہندو اخباروں نے ان کی تقریر کے بعض حصوں پر اعتراض کیا اور کہا کہ یہ تقسیم ہند کے بارے میں مسلمانوں کے مطالبے کو جائز قرار دینے کے مترادف ہیں۔ دسمبر کے آخر میں مدراس میں ہندو مہاسبھا کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس میں جناح صاحب اور مسلم لیگ کے خلاف انتہائی غیر مہذب اور نامناسب انداز میں تقریریں ہوئیں۔ اجلاس کی ایک قرارداد میں مطالبہ پاکستان کو وطن دوستی کے منافی اور ہندوستان دشمنی پر مبنی قرار دیا گیا۔

جن لیڈروں کی تقریروں سے بلاواسطہ یا بالواسطہ طور پر جنگ سے متعلق کارروائیوں پر اثر پڑتا تھا، ان کے خلاف حکومت کی مشنری حرکت میں آگئی اور سینکڑوں افراد کو قید خانوں

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۱۰۲۔ مطبوعہ ۱۹۵۷ء۔ اورینٹ لونگ مینس بمبئی۔

میں دھکیل دیا گیا۔ کانگریس کے صدر مولانا آزاد پر جنوری ۱۹۴۱ء میں ایک تقریر کرنے کی پاداش میں مقدمہ چلا اور انھیں سزا ہو گئی۔ اسی مہینے سبھاش چندر بوس جنھیں پیرول پر رہا کیا گیا تھا کلکتہ میں اپنے مکان سے پُر اسرار طریقے پر غائب ہو گئے۔ فروری کے آخر میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعے ایمرے کے ان بیانات پر جن سے بظاہر ہوتا تھا کہ انگریز "ہندوستان کے اقتصادی اور سیاسی اتحاد" کی بنیاد پر آئندہ دستور کی تشکیل کے بارے میں غور کر رہے ہیں اظہار ناپسندیدگی کیا گیا۔ قرارداد میں اس امر کا اعادہ کیا گیا کہ قرارداد لاہور ہی "ہندوستان کے دستوری مسئلے کا واحد حل ہے۔" یونینسٹوں پر ہندو ممبروں کا دباؤ بڑھ رہا تھا اور وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مسلم لیگ کی رکنیت ان کے لیے ذہنی اذیت کا سبب بن گئی ہے۔ وہ ہندوؤں کے حملوں کے سامنے پسپا ہونے لگے اور سر سکندر نے مارچ ۱۹۴۱ء میں پنجاب اسمبلی میں بحث کے دوران میں کہا کہ مسلمان مضبوط و مستحکم مرکزی حکومت سے خوف زدہ ہیں کیونکہ ایسی صورت میں مرکز میں انھیں اقلیتی حیثیت حاصل ہو جائے گی، اس لیے ان کا مطالبہ ہے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دیے جائیں۔ اُنھوں نے کہا "یونٹوں کو مکمل خود مختاری اور آزادی دے دیجیے اور پھر علاقائی بنیاد پر علاقوں یا حلقوں کی شکل میں ان کی حد بندی کیجیے ــــــ اگر آپ پنجاب کے لیے حقیقی آزادی کے خواہاں ہیں، یعنی ایک ایسا پنجاب چاہتے ہیں جس میں ہر فرقے کو معقول و مناسب حصہ ملے تو ــــــ یہ پنجاب پاکستان نہ ہوگا بلکہ صرف پنجاب ہوگا، پانچ دریاؤں کی سرزمین۔ پنجاب، پنجاب ہے اور ہمیشہ پنجاب رہے گا خواہ کوئی کچھ کہے۔"[1]

قائد اعظم کو سر سکندر کی تقریر کا یہ لب و لہجہ پسند نہ آیا۔ وہ مطالبۂ پاکستان کے خلاف

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی۔ پی مینن ص ۵۰۔ مطبوعہ ۱۹۵۷ء اورینٹ لونگ مینس بمبئی۔

پنجاب کے مسلمان یونینسٹوں کی روز افزوں مخالفت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۲ اپریل کو مدراس میں قائدِ اعظم کی زیرِ صدارت مسلم لیگ کونسل کا بیسواں اجلاس منعقد ہوا اور ۱۵ اپریل تک جاری رہا۔ اس اجلاس میں جو قرارداد پیش کی گئی اس کی غرض و غایت غالباً یہ تھی کہ ہر مسلم لیگی پاکستان کے حصول کو جزوِ عقیدہ بنا لے۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "قرارداد لاہور کے مقاصد کو آل انڈیا مسلم لیگ کے مقاصد اور نصب العین میں شامل کیا جائے۔" نوابزادہ لیاقت علی خان نے یہ قرارداد پیش کی اور حاجی عبدالستار سیٹھ نے اس کی تائید کی۔ قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور کر لی گئی۔

اسی مہینے میں برطانوی پارلیمنٹ نے فیصلہ کیا کہ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کی دفعہ ۹۳ کا نفاذ، جس کے مطابق کچھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں معطل کر دی گئی تھیں مزید ایک سال جاری رہے گا۔ وزیرِ ہند مسٹر ایمرے نے کہا کہ جب تک دونوں بڑی سیاسی جماعتوں کے درمیان سمجھوتہ نہیں ہوتا وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی از سرِ نو تشکیل کی تجویز پر عملدرآمد نہیں ہوگا۔

قائدِ اعظم مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف تھے کیونکہ برطانوی حکومت پہلے ہی بالواسطہ طور پر یہ قبول کر چکی تھی کہ مسلم لیگ کی رضامندی کے بغیر کوئی دستوری تبدیلی عمل میں نہ آئے گی۔ اس سلسلے میں انھوں نے والیانِ ریاست کے ایوان کے چانسلر جام صاحب نوانگر سے گفتگو کی اور کہا کہ والیانِ ریاست یہ اعلان کریں کہ ایک فریق کی حیثیت سے وہ مسلم لیگ کی پیٹھ میں چھرا نہیں بھونکیں گے۔ اس کے عوض میں قائدِ اعظم نے یہ پیشکش کی کہ جب بھی دستوری تبدیلیوں پر مذاکرات ہوئے، مسلم لیگ والیانِ ریاست کے ایوان سے صلاح مشورہ کرے گی۔ اگرچہ اس بات چیت کے نتیجے میں کوئی ٹھوس اور قطعی معاہدہ نہ ہو سکا تاہم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قائدِ اعظم اس پوزیشن کو برقرار رکھنے کے کس قدر خواہش مند تھے جو مسلم لیگ کو اس وقت حاصل تھی۔

۱۹۴۱ء کے وسط میں ایسے امکانات نظر آ رہے تھے جیسے نازیوں کا سیل بلا پوری دنیا کو تہس نہس کر کے رکھ دے گا۔ جرمنی میں ہٹلر کا طوطی بول رہا تھا اور اس نے بذات خود مملکت کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ مگر اس کی خواہش اور امنگوں کی تکمیل کے لیے جرمنی کافی نہ تھا۔ وہ پوری دنیا کو نازی اقتدار کے پنجوں میں جکڑنا اور خود اس عالمی نازی سلطنت کا آمر مطلق بننا چاہتا تھا۔ یوگوسلاویہ کچھ عرصے پہلے جرمنوں کے فولادی قدموں تلے روندا جا چکا تھا، انھوں نے یونان کو تاراج کر دیا تھا اور بحیرۂ ایجین کے گرد و نواح کے جزیرے جرمنی کا جزو بن چکے تھے۔ مشرق وسطیٰ، خاص طور سے عراق اور فلسطین میں اتحادیوں کو انتہائی سنگین حالات کا سامنا تھا۔ براعظم افریقہ میں بھی حالات ان کے حق میں سازگار نہ تھے اور جرمن جنرل رومیل زبردست فوجی طاقت کے ساتھ نہر سویز کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا۔ نہر سویز پر جرمنوں کے قبضے سے اتحادیوں کو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید میں فوج اور سامان کی سپلائی برقرار رکھنے میں انتہائی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا۔ وائسرائے نے محسوس کیا کہ برطانیہ کے مفادات خطرے میں ہیں۔ ایک طرف تو دونوں بڑی سیاسی جماعتیں عدم تعاون سے کام لے رہی تھیں، دوسری طرف محوری فوجوں کی برق رفتار پیش قدمی جاری تھی۔ آخر وائسرائے نے جولائی میں حکومت برطانیہ سے صلاح مشورے کے بعد اپنی ایگزیکٹو کونسل میں توسیع کا فیصلہ کیا۔ کونسل کے ہندوستانی ارکین کی تعداد تین سے بڑھا کر آٹھ کر دی گئی تھی۔ مسلم لیگ اور کانگریس کے عدم تعاون کے پیش نظر وائسرائے نے طے کیا کہ ان دونوں جماعتوں سے غیر متعلق لوگ کونسل میں شامل کیے جائیں۔ اسی عرصے میں قومی دفاعی کونسل بنائی گئی۔ وزیر ہند نے پارلیمنٹ میں وائسرائے ہند کے ان اقدامات کی تائید کی۔ گاندھی جی نے کانگریس کی طرف سے ایک بیان میں کہا کہ کانگریس ایگزیکٹو کونسل اور دفاعی کونسل سے تعاون نہیں کرے گی۔ جناح صاحب نے بھی نہایت سخت الفاظ میں وائسرائے پر الزام لگایا کہ انھوں نے مسلم لیگ کو نظر انداز کر دیا ہے اور

کہا کہ میری پارٹی وائسرائے کی پیشکش پر غور نہیں کرے گی۔

لیکن وائسرائے مسلم لیگ کے چند اراکین کو ایگزیکٹو کونسل اور دفاعی کونسل میں شامل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نازک مرحلے پر قائدِ اعظم نے ۲۴ راگست کو بمقام بمبئی لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ ورکنگ کمیٹی نے طے کیا کہ پنجاب، بنگال اور آسام کے مسلمان وزرائے اعلیٰ سر سکندر حیات خاں، فضل الحق اور سر محمد سعد اللہ دفاعی کونسل سے استعفا دے دیں۔ کمیٹی نے انھیں تین دن کی مہلت دی۔ سر سکندر حیات اور سر سعد اللہ نے ٹیلیفون پر اطلاع دی کہ وہ کمیٹی کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے فی الفور مستعفی ہونے کو تیار ہیں مگر فضل الحق نے غور کرنے کے لیے کچھ وقت طلب کیا۔ ایک قرارداد کے ذریعے انھیں دس دن کی مہلت دی گئی اور متنبہ کیا گیا کہ "لیگ کے صدر کو مقررہ مدت میں اگر فضل الحق کی طرف سے تسلی بخش جواب نہ ملا تو کمیٹی صدر کو یہ اختیار دیتی ہے کہ وہ فضل الحق کے خلاف مناسب اور ضروری کارروائی کریں۔"

کمیٹی نے تین دیگر قراردادوں کے ذریعے لیگ کونسل کے ارکان، نواب چھتاری، بیگم شاہنواز اور سر سلطان احمد پر زور دیا کہ وہ قومی دفاعی کونسل سے مستعفی ہو جائیں اور اگر وہ مستعفی نہ ہوں تو صدر کو اختیار ہے کہ ان کے خلاف جو کارروائی مناسب سمجھے کرے۔"

بنگال کے وزیرِ اعلیٰ نے مسلم لیگ کے فیصلے کے سامنے سر جھکا دیا اور دفاعی کونسل سے مستعفی ہو گئے مگر انھوں نے لیگ کونسل اور ورکنگ کمیٹی سے بھی استعفا دے دیا۔ بیگم شاہنواز اور سر سلطان احمد نے اس فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا لہٰذا انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ ۲۶ ر اور ۲۷ راکتوبر کو اینگلو عربک کالج دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک قرارداد کے ذریعے لیگ نے اپنے صدر کے اقدام کی توثیق کی۔ قرارداد میں وائسرائے کی کارروائی کی مذمت کی گئی اور اعلان کیا گیا کہ وائسرائے کونسل کی توسیع کے بعد اس کونسل اور نام نہاد قومی دفاعی کونسل میں جن مسلمانوں کو شامل کیا گیا ہے وہ کسی طرح بھی مسلمانوں

کے نمائندے نہیں ہیں، اور وہ مسلمانوں کے مفاد کی نمائندگی نہیں کر سکتے۔ یہ کونسل اس سلسلے میں حکومت کے رویے کی بھی مذمت کرتی ہے جس کا مقصد مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنا ہے۔[1]

۱۴ نومبر کو فضل الحق نے لیگ کے اعزازی سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خاں کو ایک مکتوب تحریر کیا جس میں انھوں نے لکھا کہ میں لیگ کے صدر کی انتہائی عزت کرتا ہوں اور لیگ کا وفادار کارکن ہوں۔ "میں ان لوگوں میں سے ہوں جنھوں نے مسلمانانِ ہند کی واحد قومی تنظیم کے استحکام کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، لیکن قسمت کی یہ کتنی بڑی ستم ظریفی ہے کہ مجھے بے سبب نکتہ چینی کا نشانہ بنایا گیا اور غلط سمجھا گیا۔" انھوں نے اپنے مکتوب میں یقین دلایا کہ "میں کسی فرد کی توہین نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کسی شخص کو دکھ پہنچانے یا اس پر کوئی الزام تراشی کا کبھی خیال بھی نہ کیا تھا۔ مجھے امید ہے کہ میری صراحت قبول کر لی جائے گی اور یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے گا۔" مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں طے کیا گیا کہ فضل الحق کی یقین دہانی قبول کر لی جائے اور اس سلسلے میں مزید کارروائی نہ کی جائے۔ یوں یہ قضیہ خوش اسلوبی سے ختم ہو گیا۔

مرکزی اسمبلی کا اجلاس جاری تھا کہ قائد اعظم نے ایوان میں ایک بیان دیا۔ یہ بیان مسلم لیگ کے فیصلوں سے متعلق تھا اور اس میں وائسرائے کی ان کوششوں کی مذمت کی گئی تھی جن کا مقصد مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنا تھا۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ مسلم لیگ پارٹی نے احتجاج کے طور پر ایوان کی کارروائی کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ تقریر کے بعد قائد اعظم اور مسلم لیگ پارٹی کے تمام اراکین ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

دسمبر کے اوائل میں جاپان نے پرل ہاربر پر حملہ کر دیا اور جنگِ عظیم نے پھر انگڑائی لی۔ ...

---

[1] آل انڈیا مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی اور لیگ کونسل کی قراردادوں کے اقتباسات۔ مسلم لیگ کی ان [illegible] سے اخذ کیے گئے ہیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اعزازی سیکرٹری کی حیثیت سے نواب زادہ لیاقت علی خاں نے شائع کی تھیں۔

بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ۔ پرل ہاربر پر حملے کی وجہ سے امریکہ عملاً میدانِ جنگ میں کود پڑا۔ جاپان نے چند گھنٹوں میں شنگھائی اور تھائی لینڈ پر قبضہ کر لیا اور اندیشہ پیدا ہو گیا کہ ملایا پر بھی ان کا قبضہ ہو جائے گا۔ اس پس منظر میں ۲۶ر اور ۲۷ دسمبر کو ناگپور میں جناح صاحب کی زیرِ صدارت مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اجلاس کی پہلی قرارداد میں وائسرائے کے ۱۵ دسمبر ۱۹۴۱ء کے اس بیان پر غور کیا گیا جس میں انھوں نے "اگست والی پیشکش کے اصولوں کا اعادہ کیا تھا جس کی وزیرِ ہند ۲۲ر اپریل ۱۹۴۱ء کو پارلیمنٹ میں تائید کر چکے تھے۔ قرارداد میں کہا گیا" اس وقت سے حکومتِ برطانیہ کے ذمہ دار وزیر مثلاً وزیرِ ہند مسٹر ایمرے اور وزیرِ اعظم مسٹر چرچل وقتاً فوقتاً اس پالیسی کی تائید کرتے رہے ہیں اور ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کو یقین دلاتے رہے ہیں کہ حکومتِ برطانیہ، ہندوستان کی حقیقی صورتِ حال سے باخبر ہے اور اسے احساس ہے کہ جداگانہ قوم کی حیثیت سے مسلمانوں کی فطری خواہشات کے خلاف اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو اس سے تباہ کن حالات پیدا ہو جائیں گے اور امن وامان قائم رکھنا ناممکن ہو جائے گا۔" قرارداد میں اس اندیشے کا بھی اظہار کیا گیا تھا کہ کانگریس کو منانے کے لیے کہیں مذکورہ بالا اصول ترک نہ کر دیے جائیں اس لیے ورکنگ کمیٹی حکومت اور اہلِ برطانیہ کو متنبہ کر دینا چاہتی ہے کہ ۸ر اگست ۱۹۴۰ء کے اعلان اور پالیسی سے انحراف کرکے اگر کوئی قدم اٹھایا گیا تو یہ مسلمانانِ ہند کے نزدیک صریحی عہد شکنی ہوگی اور یہ کہ اس پالیسی پر نظرِ ثانی کرنا یا کوئی ایسا نیا اعلان کرنا جو مطالبۂ پاکستان کے منافی ہو یا جس کا مقصد مسلمانوں کو کل ہند اقلیت قرار دے کر ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت قائم کرنا ہو، مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہوگا اور اس سے ان میں غم وغصے کی لہر دوڑ جائے گی ، وہ اس کی مزاحمت کے لیے اپنے تمام وسیلوں اور تمام تر قوت سے کام لیں گے جس سے اس نازک مرحلے پر دیگر امور کے علاوہ ملک کی جنگی تیاریوں میں بھی لازمی طور پر رکاوٹ پڑے گی کیونکہ مسلمانوں ہی نے ان کی اب تک تائید وحمایت کی ہے اور اس کا سبب مسلم لیگ کی وہ پالیسی ہے

جس کا مقصد جہاں تک ممکن ہو سکے جنگی کارروائیوں میں رخنہ اندازی کرنا ہے۔

ورکنگ کمیٹی نے ایک اور قرارداد کے ذریعے جنگ میں جاپان کی شمولیت پر تشویش کا اظہار کیا جس سے یہ خطرہ پیدا ہو چلا تھا کہ جنگ کے شعلے ہندوستان کو بھی اپنی لپیٹ میں نہ لے لیں۔ قرارداد ان الفاظ پر ختم ہوتی تھی "کمیٹی کے خیال میں جب تک حکومت اور مسلم لیگ نیز موجودہ خطرے کے پیش نظر ملک کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ دیگر پارٹیوں کے درمیان، صوبائی بنیاد پر نہیں بلکہ کل ہند بنیاد پر قریبی تعاون کی اطمینان بخش بنیاد طے نہیں ہوتی، حقیقی مقاصد پورے نہیں ہو سکتے۔

ورکنگ کمیٹی ایک بار پھر یہ اعلان کرتی ہے کہ مسلم لیگ پہلے کی طرح اب بھی تنہا یا دوسری پارٹیوں کے تعاون سے ملک کے دفاع کی ذمہ داری قبول کرنے کو تیار ہے بشرطیکہ موجودہ دستور کے تحت مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں اسے مناسب حصہ دیا جائے مگر آئندہ دستور کی تشکیل سے متعلق اہم سیاسی مسئلوں میں اس کے ساتھ زیادتی نہ ہونی چاہیئے۔"

ایک اور قرارداد کے ذریعے ورکنگ کمیٹی نے بنگال اسمبلی کے مسلمان ممبروں سے اپیل کی کہ وہ مسلم لیگ پارٹی کو مضبوط بنائیں اور جب تک بنگال جیسے اہم صوبے میں مسلم لیگ کی وزارت نہ بن جائے، چین سے نہ بیٹھیں۔"

۱۹۴۲ء کے آغاز میں سر تیج بہادر سپرو، جیکر، سر ایس رادھا کرشنا اور چند دیگر غیر کانگریسی ہندوؤں نے ایک بیان میں برطانوی حکومت سے اپیل کی کہ "ابھی وقت ہے کہ وہ کوئی ایسا اقدام کرے کہ ہندوستان بھی بنی نوع انسان کی آزادی کی جدوجہد میں دوسرے ملکوں کی صف میں کھڑا ہو سکے۔"

یہ بیان صورت حال کی نزاکت کے پیش نظر دیا گیا تھا۔ اب تک جنگ کے شعلے سرزمین ہند سے بہت دور تھے مگر جنگ میں جاپان کی شرکت کے بعد ہندوستان بھی ان سے محفوظ نہ رہا۔ عوام کا حوصلہ پست ہو رہا تھا اور خوف و ہراس کا دور دورہ تھا۔ کلکتہ اور ہندوستان کے

آس پاس کے علاقوں کے لیے ہر وقت خطرہ تھا اور امکان تھا کہ جاپان کسی وقت بھی ان علاقوں پر بمباری کر سکتا ہے۔ ملایا میں برطانیہ کا دفاع، جس پر انگریزوں کو بڑا ناز تھا، خس و خاشاک کی طرح اڑ چکا تھا، سنگاپور پر جاپان کا قبضہ تھا ہی کہ مارچ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں رنگون پر بھی اس کا تسلط ہو گیا۔ جنگ کا بھوت ہندوستان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ مارشل چیانگ کائی شیک باہمی دلچسپی کے امور پر حکومت ہند سے بات چیت کے لیے ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ انھوں نے جناح صاحب اور گاندھی جی سے بھی ملاقات کی اور یہ افواہ اڑی کہ جاپان کے سامنے چین کے ہتھیار ڈال دینے کی صورت میں چیانگ کائی شیک ہندوستان میں سیاسی پناہ حاصل کریں گے۔

ہندوستان پر جاپان کے ممکنہ حملے کے خطرے کے خلاف بین الاقوامی ردِ عمل ناگزیر تھا۔ انگلستان کا بااثر و طاقتور اتحادی امریکہ بخوبی واقف تھا کہ اہلِ ہند کی تائید و حمایت کے بغیر جاپان کے حملے کی مدافعت کرنا مشکل ہو گا۔ کئی ممتاز برطانوی لیڈروں کا بھی یہی خیال تھا۔ حد یہ ہے کہ قدامت پسند پارٹی کے اہم ستون اور سامراجی عزائم کے علمبردار چرچل کو بھی وزیرِ اعظم برطانیہ کی حیثیت سے اصلاحات کی ایک سکیم تیار کرنے اور مستقبل کے لیے یقین دہانی کرانے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیکن وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو نے برطانوی حکومت کو مطلع کیا کہ صرف یقین دہانیاں اور وعدے کافی نہیں ہیں، معاملے کو سلجھانے کے لیے حقیقی اور فوری تبدیلیوں کی صورت میں زیادہ ٹھوس تدابیر عمل میں لانی ضروری ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی کابینہ کی انڈیا کمیٹی بنائی گئی۔ دلارڈ اٹیلی کمیٹی کے سربراہ اور وائیکاؤنٹ سائمن، سر اسٹیفورڈ کرپس، سر جیمس جرگ اور سر جان اینڈرسن اس کے اراکین تھے۔ کمیٹی نے ایک مسودہ اعلان مرتب کیا اور وائسرائے نے ان الفاظ میں اس کی تعریف کی کہ یہ سکیم وزیرِ اعظم چرچل کے مجوزہ اعلان سے زیادہ مفید ہے۔ وائسرائے ہند اور کابینہ کی کمیٹی کے درمیان کسی مسودہ اعلان پر اتفاق رائے نہ ہو سکا اور متبادل اقدام کے طور پر

یہ فیصلہ کیا گیا کہ کابینہ سر اسٹیفورڈ کرپس کو ہندوستان بھیجے گی جو ہندوستانی لیڈروں کے صلاح مشورے سے اس پالیسی پر زیادہ سے زیادہ اتفاق رائے کی بنیاد تلاش کریں گے جس پر برطانیہ دستوری اصلاحات کے سلسلے میں عملدرآمد کرے گا۔ ۱۱ر مارچ کو چرچل نے پارلیمنٹ میں ایک اعلان کیا۔ انھوں نے ایوان کو بتایا کہ جاپان کی پیش قدمی سے ہندوستان کو جو خطرہ درپیش ہے اس کے پیش نظر ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان تمام تر قوت سے اپنی حفاظت کرے۔" چرچل نے بیرونی حملے کے خلاف ہندوستان کو مدافعت میں مدد دینے کا تو ذکر کیا مگر انھوں نے اس کے لیے آزادی کی شرط کو نظر انداز کر دیا — جو ہندوستان کے ہر طبقۂ فکر کا مطالبہ تھا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب کانگریس نے وزارتیں قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سر اسٹیفورڈ کرپس نے انگلستان میں ایک جلسۂ عام میں کانگریس کے اس فیصلے کی تعریف کی تھی اور کہا تھا۔ "اگر کانگریس پارٹی حکومت کی سامراجی مشنری میں الجھ گئی تو یہ اس کے وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ ہوگا۔" یہی شخص جس نے ۱۹۳۷ء میں بالواسطہ طور پر سامراجیت کی مذمت کی تھی، ایک سامراجی مشن پر ۱۹۴۲ء میں ہندوستان آ رہا تھا۔

اگرچہ سر اسٹیفورڈ کرپس کے مشن کا مقصد بظاہر یہ تھا کہ ہندوستانی لیڈروں کو "مفید مطلب انداز میں" اپنے ملک کے معاملوں میں شریک کیا جائے۔" تاہم اہلِ ہند یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ مشن کا حقیقی مقصد "ہندوستان کو جنگ میں دھکیلنا ہے۔" چونکہ وائسرائے اور برطانوی کابینہ میں پہلے سے اتفاق رائے نہ ہوا تھا اور کرپس کو دستور سے متعلق امور کے بارے میں کوئی واضح ہدایات نہ دی گئی تھیں، لہٰذا مدبر سیاسی مبصروں نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ مشن کامیاب نہ ہوگا۔ اس میں شک نہیں کہ تاجِ برطانیہ کی نظروں میں سر اسٹیفورڈ کی بڑی عزت تھی کیونکہ وہ لارڈ پریوی سیل تھے اور کانگریس کے سرکردہ لیڈروں سے بھی ان کے دوستانہ مراسم تھے

وہ سوشلزم پر یقین رکھتے تھے جو قدامت پسند پارٹی کی روایتی رجعت پسندی سے کسی طرح ہم آہنگ نہ تھا۔ ان تمام امور کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ ذاتی اوصاف کی بنیاد پر شاذ و نادر ہی کوئی سیاسی مسئلہ حل ہُوا ہے اور پھر اس وقت ہندوستان کی سیاست تو انتہائی پیچیدہ تھی۔

جناح صاحب نے صورتِ حال کا جائزہ لیا اور محسوس کیا کہ چونکہ "اگست کی پیشکش" جو برطانوی حکومت کی آخری پیشکش تھی، مسلم لیگ کی پالیسیوں سے کم و بیش مماثل ہے لہٰذا مسلم لیگ وقت سے فائدہ اُٹھا سکتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ ۱۹۴۰ء میں پیش کیا جا چکا تھا مگر غیر مسلموں کی شدید مخالفت اور اس تصور کے واضح نہ ہونے کے سبب یہ نظریہ کوئی یقینی شکل اختیار نہ کر سکا تھا۔ حالات و واقعات کا انحصار کرپس کی رائے پر تھا کیونکہ ان کی رپورٹ ہی پر انگلستان کی جنگی کابینہ کوئی قطعی فیصلہ کرتی۔ سوال یہ تھا کہ کرپس ہندوستان میں اپنے مختصر قیام کے دوران میں، جنگ، پاکستان اور ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے جیسے اہم معاملوں پر رائے عامہ کا اندازہ آخر کس طرح کر سکتے ہیں؟ پروفیسر کوپ لینڈ نے، جو کرپس کے عملے کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان آئے تھے، اس سوال کا جواب دیتے ہُوئے لکھا ہے۔ "ہندوستان میں رائے عامہ کی تشکیل جلسوں اور اخباروں کے ذریعے سیاست دان کرتے ہیں[1]" اور اخباروں پر، جو سیاسی پلیٹ فارم کی کارروائی کی نشر و اشاعت کرتے ہیں، کانگریس اور ہندوؤں کا غلبہ تھا۔ ان حالات میں مسلم لیگ آخر سر اسٹیفورڈ کرپس کو اپنے خیالات سے کس طرح متاثر کر سکتی تھی؟ خوش قسمتی سے مسلمانوں کو جناح صاحب جیسے رہنما کی قیادت حاصل تھی اور وہی ان کے لیے اُمید کی علامت تھے۔

---

[1] دی کرپس مشن۔ آر کوپ لینڈ۔ صفحہ ، مطبوعہ ۱۹۴۲ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

۲۲ مارچ کو کرپس اپنے عملے کے ہمراہ نئی دہلی پہنچے ۔اسی دن انھوں نے ایک اخباری کانفرنس میں کہا کہ میں ہمیشہ ہندوستان کا دوست رہا ہوں ۔میں نے سوچا کہ برطانیہ کی جنگی کابینہ کے رکن کی حیثیت سے اس آڑے وقت میں ہندوستان کی مدد کرنے کے سلسلے میں اس ملک کا دورہ کروں ۔ظاہر ہے کہ وہ اس مسئلے کو جلد از جلد حل کرنا چاہتے تھے ۔اس کا اظہار ان کے الفاظ سے ہوتا ہے ۔" ضائع کرنے اور لمبی چوڑی بحث میں گزارنے کے لیے ہمارے پاس وقت نہیں ہے ——— میں دہلی میں دو ہفتے ٹھہروں گا ——— اور مجھے یقین ہے کہ اس عرصے میں تعاون اور خیر سگالی کے جذبے سے کام لے کر ہم کامیاب ہو سکتے ہیں ۔" حقیقت یہ ہے کہ یہ ضرورت سے زیادہ خوش اعتقادی کا اظہار تھا ۔انھوں نے اقرار کیا کہ وہ کانگریس کے "دوست" ہیں اور یہ کہ انھیں دوسرے لیڈروں اور پارٹیوں کے بارے میں زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ ہر نقطۂ نظر پر غور کرنے کو تیار ہیں ۔انھوں نے کھُل کر یہ کہنے کی ہمت کی کہ حکومت کی پالیسی میں کسی بڑی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے نہ کوئی "حقیقی ، بڑی اور بنیادی تبدیلی" ممکن ہے ۔

وائسرائے ہاؤس میں تین روز ٹھہرنے کے بعد کرپس نمبر ۳ کوئن وکٹوریہ روڈ نئی دہلی میں منتقل ہو گئے جہاں ہندوستانی لیڈروں سے ان کی بات چیت ہونے والی تھی ۔گاندھی جی نے کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے نہیں بلکہ نجی طور پر ان سے ملاقات کی ۔کانگریس کی جانب سے پارٹی کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو ان سے ملنے آئے ۔جناح صاحب نے مسلم لیگ کے واحد نمائندہ کی حیثیت سے ان سے ملاقات کی ۔وہ لیگ کے واحد نمائندے کیوں نہ ہوتے جبکہ مسلمانانِ ہند کے مفاد کا نگراں ان سے بڑھ کر کوئی نہ تھا ۔ان ملاقاتوں میں والیانِ ریاست کی نمائندگی جام صاحب نوانگر اور مہاراجہ بیکانیر نے کی ۔گاندھی جی اور دیگر وفود کو کرپس نے اس مسودۂ اعلان کی ایک ایک نقل دی جو وہ اپنے ہمراہ لائے تھے

اور جس پر خفیہ تحریر تھا۔ دستاویز کے کچھ مندرجات اخبارات کے ہاتھ لگ گئے۔ اس پر سر اسٹیفورڈ کرپس نے ایک اخباری کانفرنس طلب کی۔ ۲۴ر مارچ کو انھوں نے یہ صراحت کرنے کے لیے کہ وہ ہندوستانی لیڈروں سے نجی بات چیت میں کن موضوعات پہ گفتگو کریں گے اخباری کانفرنس سے خطاب کیا اور کہا کہ حکومت برطانیہ نے ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے قیام کے لیے واضح اور قطعی اصول مرتب کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔" اس مقصد کے لیے جنگ ختم ہونے کے بعد ——— ایک منتخب ادارہ بنانے کی تجویز بنائی گئی ہے جسے ہندوستان کے لیے بنیادی دستور (جس میں ہندوستانی ریاستیں شامل ہوں گی) مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی جائے گی۔ حکومت برطانیہ "مرتب کردہ دستور فوراً منظور کرلے گی اور اسے نافذ کردے گی مگر شرط یہ ہوگی کہ برطانوی ہند کا کوئی صوبہ اپنی موجودہ دستوری حیثیت برقرار رکھنا چاہے گا تو اسے یہ اختیار ہوگا۔ لیکن اگر یہ صوبہ بعد میں انضمام کا فیصلہ کرے تو اسے اس کی آزادی ہوگی۔ دوسری دفعہ نسلی اور مذہبی بنیاد پر دیگر طبقوں کے تحفظ سے متعلق تھی۔ اس مسودہ میں دستور ساز ادارے کے طریقۂ کار اور تشکیل کی وضاحت کے بعد کہا گیا تھا کہ جنگ ختم ہونے پر تمام صوبائی اسمبلیوں کے عام انتخابات ہوں گے اور یہ اسمبلیاں "متناسب نمائندگی" کے اصول کے مطابق دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کریں گی۔ اس نئے ادارے کے ممبروں کی تعداد انتخابی ادارے کے تقریباً دسویں حصے کے مساوی ہوگی۔

گاندھی جی نے اس مسودہ اعلان کو متحدہ ہندوستان کے نقطۂ نظر سے دیکھا۔ اگرچہ اعلان میں ہندوستان کو برطانوی دولت مشترکہ کے دائرہ کار میں آزادی دینے کا اظہار کیا گیا تھا لیکن اس پر سنجیدگی سے جنگ ختم ہونے کے بعد غور کیا جانا تھا۔ گاندھی جی جلدی میں تھے اور انگریزوں کے وعدوں پر یقین کرنا نہ چاہتے تھے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ جنگ میں انگریزوں کو شکست ہو رہی تھی اور یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ جنگ کے بعد برطانیہ کی پوزیشن کیا ہوگی۔ آیا اس کا وجود باقی رہے گا یا اس کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ گاندھی جی نے کہا کہ اس غیر یقینی

صورتِ حال میں برطانیہ کے وعدے" ایک ایسے بنک کے اگلی تاریخ کے چیک کی طرح ہیں جس کا دیوالہ نکل رہا ہے۔"

اخباری کانفرنس کے بعد کرپس نے کانگریسی نمائندوں، آزاد اور نہرو سے کئی بار ملاقات کی۔ ادھر مسلم لیگ کے لیڈر مسٹر جناح واقعات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ۲ اپریل کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں کرپس تجاویز کو مسترد کر دینے کا فیصلہ کیا گیا کیونکہ یہ تجاویز تقسیمِ ہند کے اصول کو تسلیم کر لینے کے مترادف تھیں۔ مولانا آزاد نے سر اسٹیفو۔ڈ کرپس کو ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کی اطلاع پہنچائی۔ طویل المیعاد تجاویز مسترد کر دینے کے بعد کانگریس نے مطالبہ کیا کہ ڈیفنس ممبر ہندوستانی ہونا چاہیئے، البتہ مسلح افواج کا سپریم کمانڈر انگریز ہی رہے۔ اس پر کرپس نے ۷ اپریل کو مولانا آزاد اور جناح صاحب کو لکھا کہ جنگی کابینہ اس بات کو قبول کرے گی کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں کمانڈر انچیف کی نشست برقرار رہے اور یہ کہ ہندوستانی ڈیفنس ممبر کا ان چند خاص معاملات پر کنٹرول ہو جن کا تعلق ہندوستان کی جنگی سرگرمیوں سے ہے اور جن کی وضاحت ان دو ضمیموں میں کی گئی ہے جو اس خط کے ساتھ منسلک ہیں۔

مولانا آزاد نے ۱۰ اپریل کو کانگریس کی جانب سے کرپس کو مطلع کیا کہ کانگریس اس امر کے باوجود کہ ہندوستان کی آئندہ دستوری اصلاحات کے بارے میں اس کے اپنے خیالات ہیں، تعاون کرنے کو تیار ہے۔" بشرطیکہ صحیح معنوں میں ایک نمائندہ حکومت کی تشکیل کی جائے — جسے مکمل اختیارات حاصل ہوں اور جس کی حیثیت محض وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی نہ ہو۔ کرپس نے یہ تجویز مسترد کر دی اور کہا کہ کابینہ کی حکومت کا مطلب "اکثریت کی آمریت" کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ مسلم لیگ کے حلقوں نے اس پر اظہارِ مسرت کیا کیونکہ اس واضح بیان کا مطلب، قطعی ہندو اکثریت پر مشتمل متحدہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے قیام کے امکان کی تردید کرنا تھا۔ پروفیسر کوپ لینڈ رقم طراز ہیں: "سکیم کے اس حصے کے متعلق مسٹر جناح اور مسلم لیگ کا

ردعمل بنیادی طور پر خوشگوار تھا۔ وہ مشکل ہی سے یہ توقع کر سکتے تھے کہ برطانوی حکومت ان کا مطالبہ قبول کرنے پر اس حد تک آمادہ ہو جائے گی کیونکہ چند مہینے پہلے انھوں نے اس تشویش کا اظہار کیا تھا کہ کانگریس کا یہ مطالبہ قبول نہ کیا جائے کہ آئندہ بات چیت کے دوران میں مطالبہ پاکستان پر گفتگو نہیں کی جائے گی ـــــ غیر مسلم یہ کہنے لگے تھے کہ حالات تقسیم کے حق میں ہوتے جا رہے ہیں۔ مگر جناح اس سے بظاہر مطمئن نہ تھے ـــــ ان کا اعتراض یہ تھا کہ اس کا مطلب واضح طور پر پاکستان کی حمایت نہیں ہے ـــــ مسودۂ اعلان میں کسی حد تک مسلمانوں کے موقف کو تسلیم کر لیا گیا تھا مگر یہ کافی نہ تھا۔ لیکن دوسری طرف، کانگریس کے نزدیک یہ بہت کچھ تھا۔"[1]

مسلم لیگ نے اس بنا پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ واضح اور غیر مشروط طور پر مطالبہ پاکستان کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ ۲۷؍ مارچ سے ۱۱؍ اپریل ۱۹۴۲ء تک بمقام نئی دہلی [illegible] مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تو طویل قراردادوں کے ذریعے کرپس کی تجاویز کو مسترد کر دیا گیا۔ قرارداد میں کہا گیا تھا "مسلم لیگ اس بات پر شکر گزار ہے کہ حکومت برطانیہ کی تجاویز میں ہندوستان کی دو یا دو سے زائد آزاد یونینوں کے قیام کی گنجائش کے اصول کے ذریعے پاکستان کے امکان کو مبہم انداز میں تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن کمیٹی اس بات پر اظہار افسوس کرتی ہے کہ ان تجاویز میں ردوبدل کی گنجائش مفقود ہے اور متبادل تجاویز طلب نہیں کی گئی ہیں۔ ـــــ کمیٹی یہ واضح کرنا چاہتی ہے کہ یہ تجاویز موجودہ شکل میں مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر ناقابل قبول ہیں" اسباب یہ تھے :۔

۱۔ "امن عامہ اور دونوں قوموں کے سکھ چین کے پیش نظر یہ امر نہ تو ممکن ہے نہ منصفانہ کہ انھیں ایک ہندوستانی یونین بنانے پر مجبور کیا جائے۔"

---

[1] دی کرپس مشن۔ آر کوپ لینڈ۔ صفحات ۳۶ اور ۳۷ مطبوعہ ۱۹۴۲ء۔ آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

۲۔ "لہٰذا مسلمانوں کو ایسے دستور ساز ادارے میں شامل ہونے پر مجبور کرنا ناانصافی ہوگی جس کا مقصد ایک نئی ہندوستانی یونین کا قیام ہو۔" دستور ساز ادارہ واضح اکثریت کی بنیاد پر فیصلے کرے گا" اور "مسلمان اس دستور ساز ادارے کے رحم و کرم پر ہوں گے جس میں ان کی نمائندگی کی شرح تقریباً ۲۵ فی صدی ہوگی۔" قرارداد کے آخر میں، اس عزم کا اعادہ کیا گیا تھا کہ مسلم لیگ قراردادِ لاہور سے کم کسی بات پر ہرگز آمادہ نہ ہوگی" جو اب آل انڈیا مسلم لیگ کا عقیدہ بن گئی ہے" اور جب تک غیر مشروط طور پر مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم نہیں کیا جائے گا "مسلم لیگ مستقبل کے بارے میں کوئی تجویز یا سکیم قبول نہ کرے گی۔"[1]

قائداعظم نے سر اسٹیفورڈ کرپس کے رویے پر سخت اعتراض کیا۔ انھوں نے کہا "مسلمانوں کو پس پشت ڈال کر کانگریسی لیڈروں سے بات چیت کی گئی ہے اور دوسری پارٹیوں کو بری طرح نظرانداز کر دیا گیا ہے۔"

کرپس بڑی امیدیں لے کر ہندوستان آئے تھے مگر وہ ہندوستان کی آزادی کے متعلق اہل ہند کے وہ وسوسے اور اندیشے کم یا ختم نہ کر سکے جو برطانیہ کے خلاف صدیوں سے ان کے ذہن میں موجود تھے۔ یہ کرپس کے عروج کا زمانہ تھا۔ پچھلے دنوں وہ روس میں ایک اہم سفارتی کامیابی حاصل کر چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس ناکامی سے وہ کتنے بددل ہوئے ہوں گے۔ ۱۱ اپریل کی شب میں کرپس نے آل انڈیا ریڈیو دہلی سے ایک تقریر نشر کی۔ انھوں نے کہا کہ جنگی (برطانوی) کابینہ کا مرتب کردہ اعلان "جس کا مقصد ہندوستان کو جلد از جلد آزادی دینے کی (برطانوی) خواہش سے اہل ہند اور عالمی رائے عامہ کو باخبر کرنا اور یہ ظاہر کرنا تھا کہ ہم اس بارے میں کتنے مخلصانہ جذبات رکھتے ہیں، اہل ہند نے مسترد کر دیا ہے ——— میں نے اس پیشکش

۱۔ یہ اقتباسات مسلم لیگ کی ان مطبوعہ دستاویزوں کے مجموعے سے اخذ کیے گئے ہیں جو آل انڈیا مسلم لیگ کے اعزازی سیکرٹری نوابزادہ لیاقت علی خاں نے شائع کیا تھا۔

کے ذریعے جو میں لایا ہوں، ہندوستان کو فتحمندی اور آزادی کی راہ پر گامزن کرنے کی کوشش کی مگر پرانی بے اعتباری کی وجہ سے فی الوقت کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔

اگلے روز یعنی ۱۲ اپریل کو کرپس انگلستان روانہ ہوگئے۔ کانگریس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس یوں اچانک بات چیت ختم کر دیں گے۔ مینن نے تحریر کیا ہے: "کانگریسی حلقوں تک میں مایوسی اور ناامیدی پائی جاتی تھی اور ہر شخص متعجب تھا کہ سر اسٹیفورڈ کرپس اچانک انگلستان واپس کیوں چلے گئے۔ انھوں نے سمجھوتہ کی مزید کوشش بھی نہ کی۔"[1]

کرپس کے انگلستان روانہ ہونے پر گاندھی جی نے ہریجن میں لکھا کہ "صد ہزار افسوس کہ سر اسٹیفورڈ کرپس جیسے "انتہاپسند" کو یہ ذمہ داری سونپی گئی کہ وہ ایک ایسی سکیم جو کانگریس کے لیے ناقابل قبول ہے، ہندوستان کے ہاتھ فروخت کریں۔ اس اسکیم میں پاکستان کی تجویز موجود ہے پھر بھی مسلم لیگ کا نظریۂ پاکستان مفقود ہے ——— اگر مسلمانوں کی بڑی اکثریت خود کو علیحدہ قوم سمجھتی ہے اور اس کا خیال ہے کہ اس میں ہندوؤں اور دوسرے فرقوں میں کوئی چیز مشترک نہیں ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اسے اس سے ہٹ کر سوچنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔"

قائد اعظم نے اپنی بات منوا دی۔ گاندھی جی نے اب جس بات کا اعتراف کیا تھا قائد اعظم پچھلے چند برس سے یہی کہہ رہے تھے۔

۱۲ اپریل کو قائد اعظم نے ایک اخباری کانفرنس میں اس بات کی وضاحت کی کہ مسلم لیگ نے کن اسباب سے کرپس کی پیشکش مسترد کر دی۔ انھوں نے کہا "حکومت برطانیہ کی تجاویز بنیادی اصولوں کی شکل میں تھیں جن میں ردوبدل ممکن نہ تھا۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کی صراحت کے بعد

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۱۳۵۔ مطبوعہ ۱۹۵۷ء۔ اورینٹ لونگ مینس۔ بمبئی۔

مسلم لیگ نے ان تجاویز کا بغور مطالعہ کیا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ یہ تجاویز مکمل طور پر قبول کرنی ہوں گی نہ کہ جزوی طور پر۔ اس لیے ہم حال کو مستقبل پر فوقیت نہیں دے سکتے تھے۔ مزید یہ کہ موجودہ حالات پر اسی صورت میں غور کیا جا سکتا ہے جب مستقبل کے بارے میں مفاہمت ہو جائے ــــــ اس صورت حال کے پیش نظر ہم نے تمام تجاویز پر مجموعی طور پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ جہاں تک مستقبل کا تعلق ہے "تقسیم (پاکستان) کا اصول قبول نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس بات کا امکان ہے کہ ایک یا زائد صوبے الگ ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے جو مشینری تجویز کی گئی تھی اس کے مطابق مسلم اکثریت کے دو صوبوں میں طریقۂ کار کے مطابق دو کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ، صوبائی اسمبلیوں میں ہندو ووٹوں کے ذریعے کیا جائے گا جن میں مسلمان اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں، جیسا کہ بنگال اور پنجاب میں ہے، حالانکہ یہ مسلم اکثریت کے صوبے ہیں۔ اسی طرح مسلم اکثریت کے صوبے شمال مغربی سرحدی صوبہ اور سندھ میں غیر مسلموں کو بلحاظ آبادی جو تناسب دیا گیا ہے، اس سے مسلمانوں کے لیے اپنے مقصد کا حصول انتہائی مشکل ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کو واضح طور پر تسلیم نہیں کیا گیا ہے اور مسلمانوں کو حق خود اختیاری سے محروم کر دیا گیا ہے لہٰذا ہم مستقبل کے متعلق یہ تجاویز قبول نہیں کر سکے، اگرچہ ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ ان تجاویز کی بنیاد پر برطانوی پالیسی کو ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت دی جا سکتی ہے۔"

بہرحال تقسیم کے جس اصول کو تسلیم کیا گیا تھا مسلمانان ہند نے اسے استحسان کی نظر سے دیکھا تھا۔ قائد اعظم نے اس امر کی مذمت کی کہ کانگریس مرکز میں اکثریتی حکومت کی تشکیل پر مُصر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود کو "ہندوستانی فاشسٹوں کی اعلیٰ کونسل" بنانا اور اقلیتوں کو اپنے پنجوں میں جکڑنا چاہتی ہے۔ اس الزام کی تردید کرتے ہوئے کہ مسلم لیگ ملک کی آزادی کے خلاف ہے، انھوں نے کہا: "ہم آزادی کے حامی ہیں لیکن کانگریس کی سکیم سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کو آزادی نہیں ملے گی۔ وہ کانگریسی کابینہ کے رحم و کرم

پر ہوں گی۔ لہٰذا ہماری رائے میں کانگریسی تجاویز میں قومی حکومت کے نام پر اعلیٰ اور اہم تر معاملوں کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کانگریس ابتدا ہی سے ان کارروائیوں میں مصروف ہے اور ہم برابر ان کی مزاحمت کر رہے ہیں۔" انھوں نے صاف صاف کہا کہ لیگ ایک آزاد پاکستان کے قیام کی خواہاں ہے۔ "ہم کسی ایسے تصفیہ کو قبول نہیں کر سکتے جس سے مطالبہ پاکستان کی نفی ہوتی ہو یا جو اس مطالبے کے لیے مضرت رساں ہو۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اخباری کانفرنس میں کانگریس کا جو مطالبہ پیش کیا ہے اور سر اسٹیفورڈ کرپس سے خط و کتابت میں جس کا اظہار کیا گیا ہے، اس سے یقیناً مطالبہ پاکستان پر ضرب پڑتی ہے اور اس لیے ہم اس مطالبے کو قبول نہیں کر سکتے۔"[1]

آر کوپ لینڈ نے کرپس مشن کی ناکامی پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "کچھ (کانگریسی) لیڈروں نے کبھی یہ دعویٰ ترک نہیں کیا کہ کانگریس مسلمانوں سمیت پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتی ہے۔ ۱۹۳۷ء میں سات صوبوں میں انتخابات جیتنے کے بعد ان لیڈروں نے خالص کانگریسی وزارتوں کی تشکیل پر اصرار کیا تھا۔ لیکن اب مجوزہ قومی حکومت میں انھیں اکثریت بھی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ اس حکومت میں نہ صرف مسلم لیگ کو، جو کانگریس کے مساوی حیثیت طلب کر رہی ہے بلکہ دوسری اقلیتوں کو بھی نمائندگی دینی پڑے گی۔" انھوں نے مزید لکھا ہے "اگر چند برس پہلے کرپس تجاویز پیش کی جاتیں تو شاید قبول کر لی جاتیں لیکن اب جبکہ دشمن نظر کے سامنے ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت دیر ہو چکی ہے...... مشن کے سرگرم عمل ہونے سے پہلے ہی قنوطیت پسند لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سمجھوتہ ناقابل عمل ہے اور بات چیت کی ناکامی کے اسباب، خواہ کچھ ہی ہوں، ان کی ناامیدی اور مایوسی بجا تھی۔"[2]

---

[1] اسپیچز اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح۔ جلد اوّل۔ جمیل الدین احمد۔ صفحات ۴۲۹/۴۳۲ مطبوعہ ۱۹۶۰ء شیخ محمد اشرف لاہور

[2] کرپس مشن۔ آر کوپ لینڈ۔ صفحات ۶۱، ۶۲ مطبوعہ ۱۹۴۲ء آکسفورڈ یونیورسٹی پریس بمبئی۔

لیکن بعض حلقوں میں کرپس مشن میں ناکامی کا الزام خود سر اسٹیفورڈ کرپس پر لگایا جا رہا تھا۔ عجیب سی بات ہے کہ ان کے ایک انتہائی کٹر مخالف دلکتہ چین ہندوستانی سوشلسٹ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا تھے۔ ڈاکٹر رام منوہر لوہیا نے لکھا۔ آخر یہ کرپس کس قسم کے آدمی ہیں؟ صرف ایک مثال ہی سے اس کا جواب مل سکتا ہے۔ اٹلی اور حبشہ کے مابین جنگ کے دوران میں کرپس نے ایک سوشلسٹ کی حیثیت سے کسی ایک فریق کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ یہ اطالوی سامراج اور حبشہ کی جاگیردارانہ سلطنت کے درمیان لڑائی ہے۔ اس قسم کے رویے سے زندگی کے بارے میں کسی فرد کے نقطۂ نظر پر روشنی پڑتی ہے اور اس کی تعلیم و ذہنی سطح کے معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ کرپس ایک سوشلسٹ ہیں تاہم انھوں نے اپنے رویے سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ایک یورپی باشندے ہیں اور ان میں عالمی شہریت کے جذبے کا فقدان ہے۔ یورپ میں ایسے بہت سے افراد موجود ہیں جو نسلی مساوات کے مخلصانہ دعووں کے باوجود سفید فام نسل کی برتری کے احساس کو ختم نہیں کر سکتے۔ یہ ان کے تحت الشعور کا جزو بن گیا ہے۔ اگر کوئی شخص انھیں کچھ بتائے اور ٹوکے تو وہ اپنی غلطی محسوس کر لیں گے۔ مگر یورپی تہذیب و تمدن کی برتری پر ان کا یقین اس حد تک ہے کہ وہ یورپ کے مفاد کی سربلندی کے لیے ایک مجاہد کا روپ دھار لیتے ہیں۔ یہ افراد سامراج کے منکسر المزاج، میانہ رو اور پرجوش حامی ہیں۔ سر اسٹیفورڈ کرپس کا تعلق اسی طبقے سے ہے۔"[1]

غیر کانگریسی ہندوؤں نے کانگریس پر پیشکش مسترد کر دینے کا الزام لگایا۔ سر چمن لال سیتل واد رقم طراز ہیں "کرپس کی پیشکش کو مسترد کر دینے کی مہلک غلطی پر کئی ممتاز کانگریسیوں کو افسوس ہے۔"[2]

---

[1] دی ہسٹری آف سر سٹیفورڈ کرپس، رام منوہر لوہیا، صفحہ ۲۱۱ مطبوعہ ۱۹۴۲ء۔ پدما پبلیکیشنز بمبئی۔

[2] ری کلکشنز اینڈ ریفلکشنز، چمن لال سیتل واد، صفحہ ۳۹۰۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ء۔

اس میں شک نہیں کہ کچھ ہندوستانی باشندوں کا خیال تھا کہ کرپس کی ناکامی ہندوستان
کی آزادی کے حق میں مضرت رساں تھی۔ ان لوگوں میں راج گوپال اچاری پیش پیش تھے۔
کرپس کے ہندوستان آنے سے قبل راج گوپال اچاری نے کانگریس اور حکومت کے درمیان
مفاہمت کرانے کی کوشش کی تھی مگر انھیں کامیابی نہ ہوتی۔ کرپس مشن کی ناکامی کے بعد
انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ اگر کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان دستوری ترقی کے مستقبل کے
متعلق اتفاق نہ ہوا تو ہندوستان آزادی حاصل نہ کر سکے گا۔ کانگریس نے اپنے زعم میں
مسلم لیگ سے مفاہمت کے دروازے بند کر دیے تھے اور راج گوپال اچاری اس تعطل
کو ختم کرنے کے خواہاں تھے۔ مدراس میں ان کی وزارت مستعفی ہو چکی تھی مگر انھوں نے
اسمبلی کے کانگریسی ممبروں کو ایک قرارداد منظور کرنے پر آمادہ کر لیا جس میں کانگریس سے
سفارش کی گئی تھی کہ "علیحدگی کے متعلق جناح صاحب کا مطالبہ تسلیم کر لیا جائے اور یہ کہ
کانگریس کو (مسلم لیگ کے ساتھ) کوئی سمجھوتہ کر لینا چاہیے تاکہ موجودہ ہنگامی حالات سے
نپٹنے کے لیے قومی حکومت کی تشکیل ہو سکے۔" قرارداد میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے اتحاد
کے غیر یقینی تاثرے پر ایک قومی حکومت کے قیام کے امکان کو قربان کرنا دانشمندی سے بعید
ہو گا۔ کانگریس اس بات پر بری طرح مشتعل ہوتی لیکن مسلم لیگ کو خوشی تھی کہ اس کے
مطالبۂ پاکستان پر سنجیدگی سے غور کیا جا رہا ہے، اسے محض ایک شوشہ نہیں سمجھا جا رہا ہے
اور خود کانگرس کا ایک اہم طبقہ واضح طور پر اس کی تائید کر رہا ہے۔ اپریل کے اواخر میں
بمقام الہ آباد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا تو یہ قرارداد حقارت سے مسترد
کر دی گئی اور جناح صاحب اور پاکستان کے خلاف اشتعال انگیز تقریریں کی گئیں۔ کانگریس
نے ہر قیمت پر ہندوستان کو متحد رکھنے کا تہیہ کر رکھا تھا، خواہ اس کے بدلے ہندوستان کی
آزادی کی جنگ میں اسے ہزیمت ہی کیوں نہ اٹھانی پڑے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ۱۴ر جولائی کو ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا کہ انگریز

فوراً ہندوستان سے چلے جائیں ورنہ کانگریس ان کے خلاف ملک گیر مہم چلائے گی۔ قائدِ اعظم نے فوراً اس فیصلے کے خلاف اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا اور ایک اخباری بیان میں کہا کہ کانگریس کی صاف طور پر نیت یہ ہے کہ ہندو راج قائم کیا جائے ـــــ اور مسلمانوں کو ـــــ کانگریس راج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے۔

تقسیم کے سوال پر کانگریس اور لیگ کا موقف ایک دوسرے کی ضد تھا ادھر وائسرائے نے حکومت برطانیہ کے ارادوں کے متعلق کوئی اظہار نہ کیا، تاہم سپرو کے نام ایک مکتوب میں وائسرائے نے کہا کہ اس سوال پر گفت و شنید کی گنجائش رہنی چاہیئے اور جنگ کے خاتمے کے بعد اسے قطعی طور پر طے کیا جائے۔ جہاں تک برطانیہ کی حکمتِ عملی اور عزائم کا تعلق ہے، ہندوستان کی آزادی یا مسلمانوں کو اس برِ صغیر میں علیحدہ وطن دینے کے معاملے اس کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے، اسے تو فکر یہ تھی کہ جنگ جیتنے کے لیے ہندوستان سے کس طرح زیادہ سے زیادہ امداد حاصل کی جا سکتی ہے۔

دسمبر ۱۹۴۲ء کے آخر میں پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر سکندر حیات کا، جنھوں نے نظریۂ پاکستان کو پوری طرح قبول نہ کیا تھا، انتقال ہو گیا۔ مسلم لیگ کے حلقوں کا خیال تھا کہ اب پنجاب میں مسلم سیاست لیگ کے حق میں ہو جائے گی اور اس امر کے پیشِ نظر پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم کو مضبوط و مستحکم بنانے پر زیادہ توجہ دی جانے لگی۔ دریں اثنا سندھ اسمبلی میں جی ایم سید نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں ایک قرارداد پیش کی جسے اسمبلی نے ہندوؤں اور کانگریس کی سر توڑ مخالفت کے باوجود منظور کر لیا اور یوں سندھ مسلم اکثریت کا پہلا صوبہ تھا جس نے مطالبۂ پاکستان کی توثیق کی۔ اس حقیقت کا اظہار کہ مسلم لیگ پنجاب اور بنگال میں اپنے مستقبل کے بارے میں انتہائی خوش آئند توقعات رکھتی تھی، مسلم لیگ کونسل کے اجلاس منعقدہ ۸ مارچ ۱۹۴۳ء بمقام اینگلو عربک کالج دہلی، کی منظور کردہ قرارداد سے ہوتا ہے جس نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی آل انڈیا مسلم لیگ کی لاہور قرارداد کے مطابق اصول پاکستان کی سکیم

کی توثیق کرنے پر سندھ صوبائی قانون ساز اسمبلی کے فیصلے کو سراہا اور اس یقین کا اظہار کیا کہ مسلم اکثریت کے دیگر صوبے بھی اس کی پیروی کریں گے۔

اگلے مہینے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں مطالبۂ پاکستان کا اعادہ کیا گیا اور حکومت برطانیہ کو خبردار کیا گیا کہ وہ پورے ہندوستان کے لیے ایک فیڈریشن کی کانگریسی سکیم پر عملدرآمد نہ کرے۔ اس جلاس نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں پر زور دیا کہ وہ برضا و رغبت قربانیاں دینے اور اس ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے تیار ہو جائیں۔

۲۶ر جولائی ۱۹۴۳ء کا واقعہ ہے قائدِ اعظم بمبئی میں تھے کہ دوپہر کے وقت ایک اجنبی مکان میں داخل ہوا اور کہا کہ وہ قائدِ اعظم سے ملنا چاہتا ہے۔ بڑے دروازے کا پٹھان چوکیدار اجنبی کو لے کر قائدِ اعظم کے سیکرٹری مطلوب سیّد کے پاس آیا۔ اجنبی نے سیکرٹری سے بھی یہی کہا کہ میں قائدِ اعظم سے ملنا چاہتا ہوں۔ سیکرٹری نے اجنبی کو بہت سمجھایا کہ قائدِ اعظم پہلے سے وقت مقرر کر کے لوگوں سے ملتے ہیں اور یہ کہ اگر آپ اپنی آمد کا مقصد تحریر کر دیں تو میں تاریخ اور وقت مقرر کرنے کی کوشش کروں گا اور آپ کو مطلع کر دوں گا۔ اتنے میں قائدِ اعظم کسی فائل کی تلاش میں اپنے سیکرٹری کے کمرے میں داخل ہوئے۔ قائدِ اعظم کو دیکھتے ہی اجنبی چیخ چیخ کر ان سے کہنے لگا کہ مجھے چند منٹ دے دیجیے۔ قائدِ اعظم نے انتہائی نرم لہجے میں جواب دیا کہ میں آج بہت مصروف ہوں، میرے سیکرٹری آپ کو وقت دے دیں گے۔ اس پر اجنبی نے جیب سے چاقو نکال لیا اور قائدِ اعظم کی گردن پر حملہ کرنے کی نیت سے جھپٹا۔ قائدِ اعظم نے حملے کو روکنے کے لیے ہاتھ بلند کیا اور خوش قسمتی سے حملہ آور کا نشانہ چوک گیا۔ قائدِ اعظم کے سیکرٹری اور پٹھان چوکیدار نے اگرچہ حملہ آور پر قابو پا لیا تاہم قائدِ اعظم کے چہرے اور گردن پر زخم آئے۔

پولیس کو طلب کیا گیا اور حملہ آور کو گرفتار کر لیا گیا۔ تفتیش کے دوران معلوم ہوا کہ حملہ آور کا نام محمد رفیق ہے اور وہ لاہور سے بمبئی آیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کا تعلق

خاکسار تحریک سے ہے جو مسلم لیگ کی کٹر مخالف تھی۔ کیا اس اقدام کا کوئی سیاسی مقصد تھا یا یہ ایک غیر ذمہ دار فرد کی حرکت تھی؟ پولیس نے اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کی۔

اخباروں میں جلی سرخیوں کے ساتھ یہ خبر شائع ہوئی تو مسلمانانِ ہند کو شدید رنج ہوا۔ قائدِاعظم نے ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ اگرچہ یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا تاہم خدا کے فضل و کرم سے مجھے کوئی شدید زخم نہیں آیا۔ میں اس وقت کچھ کہنا نہیں چاہتا مگر مسلمانوں سے پُرامن رہنے کی اپیل کرتا ہوں۔ ہم سب کو شکر کرنا چاہیئے کہ میں معجزانہ طور پر بچ گیا ہوں۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ مجھ پر یہ بزدلانہ حملہ ——— ایک مسلمان نے کیا ہے۔"

قائدِاعظم کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ملک کے گوشے گوشے سے ہزاروں تار آئے۔ اسی دوران میں مسلم لیگ کا ایک وفد سرحدی صوبے کا دورہ کر رہا تھا جہاں ایک ضمنی انتخاب ہو رہا تھا۔ پٹھانوں کے ایک بڑے ہجوم نے، جن کے چہروں پر فکر و پریشانی کے آثار تھے، لیگی لیڈروں کی قیام گاہ پر دھاوا بول دیا۔ ان کا اصرار تھا کہ ہم خود قائدِاعظم کی زبان سے یہ سننا چاہتے ہیں کہ وہ صحیح سلامت ہیں، اخباروں کی یقین دہانیوں پر ہمیں بھروسہ نہیں ہے۔ قائدِاعظم کو بمبئی فون کیا گیا تو انھوں نے ٹیلیفون پر سرحد کے لوگوں کو یقین دلایا۔ "میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اسے بھول جایئے اور اپنی تمام تر توجہ انتخاب جیتنے پر مرکوز کر دیجیے جو ہم پاکستان کی بنیاد پر لڑ رہے ہیں۔"

مسلمانوں کی تاریخ کے اس دور میں مسلم لیگ کی مقبولیت میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اس کا اندازہ آسام، سندھ، پنجاب اور بنگال کی وزارتی کشمکش سے لگایا جا سکتا ہے۔ آسام میں کانگریسی وزارت کے استعفے کے بعد سر محمد سعداللہ سے وزارت بنانے کے لیے کہا گیا۔ وہ کچھ عرصے تک وزیرِاعلیٰ کے فرائض انجام دیتے رہے مگر جب ان کے وزیرِ تعلیم روہنی کمار چودھری استعفا دے کر سرکاری پارٹی سے علیحدہ ہو گئے تو سر سعداللہ کو اکثریت حاصل نہ رہی اور انھیں مستعفی ہونا پڑا۔ اس کے بعد اگست ۴۲ء کے لگ بھگ سر سعداللہ

سے پھر وزارت بنانے کے لیے کہا گیا اور اس مرتبہ وہ حکومت کی تشکیل میں کامیاب ہو گئے
اگرچہ یہ بھی وزارت نہ تھی لیکن مسلم لیگ مطمئن تھی کہ آسام میں کانگریس کے بجائے ایک مسلمان
وزیراعلیٰ ہے۔ سندھ کے وزیراعلیٰ خان بہادر اللہ بخش کو، جو کانگریس کی حمایت کی وجہ سے
وزارتِ اعلیٰ کے منصب پر فائز تھے، سر ہیوگ ڈو نے برطرف کر دیا کیونکہ انھوں نے خان بہادر
کا خطاب واپس کر دیا تھا۔ اُن کے بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ کو حکومت کی تشکیل کی
دعوت دی گئی لیکن جب تک مسلم لیگ پارٹی ان کی حمایت نہ کرتی وہ حکومت نہیں بنا سکتے
تھے۔ آل انڈیا مسلم لیگ نے سندھ اسمبلی پارٹی کو ہدایت کی کہ سر غلام حسین کی حمایت کی جائے
جو غیر کانگریسی ہندو وزیر ان کی کابینہ میں شامل ہوتے تھے، ہندوؤں نے ان پر سخت دباؤ
ڈالا۔ ان کے مکانوں پر پکیٹنگ کی گئی اور ان کے خاندانوں کا سماجی بائیکاٹ کیا گیا۔ سر
غلام حسین نے اسے بلیک میل قرار دیا اور اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلم لیگ میں شامل ہو
گئے۔ اس طرح سندھ ہندوستان کا پہلا صوبہ تھا جہاں مکمل مسلم لیگی وزارت قائم ہوئی اور
تقسیم کے وقت تک مسلسل لیگی وزارت ہی برسرِ اقتدار رہی۔ قائداعظم نے سندھ کی سیاسیات
کی تشکیل میں سرگرم حصہ لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ سب سے پہلے سندھ اسمبلی نے پاکستان کے
مطالبہ کی حمایت کی۔ بنگال میں صوبائی خود مختاری کے اجرا کے بعد فضل الحق وزیراعلیٰ مقرر
ہوئے۔ ان کی کرشک پرجا پارٹی بنگال کے کسانوں کی نمائندگی کرتی تھی۔ مسلم لیگ کے
اثر و نفوذ میں اضافہ ہوا تو بہت سے ممتاز مسلم رہنما لیگ میں شامل ہو گئے۔ فضل الحق نے
بھی مسلم لیگ کی سیاست میں گہری دلچسپی لینی شروع کی اور اس طرح بنگال میں مسلم لیگ کو
مؤثر اور مستحکم بنانے کے سلسلے میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ ۱۹۴۱ء کے اواخر میں وہ
لیگ سے ذاتی اختلافات کی بنا پر الگ ہو گئے اور انھوں نے مخلوط وزارت بنائی تھی۔
مگر اس وزارت کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ بنگال کے گورنر سر جان ہربرٹ کے ایما
پر انھوں نے ایک خط پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ ان کے مستعفی ہونے کے بعد چونکہ ضبوط

وزارت کی تشکیل کا امکان ہے لہٰذا میں اس پرخلوص خواہش کے ساتھ وزیرِ اعلیٰ بنگال کے عہدے سے استعفا دیتا ہوں کہ یہ کارروائی بنگال کے عوام کے بہترین مفاد میں ہوگی۔"

چونکہ اس خط پر مارچ کے آخر میں دستخط ہوئے تھے اس لیے صوبائی بجٹ منظور نہ ہو سکا اور دستور کی دفعہ ۹۳ نافذ کردی گئی جس کی رو سے بنگال میں گورنر راج قائم ہو گیا۔ لیکن ۲۴ اکتوبر کو یہ تعطل ختم ہو گیا اور خواجہ ناظم الدین نے بنگال کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھایا۔ سرکاری پارٹی میں مسلم لیگی ممبروں کی اکثریت تھی۔ اس کے بعد سے بنگال کی سیاست پر تقسیم تک مسلم لیگ کا غلبہ رہا۔ سرحد اسمبلی میں پچاس ممبر تھے جن میں سے ۲۲ کانگریس پارٹی سے تعلق رکھتے تھے۔ ان ۲۲ ممبروں میں سے بھی دس ۱۹۴۲ء کے آخر میں جیل میں تھے اور سات نشستیں خالی تھیں۔ مسلم لیگ کے ایک ممتاز لیڈر سردار اورنگ زیب خاں ایوان میں اکثریت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے اور انھوں نے صوبہ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ کی حیثیت سے حلف اٹھالیا۔

جدوجہدِ پاکستان کے سلسلے میں صوبہ پنجاب کو اہم حیثیت حاصل تھی اور اس اہم صوبے کی سیاست پر یونینسٹ پارٹی کا غلبہ تھا۔ سر سکندر ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد خضر حیات خاں ٹوانہ کو یونینسٹ پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا اور پارٹی لیڈر ہونے کے سبب وہ پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ اپریل ۱۹۴۴ء میں قائدِاعظم لاہور آئے اور انھوں نے پنجاب اسمبلی کے مسلمان یونینسٹ ممبروں پر زور دیا کہ پنجاب کی وزارت کو یونینسٹ وزارت کے بجائے مسلم لیگ مخلوط وزارت کہا جائے۔ خضر حیات خاں اپنی پارٹی کے ہندو ممبروں کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے تھے۔ ہندوؤں کے ایما پر انھوں نے قائدِاعظم کا کہنا نہ مانا اور یہ بات چیت ناکام ہو گئی۔ خضر حیات نے اپنی کابینہ میں سر سکندر کے صاحب زادے شوکت حیات خاں کو بھی شامل کیا تھا۔ شوکت حیات قائدِاعظم کے پرجوش حامی تھے۔ انھوں نے وزیرِ اعلیٰ کو دھمکی دی کہ انھوں نے اگر قائدِاعظم کے مشورے پر عمل نہ کیا

تو وہ اپنے حامیوں کے ساتھ سرکاری پارٹی سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ خضر حیات کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ سیاسی سازشوں کا دور دورہ تھا کہ بالآخر پنجاب کے گورنر نے شوکت حیات کو صوبائی کابینہ سے برطرف کر دیا۔ مسلم لیگ نے مجلس عمل قائم کی جس نے معاملہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور تحقیقات کے بعد خضر حیات سے جواب طلب کیا کہ وہ اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کریں۔ انھوں نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں یونینسٹ پارٹی کو جوابدہ ہوں۔ مسلم لیگ کو نہیں۔ اس پر انھیں مسلم لیگ سے نکال دیا گیا۔ کابینہ کے مسلم وزیروں پر کچھ تو خضر حیات کا دباؤ تھا اور کچھ کابینہ کے ہندو وزیروں کا۔ اس لیے کابینہ کے مسلمان ممبروں نے بھی مسلم لیگ سے استعفا دے دیا اور مسلمان ممبروں کی غالب تعداد خضر حیات کی اسمبلی پارٹی میں شامل رہی۔ اس طرح پنجاب پر یونینسٹ پارٹی کا تسلط مکمل ہو گیا اور پارٹی نے قیام پاکستان کے خلاف اپنی جدوجہد تیز تر کر دی۔

مسلم سیاسیات کے اس نازک دور میں جناح صاحب نے بنگال، پنجاب، سندھ اور سرحد کے مسلسل دورے کیے اور ان کی زبردست قیادت کی بدولت ہی مسلم لیگ، پنجاب کے سوا ان مسلم اکثریتی صوبوں کی سیاست میں غلبہ حاصل کر سکی۔ پنجاب اسمبلی کے مسلم ممبروں کی اکثریت یونینسٹ پارٹی کی ممبر اور لیگ کے خلاف تھی لیکن پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں قائداعظم اور لیگ کے ساتھ تھے۔ ان صوبوں میں کانگریس اور ہندو، مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ منظم اور باوسیلہ تھے۔ جناح صاحب کو علم تھا کہ پاکستان کی جدوجہد میں یہ صوبے انتہائی اہمیت کے حامل ہیں اس لیے انھوں نے ان صوبوں کو مسلم لیگ کے حق میں کرنے کے لیے انتھک محنت کی۔

وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو، ۲۰ اکتوبر ۱۹۴۳ء کو سبکدوش ہو گئے تو فیلڈ مارشل وائیکاؤنٹ ویول کو وائسرائے مقرر کیا گیا۔ حکومت نے ہندوستانیوں پر جو ظلم کیے تھے ہندوستانی فوج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے ویول نے اس میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ وزیر ہند ایمرے نے

دالعوام میں ایک تقریر میں کہا کہ ویول کے تقرر سے پالیسی میں کوئی تبدیلی نہ ہو گی جنگ
ختم نہ ہونے تک حکومت کی پالیسی میں کسی تبدیلی کا امکان نہیں ہے۔ جب وائسرائے ہند
کی حیثیت سے ویول نے عنان حکومت سنبھالی تو جنگ کا پانسہ اچانک پلٹ گیا اور اتحادیوں
کی فتح یقینی ہو گئی۔

۱۷ر فروری ۱۹۴۴ء کو لارڈ ویول نے مرکزی اسمبلی کے مشترکہ اجلاس سے خطاب کیا
اور کہا "ہمارا پہلا کام جنگ جیتنا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم مستقبل کے متعلق
کوئی تیاری نہ کریں" ظاہر تھا کہ انگریزوں کو ہر وقت یہی فکر تھی کہ کسی نہ کسی طرح جنگ
سے متعلق کارروائیوں میں ہندوستان کی حمایت حاصل کی جائے۔ ہندوستان کے اتحاد
کے بارے میں لارڈ ویول نے کہا "آپ جغرافیہ کو تبدیل نہیں کر سکتے ——— ہندوستان
ایک قدرتی وحدت ہے۔" مسلم لیگ نے بجا طور پر اس بات پر اعتراض کیا اور مسلم لیگ کے
اخبار ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا "تاریخ اور نفسیات کے حوالہ کے بغیر جغرافیہ کا ذکر
کر کے لارڈ ویول نے تدبر کا کوئی اچھا مظاہرہ نہیں کیا" قائداعظم نے ذرا کھل کر اور
برہم انداز میں اس پر تبصرہ کیا اور کہا "لارڈ ویول کانگریس سے ساز باز کر رہے ہیں"۔

۲۴ر دسمبر ۱۹۴۳ء کو بمقام کراچی، قائداعظم کے زیرِ صدارت آل انڈیا مسلم لیگ
کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس موقع پر انھوں نے ایک اہم تقریر کی۔ انھوں نے کہا مسلمانوں
کی حالیہ کامیابیوں سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں۔ ہم نے اس مخالفت کا کامیابی
سے مقابلہ کیا جو ابتدا میں حکومت اور نوکر شاہی کی جانب سے کی گئی۔ بعد میں کانگریس نے
ہم پر حملہ کیا جس کو ہم نے کامیابی سے پسپا کر دیا۔ اب مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کسی مزاحمت
سے یا ڈھونگ سے متاثر نہ ہوں گے۔ ...... ہمارا اتحاد ختم نہیں ہو سکتا ......
ہمارے ساتھ لاکھوں مسلمان ہیں۔ ہمارا اپنا پرچم، ہمارا اپنا پلیٹ فارم اور سب سے بڑھ
کر ہمارا اپنا واضح نصب العین پاکستان ہے۔" انھوں نے کہا کہ پاکستان کے حصول کے

لیے، فوج، سمندری بیڑے یا ہوائی بیڑے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ اتحاد اور اپنے نصب العین پر یقینِ محکم ہے۔ اس زبردست اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ پچھلے دنوں مسلم لیگ کے کام میں اس قدر اضافہ ہوا ہے کہ میں اس کو نہیں سنبھال سکتا، میری صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ انھوں نے اشارتاً کہا "اب وہ مرحلہ آگیا ہے کہ آپ کو ایک مجلسِ عمل بنانی ہوگی ——— جس میں پانچ سے کم اور سات سے زیادہ اراکین نہ ہوں۔" انھوں نے بتایا کہ میں نے دہلی میں ۱۵ اور ۱۶ نومبر کو مسلم اکثریتی صوبوں کے وزرائے اعلیٰ کو طلب کیا تھا تاکہ غذائی مسئلے پر بات چیت کی جائے۔ سر سعداللہ کے سوا تمام وزرائے اعلیٰ آئے تھے۔ سر سعداللہ نے عبدالمتین چودھری کو اپنی نمائندگی کے لیے بھیجا تھا۔ پانچوں صوبوں میں مکمل اتفاق رائے تھا ——— ہم انسانیت کے نام پر ——— قحط کی مصیبت اور موت کے بھیانک سایوں کو ختم کرنے کی غرض سے ہر ممکن کارروائی کرنے کو تیار ہیں۔" انھوں نے اس الزام کا مضحکہ اڑایا کہ مطالبۂ پاکستان سے ہندوستان کی آزادی میں تاخیر ہو رہی ہے۔ انھوں نے فرمایا۔ کیا آپ ہندوستان کی آزادی کے بغیر پاکستان حاصل کر سکتے ہیں؟ ہم جب پاکستان کا ذکر کرتے ہیں تو ——— ہمارا مطلب نہ صرف اپنی آزادی بلکہ ہندوؤں کی آزادی بھی ہوتا ہے۔" اس تقریر میں انھوں نے پورے ہندوستان کی آزادی کی تحریک سے مسلمانوں کی غیر متزلزل وابستگی کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر ہندو مسلمانانِ ہند پر بہتان تراشی کرتے ہیں تو کرنے دیجیے "لیکن وہ ہمیں پاکستان حاصل کرنے سے نہ روک سکتے تھے اور نہ روک سکیں گے۔" مسلم اکثریتی صوبوں میں وزارتوں کی تشکیل کے بارے میں مسلم لیگ کی پالیسی کی صراحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔ "صرف عہدے حاصل کرنے کی غرض سے وزارتیں تشکیل نہیں کی جا رہی ہیں اور نہ یہ وزارتیں اس مقصد سے مسلم اکثریت کے صوبوں میں کام کر رہی ہیں بلکہ اس کا مقصد پاکستان کے کاز کی مدد کرنا ہے۔"

انھوں نے کراچی کے اجلاس میں مسلم قوم کو ایک نیا نعرہ دیا۔ انھوں نے کہا انگریزوں کو "ملک تقسیم کر کے چلا جانا چاہیئے" ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں نے ان کے یہ الفاظ دہرائے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ انگریز برصغیر ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم کر کے اس دیس سے چلے جائیں۔

اجلاس کراچی میں ایک بار پھر نواب زادہ لیاقت علی خاں کا نام مسلم لیگ کے اعزازی جنرل سیکرٹری کے لیے تجویز کیا گیا۔ قائداعظم نے یہ تحریک رائے شماری کے لیے پیش کرتے ہوئے کہا کہ نواب زادہ لیاقت علی خاں میرے "دست راست ہیں"۔ ان کی خدمات کی تعریف کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا کہ لیاقت علی خاں نے "دن رات لیگ کی خدمت کی ہے" اور ہر کوئی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ ان پر کتنی بھاری ذمہ داریاں ہیں۔ انھوں نے آخر میں کہا کہ ہندوستان بھر کے مسلمان لیاقت علی خاں کی عزت اور ان پر اعتماد کرتے ہیں۔

مجلسِ عمل کی تشکیل کے متعلق قائداعظم کی تجویز ۲۶ دسمبر کے سالانہ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے منظور کر لی گئی۔ اس قرارداد میں صدر کو ایک کمیٹی مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا تھا "جس میں کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ سات اراکین ہوں اور جو مسلمانوں کو حصولِ پاکستان کی جدوجہد کے لیے تیار کرے۔" چودھری خلیق الزمان نے یہ قرارداد پیش کی اور سردار عبدالرب نشتر نے اس کی تائید کی۔

ایک اور قرارداد کے ذریعے صدر کو پاکستانی علاقوں کی اقتصادی اور سماجی ترقی، صنعتوں کے قیام، مفت ابتدائی تعلیم کی ترویج، جاگیرداری نظام کی اصلاح، کرایوں کے استحکام، مزدوروں اور کسانوں کے حالات بہتر بنانے اور سودی لین دین کے کنٹرول کے متعلق رپورٹ تیار کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا۔ اس قرارداد کے ذریعے پاکستانی مسلمانوں کے لیے ترقی پسندانہ اصلاحات اور انھیں سماجی تحفظ دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ قائداعظم کا کمال تھا کہ انھوں نے ایک ایسی سیاسی تنظیم سے جس کے

متعدد ممبر جاگیردار خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے، اتنی انقلابی قرارداد منظور کرالی، یہ قرارداد زیڈ ایچ لاری نے پیش کی اور مولوی تمیز الدین اور حمید نظامی مدیر نوائے وقت نے اس کی تائید کی۔

کانگریس لوگوں کو حکومت وقانون کی حکم عدولی کرنے پر ابھارنے میں کامیاب ہو گئی۔ کانگریس کا نعرہ "ہندوستان چھوڑ دو" تمام شہروں، سرکاری و نجی عمارتوں، سکولوں اور کالجوں میں گونجنے لگا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ انگریز ہندوستان چھوڑ کر چلے جائیں تاکہ ان کے بعد کانگریس اس دیس میں ہندو راج قائم کر سکے۔ قائداعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ نے اس کے جواب میں کہا کہ انگریزوں کے جانے سے پہلے اس ملک کو دو آزاد مملکتوں، پاکستان اور ہندوستان، میں تقسیم کیا جائے۔ ہندوستان بھر کے مسلمانوں نے بیک آواز نعرہ بلند کیا "ملک تقسیم کرو اور چلے جاؤ۔" "تم ہمارا اتحاد ختم نہیں کر سکتے۔"

قائدِ اعظم سندھ اسمبلی الیکشن کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ (۱۹۴۶ء) آپ کی دائیں جانب جی الانا بیٹھے ہیں۔

"ہم کبھی نہیں جُھکیں گے"

۱۹۴۳ء کے اواخر میں ہندوستانی سیاست تعطل کا شکار ہو گئی تھی۔ لیگ اور کانگریس
نے دستوری ترقی روک دینے کے بارے میں انگریزوں کی پیشکش مسترد کر دی تھی، سات صوبوں
میں گورنر راج قائم ہو چکا تھا اور گاندھی جی سمیت تمام کانگرسی لیڈر جیلوں میں تھے ۔
ہندوستان پر جو جمود طاری تھا اسے دور کرنے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ تاہم جناح
صاحب مسلم لیگ کی پوزیشن مستحکم کرنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے واضح کر دیا کہ وہ اس
بنیاد کے سوا کسی صورت میں مذاکرات پر آمادہ نہ ہوں گے اور نہ کوئی فیصلہ قبول کریں گے
کہ مسلم لیگ ہی مسلمانانِ ہند کی واحد نمائندہ تنظیم ہے۔

انہیں حالات لکھنؤ میں تیج بہادر سپرو کی کوششوں سے ایک غیر جماعتی کانفرنس
منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس میں جو قراردادیں منظور کی گئیں ان کی روشنی میں کانفرنس کے صدر
سر تیج بہادر سپرو نے وائسرائے کو ایک یادداشت پیش کی جس میں کہا گیا تھا کہ وزارتیں
بحال کی جائیں اور دفعہ ۹۳ ختم کی جائے، ہندوستانی وزیر اعظم کی سرکردگی میں مرکز میں
حقیقی قومی حکومت قائم کی جائے، تمام کانگریسی قیدیوں کو فی الفور رہا کیا جائے اور
مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات منعقد کرائے جائیں۔ یادداشت میں اس امر پر
روشنی ڈالی گئی تھی کہ سات صوبوں کے اٹھارہ مشیروں میں سے صرف تین ہندوستانی باشندے
ہیں اس لیے صوبائی حکومتیں اہل ہند سے بالکل بے تعلق ہیں۔ لارڈ ویول نے یہ تمام
تجاویز مسترد کر دیں اور کہا کہ جب تک کانگریس حکومت سے تعاون نہ کرے گی کوئی تجویز

قبول نہیں کی جائے گی۔

اس پر گاندھی جی نے ۱۷ر جون ۱۹۴۴ء کو جیل سے وائسرائے کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ موجودہ بحران ختم کرنے کی غرض سے مجھے اپنے ساتھیوں سے ملاقات کی اجازت دی جائے۔ اس کے بعد میں قطعی تجاویز لے کر آپ سے ملنا چاہوں گا۔ لارڈ ویول گاندھی جی یا کانگریس کو خوش کرنا نہ چاہتے تھے۔ انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ اپنی خط و کتابت پریس کے حوالے کر دی۔

اس وقت قائدِ اعظم کہنہ سالی کے باوجود برِّ صغیر کا طوفانی دورہ کرنے میں مصروف تھے۔ وہ کانگریس کے اس الزام کی دھجیاں اڑانا چاہتے تھے کہ مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی نمائندہ نہیں ہے۔ وہ جہاں بھی گئے، ہزاروں مسلمان ان کی تقریر سننے کے لیے جوق در جوق جمع ہو گئے۔ مسلمان انھیں اپنا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے زورِ خطابت سے مسلمانوں کے دل موہ لیے اور مسلمانوں کے تحت الشعور میں طوفان بپا ہو گیا۔ انھیں محسوس ہوا کہ یہ شخص تو ہمارے دل ہی کی بات کہہ رہا ہے۔ قائدِ اعظم نے مسلمانوں کو ہمت اور حوصلے سے کام لینے اور پُر اُمید رہنے کی تلقین کی اور مسلمانوں نے قائدِ اعظم کو غیر متزلزل وفاداری اور حمایت کا یقین دلایا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح کا نام بچّے بچّے کی زبان پر تھا۔ ہزاروں مسلمانوں کے گھروں اور دکانوں میں ان کی تصاویر آویزاں تھیں۔ شہر ہو کہ گاؤں، کارخانے ہوں کہ کھیت، سکول ہوں کہ کالج کہیں بھی مسلم عوام مسلم لیگ سے ناآشنا نہ تھے۔ پاکستان مسلمانانِ ہند کے لیے سحر انگیز کشش رکھتا تھا۔ پاکستان کا قیام ایک سو برس کے مصائب، تکالیف، ظلم و ستم اور مایوسی کا مداوا تھا۔

اس زمانے کی تقاریر میں جناح صاحب نے مسلمانانِ ہند سے اشارتاً کہا کہ وہ آزاد پاکستان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کے لیے تیاری شروع کر دیں۔ دنیا کی کوئی طاقت قیامِ پاکستان کو روک نہیں سکتی۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۴ء کو علیگڈھ یونیورسٹی میں طالب علموں

کے ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "ہم اپنے مقصد (پاکستان) سے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں ——— اب آپ کو محض کلرکی ہی پر قناعت نہ کرنی چاہیئے ——— اب تک تمام تجارت ہندوؤں اور یورپینوں کے ہاتھ میں رہی ہے۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ مسلمان تاجر، جدید اور سائنسی خطوط پر تجارت و صنعت کے میدان میں قدم رکھنے کے خواہاں ہیں ——— آپ کو اس کے لیے تیاری کرنی چاہیئے ———"

مسلمانوں کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اُنھوں نے کہا۔ ایک اور مسئلے کی طرف میں آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ کوئی قوم اس وقت تک عظمت و سربلندی حاصل نہیں کر سکتی جب تک اس کی خواتین بھی مردوں کے دوش بدوش کام نہ کریں۔ ہم غلط رسموں کے ہاتھوں کافی نقصان اُٹھا چکے ہیں۔ عورتوں کو قیدیوں کی طرح گھر کی چار دیواری میں محبوس رکھنا، انسانیت کے خلاف جرم ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں مغربی تہذیب کی خرابیوں کو اپنانا چاہیئے۔ مگر ہمیں اپنے اسلامی نظریات و معیار کے مطابق عورتوں کی حیثیت بلند کرنی چاہیئے۔ ہماری خواتین کو جن افسوسناک حالات میں زندگی گزارنی پڑتی ہے اس کے خلاف کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں ہوتی۔ آپ کو چاہیئے کہ مغربی تہذیب کی خرابیوں سے بچ کر خواتین کو زندگی کے ہر شعبے میں شریک کار کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع فراہم کریں۔ کسی ناسمجھ ماں سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ بچوں کی مناسب پرورش کرے گی۔ بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت ماں ہی کر سکتی ہے۔ ہمیں اس اثاثہ کو ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔"

۲۳ مارچ ۱۹۴۴ء کو یوم پاکستان کے موقع پر قائداعظم نے ایک پیغام میں کہا۔ ہم اپنے نصب العین پاکستان کے حصول سے قریب تر ہو گئے ہیں۔ اس سے پہلے کبھی آزادی ہم سے اتنی قریب نہ تھی ——— ہمارے نزدیک پاکستان کا مطلب ہمارا تحفظ، ہماری نجات اور ہمارا مستقبل ہے۔" کانگریسی اخبار والوں نے اس پر لکھا کہ

پاکستان اقلیت کے احساس کمتری کے شکار سیاستدانوں کے خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہندو مہاسبھا نے ہائے واویلا کی اور کہا کہ پاکستان ہماری لاشوں ہی پر سے گزر کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا جواب مسلمانوں نے "ہم پاکستان چاہتے ہیں" کے فلک شگاف نعرے سے دیا۔

لیکن پنجاب جیسے اہم صوبے میں، جہاں یونینسٹ پارٹی کے ملک خضر حیات خاں ٹوانہ وزیر اعلیٰ تھے، حالات مسلم لیگ اور پاکستان کے حق میں نہ تھے۔ قائد اعظم نے اپریل ۱۹۴۴ء میں پنجاب کا دورہ کیا اور خضر حیات سے ایک ایسا فارمولا معلوم کرنے کے بارے میں گفتگو کی جس کے مطابق پنجاب میں مسلم لیگی وزارت بن سکے۔ خضر حیات نے پہلے تو اس پر آمادگی ظاہر کی مگر یونینسٹ پارٹی کی شرانگیزی کے نتیجے میں وہ اپنے وعدے سے منحرف ہو گئے۔ ۲۷ اپریل کو قائد اعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ خضر حیات سے بات چیت ناکام ہو گئی ہے۔ "ان سے آخری ملاقات میں میں نے کہا تھا کہ وہ تحریری طور پر مجھے اپنا جواب بھیج دیں اور باوجودیکہ انھوں نے وعدہ کر لیا تھا لیکن انھوں نے اسے پورا نہ کیا۔ مجھے بڑا تعجب ہوا جب انھوں نے ٹیلیفون پر مجھے بتایا کہ وہ زبانی جو کچھ کہہ چکے ہیں وہی ان کا جواب ہے۔" بیان میں کہا گیا تھا کہ اس پر انھوں نے نواب محمد وٹ اور ممتاز دولتانہ کے ذریعے خضر حیات کو ایک مکتوب بھیجا۔ خضر حیات نے یہ خط وصول کر لیا مگر اس کی رسید نہ دی۔ قائد اعظم نے خضر حیات کو مصالحت کی جو تجویزیں پیش کی تھیں ان کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔ "پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی کے ہر ممبر کو یہ اعلان کرنا چاہیئے کہ وہ اسمبلی میں صرف مسلم لیگ پارٹی کا وفادار رہے اور یونینسٹ پارٹی یا کسی دوسری پارٹی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ——— اور یہ کہ مجوزہ مخلوط پارٹی کا نام مسلم لیگ مخلوط پارٹی ہونا چاہیئے ——— چونکہ ملک خضر حیات نے اب تک مجھے کوئی جواب نہیں

دیا ہے اس لیے مسلم لیگ کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہمیں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیئے"۔
یہ معاملہ مسلم لیگ کی مجلس عمل کے سپرد کر دیا گیا اور مجلس اور خضر حیات کے درمیان
خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مسلم لیگ نے محسوس کیا کہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ لیگ
کی ہدایتوں پر عملدرآمد کرنے پر آمادگی سے گریز کر رہے ہیں چنانچہ خضر حیات کو مسلم لیگ
سے نکال دیا گیا۔ ۲۰ رجون کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ نے ایک بیان جاری کیا اور لیگ
کی ہدایات پر عمل کرنے سے انکار کی وضاحت میں کہا کہ میں "قرارداد لاہور کے اصول
کا پابند ہوں۔

ہندوستان میں سیاسی ترقی کے سلسلے میں تعطل دور کرنے کی غرض سے گاندھی جی
اور لارڈ ویول کی بات چیت ناکام ہونے کے بعد راج گوپال اچاریہ نے لیگ اور
کانگریس میں مفاہمت کے لیے جناح صاحب کو ایک فارمولا پیش کیا۔ ۱۰ جولائی کو
راج گوپال اچاریہ نے اخباروں کو اس فارمولے کی نقل دی۔ فارمولے کے مطابق
کانگریس اور مسلم لیگ کو ہندوستان کی فوری اور مکمل آزادی کا مطالبہ کرنا تھا اور اس کے
بعد یہ معلوم کرنے کے لیے شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان میں رائے شماری کرانی
تھی کہ آیا ان علاقوں کے باشندے ہندوستان سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں؟ اس کا مطلب
یہ تھا کہ مسلمانوں کے مستقبل کا فیصلہ کرتے وقت ہندو بھی متحدہ ہندوستان کے لیے رائے عامہ
کی حمایت حاصل کر سکتے تھے اور رائے شماری میں حصہ لے سکتے تھے۔ جناح صاحب
نے کوئی وعدہ کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں یہ فارمولا مسلم لیگ کے سامنے پیش کروں گا۔

۱۷ رجولائی کو گاندھی جی نے جناح صاحب کو لکھا کہ دونوں لیڈر سیاسی صورت حال
پر بات چیت کریں۔ گاندھی جی نے اس مکتوب میں کہا تھا۔ "مجھے اسلام یا ہندوستانی
مسلمانوں کا دشمن نہ سمجھیے۔ میں ہمیشہ آپ کا اور انسانیت کا خادم اور بہی خواہ رہا
ہوں۔ مجھے امید ہے آپ مجھے مایوس نہ کریں گے" قائد اعظم نے اس کے جواب میں تحریر

کیا کہ کشمیر سے واپسی پر بمبئی میں اپنی رہائش گاہ پر آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں۔
۳۰ رجولائی کو بمقام لاہور مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں قائداعظم کو گاندھی جی
سے مذاکرات کا اختیار دیا گیا۔ اسی دن آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے جلاس میں قائداعظم
نے خطبۂ صدارت میں راج گوپال اچاریہ کے فارمولے اور گاندھی جی کے مکتوب کے بارے
میں فرمایا "آخرکار مسٹر گاندھی نے ذاتی حیثیت سے اصولِ پاکستان کو تسلیم کر لیا ہے۔"
قائداعظم کے اس اعلان کا زبردست تالیوں سے خیر مقدم کیا گیا مسلم لیگ کونسل کے ممبروں
نے محسوس کیا کہ آخرکار کانگریس اور حکومت برطانیہ سے مطالبہ پاکستان قبول کرانے کی
راہ ہموار ہوتی جا رہی ہے۔ قائداعظم نے گاندھی جی سے حالیہ خط و کتابت پر تفصیلی روشنی
ڈالی۔ انھوں نے کہا یہ واضح ہو چکا ہے کہ گاندھی اور کانگریس نے پہلے تو کانگریس سے
یک طرفہ سمجھوتہ کرنے کے سلسلے میں وائسرائے کی خوشامد کر کے مسلم لیگ کو نظر انداز کرنے
کی کوشش کی مگر انھوں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس طرح ان کی دال نہ گلے گی اور مطالبہ
پاکستان کو ختم نہ کیا جا سکے گا تو اب وہ لیگ سے مذاکرات کے خواہاں ہیں۔ انھوں نے
ہندو اخباروں کا ذکر کیا اور ان کے چند اقتباسات کا حوالہ دے کر کونسل کو بتایا کہ ہندو
اخبار کس حد تک ان کے خلاف دشنام طرازی پر اتر آتے ہیں۔ اس کے بعد راج گوپال
اچاریہ کے فارمولے کا تذکرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "اسے قبول کیجیے یا مسترد
کر دیجیے کی بنیاد پر میرے سامنے رکھا گیا ہے۔" انھوں نے کہا کہ "یہ سراسر دھونس ہے
نہ کہ مذاکرات کی پر خلوص خواہش" فارمولے پر تبصرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔
ان کا پیش کردہ فارمولا مسلم لیگ کی مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد کے منافی ہے اور اس کا
مقصد بھی یہی ہے کہ اس قرارداد کو نقصان پہنچایا جائے۔ قائداعظم نے واضح طور پر
اعلان کیا کہ مسلم لیگ مکمل آزادی کی حامی ہے اور کہا "مسٹر گاندھی واضح اور عام فہم انداز
میں پاکستان کی بنیاد پر مسلم لیگ سے اشتراک کریں اور یوں ہم اہل ہند کی آزادی کی منزل

ے قریب تر ہو جائیں گے۔" انھوں نے کانگریس اور گاندھی جی کو متنبہ کیا کہ وہ یہ یاد
ں کہ یہ ۱۹۴۴ء ہے، ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۲ء نہیں۔ اور یہ کہ مطالبۂ پاکستان کو قبول
نے کی آڑ میں گاندھی جی مسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا "جہاں
س تجویز کے محاسن و معائب کا تعلق ہے، مسٹر گاندھی ایک قیاسی، دھندلا، کٹا
ا اور کرم خوردہ پاکستان پیش کر رہے ہیں اور اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انھوں
ہماری پاکستان سکیم اور مسلمانوں کا مطالبہ قبول کر لیا ہے۔"

۹ ستمبر کو گاندھی جی قائد اعظم سے ملاقات کرنے بمبئی آئے اور دونوں لیڈروں کی
ے چیت ۲۷ ستمبر تک جاری رہی۔ ۲۷ ستمبر کو ایک بیان میں بات چیت کی ناکامی کا
ان کیا گیا اور مذاکرات کے دوران میں جناح گاندھی خط و کتابت اخباروں کو اشاعت
یلیے دے دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ گاندھی جی یہ کہتے تھے کہ وہ پاکستان کا
ل تسلیم کر رہے ہیں تاہم ان کی یہ شرط کہ اسے شمال مغربی اور شمال مشرقی ہندوستان
مام باشندوں کی رائے شماری کے ذریعے تسلیم کیا جائے گا پاکستان کے بنیادی اصول
منافی تھی۔ قائد اعظم نے گاندھی جی کو لکھا تھا "بین الاقوامی قانون کے ہر اصول کی
سے ہم ایک علیحدہ قوم ہیں۔" انھوں نے اپنے مکتوب میں آگے چل کر تحریر کیا تھا "مگر
ہ آپ (گاندھی جی) یہ کہتے ہیں کہ آپ ہندوستان کے تمام باشندوں کی نمائندگی کے
ہاں ہیں تو مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کے بیان سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ بالکل واضح
ہے کہ آپ ہندوؤں کے سوا کسی کی نمائندگی نہیں کرتے ——— مجھے یقین ہے کہ
مرف مسلمانوں بلکہ باقی ہندوستان کی فلاح بھی اسی میں مضمر ہے کہ قرارداد لاہور کے
طابق ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔" گاندھی جی نے جواب میں کہا "اگر آپ کا مکتوب
ب آخر ہے تو اب کوئی امید باقی نہیں رہی۔ کیا ہم دو قومی نظریے پر اختلاف رائے
تے ہوئے حق خود اختیاری کی بنیاد پر اس مسئلے کو حل نہیں کر سکتے؟" جناح صاحب نے

اس کے جواب میں فرمایا کہ گاندھی جی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے کہا: "کیا آپ ہمارے اس موقف کو استحسان کی نظر سے نہیں دیکھتے کہ ہم ایک قوم کی حیثیت سے نہ کہ ایک علاقائی یونٹ کے طور پر حقِ خود اختیاری کا مطالبہ کرتے ہیں اور یہ کہ مسلم قوم کی حیثیت سے ہمیں اپنا پیدائشی حق استعمال کرنے کا اختیار حاصل ہے۔" گاندھی جی نے جواب دیا کہ وہ اس بات کو قبول نہیں کرتے کہ مسلمان علیحدہ قوم ہیں تاہم انھوں نے یہ تسلیم کیا کہ اگر تقسیمِ ہند ناگزیر ہی ہے تو یہ "ناگزیر تقسیم دو بھائیوں کے درمیان تقسیم ہوگی۔" لیکن گاندھی جی نے انتہائی چالاکی کے ساتھ یہ بات کہی تھی اور اس کا اظہار ان کے مکتوب کے ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ "میں ایسی تقسیم کو قبول نہ کروں گا جس سے دفاع اور امورِ خارجہ وغیرہ۔ جیسے مشترک مفادات کا بیک وقت تحفظ نہ ہو سکے۔" قائداعظم نے "دو بھائیوں کے درمیان تقسیم" کے متعلق گاندھی جی کی تجویز کا یوں جواب دیا: "سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس کا مطلب سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مجھے خوشی ہوگی اگر آپ اپنی تجویز کی وضاحت کریں اور اس کے مجمل خاکے سے مجھے مطلع فرمائیں۔" مگر گاندھی جی نے ۲۴ر ستمبر کو قائدِاعظم کے نام جو مکتوب تحریر کیا اس میں وہ اس موقف سے منحرف ہو گئے اور انھوں نے لکھا: "ہندوستان کو دو یا زیادہ اقوام کا گہوارہ نہ سمجھنا چاہیئے۔ وہ ایک ایسا خاندان ہے جس میں کئی افراد شامل ہیں۔" قائدِاعظم نے ۲۵ر ستمبر کو اپنے مکتوب میں اس کا مدلل جواب دیتے ہوئے فرمایا: "میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں آپ محض زبانی جمع خرچ سے کام لے رہے ہیں۔ آپ حقیقتاً اس کے خواہاں نہیں ہیں۔" گاندھی جی نے اس مکتوب کے جواب میں فرمایا کہ جناح صاحب تکنیکی باریکیوں میں چلے گئے ہیں۔ انھوں نے درخواست کی کہ "اگر آپ میرا مشورہ قبول کر لیں اور مجھے اجازت دیں تو میں (مسلم لیگ کے) عام اجلاس سے خطاب کروں گا۔" جناح صاحب نے جواب میں فرمایا: "میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی ممبر یا مندوب ہی کو کونسل کے اجلاس یا عام اجلاس کی کارروائی میں حصہ لینے کی اجازت دی جاتی ہے ــــ مجھے افسوس ہے کہ میں

خلافِ توقع نہ تو آپ کو قائل کر سکا اور نہ آپ کو آپ کے موقف سے ہٹا سکا۔"

جناح گاندھی مذاکرات کے بعد قائد اعظم نے اخباری نمائندوں کو بتایا کہ گاندھی جی سے سمجھوتہ کرنا ممکن نہیں ہے مگر یہ بھی فرمایا کہ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہماری کوششوں کا انجام نہیں ہے۔" گاندھی جی نے کہا۔ بات چیت کی ناکامی محض نام ہی کی ہے۔ بات چیت تو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہوئی ہے۔" مینن نے مذاکرات پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "ان مذاکرات کا واحد عملی نتیجہ پہلی مرتبہ رونما ہوا اور وہ تھا مسلم لیگ کے مطالبے کے ٹھوس پہلو نمایاں ہونا جس کی لیگ نے اب تک وضاحت نہ کی تھی ——— اس کا ایک نتیجہ یہ بھی برآمد ہوا کہ عام مسلمانوں میں جناح کی حیثیت اور وقار میں اضافہ ہو گیا۔"[1]

لوئی فشر نے جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے اسباب کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے "گاندھی اور جناح کے درمیان دو قومی نظریہ دیوار بن کر حائل ہو گیا۔"[2]

قائد اعظم نے ۴ راکتوبر کو ایک اخباری کانفرنس بلائی تاکہ گاندھی جی سے بات چیت کی ناکامی کے متعلق اپنا نظریہ پیش کر سکیں۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ گاندھی جی ان مذاکرات کے بارے میں ۲۹ ستمبر کو ایک بیان دے چکے تھے۔ ایک اخباری نمائندہ نے قائد اعظم سے دریافت کیا "کیا مستقبل قریب میں گاندھی جی سے آپ کی ملاقات کا کوئی امکان ہے؟" قائد اعظم نے مزاحاً فرمایا "مسٹر گاندھی کہتے ہیں کہ اس کا انحصار ان کے دل کی آواز پر ہے۔ میرا وہاں تک گزر نہیں ہے۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

اکتوبر کی درمیانی تاریخوں میں بمبئی میں لندن کے ایک روزنامے ڈیلی ورکر کے نامہ نگار کو انٹرویو دیتے ہوئے قائد اعظم نے پاکستان کے تصور کی وضاحت فرمائی۔ انھوں نے کہا۔

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن صفحہ ۱۶۶ [2] دی لائف آف مہاتما گاندھی حصہ دوم۔ لوئی فشر۔ صفحہ ۱۹۵۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء۔ ہندوستان سیلوکو زاینڈ پیپر کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔

"پاکستان اس سرزمین پر کسی غیر ملکی حملے یا جارحانہ ارادے کو برداشت نہ کرے گا۔ ہم
اصول جیسے طرابلسؔ کا پر عمل کریں گے۔" انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ جس وقت
متحدہ ہندوستان کا ذکر کرتے ہیں تو ان کا مطلب برطانوی سامراج کا تسلط برقرار رکھنا
ہے۔ ــــــ وہ چاہتے ہیں کہ ہم تابع اور دست نگر بن کر جنگی کارروائیوں کی تمام ذ
سنبھال لیں اور اقتدار و اختیار ان کے ہاتھ میں رہے۔"

انھوں نے انٹرویو کے آخر میں کہا کہ تمام متعلقہ فریقوں کے لیے پاکستان ہی ہند
کے مسئلے کا واحد پائدار حل ہے۔

جناح گاندھی مذاکرات کی ناکامی کے بعد اگست ۱۹۴۴ء میں لارڈ ویول نے
گورنروں کی کانفرنس طلب کی۔ اس وقت حالات اتحادیوں کے حق میں تھے اور جنگ کا خاتمہ
قریب نظر آرہا تھا۔ وائسرائے نے محسوس کیا کہ جنگ ختم ہونے پر تمام ہنگامی قوانین ختم
ہو جائیں گے اور ہندوستان میں بے چینی کی چنگاریاں، جنھیں اب تک جنگ کا بہانہ بنا کر
دبایا گیا ہے، پھیل کر آتش فشاں بن جائیں گی۔ فوجی بھرتی نہ ہونے کی صورت میں
اقتصادی بدحالی اور بے روزگاری کی وجہ سے یہ آگ اور بھڑکے گی۔ گورنروں نے
اتفاق رائے سے سفارش کی کہ "تعطل دور کرنے کی غرض سے حکومت کو پہل کرنی چاہیے"
ہندوستانی اقتصادیات پر جنگ کے اثرات کا مقابلہ کرنے کے لیے تمام صوبوں میں معمو
کے مطابق حکومتیں کام کر سکیں۔ وائسرائے نے اس کانفرنس کی سفارشات کی بنیاد پر ا
تجاویز مرتب کیں اور وزیر ہند کو ارسال کر دیں۔ وائسرائے نے وزیر ہند کو لکھا کہ صورت حا
کو بگاڑنے سے بہتر یہ ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیوں کے درمیان متفقہ حل کی راہ میں پیش
آنے والی دشواریوں کو دور کیا جائے۔ وزیر ہند نے لارڈ ویول کی تجاویز مسترد کر دیں او
ایک متبادل منصوبہ پیش کیا جس میں لیگ اور کانگریس کو نظر انداز کر کے دیگر چھوٹی پارٹ
اور اقلیتوں کے لیڈروں کے درمیان کانفرنس کی تجویز تھی۔ یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ کانفر

کامیاب ہوگی کیونکہ اس میں زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی بالخصوص اس صورت میں کہ کانفرنس میں ان صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی موجود ہوں گے جہاں دفعہ ۹۳ نافذ نہیں ہے۔ لارڈ ویول نے محسوس کیا کہ یہ کانفرنس کامیاب نہیں ہو سکتی اور انھوں نے لگی لپٹی رکھے بغیر وزیرِ ہند کو اپنے خیالات سے مطلع کر دیا۔

امیری نے اس خواہش کے زیرِ اثر کہ مشرقِ بعید کے محاذ پر جہاں جاپان کی جارحیت کا زور ٹوٹ رہا تھا، جلد از جلد جنگ ختم ہو جائے یہ جرأت مندانہ اعلان کرنے کا ارادہ کیا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی اور مختلف اقوام کے درمیان سمجھوتے کو آزادی کے لیے شرط نہیں بنایا جائے گا۔ امیری کے خیالات سے واقف ہونے کے بعد لارڈ ویول نے چرچل کی کابینہ کو ایک مراسلہ بھیجا جو انگریزوں کے نقطۂ نظر سے ایک انقلابی حیثیت رکھتا تھا۔ وزیرِ ہند نے وزیرِ اعظم کو بتایا کہ انھیں وائسرائے کے موقف سے پورا پورا اتفاق ہے اور برطانیہ کے مختصر المیعاد اور طویل المیعاد منصوبوں کے مفاد کے لیے بھی مناسب ہے۔

دریں اثنا ہندوستان کے سیاسی حالات اتنے دگرگوں ہو چکے تھے کہ مختلف پلیٹ فارموں سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی کی دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔ بعض فرقہ پرست اخبار بھی ان باتوں کو ہوا دے رہے تھے۔ اس مرحلے پر سر تیج بہادر سپرو نے فرقہ وارانہ قتل و غارت گری روکنے کے لیے گاندھی جی کو تجویز پیش کی کہ غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ ایک کمیٹی مقرر کرے تاکہ فرقہ وارانہ بدامنی اور بے چینی نہ بڑھنے پائے اور یہ کہ کانگریس اور لیگ اس کمیٹی سے تعاون کرنے پر تیار ہو جائیں۔ گاندھی جی اصولی طور پر اس پر رضامند ہو گئے مگر انھوں نے تجویز پیش کی کہ کانفرنس کے تمام ممبر غیر جماعتی افراد ہوں جن کا کانگریس یا مسلم لیگ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ ۱۹ نومبر کو غیر جماعتی کانفرنس کی مجلس قائمہ کے اجلاس میں آئینی اور سیاسی نقطۂ نظر سے فرقہ وارانہ مسئلہ

اور انگلینڈوں کے معاملے کا مکمل جائزہ لینے" کا فیصلہ کیا گیا۔ سر تیج بہادر سپرو کو مجلس کے
ارکان نامزد کرنے کا اختیار دیا گیا اور انھوں نے ۳ر دسمبر کو ان اراکین کے ناموں کا
اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سپرو نے ۱۰ر دسمبر کو قائد اعظم کو ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ
مجلس قائمہ پاکستان کے سلسلے میں مسلم لیگ کے موقف کا مکمل جائزہ لے گی اور حالیہ گاندھی
جناح مذاکرات کے دوران میں مہاتما گاندھی اور مسٹر سی راجگوپال اچاریہ کی پیش کردہ تجاویز
کی اہمیت کا اندازہ لگائے گی " آخر میں سپرو نے قائد اعظم سے درخواست کی کہ وہ مجلس کے
ممبروں کو اس بارے میں تفصیلی گفتگو کے لیے وقت و تاریخ دے دیں۔ قائد اعظم نے ۱۴ دسمبر
کو اس کے جواب میں فرمایا کہ میں غیر جماعتی کانفرنس، اس کی مجلس قائمہ یا خاص کمیٹی کو تسلیم
نہیں کرتا تاہم ــــــ مجھے آپ سے مل کر خوشی ہوگی۔ ہریجن لیڈر ڈاکٹر امبیدکر پہلے
تو مجلس سے تعاون پر آمادہ نظر آتے تھے مگر بعد میں انھوں نے انکار کر دیا اور سپرو مشن
ناکام ہوگیا۔

۱۹۴۴ء میں کانگریس پارٹی مرکزی اسمبلی میں شامل ہوگئی۔ اس وقت کانگریس پارٹی
کے لیڈر بھولا بھائی ڈیسائی تھے۔ اسمبلی کے کام کے سلسلے میں وہ اکثر و بیشتر نواب زادہ
لیاقت علی خاں سے ملتے جس کی وجہ سے دونوں میں دوستانہ تعلقات استوار ہوگئے۔
۱۹۴۵ء کے اوائل میں ڈیسائی نے تعطل دور کرنے کی غرض سے ایک فارمولا پیش کیا جو
بعد میں "ڈیسائی لیاقت سمجھوتہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ اس منصوبے میں خاص طور سے یہ
کہا گیا تھا کہ وائسرائے جناح صاحب اور ڈیسائی کو مرکز میں عبوری حکومت بنانے کی دعوت
دیں گے۔ دونوں اصحاب وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے اراکین کے نام تجویز کریں گے۔ دونوں
پارٹیوں کو ۴۰، ۴۰ فی صدی نشستیں ملیں گی اور ۲۰ فی صدی نشستیں دیگر پارٹیوں کو دی
جائیں گی۔ تمام اراکین ہندوستانی ہوں گے۔ طویل المیعاد حل طلب تنازعے کونسل کی تشکیل
کے بعد زیر غور آئیں گے۔ جن صوبوں میں دفعہ ۹۳ نافذ ہے وہاں مسلم لیگ اور کانگریس

مخلوط وزارتیں بنائیں گی۔ ڈیسائی نے ۱۳ جنوری کو وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری ایون جینکنس سے ملاقات کی اور کہا کہ لیاقت علی خان "ڈیسائی منصوبے" پر رضامند ہو گئے ہیں۔ وائسرائے نے اس پر خوشگوار ردعمل کا اظہار کیا اور وزیر ہند کو اس سے مطلع کیا۔ برطانوی کابینہ نے منصوبے کی وضاحت طلب کی اور وائسرائے کو ہدایت کی گئی کہ وہ مسٹر جناح اور ڈیسائی سے ملاقات کریں اور کابینہ کو رپورٹ پیش کریں۔ جناح صاحب نے جب یہ محسوس کیا کہ ان کی اور مسلم لیگ کی جانب سے خاموشی کا مطلب شاید یہ لیا جائے کہ انھوں نے "ڈیسائی لیاقت سمجھوتہ" منظور کر لیا ہے تو انھوں نے ایک بیان میں اعلان کیا کہ مجھے یا مسلم لیگ کو اس سمجھوتے کا کوئی علم نہیں ہے اور ہم اس کے پابند نہیں ہیں۔ لارڈ ویول نے بمبئی کے گورنر سر جان کولول کے ذریعے جناح صاحب سے درخواست کی کہ وہ مارچ سے قبل ان سے دہلی میں ملاقات کریں۔ قائداعظم نے گورنر بمبئی کو مطلع کیا کہ مجھے ڈیسائی لیاقت سمجھوتے کا علم نہیں ہے اور اگر اس سمجھوتے کے بارے میں کوئی وعدہ کیا گیا ہے تو ہم سے اس کی منظوری نہیں لی گئی ہے۔ تاہم مارچ میں وہ دہلی تشریف لے گئے لیکن بدقسمتی سے علیل ہو گئے اور وائسرائے سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔

گاندھی جی کی سرکاری سوانح عمری کے مرتب، پیارے لال نے لیاقت ڈیسائی مذاکرات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "لیکن گاندھی جی کی بار بار تنبیہ کے باوجود کہ کوئی وعدہ کرنے سے پہلے ہر بات ضابطۂ تحریر میں لے آنی چاہیے اور اس امر کا یقین کر لینا چاہیے کہ مسٹر جناح نے اسے منظور کر لیا ہے، بھولا بھائی حد سے زیادہ اشتیاق اور ضرورت سے زیادہ قانونی مہارت کے زعم میں آگے بڑھتے رہے اور انھوں نے عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیا۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لیاقت علی خاں نے کسی سمجھوتے پر دستخط نہیں کیے تھے اور نہ کسی تجویز پر قائداعظم کی منظوری حاصل کی گئی تھی۔ لیاقت علی خاں نے ایک اخباری بیان جاری کیا اور اس بات کی تردید کی کہ انھوں نے کسی دستاویز

پر دستخط کیے ہیں۔ انھوں نے کہا، مسٹر ڈیسائی کو بخوبی علم ہے کہ کوئی سمجھوتہ نہیں ہوا ہے بلکہ صرف چند تجاویز ہیں جو مذاکرات کی بنیاد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔" ان مذاکرات کے متعلق قائدِ اعظم کو کیا اور کتنا علم تھا اس باب میں لیاقت علی خاں نے کہا، میں نے انھیں (بھولا بھائی ڈیسائی کو) واضح طور پر بتا دیا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ میرے ذاتی خیالات ہیں اور یہ کہ میں نے اس معاملے میں مسٹر جناح سے صلاح مشورہ نہیں کیا ہے۔"

اس سے چند ہفتے پہلے، کانگریسیوں کی رہائی اور اسمبلیوں میں ان کے آنے کے سبب، صوبائی سیاست میں زبردست تبدیلیاں ہو گئی تھیں۔ شمال مغربی سرحدی صوبے میں ۱۹۴۳ء سے مسلم لیگی وزارت قائم تھی۔ اسے ۱۸ کے مقابلے میں ۲۴ ووٹوں سے شکست ہو گئی۔ نتیجتاً کانگرس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر خان صاحب سرحد کے وزیرِ اعلیٰ بن گئے اور انھوں نے گورنر کو یقین دلایا کہ میری وزارت جنگ سے متعلق کارروائیوں کی پوری پوری حمایت کرے گی۔ آسام میں سر سعد اللہ خان اور کانگرس پارٹی کے لیڈر گوپی ناتھ بردولائی میں مفاہمت کے سبب سر سعد اللہ کو اپنی کابینہ میں ردوبدل کرنا پڑا۔ سندھ میں فروری ۱۹۴۵ء میں، اسمبلی کے بجٹ اجلاس کے دوران میں، مسلم لیگ کے چند ممبروں کے پارٹی سے علیحدہ ہو جانے کے سبب سر غلام حسین ہدایت اللہ کی وزارت کو شکست ہو گئی اور انھیں اپنی پوزیشن مستحکم بنانے کے لیے خان بہادر اللہ بخش کے بھائی خان بہادر مولا بخش کو وزیر بنانا پڑا۔ خان بہادر مولا بخش کے ساتھ چار آزاد مسلمان ممبر بھی سرکاری پارٹی میں شامل ہو گئے۔ جناح صاحب نے لیگی وزارت میں ایک غیر لیگی مسلمان ممبر کی شمولیت پر سخت اعتراض کیا اور اس بات پر اصرار کیا کہ مولا بخش لیگ کے عہد نامے پر دستخط کریں۔ مولا بخش نے لیگ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا اور سندھ بحران سے دوچار ہو گیا۔ ۱۴ مارچ کو نئی وزارت بنی جس میں خان بہادر مولا بخش کو شامل نہیں کیا گیا۔ سر غلام حسین بدستور وزیرِ اعلیٰ رہے۔ بنگال میں کانگریس پارٹی کے

لیڈر کرن شنکر رائے نے وزیرِ اعلیٰ بنگال خواجہ ناظم الدین سے لیگ کانگریس مخلوط وزارت کے سلسلے میں گفتگو شروع کی ہی تھی کہ ۲۰ر مارچ کو بجبٹ پر بحث کے دوران میں "زراعت" کے متعلق مطالبہ زر پر ناظم الدین وزارت کو شکست ہو گئی۔ بجبٹ منظور کرانے کے لیے ۳۰ر مارچ سے پہلے نئی وزارت کی تشکیل ممکن نہ تھی، بنابریں گورنر نے بنگال میں دفعہ ۹۳ نافذ کر دی۔

نام نہاد ڈیسائی لیاقت سمجھوتے کی ناکامی کے بعد سے ہی لارڈ ویول اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ انھیں انگلستان کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے "تاکہ وہ ذاتی طور پر وزیرِ ہند سے گفتگو کر سکیں۔ ۲۳ر مارچ کو وہ لندن پہنچے اور برطانوی کابینہ سے صلاح مشورہ کیا۔ اس کے نتیجے میں انھیں نہ صرف کانگریس اور مسلم لیگ بلکہ دوسری پارٹیوں اور اقلیتوں کے لیڈروں کی بھی کانفرنس طلب کرنے، کانگریسی نظر بند رہا کرنے اور یہ یقین دہانی کرانے کا اختیار دیا گیا کہ امورِ خارجہ وائسرائے کونسل کے ہندوستانی رکن کے سپرد کیے جائیں گے اور یہ کہ وائسرائے کونسل کے ہندو اور مسلمان اراکین کی تعداد مساوی ہوگی۔ یہ مذاکرات جاری تھے کہ جرمنی نے ۷ر مئی کو اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے اور یہ خیال عام تھا کہ اب جاپان بھی عنقریب گھٹنے ٹیک دے گا۔ ۴ر جون کو لارڈ ویول کابینہ کی جانب سے ایک منصوبہ (کیبنٹ پلان) لے کر دہلی روانہ ہو گئے۔ جس روز لارڈ ویول ہندوستان روانہ ہوئے، وزیرِ ہند ایمرے نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ وائسرائے کو ایک منصوبہ دیا گیا ہے جس کے مطابق انھیں عبوری حکومت بنانے کا اختیار سونپا گیا ہے اور توقع ہے کہ اس سے تمام فریق مطمئن ہو جائیں گے۔

۱۴ر جون کو لارڈ ویول نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک نشری تقریر میں ان تجاویز کا اعلان کیا۔ انھوں نے کہا کہ ان تجاویز کا مطلب کوئی دستوری حل مسلط کرنا نہیں ہے بلکہ ان سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ ہندوستانی پارٹیاں خود ہی آپس میں سمجھوتہ کریں گی۔

اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ میں ہندوستانی لیڈروں کو ملاقات اور صلاح مشورہ کی دعوت دے رہا ہوں تاکہ نئی ایگزیکٹو کونسل بنائی جا سکے " جس میں ہندو اور مسلمان اراکین کی تعداد مساوی ہوگی ـــــ یہ کونسل وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے سوا تمام ہندوستانی اراکین پر مشتمل ہوگی " یہ کونسل " موجودہ دستور کے دائرہ کار میں کام کرے گی اس کی تشکیل محض ایک عبوری کارروائی ہے جس سے " قطعی اور آخری دستوری حل " کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی۔ لارڈ ویول نے اعلان کیا کہ میں اس کانفرنس میں مختلف صوبوں کے موجودہ وزرائے اعلیٰ، جن صوبوں میں دفعہ ۹۳ نافذ ہے ان کے سابق وزرائے اعلیٰ مرکزی اسمبلی میں لیگ اور کانگریس پارٹیوں کے لیڈروں اور ڈپٹی لیڈروں، نیشنلسٹ پارٹی اور یورپین گروپ کے لیڈروں اور " دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں کے تسلیم شدہ لیڈروں کی حیثیت سے " گاندھی اور جناح کو، اچھوتوں کی جانب سے شوراج اور سکھ فرقے کی نمائندگی کے لیے ماسٹر تارا سنگھ کو مدعو کروں گا۔ وائسرائے نے اعلان کیا کہ اگر کانفرنس ناکام ہو گئی تو مرکز اور صوبوں میں موجودہ پوزیشن برقرار رکھی جائے گی لیکن میں انھیں (مسلمانوں کو) یہ یقین دلاتا ہوں کہ اس تجویز کے پس پشت برطانیہ کے تمام ذمہ دار لیڈروں اور عوام کی یہ خواہش کار فرما ہے کہ ہندوستان کے نصب العین کے حصول میں اس کی مدد کی جائے " وائسرائے نے یہ بھی کہا کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبروں کو رہا کیا جا رہا ہے۔ آخر میں لارڈ ویول نے کانفرنس کو کامیاب بنانے کی پر خلوص اپیل کی اور کہا " تمام فریقوں کو درگزر اور عفو کے جذبے سے کام لینا چاہیے۔ مجھے ہندوستان کے مستقبل پر یقین ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے میں اس ملک کی عظمت کو دوبالا کروں گا۔ میں آپ سب سے تعاون اور خیر سگالی کی درخواست کرتا ہوں "

اسی وقت وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ " حکومت برطانیہ کی دلی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان کا موجودہ سیاسی بحران ختم ہو جائے ـــــ حکومت برطانیہ

ہندوستان کے بڑے فرقوں کی مرضی کے خلاف کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتی" لارڈ ویول نے اپنی نشری تقریر میں جن مجوزہ عبوری تبدیلیوں کی جانب اشارہ کیا تھا، وزیر ہند نے ان کی صراحت کی اور کہا کہ وائسرائے کو حکومتِ برطانیہ کی جانب سے اس کا اختیار دیا گیا ہے انھوں نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی۔ حکومت برطانیہ کو یقین ہے کہ تمام فریق اگر خیرسگالی کے جذبے سے کام لیں اور حقیقتاً تعاون پر آمادہ ہوں تو یہ تجاویز ہندوستان میں حکومتِ خود اختیاری کے قیام کے سلسلے میں ایک اہم اور نمایاں اقدام ثابت ہوں گی اور دیگر اقوام میں ہندوستان کی جائز حیثیت اور اس کا اثر مستحکم تر ہو جائے گا۔

لارڈ ویول نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر کانفرنس میں شریک ہونے والوں کو دعوت نامے بھیج دیا۔ گاندھی جی نے اس دعوت نامے کے جواب میں فرمایا کہ چونکہ میں کانگریس کی نمائندگی نہیں کرتا اس لیے کانگریس کے صدر مولانا آزاد کو مدعو کیا جائے۔ وائسرائے نے اس پر مولانا آزاد کو دعوت دی۔ گاندھی جی نے اپنے بیانات میں لارڈ ویول کی تجاویز پر تبصرہ کرتے ہوئے اس بات پر اظہارِ افسوس کیا کہ واضح طور پر اس امر کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے کہ ہندوستان کا نصب العین مکمل آزادی ہوگا اور یہ کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو مساوی تعداد میں نشستیں دی گئی ہیں۔ جس کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ کانگریس اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی نمائندہ ہے۔ بہرحال جون کے تیسرے ہفتے میں بمقام بمبئی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں فیصلہ کیا گیا کہ جن کانگریسی اراکین کو کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے وہ یہ دعوت قبول کر لیں۔

۱۵ر جون کو قائدِ اعظم نے لارڈ ویول کو تار بھیجا اور وضاحت چاہی۔ انھوں نے وائسرائے سے درخواست کی کہ کانفرنس کی تاریخ ۲۵ جون سے چند ہفتوں کے لیے ملتوی کر دی جائے تاکہ وہ وائسرائے کی وضاحت وصول ہونے کے بعد مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی سے صلاح مشورہ کر سکیں۔ اس کے ساتھ قائدِ اعظم نے وائسرائے کو خبردار کیا کہ مجوزہ منصوبے میں اگر

مسلم لیگ سے صلاح مشورے کے بغیر کوئی تبدیلی کی گئی تو وہ کانفرنس کی ناکامی کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ وائسرائے نے اس تار کے جواب میں کہا کہ میں کانفرنس کے انعقاد سے ایک روز پہلے یعنی ۲۴ر جون کو شملہ میں آپ سے ملاقات کرنا پسند کروں گا اور اس موقع پر جملہ امور کی زبانی وضاحت کردوں گا۔ وائسرائے نے جناح صاحب سے درخواست کی کہ وہ مسلم لیگ کے دیگر مدعوئین کے ہمراہ کانفرنس میں شرکت پر آمادہ ہو جائیں۔

۲۴ر جون کو وائسرائے نے پروگرام کے مطابق جناح صاحب، گاندھی جی اور مولانا ابوالکلام آزاد سے الگ الگ ملاقات کی۔ وائسرائے سے بات چیت کے دوران میں مولانا آزاد نے اس اصول کے خلاف احتجاج کیا کہ وائسرائے کی کونسل میں مسلمان ارکان کی نامزدگی کا اختیار صرف مسلم لیگ کو ہوگا۔ گاندھی جی نے بھی اس سوال پر یہی موقف اختیار کیا مگر کہا کہ اگرچہ میں شملہ میں موجود رہوں گا اور صلاح مشورہ کے لیے تیار رہوں گا مگر میں کانفرنس میں شریک نہیں ہوں گا۔ تاہم گاندھی جی اور مولانا آزاد نے اصولی طور پر اس کانفرنس کا انعقاد منظور کرلیا۔

جناح صاحب نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ ان تجاویز کی رُو سے مسلمان اقلیت میں رہیں گے کیونکہ غیر کانگرسی ہندو ہمیشہ ہندوؤں کا ساتھ دیں گے۔ ان اندیشوں کو دور کرنے کی غرض سے قائداعظم نے تجویز پیش کی کہ اگر مسلمان ممبروں کی اکثریت کسی کارروائی کی مخالفت کرے تو اسے کالعدم سمجھا جائے۔ وائسرائے نے وضاحت کی کہ یہ طریقہ کار جمہوری اصولوں اور طرزِ عمل کے منافی ہوگا۔ قائداعظم نے ایک اور نکتہ یہ پیش کیا تھا کہ مسلم نشستیں صرف مسلم لیگ کے نامزد اراکین سے پر کی جائیں۔ مسلم لیگ وائسرائے کونسل میں مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے پنجاب کے کسی یونینسٹ یا کانگریسی مسلمان کا تقرر قبول نہ کرے گی۔ آخر میں قائداعظم نے مطالبہ کیا کہ اہم وزارتوں کے سلسلے میں لیگ کو مناسب حصہ دیا جائے۔

۲۵ر جون، کو گیارہ بجے دن، وائسرائے کی کوٹھی واقع شملہ میں یہ کانفرنس منعقد ہوئی جسے بعد میں "شملہ کانفرنس" کا نام دیا گیا تھا۔ کانفرنس میں جو اکیس^(۲۱) نمائندے شریک ہوئے ان میں مسلم لیگی نمائندوں کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

۱۔ مسٹر جناح صدر مسلم لیگ۔ ۲۔ لیاقت علی خاں، ڈپٹی لیڈر مسلم لیگ اسمبلی پارٹی انڈین لیجسلیٹو اسمبلی۔ ۳۔ خواجہ ناظم الدین سابق وزیر اعلیٰ بنگال۔ ۴۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ وزیر اعلیٰ سندھ۔ ۵۔ سر محمد سعد اللہ وزیر اعلیٰ آسام۔ ۶۔ حسین امام، لیڈر مسلم لیگ پارٹی کونسل آف اسٹیٹ۔

دیگر مسلم مدعوئین یہ تھے۔ ۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، صدر کانگریس۔ ۲۔ خضر حیات خاں، وزیر اعلیٰ پنجاب۔ ۳۔ ڈاکٹر خان صاحب، وزیر اعلیٰ صوبہ سرحد۔

یعنی کانفرنس میں شریک ۲۱ نمائندوں میں مسلم لیگ کے صرف ۶ نمائندے تھے اور نظریہ پاکستان کی مخالفت کرنے والوں میں تین غیر لیگی مسلمان نمائندے بھی موجود تھے۔

وائسرائے نے افتتاحی تقریر میں ممتاز ہندوستانی لیڈروں سے تعاون کی اپیل کی اور کہا "آج نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کی نظروں میں، ہمارے تدبر، عقل و فہم اور خیر سگالی کی آزمائش ہے۔" انھوں نے وضاحت کی کہ رازداری سے کام لینے کی غرض سے اخباری نمائندوں کو کانفرنس میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی ہے لیکن ہر نشست کے بعد ایک تیار شدہ بیان اخباروں کو دیا جائے گا۔

کانگریس کی جانب سے مولانا آزاد نے کہا کہ کانگریس ایسی کوئی تجویز قبول نہ کرے گی جس سے کانگریس کی حیثیت ایک فرقہ وارانہ تنظیم کی سی ہو جائے۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو مکمل آزادی دینے کے سوال پر اس کانفرنس میں غور کیا جائے۔ انھوں نے مندرجہ ذیل نکات پر وائسرائے سے وضاحت طلب کی: ۱۔ مجوزہ محکمۂ امور خارجہ کے اختیارات کیا ہوں گے؟ ۲۔ جنگ کے خاتمے کے بعد اتحادی جنوب مشرقی ایشیا کے

ملک کی آزادی کے لیے کیا اقدام کریں گے؟ ہندوستانی فوج کو خالص طور سے ہندوستانی رنگ دینے اور اسے عوام سے قریب تر لانے کے لیے کیا تدبیریں کی جائیں گی؟ ہم مرکز میں مجوزہ قومی حکومت اور ہندوستانی ریاستوں اور ان کے باشندوں کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی؟ مولانا آزاد نے واضح کیا کہ کانفرنس میں شریک کانگریسی نمائندوں کے دعادی محض عارضی ہوں گے اور جب تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی انھیں منظور نہ کرے اور ان کی توثیق نہ کرے ان کی کوئی حیثیت نہ ہوگی۔

قائداعظم نے فوراً مداخلت کی اور کہا کہ یہ باتیں قطعاً خارج از بحث ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کے سوالوں کا وائسرائے کی طرف سے جواب دیے جانے کے بعد میں ان امور پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالوں گا۔

اس کے بعد لارڈ ویول نے مولانا آزاد کے ایک ایک نکتے کا جواب دیا۔ وائسرائے نے کہا کہ ہندوستان کے جائز حق کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کیا گیا ہے اور یہ کہ اس امر کا فیصلہ اسی وقت کیا جائے گا جب خود اہل ہند اپنا دستور مرتب کریں اور ہندوستان کی قومی زندگی کے اہم عناصر اس کو قبول کر لیں۔ آخر میں وائسرائے نے مولانا آزاد کو یقین دلایا کہ ان تجاویز کا مقصد یہ نہیں ہے کہ کانگریس کو ایک فرقہ وارانہ تنظیم کی حیثیت دے دی جائے۔

قائداعظم فوراً اٹھے اور انھوں نے وائسرائے کے آخری جملے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ میرے اور مسلمانانِ ہند کے نزدیک کانگریس صرف ہندوؤں کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتی ہے مسلمانوں کی نہیں۔ اس پر ڈاکٹر خان صاحب نے حسبِ معمول اپنے گستاخانہ انداز میں کہا کہ مسٹر جناح غلط کہتے ہیں۔ کانگریس مسلمانوں کی نمائندگی بھی کرتی ہے۔ اس سے قائداعظم کے یہ اندیشے درست ثابت ہوئے کہ کانفرنس میں موجود غیر لیگی مسلمان نمائندے کانگریس کا ساتھ دیں گے اور پاکستان کے نظریے کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے

اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے مینن نے لکھا ہے "وائسرائے نے خیال ظاہر کیا کہ کانگریس اپنے ممبروں کی نمائندگی کرتی ہے اور جناح نے کہا کہ میں اسے تسلیم کرتا ہوں"[1]

مسلم لیگ کی جانب سے قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ کانفرنس میں لیگ کے نمائندوں کی موجودگی سے تمام متعلقہ افراد کو یہ یقین ہو جانا چاہیئے کہ وہ ایک ایسا حل تلاش کرنا چاہتی ہے جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو اور یہ کہ افراد یا سیاسی پارٹیوں کے خلاف نامناسب باتیں کہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، لیکن جس طرح مسلم لیگ ۹۰ فی صدی بلکہ اس سے بھی زیادہ تناسب سے مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اسی طرح کانگرس یقیناً ہندوؤں کی نمائندہ تنظیم ہے۔ انھوں نے یہ امر واضح کر دیا کہ جہاں تک مسلم لیگ کا تعلق ہے وہ ایسا کوئی دستور قبول نہ کرے گی جس میں واضح طور پر قیامِ پاکستان کا اصول تسلیم نہ کیا گیا ہو۔ اس سلسلے میں مسلم لیگ متحدہ آزاد ہندوستان کے بارے میں کانگرس کے مطالبے کی شدید مخالفت کرتی ہے۔ انھوں نے کانفرنس کو یاد دلایا کہ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی نے ۲۰ راگست ۱۹۴۲ء کو ایک قرارداد کے ذریعے یہ اعلان کیا تھا کہ "وہ ہندوستان میں عارضی حکومت کے قیام کی غرض سے مساوات کی بنیاد پر کسی بھی پارٹی سے بات چیت کرنے کو تیار ہے تاکہ ملکی وسائل کے ذریعے ہندوستان کا دفاع کیا جا سکے اور جنگ میں کامیابی حاصل ہو سکے" انھوں نے اس بات سے اتفاق کیا کہ پاکستان کے لیے دستور مرتب کرنے میں وقت صرف ہوگا اور اس لیے باعمل سیاست دانوں کی حیثیت سے ہم نے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ یہ دستور فوراً مرتب کیا جائے۔ اس سلسلے میں ہم نے کانگرس جیسا رویہ اختیار نہیں کیا جس کا مطالبہ ہے کہ متحدہ ہندوستان کو فوری طور پر آزادی دی جائے انھوں نے کہا عبوری کونسل میں مساوی تعداد کا معاملہ میرے لیے اہم سوال ہے اور اس

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن صفحہ ۱۹۷۔

کی تفصیلات کا تعین ان خطوط پر کیا جائے کہ مسلم لیگ انھیں قبول کر سکے۔

کانفرنس کے اجلاس ہوتے رہے اور لارڈ ویول کی کوششوں سے اس بات پر اتفاق رائے ہو گیا کہ نئی ایگزیکٹو کونسل واضح طور پر اپنے سامنے وہی مقاصد رکھے گی جن کا اعلان وائسرائے نے اپنی نشری تقریر میں کیا ہے، یہ کہ کونسل کے اراکین ان افراد کی فہرست سے نامزد کیے جائیں گے جو کانفرنس پیش کرے گی، یہ کہ محکمۂ جنگ کے سوا، جو کمانڈر انچیف کی نگرانی میں ہوگا، تمام محکمے ہندوستانی باشندوں کے سپرد کیے جائیں گے لیکن جب کانفرنس نے ایگزیکٹو کونسل میں فرقہ وارانہ مساوات کے معاملے پر غور و خوض شروع کیا تو سنگین اختلافات رونما ہونے لگے، کانگرس، نیشنلسٹ اور اچھوتوں کے نمائندوں نے اس پر اعتراضات شروع کر دیے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس طرح ۲۵ کروڑ افراد اور دس کروڑ باشندوں کی نمائندگی کی بنیاد یکساں ہو جاتی ہے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر خان صاحب نے ہندوؤں کے اعتراضات کی حمایت کی۔ ڈاکٹر خان صاحب نے کہا کہ ایک انقلابی تحریک کے ذریعے فرقہ واریت کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جاتے۔ جناح صاحب نے مساوی نمائندگی کے اصول کی حمایت کی اور تفصیل کے ساتھ اس اہم مسئلے پر مسلم لیگ کا موقف بیان کیا۔ کانگریس کے لیڈر پنڈت پنت نے ذاتی طور پر اس معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے جناح صاحب سے ملاقات کی۔ دونوں لیڈروں کی گفتگو کے بعد جناح صاحب نے ۲۷ تاریخ کو وائسرائے سے ملاقات کی اور انھیں یقین دلایا کہ اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ ایگزیکٹو کونسل میں کسی غیر لیگی مسلمان کو شامل نہ کیا جائے گا تو میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی سے کہوں گا کہ وائسرائے کا تجویز کردہ کوئی متبادل و منصفانہ منصوبہ قبول کر لیا جائے۔

۲۹ تاریخ کو کانفرنس کا اجلاس ہوا تو معلوم ہوا کہ جناح صاحب اور پنڈت پنت کی کوششوں کے باوجود دونوں کی بات چیت ناکام ہو گئی ہے اور کانگرس اور

مسلم لیگ میں مفاہمت کی کوئی بنیاد نہیں مل سکی ہے۔ متفقہ سمجھوتے کے تمام امکانات پر گفتگو ہوئی مگر کوئی بات طے نہ ہو سکی اور لارڈ ویول نے کھل کر یہ اعتراف کر لیا کہ کانفرنس تعطل کا شکار ہو گئی ہے۔ تاہم انھوں نے کہا کہ میں جس بنیاد کی نشاندہی کر چکا ہوں، بات چیت کی ناکامی کے باوجود اس کے سلسلے میں مجھے کچھ نہ کچھ انتظام کرنا ہوگا۔ انھوں نے کانفرنس کے تمام شرکا اور پارٹیوں سے درخواست کی کہ مجھے ہر پارٹی اور گروپ کی جانب سے کونسل کے لیے نمائندوں کے ناموں کی فہرست پیش کی جائے۔ مولانا آزاد نے کہا کہ کانگرس نہ صرف ہندوؤں بلکہ مسلمانوں، عیسائیوں اور اچھوتوں کے نام بھی پیش کرے گی۔ قائداعظم نے فرمایا کہ بعض نکات کے بارے میں ابھی تک مجھے تفصیلات کا علم نہیں ہے، اس لیے جب تک مسلم لیگ کی جانب سے مجھے اختیار نہ دیا جائے میں مطلوبہ فہرست پیش کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ قائداعظم نے مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان اور متحدہ ہندوستان دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان سنگین نظریاتی اختلاف ہے۔ انھوں نے کہا کہ لیگ اسی صورت میں عبوری حکومت میں شامل ہوگی کہ واضح طور پر یہ پالیسی تسلیم کی جائے کہ مسلمانوں کو حق خود اختیاری حاصل ہے۔ انھوں نے خبردار کیا کہ اگر لارڈ ویول کی تجاویز پر عملدرآمد کیا گیا تو ان سے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے گا۔ غالباً ان کا خیال تھا کہ وائسرائے کے فارمولے سے خضر حیات اور ڈاکٹر خاں صاحب کو مسلمانوں کے نام پیش کرنے کا حق مل جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ اسلامی نظریۂ قومیت دیگر اقوام کے نظریے سے مختلف النوع ہے اور چونکہ مسلمانوں پر اثر انداز ہونے والے معاملوں کی ذمہ داری مسلم لیگ پر ہوگی اس لیے عبوری حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی کے بارے میں اسے اس امر کا پورا حق حاصل ہے کہ وہی مسلمان نمائندوں کو نامزد کرے۔

۱۴ تاریخ کو قائداعظم نے ایک اخباری کانفرنس میں اعلان کیا کہ "ویول منصوبے

کا قطعی جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ یہ ایک جال ہے۔ جب لارڈ ویول نے پنجاب کے مسلمانوں کے نمائندہ کی حیثیت سے خضر حیات خاں کا نام ایک غیر لیگی مسلمان ممبر کونسل میں شامل کرنے پر اصرار کیا تو ہم الگ ہو گئے —— اگر ہم نے لارڈ ویول کی پیش کردہ پوزیشن قبول کر لی ہوتی تو اس کانفرنس سے ہمیں کچھ حاصل نہ ہوتا اور یہ مسلم عوام سے صریح غداری ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ہم نے اپنے نصب العین کو خیرباد کہہ دیا ہے اور خود اپنے ہاتھوں مسلم لیگ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے۔"

اسی دن لارڈ ویول نے کانفرنس کی اختتامی تقریر میں کہا کہ میں نے کانفرنس کے کئی شرکا سے نجی بات چیت کی ہے لیکن "جب میں نے اپنا تجویز کردہ حل مسٹر جناح کے سامنے پیش کیا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مسلم لیگ اسے قبول نہیں کر سکتی۔ انھوں نے یہ بات اتنے عزم سے کہی تھی کہ میں نے محسوس کیا کہ مذاکرات جاری رکھنا بے سود ہوگا —— اس لیے یہ کانفرنس ناکام ہو گئی" کانگریس، ہندوؤں اور مٹھی بھر غیر لیگی مسلمانوں نے وائسرائے کی بات پر آمنا و صدقنا کہتے ہوئے قائداعظم کی مذمت کی کہ ان کی وجہ سے شملہ کانفرنس ناکام ہو گئی۔ لیکن قائداعظم کی مقبولیت اور ساکھ کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچ سکا بلکہ مسلمانوں نے انھیں اپنا ناجی و مددگار قرار دیا اور انھیں مبارکباد دی کہ انھوں نے اتنی خوبی سے دس کروڑ مسلمانوں کا موقف پیش کیا۔ اگر قائداعظم شملہ کانفرنس میں مفاہمت و مصالحت کر لیتے تو نظریۂ پاکستان کو مہلک صدمہ پہنچتا۔ ان کے آہنی عزم اور اٹل ارادے ہی کے نتیجے میں بنیادی اصولوں میں کوئی کتربیونت نہ کی جا سکی اور اس طرح مسلمانانِ ہند محفوظ و مامون رہے۔ قائداعظم نے پاکستان کے نظریے کو جس طرح زندہ رکھا، اس پر مینن کے ان الفاظ سے روشنی پڑتی ہے جو انھوں نے درحقیقت کسی اور ہی نقطۂ نظر سے کہے تھے —— مینن رقم طراز ہیں "شملہ کانفرنس

ہ ملک کی قوم پرست طاقتوں کو ملک کی سالمیت محفوظ رکھنے کا ایک آخری موقع دیا
تھا اور جب اس جدوجہد میں انھیں شکست ہوگئی تو فرقہ واریت کی لہروں نے ملک کو
پنی گرفت میں لے لیا۔ اب صرف یہی چارہ کار رہا کہ ملک کو تقسیم کردیا جائے[1]۔"

مسلمانوں کے لیے کانفرنس کی ناکامی ایک زریں عہد کا آغاز ثابت ہوئی۔ شملہ
کانفرنس کے بعد گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا۔ "مجھے یہ سوچ کر تکلیف ہوتی ہے کہ جو
کانفرنس اتنی توقعات کے ساتھ شروع ہوئی تھی وہ انھی پچھلے اسباب کی بنا پر ناکام ہوگئی۔"
اشارہ ظاہر ہے کہ قائدِ اعظم کے موقف کی جانب تھا۔ اس کے ثبوت میں ایم آر جیکر کا ایک
خط پیش کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے اسی وقت گاندھی جی کو لکھا تھا۔ جیکر نے لکھا۔
(جناح صاحب) کوئی بات منظور کرنے سے پہلے دو شرطیں پیش کرتے ہیں (۱) پاکستان
قیام کے بارے میں یقین دہانی کرائی جائے اور (۲) مسلمانوں کے ہندوستان کے دیگر فرقوں کے
مساوی ووٹ تسلیم کیے جائیں۔ وہ اپنی عادت کے مطابق یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور چند
کامیابیوں سے ان کے حوصلے اور بڑھ گئے ہیں۔ مسلمانوں کو جو مراعات دی گئی ہیں، مثلاً
ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی نمائندگی وغیرہ، انہی پر بس نہ کرکے اب وہ یہ
چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مجموعی اعتبار سے دیگر تمام فرقوں کے برابر نمائندگی دی جائے۔ اس
مطلب یہ ہوا کہ مسلمانوں کو نشستیں ملنے کے بعد باقی ملک کو صرف پچاس فی صدی نشستیں ملیں گی۔
——— یہ عجیب و غریب حساب میری سمجھ سے باہر ہے کہ ۲۷ اور ۷۳ مساوی ہوتے ہیں[2]"
ہندوؤں اور ان کے لیڈروں کے نزدیک قائدِ اعظم کی معقولیت پسندی ریاضی کی غلط مساوات
لیکن مسلمانوں کے لیے وہ آخری سہارا تھی۔

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا از وی پی مینن صفحہ ۲۰۵ [2] مندرجہ بالا دو اقتباسات "مہاتما گاندھی:
لاسٹ فیز" از پیارے لال صفحات ۱۳۶/۱۳۷ مطبوعہ نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد سے ماخوذ ہیں۔

گاندھی جی کے ایک پرستار لوئی فشر نے شملہ کانفرنس کی ناکامی کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "جنگ کے دوران میں مسلم لیگ طاقتور بن گئی تھی اور اس نے غیر لیگی مسلمانوں کے مقابلے میں کئی انتخابات جیت لیے تھے۔ مگر نہ تو ویول اور نہ گاندھی (جو شملہ کانفرنس میں پس پردہ کانگرس کی پالیسی کی تشکیل کر رہے تھے) جناح کا یہ دعویٰ قبول کرنے کو تیار تھے کہ وہ مسلمانوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ کانگرس میں کئی مسلمان شامل تھے کانگرس کے صدر آزاد مسلمان تھے اور کانگرس انھیں وائسرائے کونسل کے لیے نامزد کرنا چاہتی تھی۔ پنجاب کے سابق وزیر اعلیٰ خضر حیات خاں جناح اور پاکستان کے مخالف تھے۔۔۔۔ اگر کانگرس یہ امر تسلیم کر لیتی کہ وہ محض ایک ہندو تنظیم ہے تو یہ بات کانگرس کی سیکولر (لادینی) حیثیت اور گاندھی کے اصول کے منافی ہوتی ــــــــ یہ تھی وہ چٹان جس سے ٹکرا کر شملہ کانفرنس ناکام ہوگئی"[1]

متحدہ ہندوستان کا سفینہ جس پر ہندوؤں کا غلبہ و اقتدار ہوتا، آخر چٹانوں سے ٹکرا کر غرق ہوگیا اور اس کا سہرا سر بسر قائد اعظم کے سر ہے۔

قائد اعظم کی شملہ کانفرنس سے واپسی پر مختلف ریلوے اسٹیشنوں پر ہزاروں مسلمانوں نے فلک شگاف نعروں سے ان کا استقبال کیا اور مسلمانانِ ہند کو تباہی سے بچانے پر تشکر و امتنان کے پھول نچھاور کیے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کو جنھوں نے مسلم لیگ کی مخالفت کی تھی، شملہ سے کلکتہ تک سیاہ جھنڈیاں دکھائی گئیں۔ جمیل الدین احمد نے لکھا ہے: "کلکتہ کے مسلمانوں نے ان کے خلاف اپنی ناراضی اور غم و غصے کا اظہار کرنے کے لیے انھیں عیدین کی نماز کی امامت سے الگ کر دیا"[2]

---

[1] دی لائف آف مہاتما گاندھی۔ لوئی فشر، صفحہ ۴۰۲ مطبوعہ ۱۹۵۳ء ہندوستان ہیلو لونڈ اینڈ پبلشر کمپنی لمیٹڈ بمبئی۔ [2] فائنل فیز آف اسٹرگل فار پاکستان۔ جمیل الدین احمد۔ صفحہ ۱۷ مطبوعہ ۱۹۶۴ء

شملہ کانفرنس ابھی جاری تھی کہ انگلستان کے سیاسی حالات میں دوررس تبدیلیاں رُونما ہونے لگیں اور ان کا اختتام عام انتخابات پر ہُوا۔ انتخابات میں لیبر پارٹی پہلی مرتبہ فتح یاب ہوئی اور اسے پارلیمنٹ میں قطعی اکثریت حاصل ہوگئی۔ چرچل کی جنگی کابینہ نے اقتدار کی کرسی کلیمنٹ ایٹلی کے سپرد کردی اور بادشاہ نے انھیں حکومت بنانے کی دعوت دی۔ نئی کابینہ میں لارڈ پیتھک لارنس وزیرِ ہند مقرر ہُوئے۔

تقریباً اسی زمانے میں حالیہ تاریخ کا ہولناک ترین واقعہ پیش آیا۔ جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایٹم بم گرایا گیا۔ جاپان اس تباہی سے لرز اُٹھا اور ہیروشیما کی تباہی کے تقریباً ایک ہفتے بعد یعنی ۱۶ اگست کو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

جنگ کے خاتمے کے بعد حکومتِ برطانیہ کے پاس عبوری حل کا کوئی جواز نہ رہا۔ اور اب یہ ممکن نہ تھا کہ ہندوستان کے مسئلے کے مستقل حل کو ملتوی کیا جائے۔ سر سٹیفورڈ کرپس نے ایک بیان میں تجویز پیش کی کہ آئندہ کبھی مذاکرات ہوں تو ان میں مطالبۂ پاکستان بھی شامل ہونا چاہیے۔ مسلم لیگ کی جانب سے کرپس کے بیان کی تائید کی گئی لیکن کانگریس کا اس پر نکتہ چینی کرنا قدرتی امر تھا۔ کیونکہ اس بیان سے بالواسطہ طور پر یہ تسلیم کرلیا گیا تھا کہ مسلمانوں کا مطالبہ جائز ہے۔ مسلم لیگ ورکنگ کمیٹی نے ایک قرارداد کے ذریعے مطالبہ کیا کہ مرکز اور صوبوں میں عام انتخابات کرائے جائیں۔ ۲۰ اگست کو قائداعظم نے بمقام بمبئی ایک جلسۂ عام میں مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتے ہُوئے فرمایا۔ "مسٹر گاندھی کی شخصیت ایک معمّا ہے۔ اگر وہ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کی نمائندگی نہ کرنے میں فائدہ ہے تو وہ انفرادی حیثیت سے گفتگو کرتے ہیں اور جب ان کا مفاد ہوتا ہے تو وہ کانگریس کے آمرِ مطلق بن جاتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ پورے ہندوستان کی نمائندگی کرتے ہیں"۔

جناح صاحب نے اعلان کیا کہ شملہ کانفرنس نہ صرف ناکام رہی بلکہ یہ نقیبہ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہوچکا ہے۔ دستوری اصلاحات کے بارے میں انھوں نے فرمایا "ہمیں مستقل

دستوری تصفیے کے لیے کوشش جاری رکھنی چاہیے۔ اگر ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ طے کیا جاتا ہے تو پاکستان کا معاملہ بھی طے کرنا ضروری ہے۔ ہم ہرگز شکست قبول نہ کریں گے ——— ہمارا مطالبہ حق و انصاف پر مبنی ہے اور یہی ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل ہے۔ ہم انتخاب لڑنا چاہتے ہیں تاکہ ہم ان لوگوں کو قائل کر سکیں جنھیں ہماری نمائندہ حیثیت کے بارے میں شک ہے۔"

مرکزی اسمبلی کے آخری انتخابات ۱۹۳۴ء میں اور صوبائی اسمبلیوں کے ۱۹۳۶ء میں ہوئے تھے اور اب ۱۹۴۵ء تھا۔ حکومت برطانیہ انتخابات کو مزید عرصے کے لیے ملتوی نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے انتخابات کی تیاری کی جائے۔ ۲۱ اگست کو وائسرائے نے اعلان کیا کہ موسم سرما میں انتخابات ہوں گے۔ تین دن بعد وائسرائے صلاح مشورے کے لیے لندن روانہ ہو گئے۔ لارڈ ویول ستمبر میں ہندوستان واپس آئے اور ۱۹ تاریخ کو انھوں نے ایک بیان میں کہا کہ حکومت برطانیہ نے انھیں یہ اعلان کرنے کا اختیار دیا ہے کہ حکومت ہندوستانی لیڈروں کے اشتراک و تعاون سے ہندوستان میں جلد از جلد حکومت خود اختیاری کے قیام کے امکانات کا جائزہ لینا چاہتی ہے۔ انھوں نے موسم سرما میں انتخابات کرانے کے متعلق اپنے عزم کا پھر اعلان کیا۔ وائسرائے نے کہا کہ انتخابات کے بعد میں صوبائی اسمبلیوں کے نمائندوں سے صلاح مشورہ کروں گا اور ایک دستور ساز ادارہ مقرر کیا جائے گا۔ وائسرائے نے اپنے بیان کے آخر میں کہا۔ "حکومت برطانیہ نے مجھے یہ اختیار بھی دیا ہے کہ جوں ہی صوبائی انتخابات کے نتائج شائع ہوں، انگزیکٹو کونسل کی تشکیل کی جائے جسے ہندوستان کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کی حمایت حاصل ہو گی۔ اسی دن وزیر اعظم ایٹلی نے ایک نشری تقریر میں لارڈ ویول کے بیان کی توثیق کی۔

۲۱ ستمبر کو بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں ایک

قرارداد کے ذریعے اس امر پر اظہارِ افسوس کیا گیا کہ وائسرائے کی تجاویز واضح نہیں ہیں اور کانگریس کی توقعات پر پوری نہیں اُترتیں۔ تاہم کانگریس کمیٹی نے اپنی تمام شاخوں کو ہدایت کی کہ انتخابات کی تیاری کی جائے اور یہ ثابت کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ نشستیں جیتی جائیں کہ اہلِ ہند فوری طور پر آزادی چاہتے ہیں۔ مسلم لیگ کی جانب سے جناح صاحب نے اعلان کیا کہ اگر آزادی کے ساتھ ساتھ قیامِ پاکستان منظور نہ کیا گیا تو مسلمان اس آزادی کو قبول نہ کریں گے۔ ایک اور موقع پر انھوں نے کہا کہ مسلمانوں کا مطالبہ ہے کہ ان سے کسی دستور ساز ادارہ میں شمولیت کی توقع سے پہلے مطالبۂ پاکستان کو تسلیم کیا جائے اور یہ کہ دو جداگانہ دستور ساز ادارے بنائے جائیں ایک پاکستان کے لیے اور دوسرا ہندوستان کے لیے۔

کلکتہ سے سبھاش چندر بوس کے فرار ہونے کے بعد یہ تاثر عام تھا کہ وہ اتحادیوں کے خلاف جنگ میں جاپان کی مدد کر رہے ہیں۔ بوس کی توقع تھی کہ روم برلن ٹوکیو محور کی فتح کے بعد ہندوستان کو مکمل آزادی دے دی جائے گی جبکہ انگریز اس ملک پر اپنے سیاسی تسلط سے کبھی دستبردار ہونے پر آمادہ نہ ہوں گے۔ جنگ کی ابتدا میں جاپان نے ہزاروں ہندوستانی افسروں اور سپاہیوں کو قید کر لیا تھا۔ یہ جنگی قیدی بوس کی کمان میں آزاد ہند فوج (انڈین نیشنل آرمی) میں شامل ہو گئے۔ اس فوج میں ہزاروں مسلمان افسر اور جوان بھی تھے۔ آزاد ہند فوج کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں مشہور ہوئیں اور لاکھوں نوجوان اس کے پرستار بن گئے۔ ان کے نزدیک یہ فوج ہندوستان کی آزادی کے لیے لڑ رہی تھی۔ جاپان کی شکست کے بعد آزاد ہند فوج کے ۲۰ ہزار جوانوں کو واپس ہندوستان بھیج دیا گیا اور اس ملک میں، جس کی آزادی کے لیے انھوں نے جان کی بازی لگا دی تھی، بیشتر لوگوں کو قید و بند کی صعوبتیں اٹھانی پڑیں۔ کچھ افسروں اور جوانوں پر لال قلعہ دہلی میں کھلے بندوں عام مقدمہ چلایا گیا۔

اس مقدمے کے تین بڑے ملزم پنجاب رجمنٹ کے کیپٹن شاہنواز خان، بلوچ رجمنٹ کے کیپٹن پی کے سہگل اور پنجاب رجمنٹ کے لفٹننٹ گربخش سنگھ ڈھلون تھے۔ ان کے خلاف خاص الزامات یہ تھے کہ انھوں نے "ستمبر ۱۹۴۲ء اور ۲۶ راپریل ۱۹۴۵ء کے درمیان سنگاپور، ملایا اور برما میں ——— ہز میجسٹی شہنشاہِ ہند کے خلاف جنگ لڑی" یہ کہ انھوں نے "۶ مارچ ۱۹۴۵ء کو یا اس کے لگ بھگ برما میں پوپا ہل کے قریب یا وہاں ہری سنگھ کو قتل کیا" اس کے ساتھ ان سپاہیوں اور افسروں کی ایک طویل فہرست بھی منسلک تھی جنھیں انھوں نے مبیّنہ طور پر قتل کیا تھا۔ ۷ ر ستمبر ۱۹۴۵ء کو ان الزامات میں ان کے خلاف جنرل کورٹ مارشل ہُوا۔

اس مقدمے میں ثبوت کے طور پر جو دستاویزات پیش کی گئی تھیں ان میں سے چند سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی کہ بوس اور ان کے ساتھیوں نے ہندوستان کو آزاد کرانے کے لیے آزاد ہند فوج بنائی تھی۔ ثبوت ڈبلیو (W) "خصوصی حکم" تھا جو بوس نے ۴ ر اگست ۱۹۴۴ء کو برما سے جاری کیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا۔ ہمارے یونٹوں نے اپنی بہترین تربیت، نظم وضبط اور ہندوستان کی آزادی کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کے غیر متزلزل یقین وعزم کی بدولت دشمن پر اپنی بالادستی ثابت کر دی۔ دشمن کا حوصلہ ہر شکست پر پست سے پست تر ہو گیا" ثبوت ایکس (X) اسسٹنٹ چیف آف اسٹاف لفٹننٹ کرنل حبیب الرحمٰن کے نام برما کے وزیر خارجہ ٹھکن نو کا مبارکباد کا تار تھا۔ انھوں نے ۷ ر جولائی ۱۹۴۴ء کو یہ تار ارسال کیا تھا اور اسے بوس تک پہنچانا مقصود تھا۔ ایک دستاویز سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد ہند فوج نے اپنے جوانوں کو جو تمغے دیے ان کے ناموں میں اسلامی تہذیب کے عکس موجود تھے مثلاً "شہیدِ بھارت" "شیرِ ہند" "سردارِ جنگ" "تمغۂ بہادری" وغیرہ۔ ان ثبوتوں سے اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ آزاد ہند فوج کی سپریم کمانڈ کے ہیڈ کوارٹرز کو "صدر دفتر اعلیٰ کمان آزاد ہند فوج" کہا جاتا

ما۔ ایک اور دستاویز پر "انتہائی خفیہ" کے الفاظ اور ۸ر اگست ۱۹۴۳ء کی تاریخ کے
ساتھ لفٹیننٹ کرنل شاہنواز خاں کے دستخط تھے۔ اس دستاویز میں انھوں نے رنی فورسمنٹ
ڈپو کے کمانڈر کو مطلع کیا تھا کہ ہندوستان اور برما کی سرحد پر جنگ شروع ہوتے ہی
بیشتر ہندوستانی فوجی ہم سے مل جائیں گے۔"

ثبوت "۱۱۱۱" کا عنوان تھا۔ "لافانی (وطن پرستوں) کا دھاوا" یہ دراصل
حب الوطنی کے نشے میں چُور آزاد فوج کے جوانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ایک پیغام
تھا۔ اس کے چند جملے ملاحظہ ہوں "حملے کی رہنمائی کرتے ہوئے اس نے نعرہ لگایا انقلاب
زندہ باد، آزاد ہندوستان زندہ باد۔ تمام لوگوں نے نعروں کا جواب نعروں سے دیا اور
ان فلک شگاف نعروں میں دشمن کی گولہ باری کی گھن گرج گم ہو کے رہ گئی غنیم (انگریزوں)
کی اعلیٰ فوجی طاقت کے مقابلے میں ان جانبازوں کے پاس سب سے بڑی قوت بس یہ
نعرے ہی تھے ——— آزاد ہندوستان کی آنے والی نسلیں ان جانبازوں کے اس
جذبے کی پرستش کریں گی جنھوں نے شکست کا نام بھی نہ سنا تھا ——— اور ہندوستان
کے سپوت ان کے اعلیٰ آدرشوں سے رہنمائی حاصل کریں گے۔"[1]

ان جانبازوں اور حریت پسندوں پر جو الزامات تھے ان کی پاداش میں انھیں سزائے
موت دی جا سکتی تھی۔ تاہم سیاسی جماعتیں شمع آزادی کے ان پروانوں کے ساتھ تھیں۔
مسلم لیگ اور کانگریس نے ملزموں کے دفاع کا انتظام کیا۔ اُدھر حکومت کے خلاف
زبردست مظاہرے ہونے لگے۔ ہر شخص کا یہی مطالبہ تھا کہ انھیں رہا کیا جائے۔ کچھ شہروں
میں پولیس نے مظاہرین کے ہجوم پر گولی چلائی جس سے چند افراد ہلاک اور ہزاروں زخمی ہو گئے

---

[1] مندرجہ بالا اقتباسات "فارمیشن اینڈ گروتھ آف آئی۔ این۔ اے" از درلاب سنگھ، مطبوعہ ۱۹۴۶ء
ہیرو پبلیکیشنز لاہور سے ماخوذ ہیں۔

خاص عدالت نے ملزمین کو مجرم ٹھہرا کر انھیں سخت سزائیں دیں لیکن عوامی مظاہروں سے خوف زدہ ہو کر حکومت کو آخر کار یہ سزائیں منسوخ کرنا پڑیں۔

کانگریس نے قانون شکنی کی جو عوامی تحریک شروع کی تھی وہ قابو سے باہر ہوتی جا رہی تھی اور خود کانگرسی لیڈران حالات سے پریشان تھے۔ حکومت برطانیہ کو ہندوستان کی صورت حال کے متعلق وائسرائے کی جانب سے تشویشناک رپورٹیں ملیں تو ۴ر دسمبر کو وزیرِ ہند نے دارالامرا میں ایک بیان دیا کہ مجوزہ دستور ساز ادارے کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ اہلِ ہند خود اپنی مرضی کے مطابق ہندوستان کے آئندہ دستوری نظام کے بارے میں فیصلہ کر سکیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے کہا کہ یہ بہتر ہوگا کہ پارلیمنٹ کے چند اراکین ہندوستان کا دورہ کریں اور ذاتی طور پر ہندوستانی لیڈروں کو یقین دلائیں کہ برطانوی عوام اور حکومت کی خواہش ہے کہ ہندوستان کو ایک آزاد ملک کی حیثیت سے برطانوی دولتِ مشترکہ کا رکن بنایا جائے۔ سول نافرمانی کی تحریک اور تشدد کی کارروائیوں کے متعلق وزیرِ ہند نے متنبہ کرتے ہوئے کہا کہ حکومت امن و امان برقرار رکھنے کے لیے ہر ممکن تدبیر کرے گی۔ انھوں نے کہا حکومتِ برطانیہ حکومتِ ہند کی پوری حمایت کرے گی تاکہ "ہمارے ملازمین بحفاظت اپنے فرائض انجام دے سکیں اور یہ کہ طاقت کے استعمال یا طاقت کے استعمال کی دھمکی کے ذریعے ہندوستان کا آئندہ دستور نہیں بنوایا جا سکتا۔"

قائدِ اعظم نے اپنے ایک بیان میں یہ امر واضح کر دیا کہ دستور ساز ادارہ اسی وقت تشکیل کیا جانا چاہیے جب مطالبۂ پاکستان تسلیم کر لیا جائے اور یہ کہ ایک دستور ساز ادارہ پاکستان کے لیے اور دوسرا ہندوستان کے لیے بنایا جائے۔ انھوں نے فرمایا:

"لہٰذا میں حکومتِ برطانیہ کے اس اعلان کا پُرزور الفاظ میں خیر مقدم کرتا ہوں کہ اس نے قیامِ پاکستان کو منظور کر لیا ہے ——— اگر یہ حکومت اس برِ صغیر کے عوام کو آزادی دینے کی واقعتاً خواہش مند ہے تو اسے موجودہ حقائق کا سامنا کرنا چاہیے۔"

انتخابات سر پر آ رہے تھے اور قائد اعظم ہندوستان کے طوفانی دورے میں مصروف تھے۔ ہر ہفتے انھیں لاتعداد جلسوں سے خطاب کرنا پڑتا۔ انھوں نے مسلمانوں پر یہ واضح کر دیا کہ ان انتخابات ہی سے دس کروڑ مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہو گا۔ اگر مسلم لیگ کامیاب ہو گئی تو پاکستان قائم ہو جائے گا اور اگر خدانہ کرے ہار گئی تو مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جائیں گے۔ صوبہ سرحد کے حالات تشویشناک تھے کیونکہ وہاں سرخ پوشوں کا زور تھا جو کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ اور پاکستان کے کٹر مخالف تھے۔ ۲۴ نومبر کو بمقام لنڈی کوتل سرحد لیگ کی ایک کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ میں نو سال بعد صوبہ سرحد آیا ہوں اور میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ بہادر پٹھانوں نے محسوس کر لیا ہے کہ مسلمانوں کو کیا راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ انھوں نے فرمایا: "انتخابات ایک انجام کا آغاز ہیں۔ اگر مسلمانوں نے پاکستان کی حمایت کی تو ہم آدھی لڑائی جیت لیں گے۔ اگر ہم اپنی جدوجہد کے پہلے مرحلے میں ناکام ہو گئے تو ہمارا وجود ختم ہو جائے گا۔ یہ انتخابات پہلے قدم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ آپ کی آزمائش ہے۔ اگر ہم چٹان کی طرح اپنے موقف پر قائم رہے تو انشاء اللہ ہم پاکستان قائم کر کے رہیں گے۔"

۲۵ دسمبر ۱۹۴۵ء کو قائد اعظم نے بمبئی میں اپنی سترویں سالگرہ منائی۔ اس موقع پر میمن تاجروں کے ایوانِ تجارت نے انھیں چائے پر مدعو کیا۔ سپاس نامے کے جواب میں انھوں نے جو تقریر کی وہ اس امر کی غماز تھی کہ ستر سال کی عمر ہونے کے باوجود ان میں جوانوں کا سا عزم اور جذبہ موجود ہے۔ مسلمانانِ ہند کو آزادی دلانے کے مشن نے انھیں ضعیف نہ ہونے دیا تھا۔ انھوں نے گرجدار آواز میں کہا: "اگر ہماری جدوجہد آزادی میں ہندو ہمارا ساتھ نہیں دیتے تو مسلمان اور مسلم لیگ تنہا ہی پاکستان اور آزادی حاصل کرنے کی جدوجہد کریں گے۔"

دسمبر کی آخری تاریخوں میں مرکزی اسمبلی کے انتخابات ہوئے اور مسلم لیگ نے پاکستان کی بنیاد پر انتخاب لڑ کر مسلمانوں کی تقریباً تمام نشستیں جیت لیں۔ مسلمانوں کے انتخابی حلقوں

سے مسلم لیگ کو ۸۶،۷ فی صدی ووٹ ملے۔ کل ۱۰۲ نشستوں میں سے مسلم لیگ نے ۳۰ اور ...
نے ۵۶ نشستیں حاصل کیں۔ قائدِ اعظم نے اعلان کیا کہ خدا نے مسلمانوں کو جو کامیابی عطا کی
اس پر اظہارِ شکرگزاری کے طور پر مسلمان ۱۱ جنوری ۱۹۴۶ء کو یومِ فتح منائیں اور مسجدوں میں
شکرانہ ادا کریں۔

۱۱ جنوری کو مسلمان یومِ فتح منا رہے تھے اُدھر پارلیمانی وفد ۵ جنوری کو دہلی پہنچ
گیا تھا۔ وفد کی رہنمائی پروفیسر رابرٹ رچرڈ کر رہے تھے اور اس میں دس ممبر شامل تھے۔ وزیرِ
ہند نے قائدِ اعظم اور کانگریس کے صدر کے نام ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ وفد کے دورے
کا مقصد ہندوستانی لیڈروں سے ذاتی گفتگو کرنا ہے، اور یہ کہ وفد کے ممبر انفرادی حیثیت سے
ہندوستان کا دورہ کر رہے ہیں، انھیں لیبر حکومت کی جانب سے مذاکرات کا کوئی اختیار عطا
نہیں۔ قائدِ اعظم کی وفد سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے حصولِ پاکستان کی جدوجہد کی تاریخ
بیان کی اور وہ اسباب واضح کیے جن کی وجہ سے پاکستان ہر مسلمان کے عقیدہ کا ایک جز
بن گیا تھا۔ انھوں نے واضح الفاظ میں وفد کے اراکین کو اس امر سے مطلع کیا کہ اگر پاکستان
کا اصول اور تمام دیگر پارٹیوں اور مسلم لیگ کو مساوی نمائندگی دینے کا اصول تسلیم نہ کیا گیا تو
مسلم لیگ عبوری حکومت میں شامل نہ ہوگی۔ وفد نے ہندوستان میں تقریباً ایک مہینہ قیام
کیا اور متعدد لیڈروں سے بات چیت کے بعد انگلستان روانہ ہو گیا۔

۲۸ جنوری ۱۹۴۶ء کو نو منتخب مرکزی قانون ساز اسمبلی کا اجلاس منعقد ہوا تو وائسرائے
نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا کہ میں خاص خاص سیاسی پارٹیوں کے صلاح مشورے سے نئی
ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کروں گا جس میں تمام ممتاز لیڈر شامل ہوں گے۔ اس کے بعد دستور ساز
ادارہ قائم کیا جائے گا۔ اسی دن قائدِ اعظم نے ایک بیان جاری کیا۔ آپ نے فرمایا: "مجھے
ایسی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جس کے پیشِ نظر عبوری حکومت کے قیام کے انتظامات کا تذکرہ
ضروری ہو ——— مسلمانانِ ہند نے کسی شک و شبہے کی گنجائش کے بغیر یہ واضح کر دیا

ہے کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل کا واحد حل ہندوستان کو پاکستان اور ہندوستان میں منقسم کرنے میں مضمر ہے ــــــ مسلم لیگ عبوری انتظامات کے طور پر بھی مرکزی حکومت کے قیام پر آمادہ نہ ہوگی ــــــ ہم اس بات کو ہرگز قبول نہ کریں گے کہ پورے برطانوی ہند کے لیے ایک ہی دستور ساز ادارہ قائم کیا جائے۔" آخر میں انھوں نے اپیل کی کہ حکومت برطانیہ اور وائسرائے کو "حقائق" کا سامنا کرنا چاہیے اور کسی تاخیر کے بغیر پاکستان کے اہم سوال پر کوئی واضح اعلان کرنا چاہیے:

اس کے جواب میں "کانگریس کے مرد آہن" سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کہا: "جہاز ساحل تک پہنچ گیا ہے ــــــ ہندوستان کی آزادی کی منزل سامنے آگئی ہے۔"

فروری کی درمیانی تاریخوں میں ہندوستانی بحریہ میں گڑبڑ ہوئی۔ بمبئی میں پٹیالین کے قریب کلابہ کے نیول سکول کے جوانوں نے خوراک اور تنخواہ کے بارے میں نسلی امتیاز برتے جانے کے خلاف احتجاج کے طور پر بھوک ہڑتال کر دی۔ اس ہڑتال میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے۔ حالات جلد ہی قابو سے باہر ہو گئے اور کلکتہ، کراچی اور مدراس میں بحریہ کے یونٹوں میں بھی گڑبڑ شروع ہو گئی۔ باغیوں کو بمبئی میں بیرکوں میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔ بمبئی کے شہری ان کے لیے پھل اور کھانے پینے کی چیزیں لے کر گئے اور کیمپ کی اونچی دیواروں کے اس پار یہ سامان پھینک دیا۔ پانچ دن تک ہنگامے جاری رہے حتیٰ کہ حکام اور ہندوستانی بحریہ کے جوانوں میں مفاہمت ہو گئی مگر عام شہریوں کا غم و غصہ سرد نہیں ہوا اور مشتعل افراد کے ہجوم نے قانون اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ بلوائی بمبئی کی سڑکوں پر گشت کرتے اور لوٹ مار اور آتش زدگی کی وارداتیں کرتے۔ پولیس نے امن و امان برقرار رکھنے کے لیے فائرنگ کی جس سے تقریباً دو سو آدمی ہلاک ہو گئے اور شہر میں رات بھر کا کرفیو لگا دیا گیا۔

قائد اعظم کی رہنمائی میں مسلم لیگ کی مقبولیت عروج پر تھی۔ مسلمان لیگ کے پرچم تلے متحد تھے۔ صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات قریب آ رہے تھے اور صوبائی پارلیمانی بورڈ انتخابات

کے لیے ٹکٹ جاری کرنے کا انتظام کر رہے تھے۔ ان انتخابات میں مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کے اس الزام کو غلط ثابت کرنا تھا کہ لیگ تمام مسلمانوں کی نمائندہ نہیں ہے اور احرار، نیشنلسٹ اور جمعیت العلمائے ہند مسلم اکثریت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ قائدِ اعظم اس سنگین صورتِ حال سے پوری طرح باخبر تھے اور انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ عام انتخابات میں حصہ لیا۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں نے پورے جوش و خروش سے پاکستان کے پیغام پر لبیک کہا ہے اور وہ مسلم لیگ کے امیدواروں کو اس جوش و جذبے کے ساتھ ووٹ دیں گے۔

سندھ اسمبلی میں مسلمانوں کی ۳۵ نشستیں تھیں۔ قائدِ اعظم نے لیگ کے امیدواروں کی مدد کے لیے سات ممبروں کی ایک انتخابی کمیٹی مقرر کی اور مجھے (مصنف) اس کا اعزازی سیکرٹری مقرر کیا۔ یوسف اے ہارون کمیٹی کے چیئرمین تھے اور اس کے ممبروں میں سندھ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر حسن علی عبدالرحمٰن اور ڈاکٹر اے ایچ صدیقی بھی شامل تھے۔ قائدِ اعظم نے راقم الحروف کو مسلم لیگ کی انتخابی مہم کے لیے کثیر رقم دی اور کمیٹی کے ممبروں کو وضاحت سے بتایا کہ حصولِ پاکستان کی جدوجہد میں سندھ ایک اہم صوبہ ہے اور یہ کہ اس صوبے میں مسلم لیگ کو مسلمانوں کی ۳۵ کی ۳۵ نشستیں حاصل کرنی چاہئیں تاکہ یہاں لیگی وزارت بنائی جائے۔ اس کے بعد وہ دوسرے صوبوں میں انتخابی سرگرمیوں کا معائنہ کرنے تشریف لے گئے۔ پولنگ سے تقریباً چار ہفتے پہلے قائدِ اعظم کراچی تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ صحیح صورتِ حال بیان کرو۔ جب انھوں نے یہ سنا کہ شاید ہم پانچ نشستیں نہ جیت سکیں۔ تو وہ پریشان ہو گئے کیونکہ سندھ اسمبلی میں کل ۶۰ نشستیں تھیں۔ انھوں نے دریافت کیا کہ وہ پانچ نشستیں کون سی ہیں اور انھیں حاصل نہ کرنے کے اسباب کیا ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ ہمارے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ رقم کی کمی ہے۔ سندھ کے ہندوؤں کے ہاتھ میں موٹر ٹرانسپورٹ اور پٹرول اسٹیشن ہیں۔ جب تک ہم لیگ کے امیدواروں کے لیے

پٹرول اور گاڑیاں مہیا نہ کریں گے ان کی کامیابی غیر یقینی رہے گی۔ قائداعظم نے دریافت فرمایا کہ تمھیں اور کتنی رقم درکار ہے؟ اور میرے یہ کہنے پر کہ ہمیں مزید ایک لاکھ روپیہ کی ضرورت ہوگی، آپ نے فرمایا کہ میرے پاس جو روپیہ ہے وہ میرا ذاتی نہیں بلکہ مسلمانوں کی امانت ہے۔ میں تو بس یہ چاہتا ہوں کہ ہر روپے پر ہمیں سولہ آنے فائدہ ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں سودے بازی نہیں کر رہا ہوں لیکن مزید پچاس ہزار روپے کی رقم لے لیجیے اور مجھے یہ یقین دلا دیجیے کہ ہم تمام یعنی ۳۵ کی ۳۵ نشستیں جیت لیں گے۔ میں نے قائداعظم کو یقین دلایا کہ ہم ہر ممکن کوشش کریں گے اور انشاءاللہ تمام نشستیں حاصل کر کے رہیں گے۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ ان پانچ نشستوں میں سے ایک نشست جی ایم سید کی ہے تو میری جانب دیکھنے لگے۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی نگاہیں میرے دل میں اترتی جا رہی ہیں۔ انھوں نے فرمایا "یہ ایک انتہائی نازک انتخاب ہے۔ لیگ کو مسلمانوں کی تمام نشستیں جیتنی چاہئیں۔ خاص طور سے سید کی نشست تو ہمیں ہر قیمت حاصل کرنی ہے۔ آخر اس حلقے میں ہمیں کامیابی کیوں نہ ہوگی؟" میں نے وضاحت کی کہ جی ایم سید اپنے ضلع کے انتہائی بااثر شخص ہیں۔ وہ ضلع دادو کے پیر ہیں اور ان کے مریدوں کا بہت بڑا حلقہ ہے۔ ہم نے ان کے مقابلے پر ضلع حیدرآباد کے قاضی محمد اکبر کو کھڑا کیا ہے۔ جی ایم سید کے حامی اس سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہتے پھر رہے ہیں کہ قاضی محمد اکبر باہر کے آدمی ہیں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ میں جی ایم سید کی نشست کو انتہائی اہم سمجھتا ہوں اور قاضی اکبر کو بہرطور یہ نشست حاصل کرنی ہے۔ انھوں نے فرمایا کہ اس حلقے میں لٹریچر کی بارش کر دو۔ ورکروں کی فوج بھیج دو، جلسے کرو اور قاضی اکبر کو ٹرانسپورٹ کے سلسلے میں ہر قسم کی امداد دو۔ قائداعظم نے مجھے حکم دیا کہ میں اپنا ہیڈکوارٹر کراچی سے حیدرآباد منتقل کر دوں تاکہ جی ایم سید کے انتخابی حلقے سے قریب رہ سکوں۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ وہ کل ہند اہمیت کے چند لیڈر اور علیگڑھ سے طالب علم رضاکار بھیجیں گے۔ میں انھیں خداحافظ کہہ کر کمرے سے باہر آ ہی رہا تھا

انھوں نے مجھے دوبارہ طلب کیا اور اپنے قریب کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرکے فرمایا "ایک بات یاد رکھیے۔ اگرچہ یہ انتخابات اہم ہیں تاہم انھیں جیتنے کے لیے نامناسب طریقے اختیار نہ کیے جائیں۔ مثال کے طور پر آپ کو جی ایم سید کے حلقے میں مسلم لیگ کے نمائندے قاضی اکبر کو ہر قیمت کامیاب کرانا ہے لیکن ووٹروں کو کسی قسم کی رشوت نہیں دی جائے گی۔ میں یہ ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ ووٹ خریدنے کے لیے کسی ووٹر کو ایک روپیہ بھی دیا جائے۔ یہ بددیانتی اور بے ایمانی ہے۔ میں اس بے ایمانی کے مقابلے میں ہار جانے کو ترجیح دوں گا۔"

حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کی عظمت کا ایک اہم عنصر تھا۔ ان کا یقین تھا کہ قیام پاکستان جیسے اعلیٰ مقصد میں صرف اخلاقی طریقوں ہی سے کامیابی ہو سکتی ہے۔

قائداعظم کی ہدایت پر کئی مسلم لیڈر حیدرآباد پہنچے اور جی ایم سید کے انتخابی حلقے میں عام جلسے منعقد کیے گئے۔ علیگڑھ کے ایک سو طالب علم، مشکلات کا بہادری سے مقابلہ کرتے ہوئے ضلع کے گوشے گوشے میں پھیل گئے۔ چونکہ یہ ایک پہاڑی مقام تھا اس لیے ان طالب علموں نے اونٹوں پر دور دراز دیہات کا دورہ کیا۔ دس روز انھوں نے صرف چنے اور کھجوریں کھائیں۔ طالب علموں کے ایک لیڈر راے ٹی ایم مصطفیٰ تھے، جو تقسیم کے چند سال بعد پاکستان کے وزیر تعلیم مقرر کیے گئے۔ صوبے میں ہندوؤں کے غلبہ کی وجہ سے منہ مانگے داموں ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا گیا اور سندھ کے مختلف ضلعوں میں چند مقامات پر رازداری کے ساتھ پٹرول کا ذخیرہ کر لیا گیا۔

سندھ اسمبلی میں مسلم خواتین کی ایک نشست تھی۔ مسلم لیگ نے یہ نشست بلامقابلہ حاصل کر لی تھی کیونکہ مسلم لیگ کی نامزد امیدوار مسز جے جی الانا کے مقابلے میں کسی نے کاغذات داخل نہ کیے۔ لیگ نے ان انتخابات میں مسلمانوں کی ۳۵ کی ۳۵ نشستیں حاصل کر لیں۔ ان میں جی ایم سید کی نشست بھی شامل تھی۔ سندھ میں مزدوروں کے لیے بھی ایک نشست مخصوص تھی جس کے لیے کسی بھی فرقے کا امیدوار انتخاب لڑ سکتا تھا۔ ۱۹۲۷ء سے یہ نشست ایک

ممتاز مزدور لیڈر، نارائن داس آنندجی بیچر کے پاس تھی۔ مسلم لیگ نے نارائن داس بیچر کے مقابلے پر قاضی محمد مجتبیٰ کو نامزد کیا۔ مزدوروں کے حلقۂ انتخاب میں بھی مسلم لیگ کا پلّہ بھاری رہا اور قاضی مجتبیٰ نے نارائن داس بیچر کو شکست دے دی۔ اس طرح مسلم لیگ کو سندھ اسمبلی کی ۶۰ میں سے ۲۸ نشستیں حاصل ہو گئیں اور صوبے میں خالص لیگی وزارت قائم ہونے کا امکان ہو گیا۔

پنجاب میں لیگ نے مسلمانوں کی ۸۶ نشستوں میں سے ۷۹ حاصل کی تھیں، کانگریس کو ۵۱، یونینسٹوں کو ۱۰، آزاد گروپ کو ۱۰ اور پنتھک اکالی سکھوں کو ۲۲ نشستیں ملی تھیں۔ چونکہ مسلم لیگ پارٹی سب سے بڑی پارٹی تھی اس لیے ضروری تھا کہ گورنر مسلم لیگ کو وزارت بنانے کی دعوت دیتا لیکن ایسا نہ ہوا۔ کانگریس اور اکالی سکھوں میں مفاہمت ہو گئی اور اس مخلوط گروپ نے مسلم لیگ پارٹی کے سامنے چند شرائط پیش کیں۔ لیگ پارٹی کسی صورت میں یہ شرائط قبول نہ کر سکتی تھی۔ کانگریس اکالی گروپ کی ایک شرط یہ تھی کہ کانگریس اپنے کوٹے میں سے صوبائی کابینہ میں ایک مسلمان وزیر نامزد کرے گی اور یہ کہ پنجاب اسمبلی میں پاکستان کا سوال نہیں اٹھایا جائے گا۔ قائداعظم نے سخت رویہ اختیار کیا اور پنجاب کے لیڈروں کو ہدایت کی کہ یہ شرائط مسترد کر دی جائیں۔ مسلمان یونینسٹ ان مذاکرات سے بے تعلق سے تھے مگر کانگریس اور اکالیوں نے خفیہ طور پر انھیں یقین دلا دیا تھا کہ گورنر کو اس امر کا ثبوت دینے کے بعد کہ لیگ مستحکم وزارت نہ بنا سکے گی، یونینسٹوں کے تعاون و اشتراک سے وزارت بنائی جائے گی۔ یہ سازش کامیاب رہی اور گورنر نے اسمبلی میں دس یونینسٹ ممبروں کے لیڈر خضر حیات خاں کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔

صوبہ سرحد میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۱۷ نشستیں اور کانگریس نے ۱۹ نشستیں حاصل کی تھیں، آزاد مسلمانوں نے دو اور اکالی سکھ پارٹی نے ایک نشست جیتی۔ دیگر عام نشستوں میں سے کانگریس نے گیارہ نشستیں حاصل کی تھیں۔ یوں کانگریس کے پاس کل ۳۰ نشستیں تھیں۔

کانگریس پارٹی کے لیڈر ڈاکٹر خان صاحب کو وزارت بنانے کی دعوت دی گئی۔

بہار میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۴۰ میں سے ۳۴ نشستیں، یوپی میں ۶۵ میں سے ۵۵ نشستیں، بمبئی میں ۳۰ میں سے ۳۰ نشستیں، سی پی میں ۱۴ میں سے ۱۲ نشستیں، اڑیسہ میں ۴ میں سے ۴ نشستیں، آسام میں ۳۴ میں سے ۳۱ نشستیں اور مدراس میں ۲۹ میں سے ۲۹ نشستیں حاصل کیں۔ مجموعی اعتبار سے پورے ہندوستان میں مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۴۹۵ نشستوں میں سے ۴۴۰ نشستیں حاصل کیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے مسلمانوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں تقریباً ۹۰ فی صدی کامیابی ہوئی۔

بنگال اسمبلی کی کل ۲۵۰ نشستیں تھیں اور مسلم لیگ نے مسلمانوں کی ۱۱۹ میں ۱۱۲ نشستیں جیت لی تھیں۔ لہٰذا مسلم لیگ کو ایوان میں قطعی اکثریت حاصل نہ ہوئی تھی۔ گورنر بنگال نے مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر ایچ ایس سہروردی کو وزارت بنانے کی دعوت دی اور انھوں نے مخلوط وزارت بنانے کے لیے کانگرسی لیڈروں سے بات چیت کی۔ کانگریس نے جو شرائط پیش کی تھیں سہروردی انھیں ہرگز قبول نہ کر سکتے تھے۔ سہروردی اور کانگریس کے درمیان مذاکرات ناکام ہو گئے اور انھوں نے اسمبلی میں آزاد ممبروں کی حمایت سے مسلم لیگی وزارت بنالی۔

عام انتخابات سے یہ ثابت ہو گیا کہ مسلمانانِ ہند کی اکثریت مسلم لیگ کی حامی ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ مطالبۂ پاکستان کی حمایت کرتے ہیں۔ مگر صوبائی اسمبلیوں کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبوں میں سے مسلم لیگ صرف دو یعنی بنگال اور سندھ میں وزارت بنا سکی۔ لیکن اس سے جناح صاحب کے اس مطالبے پر کوئی اثر نہ پڑا کہ ہندوستان کے تمام سیاسی ہنگاموں اور پیچیدگیوں سے نمٹنے کا واحد اور پائدار طریقہ یہ ہے کہ پاکستان قائم کیا جائے۔ انھیں اپنے نصب العین پر کامل اعتقاد تھا اور ان کے دل میں ایک مجاہد کا سا عزم و حوصلہ تھا۔

دریں اثنا دہلی میں لارڈ ویول انتخابات کے نتائج کا تجزیہ کرنے اور سیاسی تعطل دُور کرنے کی غرض سے نئی راہِ عمل متعین کرنے میں مصروف تھے۔ انھوں نے وزیر ہند

سے خط وکتابت کی جس میں دستوری اصلاحات کی پوری تفصیلات بتائی گئی تھیں۔ برطانوی کابینہ نے بڑے محتاط انداز میں وائسرائے کی پیش کردہ تجاویز کا مطالعہ کیا اور گزشتہ تجربات کی روشنی میں ان میں ترمیم واصلاح کی۔ کابینہ نے فیصلہ کیا کہ اس تصفیے کو حل کرنے کے لیے کابینہ کا ایک وفد (کیبنٹ مشن) ہندوستانی سیاسی لیڈروں سے بات چیت کرنے ہندوستان بھیجا جائے۔ وائسرائے نے یہ تجویز منظور کرلی اور ۱۹ر فروری کو لارڈ پیتھک لارنس اور وزیراعظم اٹیلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہندوستان کا سیاسی تعطل دور کرنے اور اس ملک کی سیاسی ترقی کے لیے نیا فارمولا تیار کرنے کی غرض سے کابینہ کے تین وزیروں لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے وی الیگزینڈر۔ پر مشتمل یک مشن عنقریب ہندوستان بھیجا جائے گا۔ ۱۵ر مارچ کو دارالعوام میں ان اعلانات پر بحث ہوئی تو وزیراعظم اٹیلی نے کیبنٹ مشن کے دورۂ ہندوستان کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اٹیلی نے اقلیتوں کو یقین دلایا کہ "ہم اقلیتوں کے حقوق سے باخبر ہیں اور ان کو ہر قسم کا ڈر اور خوف اپنے دل سے نکال دینا چاہیے" لیکن انھوں نے اقلیتوں کو متنبہ کیا کہ "ہم کسی اقلیت کو اکثریت پر غالب نہ آنے دیں گے۔"

ظاہر ہے کہ یہ اشارہ مسلمانانِ ہند کی جانب تھا۔ قائداعظم نے ۱۷ر تاریخ کو ایک بیان جاری کیا اور اقلیتوں کے بارے میں اٹیلی کے موقف کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ "برطانوی وزیراعظم دوسروں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہیں۔ میں پھر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانانِ ہند اقلیت نہیں بلکہ ایک قوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور حقِ خود اختیاری ان کا پیدائشی حق ہے۔" قائداعظم نے ایک ہی دستور ساز ادارہ کے خلاف بھی اظہارِ خیال کیا۔ بیان کے آخر میں انھوں نے فرمایا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وزیراعظم اٹیلی کسی مختلف الخیال اجتماع کو خطاب کر رہے تھے لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے، ہماری پوزیشن بدستور واضح ہے۔ وہ یہ کہ ہم ہندوستان کی تقسیم اور قیامِ پاکستان چاہتے ہیں۔ ہندوستان

کے دستوری مسئلے کا پاکستان ہی واحد حل ہے۔ یہ دونوں خود مختار مملکتوں اور برِّ صغیر
کے تمام باشندوں کے لیے مسرت، خوش حالی اور سلامتی کا ضامن ہوگا۔“

کانگریسی لیڈروں نے کیبنٹ مشن کے تقرّر کا خیر مقدم کیا کیونکہ انھیں دارالعوام
میں اٹیلی کی تقریر سے یقین ہو گیا تھا کہ انگریز مسلم لیگ کی مرضی سے یا اس کے بغیر
کانگریس سے تصفیہ کرلیں گے۔

ہندوستان میں کانگریس اور ہندو جشنِ مسرّت منا رہے تھے لیکن قائدِ اعظم جنھیں
مسلمان قوم کی تائید و حمایت کا یقین تھا، اپنی جگہ اٹل تھے۔

انھوں نے فرمایا۔ ”ہم کبھی نہیں جھکیں گے۔“

مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں

جب دو قومیں، جن میں سے ایک مالدار اور طاقت ور اور دوسری مفلس کمزور اور پس ماندہ ہو اور اُس کے دوسری قوم کے برابر ترقی کرنے کا کوئی امکان موجود نہ، ایک مشترک حکومت اور پرچم کے زیرِ سایہ رہتی ہیں تو اُس ملک کے اتحاد کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہتا ہے۔ مستقل تحفظ کے فقدان کی صورت میں کمزور قوم اپنی بقا کے لیے انتھک جدوجہد کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے خواہ اس میں اُسے کیسے ہی صبر آزما مراحل سے کیوں نہ گزرنا پڑے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ ہندوستان کے ہندو باشندے ہندو اکثریتی حکومت قائم کرنے کا عزم کیے بیٹھے ہیں خواہ اس طرح مسلمانوں کا سیاسی وجود ہی کیوں نہ ختم ہو جائے۔ یہ وہ مسلمان تھے جن کی آبادی پورے ملک کی آبادی کا تہائی حصہ تھی۔ ان حالات میں دونوں قوموں میں ایک زبردست سیاسی معرکہ ناگزیر تھا۔ پچھلے سو برس میں ہماری تاریخ کے مختلف ادوار میں، مختلف صورتوں میں، یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ اس عرصے میں ایسے رہنما سامنے آئے، جو شروع میں لاشعوری طور پر، لیکن بعد میں عزم مصمّم کے ساتھ مسلمانوں کو علیحدہ قوم کی حیثیت سے تسلیم کیے جانے کے لیے جدوجہد کرتے رہے تاکہ وہ اپنے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ کر سکیں اور اُسے حاصل کر سکیں۔ ہندوستان کے ایک اشتراکی کارکن سجاد ظہیر نے مسلم سیاسیات کے ارتقا کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

"جداگانہ انتخابی اداروں اور جداگانہ نمائندگی سے لے کر خود مختاری، مسلمانوں کی اکثریت کے صوبوں کے لیے کُلّی اختیارات اور اُس کے بعد حقِ خود اختیاری اور

پاکستان کے مطالبے تک مسلمانوں اور مسلم لیگ کی ترقی کو رجعت پسندی اور فرقہ واریت کی پیداوار نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ ہندوستان کی ترقی پذیر مسلم قومیتوں کی قومی جمہوری اور سامراج دشمن جذبے کے مختلف مراحل کا اظہار ہے[1] "بے چینی اور بے اطمینانی کی وہ آواز جو چند برس پہلے تک مشکل سنائی دیتی تھی وہ اب مطالبۂ پاکستان کی صورت میں ایک بلند آہنگ نعرہ بن گئی اور قائد اعظم محمد علی جناح اس کے ترجمان تھے۔ اُن کی قیادت میں آل انڈیا مسلم لیگ نے آزادی اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد کا آغاز کیا جناح صاحب لیگ کے صرف صدر تھے۔ اُن کی ذات مسلم لیگ نہ تھی تاہم تاریخ نے یہ اعتراف کر دیا کہ یہ انہی کی ذات تھی جس کے سبب مسلم لیگ برصغیر کے مسلمانوں کی نجات کا ذریعہ اور وسیلہ بنی۔ مسلم ہند کی تاریخ میں کوئی فرد واحد اُن جیسی قوت حاصل نہ کر سکا لیکن اس قوت اور اختیار کا انھوں نے کبھی ناجائز استعمال نہ کیا۔ ۱۹۴۰ء اور ۱۹۵۰ء کے درمیانی عرصہ میں جب اُن کی طاقت عروج پر تھی۔ اُن کے مزاج میں معمولی سی تبدیلی بھی رونما نہ ہوئی۔ اگر کوئی شخص دس کروڑ مسلمانوں کی ترجمانی کا دعویٰ کر سکتا تھا تو وہ صرف قائد اعظم تھے اور ہندوستان کے دورے پر آنے والا کیبنٹ مشن اس حقیقت سے بخوبی واقف تھا۔

رائٹر کے خاص نمائندے فریزر وہان نے کیبنٹ مشن کے دورے کے بارے میں قائد اعظم کے خیالات معلوم کرنے کے لیے ۳۱ مارچ ۱۹۴۶ء کو بمبئی میں اُن سے ملاقات کی۔ اس انٹرویو میں قائد اعظم نے فرمایا "ہمیں وفد سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ ہم تفصیلات طے کرنے پر آمادہ ہیں۔ لیکن پاکستان کے سوال پر سمجھوتے کی کوئی گنجائش

---

[1] اے کس فار کانگریس - لیگ یونٹی - سجاد ظہیر صفحہ ۸ - مطبوعہ ۱۹۴۴ء پیپلز پبلشنگ ہاؤس - بمبئی -

نہیں"۔ بی بی سی کے نمائندے ڈونلڈ ایڈورڈز نے ۱۳ اپریل کو دہلی میں قائد اعظم سے ملاقات کی اور
ان سے دریافت کیا کہ دو حصوں میں منقسم پاکستان کے درمیان مواصلات کا رابطہ کیونکر قائم ہو
سکے گا، تو قائد اعظم نے فرمایا "جب آپ برطانیہ سے برطانوی دولت مشترکہ کے دوسرے
حصوں کا سفر کرتے ہیں تو آپ کو غیر ملکی علاقے مثلاً نہر سویز سے گزرنا پڑتا ہے۔ آپس کے سمجھوتے سے
یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ شمال مشرق کے مسلم علاقوں سے شمال مغرب کے مسلم علاقوں تک جانے
کے لیے ہمیں نام نہاد ہندو علاقے (کوریڈور) سے گزرنا پڑتا ہے اور اس میں کوئی دشواری
پیش نہیں آتی۔ آئندہ بھی اس طریقے پر عمل ہو سکتا ہے"۔ ایڈورڈز نے قائد اعظم کو بتایا کہ آزاد
اور خود مختار پاکستان کی اقتصادی طاقت کے بارے میں شبہات ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ اس
کے جواب میں قائد اعظم نے فرمایا "اقتصادی اعتبار سے پاکستان ایک مضبوط مملکت ہو گا۔ خود
کانگریس پارٹی کے ماہرین نے جب چھان بین کی تو انھیں سخت حیرانی ہوئی۔ پاکستان کے بیے
حیرت انگیز اقتصادی مواقع ہیں"۔ قائد اعظم کے اس بیان کی صداقت تقسیم کے بعد کے حالات
سے بخوبی ظاہر ہو گئی۔

دریں اثنا ۲۴ مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن ہندوستان پہنچ گیا تھا۔ اگلے روز لارڈ پیتھک
لارنس نے ایک اخباری کانفرنس بلائی اور اس میں انھوں نے جو بیان دیا اس میں مسلمانوں
کے بارے میں مصالحانہ رویّہ جھلکتا تھا۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ لارڈ پیتھک لارنس نے
وزیر ہند کی حیثیت سے انگلستان میں جب یہ بیان دیا تھا کہ مسلم اقلیت کو ہندوستان کی آئینی
ترقی کے بارے میں حق تنسیخ نہیں دیا جا سکتا تو قائد اعظم نے اس پر احتجاج کیا تھا۔ قائد اعظم
کے اس احتجاج کے سلسلے میں وزیر ہند نے اس اخباری کانفرنس میں کہا کہ مجھے غلط فہمی
ہوئی تھی۔ "مسلم لیگ کو صرف ایک اقلیتی سیاسی پارٹی سمجھنا درست نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے
کہ مسلم لیگی عظیم مسلم قوم کی اکثریت کے نمائندے ہیں" سر اسٹیفورڈ کرپس نے اہل ہندوستان
کو یقین دلایا کہ مشن بالکل صاف دل و دماغ کے ساتھ ہندوستان آیا ہے اور کوئی سکیم لے کر

نہیں آیا۔ ابتدا میں چند روز مشن وائسرائے صوبائی گورنروں اور وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبروں سے تبادلہ خیال کرتا رہا اور بعد میں اُس نے ایوانِ والیانِ ریاست کے نمائندوں صوبائی وزرائے اعلیٰ اور ہندوستان کی ممتاز شخصیات سے گفتگو کی۔ کانگرس کی جانب سے ۲ اپریل کو مولانا آزاد نے مشن سے ملاقات کی اور اس بات کی وضاحت کی کہ کانگرس کسی حیل وحجت کے بغیر متحدہ ہندوستان کی آزادی کا مطالبہ کرتی ہے اور یہ کہ ملک کا آئندہ آئین صرف ایک دستور ساز اسمبلی کو تفویض کیا جاتے۔ انھوں نے مشن پر واضح کیا کہ اُن کے خیال میں مسلم لیگ جس پاکستان کا مطالبہ کر رہی ہے وہ خود مسلمانوں کے لیئے نقصان دہ ہوگا۔ گاندھی جی نے بھی مشن سے ملاقات کی اور مشن کے ممبروں سے کہا کہ میں نجی حیثیت سے آپ حضرات سے ملنے آیا ہوں۔ جہاں تک کانگرس کے موقف کا تعلق ہے اُس کی وضاحت مولانا آزاد کر چکے ہیں۔ گاندھی جی نے پاکستان اور دو قومی نظریہ کی مخالفت کی۔ ہندوستان کو سیاسی اعتبار سے متحد رکھنے کے لیئے انھوں نے تجویز پیش کی کہ جناح صاحب کو نئی حکومت بنانے اور اپنی پسند سے مرکزی کابینہ کے وزیر منتخب کرنے کی دعوت دی جائے بشرطیکہ وہ اس امر پر متفق ہو جائیں کہ ہندوستان کو دو ملکوں یعنی پاکستان اور ہندوستان میں تقسیم نہیں کیا جائیگا۔

اگلے روز قائدِ اعظم نے دہلی میں مشن سے طویل گفتگو کی۔ مشن کے ممبروں نے قائدِ اعظم سے پاکستان کی سکیم کی تفصیلات دریافت کیں اور یہ بتانے کی درخواست کی کہ اُن کے خیال میں تمام متعلقہ فریقوں کو پاکستان کے قیام سے کیا فوائد حاصل ہوں گے؟ قائدِ اعظم نے فرمایا کہ ہندوستان کا اتحاد ایک خیالی چیز ہے، اسے حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ برِصغیر پر کسی حکومت کا متحدہ کنٹرول نہیں رہا۔ ہندوستان کئی ملکوں میں بٹا ہُوا تھا۔ انگریز اپنے سیاسی اور انتظامی مفاد کے پیشِ نظر اسے متحد کر کے اس پر حکومت کر رہے ہیں۔ انھوں نے یورپ کی مثال پیش کی جہاں مشترک مذہب و ثقافت کے باوجود ایسی مختلف مملکتیں موجود ہیں جو رقبے میں مجوزہ پاکستان سے بھی کم ہیں۔ علاوہ ازیں مذہب روایات اور ثقافت کے اعتبار سے ہندو مسلمانوں کے درمیان ایک ایسی خلیج

ل ہے جسے پُر کرنا امر ناممکن ہے۔ ہندوستان کا موجودہ اتحاد ایک مصنوعی شئے ہے، جو
ں پہ زبردستی مسلط کیا گیا ہے۔ انھوں نے مشن سے دریافت کیا کہ آپ کیوں کر یہ توقع کرسکتے
ر دس کروڑ مسلمان ایک ایسی حکومت کے تحت زندگی بسر کرسکیں گے جہاں ۲۵ کروڑ ہندوؤں
ہاتھوں میں تمام اختیارات و اقتدار ہو؟ وزیر ہند کا ان اصولوں سے اتفاق نہیں تھا جن پر
اعظم نے مطالبہ پاکستان کی بنیاد رکھی تھی۔ لیکن انھوں نے کہا کہ مشن ایسا طریقہ معلوم کرے گا
ہندوستان میں اقتدار کس طرح اور کسے منتقل کیا جاسکتا ہے کیونکہ حکومت برطانیہ نے فیصلہ
ہے کہ ہندوستان کی حکومت اہل ہند کو سونپ دی جائے۔ انھوں نے وضاحت کی کہ اختیارات
منتقلی کے سوال پر اگر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان کوئی مفاہمت نہ ہوسکی۔ تو بادلِ ناخواستہ
انوی حکومت ہی کو کوئی فیصلہ کرنا پڑے گا۔

بعد میں مشن نے سکھوں کے نمائندوں، ماسٹر تارا سنگھ، گیانی کرتار سنگھ اور ہرنام سنگھ
بات چیت کی۔ ان لیڈروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ملک متحد رہے یا تقسیم ہوجائے، ہر دو
رتوں میں سکھ قوم کو نقصان پہنچے گا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان میں تیسری مملکت
سکھستان بنائی جائے۔ بلدیو سنگھ نے جو اس وقت پنجاب کی کابینہ میں سکھ وزیر تھے،
کے خیالات سے اختلاف کیا۔ اور تجویز پیش کی کہ سکھوں کو پنجاب میں، جہاں اُن کی کثیر آبادی
خصوصی ویٹج دیا جائے۔ اچھوتوں کے نمائندے ڈاکٹر امبیدکر نے ایک ہی آئین ساز اسمبلی
مخالفت کی۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ اس آئین ساز ادارے پر اعلیٰ نسل کے ہندوؤں کا اقتدار
ا اور اس طرح اچھوتوں کو نقصان پہنچے گا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے فرقے کے لیے جداگانہ
نتخاب کے حق کا بھی مطالبہ کیا۔ دوسرے اچھوت لیڈروں مثلاً جگ جیون رام، رادھا ناتھ
س اور پرتھوی سنگھ آزاد نے مطالبہ پاکستان کی مخالفت کی اور کہا کہ اُن کے فرقے کے حقوق
کا آئینی تحفظ کیا جائے تو بہتر ہوگا، لیکن اُن کے اندر احساس تحفظ پیدا کرنے کے لیے ضروری
کہ انھیں مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں مناسب ویٹج (استحقاق) دیا جائے۔ ہندو مہاسبھا

کے لیڈر شیام پرشاد مکرجی اور بھوتیکر نے مطالبۂ پاکستان کی شدید مخالفت کی اور ہندوستان کو
آزادی دینے اور اُسے متحدہ رکھنے پر اصرار کیا۔ مشن نے دو آزاد خیال لیڈروں ایم آر جیکر اور سر
تیج بہادر سپرو سے بھی گفتگو کی۔ اُن لیڈروں نے بھی تقسیم ہند کی مخالفت کی۔ اُن کا بیان تھا کہ
قضیے کو متحدہ ہندوستان کی صورت ہی میں نمٹایا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی عبوری حکومت قائم کی جانی
چاہیئے جسے تمام سیاسی جماعتوں کا اتحاد حاصل ہو۔ تاہم انھوں نے اس امر سے اتفاق کیا کہ
کوئی قطعی اور آخری فیصلہ کرتے وقت مسلم لیگ کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

کیبنٹ مشن پر ہر جانب سے زبردست دباؤ پڑ رہا تھا اور اندیشہ تھا کہ مسلم لیگ کی مخالف
جماعتوں کے دباؤ میں آ کر مشن کوئی ایسا فیصلہ نہ کر دے جس سے پاکستان کے قیام کو نقصان
پہنچے۔ ان حالات میں قائداعظم نے بڑی باریک بینی سے کام لیا۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ
کے ٹکٹ پر مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے منتخب تمام مسلمان ممبروں کا کنونشن بلایا جائے۔ اسمبلی
کے چار سو سے زائد ممبروں نے قائداعظم کی دعوت قبول کر لی اور ۷ اپریل کو دہلی میں یہ تاریخی
کنونشن شروع ہوا۔ قائداعظم نے اس اجتماع کی صدارت کی جو مسلم لیگ کی قوت اور طاقت کا
زبردست مظاہرہ تھا۔ قائداعظم نے کنونشن کے شرکاء کو سیاسی حالات کے بارے میں اپنے
خیالات سے آگاہ کیا اور تفصیل کے ساتھ بتایا کہ مطالبہ پاکستان کے مخالفین مشن پر دباؤ
ڈالنے کے لیے کیا کیا جتن کر رہے ہیں۔ اس کنونشن میں ایچ ایس سہروردی نے ایک قرارداد پیش کی
جس میں گذشتہ چند صدیوں کے ہندو مسلم اختلافات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی۔ قرارداد میں صاف
صاف الفاظ میں کہا گیا تھا کہ مسلمان ایسا کوئی آئین ہرگز قبول نہیں کریں گے جو متحدہ ہندوستان کی بنیاد
پر تیار کیا گیا ہو۔ قرارداد میں مطالبہ کیا گیا کہ پاکستان اور ہندوستان کے لیے علیحدہ علیحدہ دو آئین ساز
ادارے بنائے جائیں۔ مسلم لیگ کے نقطۂ نظر کے خلاف اگر کوئی آئین بنانے کی کوشش کی گئی تو
ہندوستان کے دس کروڑ مسلمان اپنی قومی بقا کے لیے تمام تر قوت کے ساتھ اس کا مقابلہ کریں گے
اس کے بعد تمام صوبوں کے ممتاز لیڈروں نے مسلمانانِ ہند کے اتحاد اور مطالبۂ پاکستان کی حمایت

ں مدلل تقاریر کیں۔ تمام مقررین نے یقین دلایا کہ اُن کے حلقۂ انتخاب کے مسلمان حصول پاکستان
ے سلسلے میں قائداعظم کی جدوجہد کی مکمل حمایت کریں گے۔ اس اجتماع میں شریک تمام نمائندوں
ے ایک عہد نامہ پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ اُن کا ایمان ہے کہ پاکستان اور صرف پاکستان ہی
سلمانانِ ہند کی راہِ نجات ہے اور پاکستان کے حصول کی جدوجہد میں وہ کسی قربانی سے دریغ نہیں
ریں گے۔

گیارہ تاریخ کو کنونشن کا آخری اجلاس ہوا جس میں قائداعظم نے ایک تاریخی تقریر کی۔ آپ
ے فرمایا "یہ سچ ہے کہ مسلمان اپنے مذہب کے لیے جنگ آزما ہیں لیکن صرف اتنا کہہ دینا کافی نہیں
ہے۔ مسلمان اپنی سماجی اور اقتصادی زندگی کی بقا کے لیے بھی جدوجہد کر رہے ہیں۔ انھوں نے
ا: "بھلا سیاسی اقتدار کے بغیر آپ اپنے عقیدے اور معاشی زندگی کا کس طرح دفاع کر سکتے ہیں؟"
نھوں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ کنونشن میں آپ نے ایک عہد کیا ہے" "ہمیں امید ہے کہ حالات بہتر
ہوں گے۔ لیکن ہم بدترین حالات کا سامنا کرنے کو بھی تیار ہیں" مسلم اقلیت کے صوبوں کے نمائندوں
ے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ میرا بمبئی سے تعلق ہے اور بمبئی بھی مسلم اقلیت کا صوبہ
ہے۔ مسلم اقلیت کے صوبوں کے مسلمانوں کے تحفظات کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ "موثر ترین
تحفظ پاکستان کا قیام ہے۔ موجودہ آئین میں ہمیں تحفظات دیے گئے ہیں مگر کاغذی تحفظات سے
بھی کبھی کوئی فائدہ ہوا ہے۔ انھوں نے کہا "اکھنڈ ہندوستان میں ہندو آئین کو بدل کر رکھ دیں گے،
ور موجودہ تحفظات کا نام و نشان تک مٹا دیا جائے گا۔" تاہم انھوں نے خبردار کیا کہ "اگر ہندوستان
یں ہماری اقلیتوں (مسلمانوں) سے برا سلوک کیا گیا تو پاکستان ایک مجہول تماشائی بنا نہیں بیٹھا رہے
گا۔" انھوں نے اس بات پر خوشنودی کا اظہار کیا کہ مسلمانوں نے مطالبۂ پاکستان کی حمایت میں بڑے
حوصلے اور جرأت سے کام لیا ہے۔ انھوں نے فرمایا "مسلمانوں کو خدا نے سب کچھ دیا ہے۔
دماغ، ذہانت، صلاحیت اور حوصلہ۔ غرضیکہ ہمارے پاس وہ سب کچھ ہے جو ایک زندہ قوم
کے لیے ضروری ہے ——— مگر ہم نے اپنے حقیقی کردار کی کچھ خوبیاں گنوا دی ہیں" الفاظ

کردار کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا "اس کا مطلب ہے غیرت اور دیانت کا اعلیٰ ترین احساس، یقین کامل، بے لوثی اور کھرا پن اور قوم کی مجموعی فلاح کے لیے ہمہ وقت آمادہ رہنا" کنونشن میں شریک خواتین سے خطاب کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا "جب تک کسی قوم کی عورتیں مردوں کے دوش بدوش نہیں چلیں گی چاہے وہ میدان جنگ ہی کیوں نہ ہو، وہ قوم کچھ حاصل نہیں کر سکتی" انھوں نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے کہا کہ برطانوی حکومت پاکستان کے قیام میں دیر تو لگا سکتی ہے لیکن دنیا کی کوئی طاقت ہمیں پاکستان سے محروم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا آئیے ہم امید، حوصلہ اور یقین کو اپنے دلوں میں جاگزیں کر کے اس تاریخی کنونشن سے اٹھیں۔ انشاء اللہ فتح و نصرت ہمارے قدم چومے گی"

عجیب بات ہے کہ اس کنونشن نے جو قرارداد منظور کی اور اس میں جو تقریریں کی گئیں اُن پر کانگریس اور ہندو بہت چراغپا ہوئے۔ مسلم دشمن اخباروں نے جناح صاحب اور مسلم لیگ کے خلاف خوب کیچڑ اچھالی۔ مگر وہ اس سے بددل نہ ہوئے۔ وہ جواں ہمت اور پُرامید تھے۔ انھیں اپنے نصب العین پر یقین کامل تھا۔

پانچ روز بعد مشن نے جناح صاحب کو پھر گفت و شنید کے لیے مدعو کیا۔ اُن سے کہا گیا کہ کیبنٹ مشن اُن کے خیالات کی قدر کرتا ہے لیکن جب تک کانگریس پاکستان کی مخالفت ترک نہیں کرتی مشن کچھ نہیں کر سکتا اور اس کا امکان کم ہے کہ کانگریس مسلم لیگ کے مطالبے کو تسلیم کرے۔ وزیر ہند نے مفاہمت کی غرض سے ایک متبادل تجویز پیش کی کہ آزاد پاکستان کے بجائے ہندوستان کی ایک یونین بنا دی جائے جس میں ہندو و مسلمان دونوں کو مساوی اختیارات حاصل ہوں۔ قائداعظم نے اس تجویز کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ انھوں نے مشن کو خبردار کیا کہ اس نے اگر ذرا بھی کمزوری ظاہر کی تو کانگریس پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ اپنے مطالبات پیش کرے گی۔ کیبنٹ مشن سے قائداعظم کی گفت و شنید پر تبصرہ کرتے ہوئے وی پی مینن رقم طراز ہیں: "جناح مطالبہ پاکستان سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھے"[1] کیبنٹ مشن نے اعلان کیا کہ وہ

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۲۵۲

کانگرس سے مزید گفت وشنید کرے گا اور کوئی ایسا طریقہ تلاش کرے گا جس سے مسلم لیگ اور
کانگرس دونوں متفق ہوجائیں۔

۱۱ تاریخ کو مشن نے کانگرس کے نمائندے مولانا آزاد سے پھر گفتگو کی اور اُس نے
جناح صاحب کے ساتھ جو بات چیت کی تھی اُس سے آزاد کو مطلع کیا اور امید ظاہر کی کہ کانگرس
پاکستان کے اصول کو تسلیم کرلے گی "تاکہ مشن اپنی کاوش میں کامیاب ہوسکے۔ لیکن کانگرس کے
ترجمان مولانا آزاد نے ہندوستان کو دو علاقوں میں تقسیم کرنے کی شدید مخالفت کی انھوں
نے تجویز پیش کی کہ مرکز کے ہاتھ میں دو قسم کے امور ہوں۔ ایک لازمی اور دوسرے اختیاری۔
لازمی امور میں دفاع اور امور خارجہ شامل ہوں گے، اور باقی معاملات اختیاری ہوں گے۔
مطلب یہ تھا کہ مرکز کے ساتھ ہر ایک صوبے کا اشتراک اُس صوبے کی اپنی شرائط پر منحصر ہوگا۔
اور یہ ضروری نہیں کہ تمام صوبے ایک ہی قسم کے اختیارات مرکز کو سونپ دیں۔ بہر حال مسلم
اکثریت کے صوبے اِس سلسلے میں مشترک پالیسی اختیار کرسکتے تھے اور یوں پاکستان
اور ہندوستان کے لیے دو مرکز وجود میں آسکتے تھے، جن پر ایک اعلیٰ اختیارات
کے مرکز کی بالادستی قائم ہوتی۔ آخر میں آزاد نے یہ کہہ کر بات ختم کردی کہ میں کانگریس کی
مجلس عاملہ سے صلاح مشورہ کروں گا اور گفتگو ملتوی ہوگئی۔

کیبنٹ مشن کے ایک ممبر سر اسٹیفورڈ کرپس گاندھی جی اور جواہر لال نہرو کے ذاتی
دوست تھے۔ کرپس نے اُن سے ملاقات کی اور انھیں کوئی مصالحتی فارمولا قبول کرلینے
پر آمادہ کرنا چاہا مگر دونوں کانگرسی لیڈر ہٹ دھرمی سے کام لیتے رہے۔ وہ کسی صورت
میں بھی پاکستان یا کسی ایسی حکومت کی تشکیل کی مخالفت ترک کرنے پر تیار نہ تھے جس کے
سبب پاکستان وجود میں آسکے۔ مشن کے ممبر مختلف لیڈروں سے طویل گفت وشنید کے بعد
آرام کی غرض سے کشمیر چلے گئے اور وہاں پر سکون ماحول میں انھوں نے ایک منصوبہ تیار کیا
جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ کانگرس اور مسلم لیگ اُسے قبول کرلیں گے۔ اس منصوبے

یں مرکز میں ایک عبوری حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی گئی تھی، یہ عبوری حکومت چند اراکین اسمبلی پر مشتمل ایک طویل کل ہند کمیشن کی تشکیل کرتی۔ کمیشن اقلیتوں کے تحفظ کے لیے آئینی ضمانتوں کی فہرست تیار کرتا اور یہ معلوم کرتا کہ آیا ہندوستان میں "انگریزوں کے جانے کے بعد" ایک مملکت بنائی جائے، یا دو مملکتیں۔ کمیشن کو تینتیس ۳۳ دن کے اندر اندر کسی نتیجے پر پہنچنا تھا اور فیصلے کے لیے کہ ووٹوں کی تعداد مقرر کر دی گئی تھی، منصوبے میں کہا گیا تھا کہ اگر کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو سکے تو ایک مملکت یا دو مملکتوں کا سوال استصواب کے ذریعے طے کیا جائے گا۔ پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد کی اسمبلیوں کے مسلمان ممبر یہ طے کریں گے کہ آیا اُن کے صوبے متحدہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں؟ اور اگر وہ [illegible] نمائندوں نے شامل نہ رہنے کا فیصلہ کیا تو اُس صوبے کو انڈین یونین میں شامل نہیں کیا جائیگا" کیبنٹ مشن نے کشمیر سے واپسی پر قائداعظم اور کانگرس کے سامنے یہ منصوبہ پیش کیا جسے انھوں نے مسترد کر دیا۔

کیبنٹ مشن نے لیگ اور کانگرس میں سمجھوتہ کرانے کی ایک آخری کوشش کی۔ اُس نے ۲۷ اپریل کو ہر دو تنظیموں کو ایک مراسلہ بھیجا جس میں کہا گیا تھا کہ ۵ سے ۱۲ مئی تک شملہ میں ایک کانفرنس ہوگی جس میں شمولیت کے لیے وہ اپنے چار چار نمائندے بھیجیں۔ اس مراسلے میں مشن نے اس نئے منصوبے کا خاکہ بھی دیا تھا جو کانفرنس میں پیش کیا جانا تھا۔ قائداعظم نے مراسلے کے جواب میں فرمایا کہ مشن نے جو تجاویز پیش کی ہیں میں اُن کے بارے میں اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ اور یہ کہ کانفرنس ہی میں ان تجاویز کی تفصیلات معلوم کروں گا۔ مسلم لیگ نے کانفرنس میں شرکت کے لیے قائداعظم، لیاقت علی خاں، نواب محمد اسمٰعیل خاں اور سردار عبدالرب نشتر کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ کانگرس نے بھی اپنی رائے محفوظ رکھی اور آزاد، نہرو، ولبھ بھائی پٹیل اور عبدالغفار خاں کو اپنا نمائندہ نامزد کیا۔

۵ مئی کو شملہ میں کانفرنس شروع ہوئی تو اس سے کیبنٹ مشن کے تین مرحلوں کے ایک

منصوبہ پر غور کرنے کی درخواست کی گئی۔ مسلم لیگ اور کانگرس کو پہلے ہی یہ منصوبہ بھیج دیا گیا تھا۔ منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کو خوش کر کے اُسے پاکستان کے مطالبے سے کچھ ہٹنے پر آمادہ کیا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے اصول کو تسلیم نہ کر کے کانگرس کو دم دلاسہ دیا جائے۔ مختصراً اسکیم یہ تھی کہ پہلے مرحلے میں برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کی ایک یونین بنائی جائے گی جس کے پاس امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔ آخری مرحلہ صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔ صوبوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جائے گا، ایک حصہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے صوبوں اور دوسرا ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے صوبوں پر مشتمل ہوگا۔ صوبائی حکومتوں کو امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے سوا، دوسرے تمام معاملوں سے نمٹنے کا اختیار ہوگا اور صوبائی قانون ساز اسمبلیاں دوسرے صوبوں کے ساتھ مل کر گروپ بنانے اور کسی گروپ میں شامل ہونے یا اس سے علیحدہ ہونے کے باب میں آزادی سے فیصلہ کر سکیں گی۔

۹ رتاریخ کو کانگرس کے صدر نے مشن کے نام ایک مراسلے میں اس منصوبے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کانگرس اسے دیکھ کر حیران رہ گئی ہے، اور اس کا ابہام اس کے لیے پریشان کن ہے۔ مراسلے میں کہا گیا تھا کہ کسی بھی ملک میں ایسا بند و بست موجود نہیں ہے۔ کانگرس کے صدر نے زور دے کر کہا تھا کہ "کانفرنس کو ہندوستان کی تقسیم کے بارے میں کسی تجویز پر غور کرنے کا اختیار نہیں ہے۔" اسی روز مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں طے کیا گیا کہ "اس منصوبے میں چونکہ پاکستان کا اصول اور بنیاد موجود ہے۔ بنا بریں مسلم لیگ مشن کے تجویز کردہ آئین ساز ادارے سے تعاون کرنے کو تیار ہے۔" قرارداد میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ اس طرح بالآخر مکمل طور پر خود مختار پاکستان قائم ہو جائے گا۔"

یہ دو متضاد ردِ عمل کیبنٹ مشن کے لیے خاصے پریشان کن تھے۔ وزیرِ ہند نے کیبنٹ مشن کی جانب سے قائدِ اعظم اور کانگرس کے صدر کو ایک مکتوب لکھا جس میں کانگرس اور

اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت کے لیے مندرجہ ذیل نکات تجویز کیے گئے تھے۔

۱: کل ہند یونین اور قانون ساز اسمبلی جس کے پاس امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔

۲: دیگر تمام معاملات صوبوں کو تفویض کیے جائیں گے۔

۳: صوبے اپنے گروپ بنا سکتے ہیں اور وہ یہ طے کر سکیں گے کہ مشترک طور پر وہ کونسے صوبائی معاملات اپنے پاس رکھ سکتے ہیں۔

۴: یہ گروپ اپنی انتظامیہ اور قانون ساز اداروں کی خود تشکیل کریں گے۔

۵: ہند یونین کی قانون ساز اسمبلی میں مسلم اور ہندو اکثریت کے صوبوں کے نمائندوں کی تعداد مساوی ہوگی

۶: یونین گورنمنٹ بھی قانون ساز اسمبلی کے تناسب سے ہی تشکیل کی جائیگی۔

۷: یونین کی قانون ساز اسمبلی میں دس دس سال کے وقفے کے بعد کثرت رائے سے آئین پر دوبارہ غور کیا جا سکے گا۔

۸: ایک آئین ساز مشینری قائم کی جائے گی اور اس مقصد کے لیے واضح طریقہ کار وضع کیا جائیگا۔

"مفاہمت کے مجوزہ نکات" موصول ہونے پر قائداعظم نے وزیر ہند کو ایک مکتوب تحریر کیا جس میں اس امر پر احتجاج کیا گیا تھا کہ مشن اپنے اصل موقف سے ہٹ گیا ہے۔ وزیر ہند نے اس کا مبہم سا جواب دیا اور قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ ۹ تاریخ کو کانفرنس میں شریک ہوں۔ کانگرس کے صدر نے بھی وزیر ہند کے نام ایک مکتوب میں ان تجاویز پر ناراضی کا اظہار کیا اور تجویز پیش کی کہ کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین قانون ساز اسمبلی کا تنازعہ ایک با اختیار اور خود مختار ٹریبونل کے سپرد کیا جائے۔

۹ تاریخ کو کانفرنس کا اجلاس ہوا تو جواہر لال نہرو نے تجویز پیش کی کہ اختلافی

مسئلے پر غور و خوض کے لیے کانگرس اور مسلم لیگ ایک ایک نمائندہ نامزد کریں اور دونوں جماعتیں باہمی رضامندی سے ایک حکم منتخب کریں تاکہ اس اختلاف کو قطعی طور پر طے کیا جا سکے۔ قائداعظم نے فرمایا کہ میں اس بارے میں مسٹر نہرو سے گفتگو کروں گا۔ کانفرنس ۱۱ تاریخ تک ملتوی ہوگئی لیکن جناح نہرو ملاقات کامیاب نہ ہو سکی۔ ۱۱ تاریخ کو کانفرنس کا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے تحریری طور پر مشن کو مسلم لیگ کے مطالبات پیش کیے جو کم سے کم اور ناقابل تخفیف تھے۔ ان مطالبات کے ساتھ قائداعظم نے جو مکتوب تحریر کیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ ہم یہ مطالبات ایک پیش کش کی صورت میں ارسال کر رہے ہیں۔ مطالبات یہ تھے:۔

۱: بنگال، پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبے، سندھ، آسام اور بلوچستان کو ملا کر ایک گروپ بنایا جائے۔ ان صوبوں کو امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے سوا دیگر تمام محکمے دیے جائیں۔ مذکورہ بالا تینوں محکموں کی نگرانی دو آئین ساز اداروں کے سپرد کی جائے۔ ان میں سے ایک ادارہ مذکورہ بالا صوبوں کے نمائندوں پر اور دوسرا دیگر صوبوں کے نمائندوں پر مشتمل ہو

۲: مذکورہ بالا صوبوں کے گروپ کا آئین ساز ادارہ ان صوبوں کے لیے آئین کی تشکیل کرے گا۔ بقیہ اعلیٰ اختیارات بھی صوبوں کے پاس رہیں گے۔

۳: ان چھ صوبوں کے نمائندوں کی تعداد ان کی آبادی کے تناسب سے ہوگی۔

۴: ہر صوبے کو پاکستان کی وفاقی حکومت کے آئین کی تشکیل کے بعد علیحدگی کا اختیار ہوگا۔ بشرطیکہ ریفرنڈم کے ذریعے یہ فیصلہ کیا جائے۔

۵: یونین کے لیے قانون ساز اسمبلی ہوگی یا نہیں، اس کا فیصلہ آئین ساز ادارہ کرے گا۔

۶: یونین کی انتظامیہ میں اور اگر قانون ساز اسمبلی بنائی جائے تو اس میں مساوی نمائندگی کا اصول پیش نظر رکھا جائیگا۔

۷: جب تک مسلم اور ہندو گروپوں کے نمائندوں کی اکثریت طے نہ کرے، بڑے بڑے

فرقہ وارانہ مسائل سے متعلق فیصلے موثر اور نافذ العمل نہیں ہوں گے۔

۸ : یونین تین چوتھائی اکثریت کے بغیر کسی اختلافی مسئلے پر غور نہیں کرے گی۔

۹ : صوبوں اور گروپوں کے آئین میں بنیادی حقوق اور مذہب وثقافت کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔

۱۰ : کسی صوبے کو دس سال بعد یونین سے علیحدگی اختیار کرنے کا حق ہوگا۔ بشرطیکہ اس صوبے کی قانون ساز اسمبلی کثرت رائے سے یہ فیصلہ کرے۔

مسلم لیگ کے ان مطالبات کے جواب میں کانگرس نے قطعی مختلف مطالبات پیش کیے۔ کانگرس کے صدر نے اس سلسلے میں مشن کو ایک یادداشت پیش کی جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ایک ہی آئین ساز ادارہ قائم کیا جائے۔ یادداشت میں سرحدی صوبے کو پاکستان گروپ میں شامل کرنے کی تجویز کی بھی شدید مخالفت کی گئی تھی۔ کانگرس نے کہا تھا "جیسا کہ سرحدی صوبے کے، انتخابات سے ظاہر ہوتا ہے، صوبہ اس تجویز کی حمایت نہیں کرتا۔"

کانگرس نے مسلم لیگ کے مطالبات میں سے بہت کم باتیں تسلیم کی تھیں۔ ورنہ اس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ مطالبہ پاکستان کو پنپنے نہ دیا جائے۔ ظاہر تھا کہ قائداعظم کانگرس کے فارمولے کو کسی طرح قبول نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ ۱۲ تاریخ کو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو تھوڑی ہی دیر میں ختم ہو گیا۔ مسلم لیگ مطالبہ پاکستان میں کوئی کمی کرنے کو تیار نہ تھی اور قائداعظم کے الفاظ میں مسلمان اُس "مکڑی کے جالے" میں پھنسنے کو آمادہ نہ تھے، جو کانگرس انھیں پھانسنے کے لیے تن رہی تھی۔ الغرض کانفرنس کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی۔ قائداعظم کے نزدیک پاکستان ایک بنیادی ضرورت تھا اور ان کا عقیدہ تھا کہ "اصولوں پر کوئی سودے بازی نہیں ہو سکتی۔"

۱۵ تاریخ کو کیبنٹ مشن نے ایک اخباری بیان جاری کیا۔ درحقیقت مشن کا یہ بیان اُس کی ناکامی کا اعتراف تھا۔ اگرچہ مشن نے اس بیان کے ایک حصے میں پاکستان کی ان

الفاظ میں حمایت کی تھی کہ "ہمیں مسلمانوں کے اس جائز اندیشے اور تشویش کا بخوبی احساس ہے
ر وہ آخر کار ہندو اکثریت کے اقتدار کے سامنے بے بس ہو کر رہ جائیں گے" تاہم دوسرے
حصے میں مشن نے مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو رد کر دیا تھا۔ بیان کے آخر میں کہا گیا تھا
مشن کو اُمید ہے کہ آزاد ہندوستان برطانوی عوام کا دوست رہے گا۔ لیکن آپ خواہ کچھ
یصلہ کریں، ہم دنیا کی عظیم اقوام کے درمیان آپ کی روز افزوں خوشحالی اور ایک ایسے مستقبل
ے متمنی ہیں جو آپ کے ماضی سے زیادہ شاندار اور تابناک ہو۔"

قائد اعظم نے عوام کو کانفرنس میں مسلم لیگ کے کردار سے مطلع کیا اور وہ اسباب بتائے
ن کی بنا پر مسلم لیگ نے پاکستان کے بارے میں ٹھوس موقف اختیار کیا تھا۔ ۲۴ تاریخ کو
نھوں نے شملہ میں ایک بیان دیا جس میں کانفرنس کی ناکامی کے اعلان کے وقت تک جو
ا کرات ہوئے تھے اُن کے پس منظر کی وضاحت کی۔ انھوں نے مشن کے فارمولے کا خاکہ
وام کے سامنے رکھا اور اُس پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ آپ نے لیگ کی پیش کش کے جواز کی
ضاحت کرتے ہوئے فرمایا "ہماری پیش کش کا اصل مغز یہ تھا کہ مسلمانوں کے چھ صوبوں
و ملا کر ایک پاکستان گروپ بنایا جائے۔" کیبنٹ مشن کے آخری بیان کا حوالہ دیتے ہوئے
پ نے فرمایا "یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ مشن نے مکمل خود مختار مملکت پاکستان کے
یام سے متعلق مسلمانوں کے مطالبے کو رد کر دیا ہے۔ ہم اب بھی اس پر یقین رکھتے ہیں
مکمل خود مختار مملکت پاکستان کا قیام ہی ہندوستان کے آئینی مسئلے کا واحد حل ہے۔" مشن
ے بیان کے کچھ نکات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا کہ یہ باتیں محض کانگرس
و خوش کرنے اور اُسے دم دلاسہ دینے کے مقصد سے کہی گئی ہیں۔" اس کے بعد قائد اعظم
نے مشن کے بیان کے اصل حصے پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے فرمایا کہ مسلمانوں کے نقطۂ نظر
سے یہ بات غیر تسلی بخش ہے اور بنا بریں ہمارے لیے ناقابل قبول ہے۔ انھوں نے فرمایا
ر مشن نے شملہ سے جو آخری بیان جاری کیا ہے اور اس میں جو تجاویز پیش کی ہیں اُن کے

بارے میں فیصلے کے لیے میں مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کا اجلاس طلب کر رہا ہوں۔

۶ جون کو مسلم لیگ کونسل کا اجلاس منعقد ہوا، جس میں قائداعظم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا "آپ کو اس وقت اہم مسائل درپیش ہیں اور آپ کو اُن کے بارے میں فیصلہ کرنا ہے۔" انھوں نے اجلاس کے شرکاء کو شملہ کانفرنس کی روداد بتائی اور کہا کہ تمام مواد آپ کے سامنے ہے اور آپ جو کچھ فیصلہ کریں گے وہ انتہائی دُور رس نتائج اور اہمیت کا حامل ہوگا۔ انھوں نے فرمایا کہ مجلسِ عاملہ نے اس باب میں کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے کیونکہ مجلس عاملہ کے اراکین آپ کے فیصلے کو مقدم سمجھتے ہیں۔ ہر رکن کو فکر و عمل کی آزادی ہے، اور آپ ہمارے کسی فیصلے کے پابند نہیں ہیں۔" انھوں نے باآواز بلند کہا "مجھے یہ کہنے دیجیے کہ جب تک مسلمان مکمل اور خود مختار پاکستان حاصل نہیں کر لیں گے، ہم چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ چند سال پہلے مسلمان اس پوزیشن میں تھے کہ انھیں سیاسی اعتبار سے ختم کیا جا سکتا تھا۔" اگر ہندو چاہتے ہیں کہ ہندوستان آزاد ہو جائے تو اس کا بہترین اور آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ پاکستان کو قبول کر لیں۔" آپ ہماری بات مان لیں ورنہ ہم آپ کی مرضی کے خلاف اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔" کانگرس کا ذکر کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "ہندو مغرور، جابر اور ظالم ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ معقولیت پسندی سے کام لیں گے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر ہمیں انھیں معقولیت پسند بنانے کے لیے کچھ کرنا پڑے گا۔"

مسلم لیگ کے سربرآوردہ رہنماؤں کی تقاریر کے بعد کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے کیبنٹ مشن کے منصوبے کی اُن دفعات پر احتجاج کیا جن سے مکمل آزاد اور خود مختار پاکستان کے قیام کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا ہو گئے تھے۔ تاہم اِس منصوبے میں مشن نے چونکہ بالواسطہ طور پر پاکستان کے اصول کو تسلیم کر لیا تھا لہٰذا مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ لیگ آئین ساز جماعت میں شامل ہو گی لیکن اُسے یہ حق حاصل ہو گا کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو وہ ادارے سے علیحدگی اختیار کر لے۔ قرارداد کے آخر میں قائداعظم کو مرکز میں مجوزہ

بوری حکومت کے قیام اور دیگر تمام امور پر لیگ کے واحد اور بااختیار نمائندے کی
یثیت سے وائسرائے کے ساتھ گفت وشنید کا اختیار دیا گیا تھا۔ دو روز بعد قائد اعظم
ے وائسرائے کو مسلم لیگ کے فیصلے سے مطلع کیا اور انھیں یاد دلایا کہ وہ اس بات کی یقین
ہانی کرا چکے ہیں کہ مرکزی حکومت میں پانچ مسلم لیگی، پانچ کانگرسی، ایک سکھ اور ایک ہندوستانی
سیحی یا یورپی نامزد اراکین شامل ہوں گے اور یہ کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اہم
لمحوں کی مساوی تقسیم کی جائے گی۔

مولانا آزاد نے اس دور کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "کانگرس اور
لم لیگ کی جانب سے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری، ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ
ایک شاندار واقعہ تھا۔"[1]

کانگرس کے صدر مولانا آزاد علیل تھے۔ اس لیے وائسرائے نے ۱۲ تاریخ کو پنڈت
ہر لال نہرو کو گفت وشنید کے لیے وائسرائے ہاؤس بلایا۔ نہرو نے عبوری حکومت
سلسلے میں وائسرائے کا فارمولا تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور آزاد کو اس گفت و
ید سے مطلع کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وائسرائے کی تجاویز پر کانگرس کا رویہ سخت
ئیا ہے۔ کیونکہ کانگرس کے خیال میں یہ تجاویز مسلم لیگ کے حق میں جاتی تھیں۔ مولانا آزاد
ر اپنی کتاب "انڈیا ونز فریڈم" (آزادیٔ ہند) میں جو ان کے انتقال کے بعد شائع ہوئی،
ا ہے کہ "وہ (لارڈ ویول) حقیقتاً یہ سمجھتے تھے کہ کیبنٹ مشن کے منصوبے سے بہتر
ہندوستان کے آئینی مسئلے کا کوئی حل نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ کیبنٹ مشن پلان کی بنیاد بڑی حد
۔ اس سکیم پر تھی جو میں نے ۱۵ اپریل ۱۹۴۶ء کے بیان میں پیش کی تھی۔ بنا بریں

---

[1] انڈیا ونز فریڈم۔ مولانا ابوالکلام آزاد، صفحہ ۱۵۱۔ مطبوعہ ۱۹۵۹ء۔
اورینٹ لانگ مینز، بمبئی۔

ہیں نے اُن سے اتفاق رائے کیا۔"[1] لیکن جب نہرو نے آزاد کو وائسرائے کی تجاویز سے مطلع کیا تو انھوں نے وائسرائے کو تحریر کیا کہ کانگرس کی مجلسِ عاملہ اِن تجاویز کو قبول نہیں کر سکتی

چونکہ منفقہ حل کے بنیادی امور پر مسلم لیگ اور کانگرس کے متضاد خیالات تھے۔ اِس لیے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ کہیں سیاسی بحران پیدا نہ ہو جائے۔ اور اِسی خیال کے پیشِ نظر ۱۲ تاریخ کو وائسرائے نے قائدِ اعظم اور آزاد کو ایک مکتوب لکھا جس میں چودہ ممبروں پر مشتمل ایک ایگزیکٹو کونسل قائم کرنے کی تجویز تھی۔ اس کونسل میں اچھوت کانگرسی نمائندے سمیت چھ کانگرسی اراکین، پانچ مسلم لیگی، ایک سکھ، ایک ہندوستانی مسیحی اور ایک پارسی نمائندہ لیا جاتا تھا۔ مسلم لیگ کے نامزد نمائندے ایم اے جناح، لیاقت علی خاں، نواب محمد اسمٰعیل، خواجہ سر ناظم الدین اور سردار عبدالرب نشتر تھے۔ وائسرائے نے مکتوب میں امید ظاہر کی تھی کہ لیگ اور کانگرس اس فارمولے کو تسلیم کر لیں گی۔ انھوں نے تحریر کیا تھا "ہم آپ سے اور آپ کی مجلسِ عاملہ سے بجا طور پر آپ سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ ملک کے وسیع تر مسائل اور فوری ضروریات کے پیشِ نظر آپ رواداری کے جذبے کے ساتھ ان تجاویز پر غور کریں گے۔" اس مکتوب میں اس جانب اشارہ کیا گیا تھا کہ دونوں میں سے کسی پارٹی نے اگر اس فارمولے کو تسلیم نہ کیا تو وائسرائے عبوری حکومت کی خود تشکیل کریں گے۔

مسلمان ممبروں کے ناموں کا اعلان ہوا تو صوبائی رقابتیں سر اٹھانے لگیں۔ سرحد کے وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر خاں صاحب اور اُن کے بھائی خان عبدالغفار خاں نے اپنے کانگرسی رفقا پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا کہ عبوری حکومت میں سردار عبدالرب نشتر کی شمولیت کی مخالفت کی جائے۔ سردار نشتر کا تعلق سرحدی صوبے سے تھا اور وہ قائدِ اعظم کے با اعتماد رفیقوں میں سے تھے۔ اور قائدِ اعظم ایک ایسے دوست کو نظر انداز نہیں کر سکتے تھے جو مسلم لیگ کا وفادار تھا

---

[1]: انڈیا ونز فریڈم۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ صفحہ ۱۲۴۔ اورینٹ لونگ مینز۔ بمبئی۔

قائدِ اعظم نے ۱۹ تاریخ کو وائسرائے کے مکتوب کے جواب میں اُن سے دریافت کیا کہ کیا یہ
تجاویز قطعی اور آخری ہیں یا ان میں کسی رد و بدل کی گنجائش ہے۔ اس کے علاوہ انہوں
نے چند دیگر امور کی بھی وضاحت چاہی۔ وائسرائے نے بلا تاخیر وضاحت طلب امور کی
تفصیلات بتا دیں۔ حالات بتا رہے تھے کہ قائدِ اعظم یہ تجویز قبول کر لیں گے۔ ۲۵ جون کو
دہلی میں کانگرس کی مجلسِ عاملہ کا اجلاس ہوا جس نے قرار داد کے ذریعے یہ تجاویز مسترد
کر دیں۔ قرار داد میں کہا گیا تھا کہ کانگرس وائسرائے کی تجویز مسترد کرتی ہے "کیوں کہ
کانگرسی کانگرس کی قومی حیثیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ وہ نہ تو غیر حقیقی اور نامنصفانہ
مساوات کو قبول کر سکتے ہیں اور نہ کسی فرقہ وار گروپ کے حقِ تنسیخ کو قبول کرنے پر
آمادہ ہیں۔" آزاد نے وائسرائے کو اس قرار داد کی نقل بھیجی اور اس کے ساتھ جو مکتوب
تحریر کیا اس میں کانگرس کے کوٹے سے کسی کانگرسی مسلمان کو نہ لینے کے خلاف احتجاج
کیا۔ کانگرس کا موقف معلوم ہونے کے بعد مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ نے وائسرائے
کے ۱۶ جون کے بیان کی روشنی میں عبوری حکومت میں شمولیت کے حق میں فیصلہ کیا۔
قائدِ اعظم کا خیال تھا کہ اگر کانگرس یا مسلم لیگ نے یہ تجاویز مسترد کر دیں تو وائسرائے
عبوری حکومت بنا لیں گے، اور تجاویز قبول نہ کرنے والی پارٹی کے نمائندوں کو اس حکومت
میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن ان تجاویز کا وائسرائے اور کیبنٹ مشن کے ذہن میں
جو مفہوم تھا وہ اس مفہوم سے مختلف تھا جو قائدِ اعظم نے لیا تھا۔

اب یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ کیبنٹ مشن گذشتہ تین ماہ سے
جو گفت و شنید کر رہا تھا۔ اس سے مسلم لیگ اور کانگرس کے مابین نہ تو کوئی مفاہمت ہوئی
اور نہ عبوری حکومت کی تشکیل ممکن ہو سکی۔ کیبنٹ مشن ہندوستان سے واپسی کی تیاریاں کر
رہا تھا کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے کچھ غیر سرکاری اراکین نے استعفا دے دیا جس
کے سبب مرکز میں نگران حکومت کی تشکیل ضروری ہو گئی جس کے تمام اراکین سرکاری افسر

تھے۔ جون کے آخر میں کیبنٹ مشن کسی کامیابی کے بغیر ہندوستان سے رخصت ہو گیا۔ لیکن اسے مکمل ناکامی بھی نہیں کہا جا سکتا۔ اہل ہند پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ لیبر پارٹی ہندوستان میں سیاسی اقتدار سے دستبردار ہونا چاہتی ہے اور ہندوستان کے مسئلے کے کسی بھی تصفیے میں مطالبہ پاکستان کو لازمی طور پر شامل کیا جائے گا۔ دریں اثنا مسلم لیگ اور کانگرس دونوں جماعتیں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات کے لیے اپنے تمام وسیلوں کو بروئے کار لانے کی تیاری کر رہی تھیں جو عنقریب منعقد ہونے والے تھے۔

۶ر جولائی کو بمبئی میں کانگرس کا سالانہ اجلاس ہوا جس میں مولانا آزاد کی جگہ جواہرلال نہرو کو کانگرس کا صدر منتخب کیا گیا۔ اس اجلاس میں جو قرارداد منظور کی گئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے نہرو نے کہا کہ کانگرس کسی منصوبے کے کسی طویل المیعاد یا مختصر المیعاد پہلو کی پابند نہیں ہے۔ وہ صرف مجوزہ دستور ساز اسمبلی میں جانا چاہتی ہے۔ جناح صاحب نے ایک اخباری بیان میں اس کا جواب دیتے ہوئے کہا آل انڈیا کانگرس کمیٹی میں نہرو کی تقریر سے واضح ہو گیا ہے کہ کانگرس نے "اس بنیاد کو مسترد کر دیا ہے جس پر اس طویل المیعاد سکیم کا دارومدار ہے" انھوں نے امید ظاہر کی کہ برطانوی پارلیمنٹ میں اس مسئلے پر بحث کے وقت اس امر کو ملحوظ رکھا جائے گا کہ کانگرس نے طویل المیعاد سکیم کو منظور نہیں کیا ہے"۔ اخبار ڈان نے قائداعظم کے موقف کی حمایت کی اور ایک اداریے میں لکھا کہ اگر کانگرس ہٹ دھرمی سے کام لیتی رہی (جیسا کہ نہرو کے رویے سے ظاہر ہوتا ہے) تو دستور ساز اسمبلی کے ڈھونگ سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

برطانوی پارلیمنٹ میں ہندوستان کے مسئلے پر ۱۸ر تاریخ کو بحث کا آغاز ہوا اور لارڈ پیتھک لارنس نے کہا کہ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ نے ۱۶ر مئی کے بیان کو اور اس بیان کے مطابق منتخب ہونے والی دستور ساز اسمبلی کی تشکیل کو مان لیا تھا لہٰذا اب وہ اس سمجھوتے کی شرائط کو مسترد نہیں کر سکتیں"۔ اس بحث سے یہ انکشاف ہوا کہ برطانوی حکومت مسلم لیگ

ے موقف کی مکمل حمایت نہیں کرتی۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جب ۲۷ تاریخ کو بمبئی میں مسلم لیگ
نسل کا اجلاس ہوا تو قائداعظم نے اس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا "کیبنٹ مشن کانگرس
الۂ کار بن گیا ہے۔ کانگرس نے ہندوستان کے عوام کو اپنے مبہم اور ہر لحہ بدلتے ہوئے
ںیے سے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے ــــــــــ کانگرس مسلمانوں کے بے
رت کے سوا کوئی جذبہ نہیں رکھتی" آپ نے فرمایا "آئین ساز اسمبلی کو خود مختار ادارہ
سنے کا مطالبہ کر کے کانگریس ناممکن کو ممکن بنانے کی خوش فہمی میں مبتلا ہے" انھوں
ے نہرو کے بیان کو بچگانہ قرار دیا۔ آپ نے اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ برطانوی
رلیمنٹ میں بحث کے دوران میں لارڈ پیتھک لارنس اور سر اسٹیفورڈ کرپس نے یہ
ر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ کانگریس نے طویل المیعاد تجویز قبول کر لی ہے۔ یہ امر
حقیقت کے قطعی خلاف ہے قائداعظم نے فرمایا کہ مجوزہ آئین ساز اسمبلی میں کانگرس کو
ریت حاصل ہوگی، اور اس کا خیال ہے کہ وہ کسی بات کی پابند نہیں ہے اور وہ اپنی
رضی کے مطابق اپنے مقاصد کے حصول کے لیے آئین ساز اسمبلی میں شامل ہو رہی ہے"
نھوں نے کہا ان حالات میں مسلم لیگ کو ایک نئی صورت حال درپیش ہے اور
نسل کے لیے اپنا آئندہ طریقۂ کار متعین کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ جہاں تک میرا
ہے، میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ "اب معقولیت پسندی کی حد ہو گئی ہے۔
، توقع رکھنا فضول ہے۔ ہم کسی عدالت سے فریاد رسی نہیں کر سکتے۔ ہمارا واحد
در ہماری واحد معاون و مددگار مسلم قوم ہے" قائداعظم نے فرمایا کہ مسلم لیگ نے
واداری کے جذبے کے ساتھ کیبنٹ مشن سے گفت و شنید کی ہے۔ لیکن کانگرس
ا یہ ہٹ دھرمی سے کام لیتی رہی۔ کانگرس کے نزدیک ایک اور صرف ایک مقصد ہے
ور وہ یہ کہ مسلم لیگ کو کس طرح نقصان پہنچایا جائے"۔ کانگرس کے اس رویے سے
بت ہو جاتا ہے کہ "ہندوستان کے مسئلے کا واحد حل پاکستان ہے" سر اسٹیفورڈ کرپس

نے دارالعوام میں جس انداز سے مذاکرات کی وضاحت کی تھی، قائداعظم نے اُس پر سخت
تنقید کی۔ انھوں نے فرمایا "کرپس نے اپنی قانونی صلاحیتوں سے غلط فائدہ اٹھایا
ہے اور غیر منصفانہ تاویلات پیش کی ہیں۔" قائداعظم نے کرپس کو "الفاظ کا ذہین شعبدہ باز"
قرار دیا۔ انھوں نے اپنی تقریر کے آخر میں لارڈ پیتھک لارنس اور کرپس کے طرزِ عمل پر
شدید اعتراضات کیے اور فرمایا "جب تاج برطانیہ کے نمائندے دس روز کے اندر
اندر خود اپنے الفاظ سے پھر جائیں اور اس طرح اپنا، اپنی حکومت اور اپنی قوم کا وقار
گنوا دیں تو پھر ہم ان لوگوں پر بھلا کیسے اعتماد کر سکتے ہیں؟"

قائداعظم کی تقریر کے بعد مسلم لیگ کونسل نے ایک قرارداد منظور کی جس میں اظہار
افسوس کیا گیا تھا کہ کیبنٹ مشن نے مسلم لیگ کے صدر کو جو یقین دہانیاں کرائی تھیں
وہ اُن سے پھر گیا ہے۔ اس لیے مسلم لیگ نے دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کا جو فیصلہ
کیا تھا وہ اسے واپس لیتی ہے۔ ایک اور قرارداد کے ذریعے کونسل نے مجلس عاملہ کو
"راست اقدام" کا منصوبہ تیار کرنے کا اختیار دیا اور لیگ کے حامی اور وفادار افراد پر زور
دیا کہ وہ برطانوی حکومت کے خطابات واپس کر دیں۔ قائداعظم نے کونسل کے فیصلے کو
سراہتے ہوئے کہا "آج ہم آئینی طریقوں کو الوداع کہتے ہیں ———— آج
ہمارے ہاتھ میں بھی ہتھیار ہے اور ہم اُسے استعمال کر سکتے ہیں۔ تجاویز کو مسترد کرنے
اور راست اقدام شروع کرنے کا فیصلہ جلد بازی میں نہیں کیا گیا ہے۔ ہم نے جو کہا
ہے اُسے کر کے دکھائیں گے۔ ہم الفاظ کے ہیر پھیر کے قائل نہیں۔" انھوں نے
فرمایا کہ مسلم لیگ حالات کو اس قدر بگڑنے نہیں دے گی کہ خونریزی اور خانہ جنگی
ہو جائے۔" انھوں نے بڑے افسوس سے کہا کہ کانگرس اور انگریزوں نے
مسلمانوں پر اعتماد نہیں کیا۔ ہم نے ایک تلخ سبق حاصل کیا ہے۔ میرے خیال
میں یہ ہمارے لیے تلخ ترین سبق ہے۔ اب مصالحت کی کوئی گنجائش نہیں۔"

پرامن چاہتے ہیں تو ہم بھی جنگ کے خواہاں نہیں، لیکن اگر آپ جنگ کے خواہاں
ں تو ہم کسی تذبذب کے بغیر اسے قبول کرنے کو تیار ہیں۔"

اگلے دن مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں طے کیا گیا کہ پورے ہندوستان
بھر کے مسلمان ۱۶ راگست ۱۹۴۶ء کو جگہ جگہ جلسے منعقد کر کے یومِ راست اقدام منائیں
ن میں پاکستان کے قیام کی ضرورت اور مسلم لیگ کونسل کی منظور کردہ قرارداد کی وضاحت
ں جائے۔

جولائی کے اواخر میں دستور ساز اسمبلی کے انتخابات ہوئے تھے جن میں مسلم لیگ نے
۷۸ مسلم نشستوں میں سے ۷۳، یعنی ۹۴ فیصد نشستیں حاصل کیں۔ کانگرس نے نو انتخابی
حلقوں میں مقابلہ کیا اور ہار گئی۔ انتخابات کے دوران میں وائسرائے نے جنھیں یقین
تھا کہ مسلم لیگ بھاری تعداد میں مسلم نشستیں حاصل کر لے گی۔ قائداعظم اور کانگرس کے
صدر نہرو کو ایک مکتوب تحریر کیا کہ انتخابات کے بعد میں اپنی حکومت میں ردوبدل کروں گا
جس کے مطابق ۱۴ اراکین پر مشتمل ایک عبوری حکومت کی تشکیل کی جائے گی۔ ان میں
پانچ مسلم لیگ کے اور چھ کانگرس (ایک اچھوت سمیت) نمائندے ہوں گے۔ علاوہ
ازیں دوسرے فرقوں کی نمائندگی کے لیے تین اراکین وائسرائے نامزد کریں گے۔ مکتوب
میں کہا گیا تھا کہ مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان اہم محکموں کی مساوی تقسیم ہوگی۔ آخر
میں وائسرائے نے دونوں جماعتوں کے سربراہوں سے درخواست کی تھی کہ اس مکتوب
کا جلد جواب دیا جائے۔ نہرو نے گول مول جواب دیا۔ انھوں نے تحریر کیا کہ کانگرس
کی مجلس عاملہ سے مشورہ کیے بغیر میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ اس
سے پیشتر کہ کانگرس کوئی تجویز قبول کرے، ہندوستان کی آزادی کی ضمانت دی جائے۔

قائداعظم نے ۳۱ تاریخ کو وائسرائے کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ وائسرائے
کی تازہ ترین تجویز مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان مساوات کے اصول کے منافی ہے۔

اور یہ کہ اس کارروائی کا مقصد کانگرس کو خوش کرنا ہے۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ وائسرائے کی پیش کش کو مسترد کر دے گی کیونکہ یہ پیش کش مسلمانانِ ہند کے مفاد کے خلاف ہے۔ ۲ر اگست کو وائسرائے نے اس کے جواب میں لکھا کہ یہ ویسی ہی پیش کش ہے جیسی مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ پہلے منظور کر چکی ہے۔ مزید یہ کہ آپ کے ۱۳ر تاریخ کے مکتوب کے مطابق مسلم لیگ کے موقف کے پیشِ نظر ہم نے کانگریس سے عبوری حکومت کی تشکیل کے سلسلے میں تجاویز مانگی ہیں۔ اس سلسلے میں مینن نے لکھا ہے کہ "اندیشہ تھا کہ اگر جناح نے راست اقدام کی اپیل کی تو اس پر فوراً عمل درآمد شروع ہو جائیگا۔ اگر بنگال اور سندھ میں جہاں بڑے پیمانے پر مسلمانوں کی تحریک جاری تھی حکومتوں نے استعفا دے دیا۔ تو ممکن ہے کہ مشرقی بنگال اور سندھ کے حالات حکومت کے قابو سے باہر ہو جائیں اور پنجاب اور یوپی کے بڑے بڑے شہروں میں فرقہ دارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھے۔"[۱] مینن نے جن حالات کی نشاندہی کی تھی۔ ان کے باوجود وائسرائے نے حکومتِ برطانیہ کے ایماء پر مسلم لیگ کو نظر انداز کر کے کانگرس کو خوش کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ کئی جگہ شدید فرقہ وارانہ فسادات ہوئے۔ اور پورے ملک میں فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہو گئی۔ مزدوروں کی ملک گیر ہڑتال نے اس جلتی پر تیل کا کام کیا۔

۸ر اگست کو واردھا میں کانگرس کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا اور ایک قرارداد میں مسلم لیگ کے رویّے کی مذمت کی گئی۔ اس قرارداد میں کہا گیا تھا کہ کانگرس دستور ساز اسمبلی کو خود مختار حیثیت دینے کی سختی سے حامی ہے"اس کے بعد ایک عجیب و غریب انداز میں قرارداد میں امید ظاہر کی گئی تھی کہ ملک اور خود اپنے عظیم تر مفاد کے پیشِ نظر مسلم لیگ اور دیگر متعلقہ افراد اس عظیم مقصد کے حصول میں کانگرس کا ساتھ دیں گے" قائدِاعظم نے

---

[۱] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن، صفحہ ۲۹۰

جب اس قرار داد پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو آپ نے فرمایا: " حالات جُوں کے تُوں ہیں اور ہم آج بھی وہیں ہیں جہاں پہلے تھے " کانگرس کی مجلسِ عاملہ کے فیصلے کے بعد نہرو نے وائسرائے کو لکھا کہ کانگرس کے صدر کو مرکز میں عبوری حکومت کی تشکیل کی دعوت دی جائے اور اس ضمن میں مسلم لیگ کا تعاون کانگرس کے صدر حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ وائسرائے نے کانگرس کو ممنون کرنے کی خاطر اس قسم کا اعلامیہ جاری کر دیا اور نہرو نے قائدِ اعظم سے عبوری حکومت کی تشکیل میں تعاون کی درخواست کی۔ قائدِ اعظم نے ان شرائط پر عبوری حکومت میں شرکت کی پیش کش ٹھکرا دی اور نہرو کو لکھا کہ " اگر اس کا مطلب یہ ہے کہ وائسرائے نے آپ کو گورنر جنرل کی ایگزیکٹو کونسل کی تشکیل کی دعوت دی ہے تو میرے لیے اسے قبول کرنا ممکن نہیں ہے " لیکن انھوں نے تحریر کیا کہ میں آپ سے ہندو مسلم مسئلے پر گفتگو کر سکتا ہوں۔ اس پر دونوں زعما کی ملاقات ہوئی مگر نہرو چونکہ کانگرس کی سوچی سمجھی سکیموں پر عمل کر رہے تھے اس لیے سیاسی بحران کا کوئی تصفیہ نہ ہو سکا۔

۱۶ راگست کو مسلمانانِ ہند نے یومِ راست اقدام منایا۔ تمام بڑے بڑے شہروں میں جلوس نکالے گئے، جلسے منعقد ہوئے اور لیگ کے موقف کی حمایت میں قرار دادیں منظور کی گئیں۔ بنگال اور سندھ کی حکومتوں نے اس موقع پر عام تعطیل کا اعلان کیا اور بنگال کے وزیرِ اعظم سہروردی نے ایک بیان میں کہا کہ اگر وائسرائے نے مرکز میں کانگرس کو حکومت بنانے کا موقع دیا تو میں بنگال کی مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دوں گا اور اس صوبے میں متوازی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ انہوں نے کہا " ہم دیکھیں گے کہ یہ مرکزی حکومت بنگال سے مالیہ کس طرح وصول کرتی ہے۔ ہماری مملکت ایک خود مختار مملکت ہو گی۔ اور اس کا مرکز سے کوئی تعلق نہ ہو گا " کلکتے میں کانگریسیوں کی سرپرستی میں ہندو فرقہ پرست تشدد پر اُتر آئے اور اتنے بڑے پیمانے پر بلوے ہوئے کہ پانچ ہزار افراد

ہلاک اور بیس ہزار سے زیادہ مجروح ہوئے۔ انسانی خون کی ارزانی کے یہ محتاط اندازے صرف کلکتے سے تعلق رکھتے ہیں۔

ان فسادات کو "کلکتہ کا قتلِ عام" کا نام دیا گیا ہے۔ آئن اسٹیفنس نے ان فسادات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ "پولس کے مردہ خانے میں داخل ہونے کے لیے آلہ تنفس کی ضرورت تھی۔ کیونکہ وہاں سڑی ہوئی لاشوں کے چھت تک انبار لگے ہوئے تھے۔ ملٹری پولس کے انگریز نان کمیشنڈ افسروں کے ساتھ میں نے تین گھنٹے ایک جیپ میں شہر کی سڑکوں پر گشت کیا۔ ہم نے جو کچھ دیکھا وہ موجودہ دنیا کے فوجی، میدان کارزار میں بھی نہیں دیکھ سکتے۔[1]" قائد اعظم نے ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ "کلکتے کی واقعات کی اصل ذمہ داری وائسرائے، مسٹر گاندھی اور کانگرس پر ہے اور وہ اس سے دامن نہیں بچا سکتے" انھوں نے فرمایا کہ ہندو زمین پر پاؤں نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہندو راج قائم ہو گیا ہے اور اسی لیے وہ مسلمانوں کی توہین کرنے اور انھیں قتل کرنے پر اتر آئے ہیں۔ مرکز میں کانگرس جو حکومت بنانے والی تھی، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قائدِ اعظم نے کہا "مجھے توقع نہیں ہے کہ یہ حکومت مسلمانوں سے انصاف برتے گی۔" وائسرائے کی جانب سے نہرو کو حکومت بنانے کی دعوت دی گئی تھی اس پر انھوں نے ناپسندیدگی ظاہر کی اور فرمایا "مسلم لیگ سے عبوری حکومت اور دستور ساز اسمبلی میں شرکت کی توقع رکھنا بے سود ہے کیونکہ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم اپنے مقاصد سے دستبردار ہو جائیں اور ہمارے ساتھ گھٹیا سلوک کیا جائے۔ پاکستان کا ذکر کرتے ہوئے قائد اعظم نے کہا "پاکستان کے فوری قیام کے سوا اور کوئی متبادل صورت موجود نہیں ہے۔ قیام پاکستان کا مطلب ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کی آزادی ہے۔

---

[1] پاکستان اولڈ کنٹری / نیو نیشن۔ آئن اسٹیفنس۔ صفحہ ۱۲۸۔ مطبوعہ ۱۹۶۴ء
پینگوئن بکس۔ ہارمنڈز ورتھ

حقیقی معنوں میں ہندوستان کی آزادی کا یہ سہل ترین طریقہ ہے۔ بدقسمتی سے کانگریس کی آنکھوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں" آخر میں انھوں نے انکشاف کیا کہ مجھے ٹیلیفون اور ڈاک کے ذریعے دھمکیاں دی جا رہی ہیں لیکن میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ ایسی صورت میں، جب کہ ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لیے ایک وطن کا حصول ہمارا نصب العین ہے، ایک فرد کی زندگی کوئی معنی نہیں رکھتی۔

۲۲ر اگست کو نہرو نے وائسرائے کو لکھا کہ کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط حکومت بنانے کی خواہش مند ہے لیکن کانگریس مسٹر جناح کے اشاروں پر نہیں چلے گی۔ ۲۴ر تاریخ کو وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کی سربراہی میں عبوری حکومت کے قیام کا گزٹ جاری کیا۔ گورنر جنرل کی اس کونسل میں کانگریسی نمائندے، ایک سکھ، ایک پارسی اور ایک ہندوستانی مسیحی نمائندہ شامل تھا۔ عبوری حکومت کے اراکین ۲ر ستمبر کو اپنے عہدوں کا حلف اٹھانے والے تھے۔ اسی دن شام کو وائسرائے نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کی جس میں انھوں نے کہا کہ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے لیے پانچ نشستیں رکھی گئی ہیں مگر مسلم لیگ نے اپنے نامزد نمائندوں کے نام مجھے نہیں بھیجے۔ میں غیر معینہ عرصے تک عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کا انتظار نہیں کر سکتا۔ بنابریں میں عبوری حکومت کی تشکیل کر رہا ہوں۔ وائسرائے نے اس نشری تقریر میں اہل ہند کو مطلع کیا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ برطانوی حکومت اس امر پر رضامند ہو گئی ہے کہ عبوری حکومت میں امورِ جنگ کا محکمہ ایک ہندوستانی رکن کو سونپا جائے۔ انھوں نے اپنی تقریر کے آخر میں عوام اور اخباروں سے حکومت کے ساتھ تعاون کرنے کی اپیل کی "رواداری اور ٹھنڈے دل سے معاملات کو سوچنے سمجھنے کی ضرورت جتنی آج ہے پہلے کبھی اتنی نہ تھی۔"

قائدِ اعظم نے اس کا فوراً جواب دیا۔ انھوں نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ وائسرائے نے "مسلم لیگ اور مسلمانانِ ہند کے مفاد پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ

مسلمان صبر اور حوصلے سے کام لیں گے۔ اگر وائسرائے نے خلوص کے ساتھ یہ اپیل کی ہے اور اُن کی نیت صاف ہے تو وہ اپنے افعال سے اُسے ٹھوس تجاویز کے طور پر پیش کریں۔"

نشری تقریر کے چند روز بعد لارڈ ویول نے کلکتہ کے فساد زدہ علاقوں کا دورہ کیا جس میں انھوں نے دیگر افراد کے علاوہ خواجہ ناظم الدین سے بھی ملاقات کی۔ خواجہ ناظم الدین نے ذاتی حیثیت میں وائسرائے سے اس امر پر تبادلہ خیال کیا کہ مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنے کا کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔ دہلی واپس آنے پر وائسرائے نے خواجہ ناظم الدین کی تجاویز پر گاندھی اور نہرو سے گفتگو کی۔ وائسرائے نے کانگرسی لیڈروں کے سامنے جو فارمولا رکھا اُس سے صاف ظاہر تھا کہ ۱۶ مئی کے بیان کے مطابق صوبوں کے گروپ بنانے کی تجویز وائسرائے اور کانگرس کے درمیان مفاہمت کا لازمی جزو ہو گی۔ لارڈ ویول نے یہ واضح کر دیا کہ میں ہندوستان میں ایسے حالات پیدا کرنا نہیں چاہتا جن سے ملک میں ہندو مسلمانوں کے درمیان خانہ جنگی چھڑ جائے۔ انھوں نے کہا کہ ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی امن و امان کے ساتھ ہونی چاہیے نہ کہ تشدد کے ذریعے۔

کانگرس کی مجلس عاملہ نے ایک قرارداد کے ذریعے وائسرائے کے رویے میں تبدیلی پر اظہار تعجب کیا۔ وائسرائے کے رویے میں اس تبدیلی کا اظہار گاندھی اور نہرو سے اُن کی گفت و شنید اور اُن خطوط سے ہوتا تھا جو انھوں نے اُن کانگرسی لیڈروں کو تحریر کیے تھے۔ لیکن وائسرائے اپنی بات پر قائم رہے اور انھوں نے کہا کہ میں کسی قانون دان کے محدود زاویہ نظر سے اس معاملے پر غور نہیں کرتا۔ بلکہ ایک عام انسان کی حیثیت سے بنظر غائر اس کا جائزہ لیتا ہوں۔ حکومت برطانیہ نے وائسرائے کو ہدایت کی کہ وہ نئے اراکین کو اختیارات سونپ دیں۔ جس پر مقررہ تاریخ یعنی ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو ان اراکین نے اپنے عہدوں کا حلف اٹھا لیا۔ عبوری حکومت کے قیام کے ساتھ ہی احمد آباد اور بمبئی میں شدید فرقہ وارانہ فسادات

کے شعلے بھڑک اُٹھے جن میں بھاری جانی اور مالی نقصان ہُوا۔ گاندھی جی نے فسادات
پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا: "ابھی خانہ جنگی تو شروع نہیں ہوئی لیکن ہم خانہ جنگی کے دروازے
پر پہنچ گئے ہیں۔"

نئی حکومت کی تشکیل کے پانچ روز بعد نہرو نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک نشری تقریر
میں کہا کہ حکومت تمام مسئلوں کا ایسا حل تلاش کرنا چاہتی ہے جو سب کے لیے قابل قبول
ہو۔ اور مجھے امید ہے کہ آزاد اور خود مختار ہندوستان کا آئین مرتب کرنے کے لیے دوسری
سیاسی پارٹیاں مل جل کر دستور ساز اسمبلی میں کام کریں گی۔ قائد اعظم سے نہرو کی اس تقریر
پر تبصرہ کرنے کو کہا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ نہرو وہی فرسودہ باتیں کہہ رہے ہیں۔ ان کا مطلب
یہ نہیں کہ مسلمانوں کی امنگیں پُوری کی جائیں۔ انھوں نے مجھے کوئی قطعی تجویز پیش نہیں کی ہے۔
خالی خولی الفاظ ہی کافی نہیں۔ محض تسلی آمیز باتوں سے کسی مجروح کے زخموں سے بہتے
ہوئے خون کو نہیں روکا جا سکتا۔"

وائسرائے نے سیاسی تعطل کے بارے میں گفت و شنید کے لیے قائد اعظم کو ۱۶ ستمبر
کو دہلی میں مدعو کیا۔ قائد اعظم نے وائسرائے سے کہا کہ ان کے خیال میں ۱۶ مئی کے منصوبے
پر اب تک سرے سے عمل ہی نہیں ہوا ہے اور اسی سبب مسلم لیگ کے لیے تعاون کرنا ممکن
نہیں۔ انھوں نے اس امر پر اظہار افسوس کیا کہ وائسرائے نے مرکز میں ایک جماعتی حکومت کو
وزارت سونپ دی ہیں۔ دس روز بعد قائد اعظم اور وائسرائے کی پھر ملاقات ہوئی۔ اس
ملاقات میں قائد اعظم اپنے رفقائے کار سے صلاح مشورہ کر چکے تھے۔ انھوں نے اصرار کیا کہ
وائسرائے اس پر رضامند ہو جائیں کہ تمام فرقہ وارانہ اختلافی مسائل کو دونوں قوموں کے
اکثریتی ووٹ کے ذریعے طے کرنے کے اصول پر عمل کیا جائے گا۔ قائد اعظم کو اندیشہ تھا کہ
دوسری اقلیتوں کے نمائندے ہمیشہ کانگریس کے حق میں ووٹ دیں گے۔ وائسرائے نے
تجویز پیش کی کہ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آیا دونوں بڑی قوموں میں ضروری نکات پر اتفاق ہے

ہو سکتا ہے کہ نہیں، قائداعظم اور مسٹر نہرو کو گفتگو کرنی چاہیے۔ مگر جب وائسرائے نے گاندھی جی اور نہرو سے علیحدہ علیحدہ گفتگو کی تو پتہ چلا کہ دونوں کانگرسی لیڈر خاص طور سے کانگرس کے اس حق کے بارے میں اپنے موقف سے دستبردار ہونے یا اس میں کوئی رعایت کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ عبوری حکومت میں ایک نیشنلسٹ مسلمان کو بھی شامل کیا جائے۔ وائسرائے نے قائداعظم کو مطلع کیا کہ وہ گاندھی جی اور نہرو کو رضامند نہیں کر سکے ہیں مگر انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ تمام متعلقہ افراد کا مفاد اسی میں ہے کہ مسلم لیگ مرکزی حکومت اور دستور ساز اسمبلی میں شمولیت پر تیار ہو جائے۔ قائداعظم نے اس کے جواب میں کہا کہ میں مسلم لیگ کی مجلسِ عاملہ کے اجلاس میں وائسرائے سے اپنی گفت و شنید کی رپورٹ پیش کروں گا اور مجلسِ عاملہ جو فیصلہ کرے گی اُس کا پابند ہوں گا۔

انگلستان کے کیمسلے نیوز پیپر گروپ کے نمائندے ہینلے سے ایک انٹرویو میں قائداعظم نے فرمایا "مخلوط حکومت کی تشکیل میں وائسرائے کی ناکامی پر وائسرائے سے زیادہ مجھے دکھ ہوا لیکن انھوں نے اس بات کی وضاحت کی کہ اس ناکامی کا الزام مسلم لیگ پر نہیں لگایا جا سکتا۔ مسلم لیگ کے لیے وائسرائے کی پیش کش کے بارے میں انھوں نے کہا سوائے اس کے کہ مسلم لیگ کو پانچ نشستیں ملیں گی یہ پیش کش سر تا سر مبہم اور غیر واضح ہے" انھوں نے کہا ہم نشستوں کے لیے سودے بازی نہیں کر رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو اہمیت اس بات کی ہے کہ ایسے بنیادی اصولوں پر اتفاق رائے ہو جائے جن سے گریز نہ کیا جا سکے۔ سر جارج ڈنبر نے ان اسباب کی وضاحت کی ہے جن کے سبب قائداعظم نے ۱۶ مئی کو تجاویز قبول نہ کرنے اور دستور ساز اسمبلی سے علیحدہ رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں "مسلم لیگ نے اس سکیم سے قطعی دستبرداری کا اعلان کر دیا جو جناح کے خیال میں خطرناک حد تک غیر واضح تھی"[1]

---

[1] : انڈیا اینڈ دی پاسنگ آف ایمپائر۔ سر جارج ڈنبر صفحہ ۲۰۴ مطبوعہ ۱۹۵۱ء نکلسن اینڈ واٹسن لندن

پورے ملک میں حالات خراب ہوتے جارہے تھے اور بھیانک ترین اور بدترین
نہ وارانہ فسادات معمول بن کر رہ گئے تھے۔ ہر ہفتے ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون بہہ
ہا تھا اور آتشزدگی کی وارداتوں کے سبب بھاری مالی نقصان ہو رہا تھا۔ آئن اسٹیفنس
نے اِن فسادات میں ہونے والے نقصان کے اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے لکھا ہے
یہ واقعات یعنی کلکتہ کا قتال اور برطانوی کیبنٹ مشن کے منصوبے کے مطابق مسٹر
رو کی حکومت کی تشکیل، در اصل سولہ ماہ کی خانہ جنگی کے آغاز کا سگنل تھے۔ اس خانہ
ی کے دوران میں تقریباً پانچ لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ دوسری جنگِ عظیم کے چھ
سوں میں پوری برطانوی دولتِ مشترکہ میں کم و بیش اتنے ہی افراد ہلاک ہوئے تھے"۔ [1]

اس مرحلے نواب بھوپال نے، جن کا تمام لیڈر اور سیاسی جماعتیں احترام کرتی تھیں،
د اعظم اور گاندھی جی کے درمیان گفت و شنید کا بندوبست کیا تاکہ دونوں لیڈر کوئی
بل قبول فارمولا مرتب کر سکیں۔ نواب بھوپال کی کوششوں کے سبب دونوں لیڈروں
ں اتفاق رائے ہو گیا کہ "کانگرس اب یہ تسلیم کرتی ہے کہ مسلم لیگ، مسلمانانِ ہند کی
اری اکثریت کی با اختیار نمائندہ تنظیم ہے۔ بنا بریں جمہوری اصولوں کے مطابق صرف
لم لیگ ہی کو مسلمانانِ ہند کی بلا شرکتِ غیرے نمائندگی کا حق حاصل ہے لیکن کانگرس
پنے ممبروں میں سے جن لوگوں کو مناسب و موزوں سمجھے گی اپنا نمائندہ منتخب کر سکے
۔ اس سلسلے میں اس پر کوئی پابندی یا قید عائد نہیں کی جا سکتی۔ مگر گاندھی جی نے
ب نہرو اور کانگرس کو اس فارمولے سے مطلع کیا تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے
کار کر دیا۔ گاندھی جی کے لیے اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ اپنے پیمان سے

---

[1] پاکستان نیو کنٹری / اولڈ نیشن - آئن اسٹیفنس صفحہ ۱۳۰/۱۲۹ مطبوعہ ۱۹۶۴
پلوتن بکس۔

بچھڑ جائیں۔

اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں قائد اعظم نے لارڈ ویول سے پھر ملاقات کی۔ ۱۲۔ ملاقات میں انھوں نے وائسرائے کو مطلع کیا کہ اگر کانگریس عبوری حکومت میں اپنے ساتھ ایک نیشلسٹ مسلمان کو بھی شامل کرنے کا حق مانگتی ہے تو مسلم لیگ بھی اپنے ساتھ ایک اچھوت نمائندے کو حکومت میں شامل کرنے کا حق محفوظ رکھتی ہے۔ ۱۳ تاریخ کو قائد اعظم نے لارڈ ویول کے نام ایک مکتوب میں انھیں عبوری حکومت میں مسلم لیگ کی شمولیت کے بارے میں مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے فیصلے سے مطلع کیا۔ مکتوب میں کہا گیا تھا کہ اگرچہ مسلم لیگ کو چند امور پر سخت اعتراض ہے تاہم مسلمانوں اور دوسری قوموں کے حق میں یہ انتہائی مہلک ہوگا کہ مرکزی حکومت کا نظم ونسق ہندوؤں کے ہاتھ میں رہنے دیا جائے؟ اگلے روز قائد اعظم نے ایک مکتوب کے ذریعے وائسرائے کو اطلاع دی کہ عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے پانچ نمائندے نواب زادہ لیاقت علی خاں آئی آئی چندریگر عبدالرب نشتر، غضنفر علی خاں اور جوگندرناتھ منڈل ہوں گے۔ جوگندرناتھ منڈل اچھوت نمائندے تھے اور بنگال کی مسلم لیگی وزارت کے رکن تھے۔ اس وقت عبوری حکومت میں دو نشستیں خالی تھیں اور مسلم لیگ کے نامزد نمائندوں کو حکومت میں شامل کرنے کے لئے سرت چندر بوس، سر شفاعت احمد خاں اور سید علی ظہیر نے استعفا دے دیا۔

قائد اعظم اس بات پر اصرار کرتے رہے تھے کہ اگر مسلم لیگ کے نمائندے مرکزی حکومت میں شامل ہوئے تو کانگریس اور مسلم لیگ کے نمائندوں کے درمیان مختلف محکموں کی مساوی تقسیم کی جائے گی۔ اس نکتے پر قائد اعظم اور وائسرائے اور وائسرائے اور نہرو کے درمیان طویل مذاکرات ہوتے۔ اور اتفاق رائے ہونے میں بارہ روز گزر گئے۔ ۲۵۔ تاریخ کو لارڈ ویول نے قائد اعظم کے نام ایک مکتوب تحریر کیا کہ "میں مسلم لیگ کو جن محکموں کی پیش کش کرسکتا ہوں وہ خزانہ، تجارت، مواصلات، صحت اور قانون ہیں" اسی روز

قائداعظم نے وائسرائے کو جواب دیا "مجھے افسوس ہے کہ میں اُسے منصفانہ اور مساوی تقسیم نہیں سمجھتا۔ میں آپ کو مسلم لیگ کے مندرجہ ذیل نامزد نمائندوں کے نام بھیج رہا ہوں۔ اِن محکموں کی تقسیم اِن کے درمیان اس طرح کی جائے۔

خزانہ : ———— جناب لیاقت علی خاں

تجارت : ———— جناب آئی آئی چندریگر

مواصلات: ———— جناب اے آر نشتر

صحت : ———— جناب غضنفر علی خان

قانون : ———— مسٹر جوگندر ناتھ منڈل

کیبنٹ مشن کے دَورے سے لے کر مسلم لیگ کے نمائندوں کی مرکزی عبوری حکومت میں شمولیت تک سیاسی جنگ کا سارا زور اس امر پر تھا کہ کانگرس من مانی نہ کر سکے مسلمانانِ ہند کی جانب سے اس جنگ کی کامیابی کا سہرا ایک فردِ واحد کے سر رہا اور وہ تھے قائداعظم، جن کی عمر ستر سال سے اُوپر ہو چکی تھی لیکن پیرانہ سالی کے باوجود ان میں نوجوانوں سا دم خم تھا۔ انھوں نے جس عزم اور جوش کے ساتھ بھاری ذمہ داریاں سنبھالی تھیں اس پر نوجوانوں کو رشک ہوتا تھا۔ آغا خان نے ہماری تاریخ کے اس نازک دور میں قائداعظم کی عظیم خدمات پر اُنھیں شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "قائداعظم کی تابناک اور عہد آفریں شخصیت جس سے ہم قبل از وقت محروم ہو گئے ۱۹۴۶ء اور ۱۹۴۷ء کے اہم سالوں میں پورے عروج پر تھی۔ اب وہ ایک تاریخی شخصیت ہیں اور مجھے یقین ہے کہ اُن کی یاد ہمارے دلوں میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ میں اپنی زندگی میں جتنے مدبروں سے مِلا ہوں۔ کلیمنو، لائڈ جارج، چرچل، کرزن، مسولینی، مہاتما گاندھی۔ جناح اِن میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں کردار کی بلندی میں وہ ان سب پر فوقیت رکھتے تھے۔

وہ زبردست قوتِ فیصلہ اور پیش بینی کے امتزاج کا مجسمہ تھے اور درحقیقت یہی تدبّر ہے"۔[1]

---

[1] دی میموائرز آف آغا خان۔ صفحہ ۲۹۲۔ مطبوعہ ۱۹۵۴ء کاسیل اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ لندن

پاکستان زندہ باد

عبوری حکومت میں مسلم لیگ کے نمائندوں کی شمولیت سے یہ واضح ہوگیا تھا
کہ ہندوستان کے سیاسی حل سے متعلق آئندہ جو بھی مذاکرات ہوں گے اُن میں قیام پاکستان
اہم مسئلہ ہوگا۔ گول میز کانفرنس کے موقع پر مطالبۂ پاکستان کو چند پُرجوش طلبہ کا ایک خواب
سمجھا گیا تھا۔ ۱۹۳۹ء تک چند لوگ ہی اس پر سنجیدگی سے غور کر سکے تھے مگر ۲۳ مارچ
۱۹۴۰ء کی قرار داد پاکستان کے بعد کانگریس نے تمسخر اڑا کر اس نظریے کو ختم کرنے کی کوشش
کی۔ کوئی حکومت ظلم و ستم کے ذریعے کسی سیاسی تحریک کو کچل سکتی ہے، کوئی سیاسی جماعت
یا قوم دہشت انگریزی یا بڑے پیمانے پر قتل و غارت کے ذریعے کسی عوامی مطالبے
کی آگ بجھا سکتی ہے، مگر پاکستان اب مسلمانانِ ہند کا جزو ایمان بن گیا تھا اور اس بنیاد
کو کوئی قوت فنا نہیں کر سکتی تھی۔ ایک صدی کی سیاسی جدوجہد کے بعد مسلمانانِ ہند
اپنا نصب العین متعین کر چکے تھے جو سو سال تک اُن کے لاشعور میں جاگزیں رہا تھا
اور اب اس نصب العین نے مطالبۂ پاکستان کی شکل اختیار کر لی تھی۔ ڈاکٹر بی آر
امید کرنے اس سلسلے میں لکھا ہے "مسلم سیاست کا ایک متوازی خط پر عمل پیرا ہونا اور
ہندو سیاست میں ضم نہ ہونا، ہندوستان کی موجودہ تاریخ کا ایک انتہائی عجیب و
غریب واقعہ ہے۔ اس طرزِ عمل کا سبب مسلمانوں پر چند مُبہم اسرار احساسات کا اثر تھا
مسلمان یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ وہ ایسا کیوں محسوس کرتے ہیں۔ مگر کوئی نادیدہ قوت برابر

اُن سے کہتی رہتی کہ ہندوؤں سے الگ رہیں۔ یہ نادیدہ قوت خود اُن کا پہلے سے متعین کردہ نصب العین' پاکستان تھا، اور مسلمانانِ ہند غیر شعوری طور پر اس نصب العین کے حصول کے لیے کوشاں تھے۔ حاصلِ کلام یہ کہ نظریہ پاکستان کوئی نئی بات نہیں ہے البتہ جو چیز پہلے غیر واضح تھی اب وہ واضح اور روشن ہو گئی ہے اور جو مقصد بے نام تھا' اب اس کا ایک نام ہے''۔[۱]

عبوری حکومت میں شمولیت کے بارے میں لیگ کے فیصلے کے اعلان کے ساتھ ہی ہندوستان کے کئی علاقوں' خاص طور سے بہار' نواکھالی اور تپرہ (مشرقی بنگال) میں شدید فرقہ وارانہ فسادات شروع ہو گئے جن میں ہزاروں مسلمانوں کو انتہائی بربریت کے ساتھ قتل کر دیا گیا۔ یہ فسادات جس انداز میں اور جس وقت شروع ہُوئے۔ اِن سے یہ یقین ہوتا ہے کہ فرقہ پرست ہندوؤں کے انتہا پسند عناصر مسلمانوں کو ہندوستان میں باعزت مقام حاصل کرتے دیکھنے کے خواہشمند نہ تھے۔ ملک کے بیشتر علاقوں میں پولیس صورتِ حال پر قابو نہ پا سکی اور عوام کا اعتماد بحال کرنے نیز امن و امان قائم کرنے کے لیے فوج طلب کرنی پڑی۔ قائداعظم نے ایک بیان جاری کیا جس میں انھوں نے فرمایا" ملک کے مختلف حصّوں میں جو کچھ ہو رہا ہے مسلم لیگ اور مسلمانوں کو اس کا ذمّہ دار ٹھہرانے کی غرض سے جھوٹ کے طُومار باندھے جا رہے ہیں۔ مجھے علم ہے کہ مسلمانوں کا کافی نقصان ہُوا ہے اور وہ نقصان اُٹھا رہے ہیں۔ یہ چنگاریاں ہندوستان کے ہر حصّے میں موجود ہیں۔ صرف بہار میں آگ کی صورت میں بھڑکی ہیں۔ میں ہر قسم کی بربریت کی مذمت کرتا ہوں۔ لیکن ہندو اکثریت کے ہاتھوں

---

[۱] پاکستان اور پارٹیشن آف انڈیا۔ بی آر امبیدکر صفحہ ۳۳۴/۳۳۳۔ ٹھاکر اینڈ کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی۔

ــ کے مختلف حصّوں میں مسلمان اقلیّت کا جو بیمانہ قتلِ عام ہُوا ہے۔ اس میں سانحہ
رجیسے وحشیانہ واقعہ کی کوئی مثال نہیں ملتی" انھوں نے مسلمانوں سے اپیل کی کہ
تہذیب" اخلاق اور انسانیت کی پستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ بلکہ اپنے عمل سے یہ ثابت
دیں کہ وہ بہادر" فراخ دل اور اعتماد کے اہل ہیں۔ آخر میں قائداعظم نے فرمایا
نلیتی صُوبوں میں مسلمانوں کو جن مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے اور انھیں جو زبردست
، قربانی دینی پڑی ہے وہ رائیگاں نہ جائے گی۔ مجھے یقین ہے کہ اس قربانی سے
اِمطالبہ پاکستان مستحکم تر ہو جائیگا۔ ہلاک و زخمی ہونے والے مسلمان اور وہ لوگ
ہیں مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ یہ یاد رکھیں کہ اُنھیں یہ سب کچھ اپنی آزادی اور
ولِ پاکستان کے لیے سہنا پڑا ہے"

آیان اسٹیفنز بہار کے قتلِ عام کے بارے میں رقم طراز ہے "مورّخ یہ تسلیم
ب گے کہ بہار کا سانحہ تقسیم کے نزاعی موضوع پر فیصلہ کن اثرات ثبت کر گیا ہے۔
نے زبردست قتلِ عام کے بعد" جو سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق ہوا" ایک اکثریت
نت ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا امن و صُلح کے ساتھ مل جل ک
نے کا امکان ختم ہو گیا۔ سانحہ بہار سے صدیوں پرانے اندیشے اور نفرت انگیز تاریخی
جۂ تاریخی واقعات ذہن میں تازہ ہو گئے اور عملی اعتبار سے تقسیم ناگزیر ہو گئی"

لفٹیننٹ جنرل ٹکر نے اِن معلومات کی بنیاد پر جو اُسے جنرل آفیسر کمانڈنگ
رتی کمان کی حیثیت سے ملی تھیں، لکھا ہے: ۱۹۴۶ء کی بیمانہ وارداتوں میں سانحہ
رعظیم ترین سانحہ تھا۔ ہندوؤں کے زبردست ہجوم پوری طرح تیار ہو کر نکلے اور

پاکستان اولڈ کنٹری نیو نیشن۔ آیان اسٹیفنز۔ صفحہ ۱۲۷-۱۲۶۔ مطبوعہ ۱۹۶۴ء
بو ئینز بکس لندن۔

گنتی کے اُن مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے جن کے آباؤ اجداد اور خود وہ اُن ہندوؤں
کے ساتھ دوستی، محبت اور خلوص کے ساتھ ہمسایوں کے طور پر رہتے آئے تھے۔
تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ نسل کشی کا یہ بھیانک منصوبہ کس کے ذہن کی پیداوار تھا۔
تو بس اتنا علم ہے کہ اس منصوبے پر پروگرام کے مطابق عمل ہوا۔ اگر یہ سب کچھ کسی سو
سمجھے منصوبے کے تحت نہ ہوتا تو زبردست مسلح ہجوم وقت پر جمع نہ ہوتے اور اس ط
قتل و غارت گری کا بازار گرم نہ ہوتا۔ تھوڑی ہی دیر میں تقریباً سات آٹھ ہزار مسلما
مردوں، عورتوں اور بچوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ ماں کے ساتھ
اُن کے سینے سے لپٹے ہوئے بچوں کو قتل کرنے کے بعد ماؤں کو بھی تہہ تیغ کر دیا گیا
گاندھی جی فرقہ وارانہ ہم آہنگی بحال کرنے کے لیے بہار پہنچے اور ۲۶ مارچ کو انھو
نے ضلع گیا میں جہاں آباد کے مقام پر پرارتھنا سے خطاب کیا۔ اس پرارتھنا میں
گاندھی جی نے جو تقریر کی پیارے لال نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے "ا
دن صبح کو انھوں (گاندھی جی) نے ایک گاؤں کا دورہ کیا تھا جہاں ایک مسجد کے قریب
کسی شخص نے گذشتہ رات ایک غار کے اوپر ناریل کا درخت کاٹ کر ڈال دیا تھا
اس غار میں فسادات کے دوران ہلاک ہونے والے مسلمانوں کی لاشیں پڑی ہوئی
تھیں۔ پرارتھنا میں گاندھی جی نے بڑے غصے سے کہا کہ کیا ہندوؤں کو اس بات
تعجب ہے کہ ان کی یقین دہانی پر بھی مسلمان اپنے گھروں کو واپس آنے کو تیار نہیں
ہیں؟ پیارے لال نے آگے چل کر لکھا ہے "انھوں (گاندھی جی) نے یہ اعتراف
کیا کہ میں نے آج صبح جو کچھ دیکھا ہے اس کے بعد ہماری ہندوؤں کے وعدوں
مجھے اعتبار نہیں رہا۔"[2]

---

[1] وہائل میموری سروس۔ لیفٹیننٹ جنرل ٹکر۔ [2] مہاتما گاندھی۔ دی لاسٹ فیز
جلد اول صفحہ ۶۷۲۔ پیارے لال نوجیون پبلشنگ ہاؤس احمد آباد۔

لارڈ ویول کی خواہش تھی کہ لیگ اور کانگرس اس بات کی توثیق کر دیں کہ وہ
نٹ مشن کے ۱۶ ر مئی کے بیان پر عمل درآمد کے لیے عبوری حکومت میں شامل ہوئی
ں۔ اس سلسلے میں انھوں نے قائداعظم سے ملاقات کی۔ قائداعظم نے وائسرائے کو بتایا
مرف مسلم لیگ کونسل ہی اس کی مجاز ہے اور وہ یہ اسی صورت میں کرے گی جب کہ
زہ تجاویز کے استرداد کی بابت گذشتہ قرار دادیں واپس لے اور یہ کہ ممبروں کو
سب نوٹس دیئے بغیر کونسل کا اجلاس طلب نہیں کیا جاسکتا۔ ۲۶ اکتوبر کو نئی تشکیل
ہ عبوری حکومت نے حلف اٹھایا۔ مسلم لیگ کے نامزد ممبروں کو طے شدہ عہدے
یلے گئے۔ نہرو کو ایگزیکٹو کونسل کا نائب صدر بنایا گیا۔ پہلے روز ہی سے اُن
دیہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ مسلم لیگ کے نامزد ممبروں کو یہ باور کرانا چاہتے ہوں کہ
وزیر اعظم ہیں۔ عبوری حکومت میں لیگ کے نمائندوں نے اس پر اعتراض کیا۔
نت علی خاں نے ایک بیان میں اپنی پوزیشن کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا "عبوری
ومت میں ایک بلاک کانگرس کا اور دُوسرا مسلم لیگ کا ہے۔ ہر بلاک علیحدہ قیادت
بحت کام کر رہا ہے۔"

وائسرائے نے دستور ساز اسمبلی کا پہلا اجلاس ۹ دسمبر کو طلب کرنے کا
لہ کیا اور حکومت کے کانگرسی ارکان نے اصرار کیا کہ لارڈ ویول اسمبلی کے
بروں کو جلد از جلد دعوت نامے بھیج دیں۔ ۱۷ نومبر کو قائداعظم نے وائسرائے
لکھا کہ چونکہ کانگرس نے ۱۶ مئی کا بیان تسلیم نہیں کیا ہے۔ لہٰذا میرے لیے
بیکار محض ہے کہ مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کروں۔ اس سلسلے میں قائداعظم
ے اپنا نقطۂ نظر ثابت کرنے کے لیے کانگرس ورکنگ کمیٹی کی قراردادوں اور
رھی جی کے بیانوں کا حوالہ دیا۔ قائداعظم نے اپنے مکتوب میں ہندوؤں کے ہاتھوں
بے ہندوستان، خاص طور سے بہار میں، مسلمانوں کے بے رحمانہ قتل کی مذمت

کی۔ انھوں نے وائسرائے پر زور دیا کہ وہ ملک میں امن و امان بحال کرنے پر تمام
توجہ دیں۔ اور انھیں مشورہ دیا کہ وہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے
لیے ملتوی کر دیں۔

اِس مکتوب کے بعد قائدِ اعظم اور لارڈ ویول کی ملاقات ہوئی۔ قائدِ اعظم نے
ویول کو خبردار کیا کہ دستور ساز اسمبلی کا اجلاس طلب کرنا انتہائی سنگین غلطی ہوگی۔ اور
اُس کے خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ انھوں نے بہار میں جنونی ہندوؤں کے بہیمانہ
مظالم بیان کیے جہاں ہزاروں مسلمانوں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ وائسرائے کا کہنا تھا کہ
برطانوی حکومت ہندوستان چھوڑ دینا چاہتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ
برطانوی اقتدار کے خاتمے کے بعد اختیارات کی منتقلی کے معاملے پر کانگرس اور مسلم لیگ
میں اتفاق رائے ہو جائے۔ قائدِ اعظم نے جواب دیا کہ مسلمان ہندوستان سے انگریز
اقتدار کے خاتمے کے نتائج سے خوف زدہ نہیں ہیں اور وہ ہر قسم کے حالات کا
بالجزم کے ساتھ سامنا کریں گے، اور یہ کہ انگریز پاکستان کے قیام کو منظور کرنے کے
بعد ہندوستان سے کسی وقت بھی جا سکتے ہیں۔

مگر قائدِ اعظم کے مشورے کے برعکس وائسرائے نے ۲۲ نومبر کو دستور ساز
اسمبلی کے اجلاس کے دعوت نامے جاری کر دیے۔ قائدِ اعظم نے اس اقدام کو ایک
اور انتہائی سنگین اور خطرناک غلطی قرار دیا۔ وائسرائے نے جو حالات پیدا کر دیے تھے
ان کا مقابلہ کرنے کے لیے قائدِ اعظم نے دستور ساز اسمبلی کے مسلم لیگی ممبروں کو
ہدایات جاری کیں کہ وہ اجلاس کا بائیکاٹ کر دیں۔ لارڈ ویول اس پر بڑے برہم
ہوئے اور انھوں نے لیاقت علی خان کو مطلع کیا کہ جب تک مسلم لیگ غیر مشروط
طور پر ۱۶ مئی کا بیان قبول نہ کر لے گی، عبوری حکومت میں لیگی نمائندے اپنے فرائض
انجام نہ دے سکیں گے۔ لیاقت علی خاں عبوری حکومت میں شمولیت کے لیے وائسرائے

کی شرائط قبول کرنے کے بجائے حکومت سے فوراً مستعفی ہونے پر تیار ہو گئے۔ انھوں نے برطانوی حکومت پر یہ الزام بھی لگایا کہ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ کانگریس سے کیبنٹ مشن کا منصوبہ قبول کرا سکے۔ مسلمانوں کا یہ خیال غالباً درست تھا کہ انگریز دل نے مسلمانوں کو بھیڑیوں کے سپرد کر دیا ہے اور یہ کانگریسی بھیڑیے مسلمانوں کے ساتھ رحم کرنا نہیں چاہتے۔ لیاقت علی خاں نے کہا کہ ہندوستان کی موجودہ تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے کہ اگر ایک پائیدار نظام قائم کرنا ہے اور متفقہ طور پر کوئی دستور بنانا مقصود ہے تو کانگریس اور لیگ میں مفاہمت ناگزیر ہے، اور کانگریس کے مسلم لیگ دشمن رویّے کے سبب اس مفاہمت کا کوئی امکان نہیں ہے۔

دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ۹ر دسمبر کو طلب کیا گیا تھا لیکن وائسرائے نے اجلاس طلب کر کے ایک مصیبت اپنے سر لے لی۔

رہی سہی کسر نہرو نے پوری کر دی۔ نومبر میں میرٹھ کے مقام پر انھوں نے کانگریس کے سالانہ اجلاس میں کہا کہ وائسرائے "ناممکن کو ممکن بنانے کی تدبیریں کر رہے ہیں اور اس سے صورتِ حال انتہائی تشویش ناک ہو رہی ہے۔" انھوں نے اعلان کیا کہ عبوری حکومت کے کانگریسی اراکین مسلم لیگ کے نامزد ممبروں کے رویّے کے سبب دو مرتبہ حکومت سے مستعفی ہو جانے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ مسلم لیگی ممبر خود کو حکومتِ برطانیہ کا منظورِ نظر سمجھتے ہیں۔ انھوں نے کہا "ہماری قوت برداشت جواب دینے لگی ہے۔" نہرو کے بعد سردار پٹیل نے تقریر کی۔ انھوں نے کہا "مسلم لیگی اراکین کانگریس کے خلاف اعصابی جنگ شروع کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔" میرٹھ میں کانگریس کے اُن ممتاز لیڈروں کی گرج کڑک کے بعد قائد اعظم نے ایک بیان میں مسلم لیگ کی پوزیشن کی وضاحت کی اور کانگریس کے شعلہ بیان لیڈر پٹیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "سردار پٹیل کو مردِ آہن کہا جاتا

ہے۔ اس لیے انھوں نے سخت لب و لہجہ اختیار کیا ہے۔ مگر الفاظ سے کوئی گھائل نہیں ہوتا۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتے کہ جو شخص اس قسم کی کارروائیوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے وہ تمام فرقوں کا دشمن ہے۔ سردار پٹیل کو یہ تلوار کہاں سے ملی؟ کانگرسی وزیر اور ایگزیکٹو کے اراکین برطانوی سنگینوں کی حفاظت کے بغیر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے انھوں نے اس بیان میں یہ بھی فرمایا کہ 1919 کے ایکٹ کے مطابق عبوری حکومت محض ایک ایگزیکٹو کونسل ہے۔ یہ کسی طرح بھی کابینہ نہیں ہے۔ کسی گھوڑے کو محض ہاتھی کہہ دینے سے وہ ہاتھی نہیں بن جاتا۔

مرکزی حکومت میں لیگ اور کانگرس کے نمائندے وزیر تھے۔ مگر صاف ظاہر تھا کہ وہ مختلف النوع نظریات کے حامل تھے۔ ان کی راہِ عمل بالکل مختلف تھی۔

اس مرحلے پر نہرو نے دستور ساز اسمبلی کے مسلمان میروں کو خفیہ طور پر اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ سے اُن مسلم اراکین کی وفاداری ختم کرائی جائے۔ گاندھی جی کے نام ایک نجی مکتوب میں نہرو نے لکھا: "فی الوقت ہمارا مطمح نظر یہ ہے کہ چند مسلم لیگی لیڈروں سے پرائیویٹ بات چیت کی جائے اور انھیں دستور ساز اسمبلی میں شمولیت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی جائے"[1] لیکن کانگرسی چال ناکام ہو گئی اور ایک مسلمان بھی لیگ کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوا۔

وزیر اعظم برطانیہ نے حکومت برطانیہ، مسلم لیگ اور کانگرس کے درمیان ایک اور سہ جماعتی کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ اس سلسلے میں انھوں نے وائسرائے سے کہا کہ وہ دونوں پارٹیوں کے لیڈروں اور سکھ لیڈر سردار بلدیو سنگھ کو انگلستان آنے پر آمادہ کریں تاکہ پنجاب کے پیچیدہ مسئلے کو بھی جہاں سکھوں کی کثیر آبادی تھی، حل کیا جا سکے۔

---

[1] مہاتما گاندھی۔ دی لاسٹ فیز۔ جلد دوم صفحہ ۲ مطبوعہ ۱۹۵۸ء پیارے لال

وائسرائے نے ۲۶ نومبر کو پانچ لیڈروں کو اس سلسلے میں دعوت نامہ بھیجا۔ لیاقت علی خان نے اس کے جواب میں کہا کہ میں قائد اعظم سے جو ان دنوں کراچی گئے ہوئے ہیں، صلاح مشورہ کرنے کے بعد قطعی طور پہ کچھ کہہ سکوں گا۔ جناح صاحب لندن جانے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وزیر ہند اور نہرو کے درمیان کیا خط و کتابت ہوئی ہے۔ انھیں اس خط و کتابت کی نقول فراہم کی گئیں اور اُن کے مطالعے کے بعد اُنھوں نے لندن جانے کی درخواست قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس پہ خود وزیر ہند نے قائد اعظم کو تار دیا اور وہ لندن جانے کو تیار ہو گئے۔ ۲ دسمبر کو قائد اعظم، لیاقت علی خاں، نہرو، لارڈ ویول اور بلدیو سنگھ لندن پہنچے اور ہندوستانی لیڈروں اور برطانوی کابینہ کے نمائندوں کے درمیان ہندوستان کے مسئلے پہ مذاکرات شروع ہو گئے لیکن اس مرتبہ بھی مذاکرات ناکام ہی رہے۔ برطانوی حکومت نے ۶ دسمبر کو ایک بیان میں کہا کہ دونوں بڑی سیاسی پارٹیوں میں اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ "مذاکرات میں کیبنٹ مشن کا یہ خیال رہا ہے کہ مختلف فرقوں کی جانب سے جن امُور پہ اتفاق رائے ہوا ہے اس فرقے کے ممبروں کی اکثریت کے ووٹ سے منظور کیا جائے۔ لیگ نے یہ رائے قبول کر لی مگر کانگرس نے بالکل مختلف رائے پیش کی۔ اس نزاعی موضوع پہ حکومت برطانیہ نے فوراً کانگرس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ کیبنٹ مشن کی رائے قبول کر لے تاکہ مسلم لیگ کو اپنے رویّہ پہ نظر ثانی کرنے کا موقع فراہم کیا جا سکے۔" بیان میں کہا گیا تھا کہ ۱۶ مئی کی تجاویز کے معانی و مطالب پہ اختلاف ہونے کی صورت میں یہ معاملہ فیصلے کے لیے وفاقی حکومت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ آخر میں کہا گیا تھا کہ اگر کسی ایسی دستور ساز اسمبلی نے جس میں ملک کی آبادی کے ایک بڑے حصّے کو نمائندگی نہ دی گئی ہو، کوئی دستور مرتب کیا تو وہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ حکومت برطانیہ ملک کے کسی علاقے کی مرضی کے خلاف اس پہ یہ دستور مسلط نہیں کر سکتی۔"

نہرو نے حکومت برطانیہ کے اس بیان پر اظہارِ ناراضی کیا اور مایوس ہو کر وطن واپس آ گئے۔ قائد اعظم اور لیاقت علی خان کچھ عرصہ لندن میں رہے۔ قائد اعظم نے وہاں ایک تقریر میں کہا کہ پاکستان مسلمانوں کے عقیدے کا ایک جزو ہے۔ اس کا کوئی متبادل نہیں ہے۔ پاکستان کے مطالبے کو اگر قبول نہ کیا گیا تو ہندوستان میں خانہ جنگی شروع ہو جائے گی۔ ۵ دسمبر کو رائٹر کے سیاسی نامہ نگار سے ایک انٹرویو میں قائد اعظم نے کہا "ہم حق پر ہیں۔ ہمیں ناکامی نہیں ہوگی اور ہم اپنا نصب العین پاکستان حاصل کر کے رہیں گے"۔ انھوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ پاکستان اور ہندوستان "قریبی تعلق کے سبب اور برصغیر کی سلامتی کے پیش نظر" دوست ممالک کی طرح رہیں گے" ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ برطانوی عوام کچھ بیدار ہو چلے ہیں۔ برطانوی عوام اسی وقت بیدار ہوتے ہیں جب کوئی خطرہ سر پر منڈلاتا ہو"۔

پروگرام کے مطابق ۹ دسمبر کو دستور ساز اسمبلی کا اجلاس ہوا لیکن یہ اجلاس ایسا ہی تھا جیسے ہیملٹ کا ڈراما سٹیج کیا جا رہا ہو اور اُس میں ڈنمارک کے شہزادے کا کردار سرے سے غائب ہو۔ مسلم لیگ نے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ اجلاس میں ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے نمائندوں کی عدم شمولیت سے دستور ساز اسمبلی کی کارروائی محض تمسخر بن کر رہ گئی۔ قائد اعظم نے کانگرسی چالوں کا شکار بننے سے انکار کر دیا تھا۔

اجلاس میں نہرو نے ایک قرارداد پیش کی جسے انتہائی دبے لہجے میں "قرارداد مقاصد" کا نام دیا گیا۔ اس قراردادِ مقاصد پر جزوی بحث کے بعد دستور ساز اسمبلی کا اجلاس اس امید میں کہ مسلم لیگ کے نمائندے دوبارہ اجلاس ہونے پر اسمبلی کی کارروائی میں شریک ہوں گے اور نہرو کی قرارداد پر بحث میں حصہ لیں گے ۲۰ جنوری

۱۹۴۶ء تک ملتوی کر دیا گیا۔ اس چال کا جواب دینے کے لیے قائداعظم نے ۲۴ تاریخ
کراچی میں لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں ورکنگ کمیٹی
جو قرارداد منظور کی اس میں کہا گیا تھا کہ حکومتِ برطانیہ نے ۱۶ مئی کی تجاویز کی
نیق کر دی ہے۔ لیکن کانگریس، سکھوں اور اچھوتوں نے چونکہ اس سکیم کو مسترد
دیا ہے لہذا حکومت برطانیہ دستور ساز اسمبلی توڑ دے۔ اور یہ اعلان کرے کہ
مئی کی تجاویز کی سکیم ناکام ہو گئی ہے۔ قرارداد میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ
لم قوم کے نمائندوں کی عدم شرکت کے سبب دستور ساز اسمبلی محض ڈھونگ ہے
یہ وہ ادارہ نہیں ہے جس کی تشکیل مقصود تھی۔ کراچی کی ایک اخباری کانفرنس
قائداعظم نے کانگریس کی شاطرانہ چالوں کو بے نقاب کیا اور نہرو کے اس دعوے
دھجیاں اڑا دیں کہ مرکز میں کابینہ کی شکل میں حکومت موجود ہے اور وہ اس مرکزی
ت کے وزیراعظم ہیں۔ انھوں نے فرمایا "حقیقت یہ ہے کہ وہ (نہرو) اگر خوابوں
نیا سے باہر آئیں اور اپنے دماغ سے کام لیں تو انھیں معلوم ہوگا کہ نہ وہ وزیراعظم
اور نہ کوئی نہرو حکومت موجود ہے۔ وہ آزس ایگزیکٹو کونسل میں امورِ خارجہ اور
ت مشترکہ کے محکمے کے نگران ممبر ہیں۔ پنڈت نہرو اور کانگرس کی خواہش ہے کہ مسلم لیگ
مزوار اکین ان کی مرضی کے مطابق کام کریں، ہمارے لیے یہ صورتِ حال ناقابلِ قبول
۔ ہم کانگرس یا نہرو کے احکامات پر عمل نہیں کر سکتے۔"

پنڈت نہرو نے حالات اور صورتِ حال کے منطقی نتائج کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا
ستور ساز اسمبلی میں اپنی کامیابی پر مطمئن تھے لیکن یہ کوئی حقیقی کامیابی نہ تھی۔ اس
جہ یہ تھی کہ ان کی قیادت کو چیلنج کرنے کے لیے ان کے سیاسی حریف موقع پہ
ود نہ تھے۔

ادھر لارڈ ویول مشکل میں گرفتار تھے۔ انھوں نے یکم فروری کو نہرو کو طلب کیا

اور اُن کے سامنے اعتراف کیا کہ اُن کے خیال میں مسلم لیگ کی شمولیت کے بغیر دستور ساز اسمبلی ایک ڈھونگ کے سوا کچھ نہیں۔ ۵ فروری کو ایگزیکٹو کونسل میں کانگرس اور اقلیتوں کے نمائندوں نے مطالبہ کیا کہ وائسرائے مرکزی حکومت میں مسلم لیگ کے نامزد اراکین سے استعفا طلب کریں۔ اگلے روز وائسرائے نے لیاقت علی خاں کو اپنے رفقا کے خیالات سے آگاہ کیا۔ تمام حالات کا بخوبی جائزہ لینے کے بعد ۷ تاریخ کو لیاقت علی نے وائسرائے کے نام مکتوب میں تحریر کیا کہ کانگرسیوں کو ہم سے استعفا طلب کرنے کا کوئی حق نہیں کیونکہ مسلم لیگ کے موقف کے مطابق کانگرس نے کیبنٹ مشن کا ۱۶ مئی کا بیان قبول نہیں کیا ہے۔ انھوں نے کانگرس پر الزام لگایا کہ اس نے ۱۶ مئی کے بیان کی شرائط کی پابندی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اور اب وہ بڑی دیدہ دلیری سے مسلم لیگ کو مورد الزام ٹھہرا رہی ہے۔ لیاقت علی خاں نے قائد اعظم کے مشورے سے وائسرائے کو جو مکتوب تحریر کیا تھا مینن نے اُس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "وائسرائے مسلم لیگ کے موقف کے حق میں تھے، اور اُن کا خود یہ خیال تھا کہ کانگرس نے حقیقتاً کیبنٹ مشن کی تجاویز قبول نہیں کی ہیں[1]"

۱۳ فروری کو پنڈت نہرو نے وائسرائے کو پھر لکھا کہ وہ لیگ کے نامزد اراکین سے استعفا طلب کریں۔ اگرچہ انھیں بخوبی علم تھا کہ کانگرس کے اس موقف کا سرے سے کوئی جواز ہی نہیں ہے۔ ۱۵ فروری کو سردار پٹیل نے ایک اخباری انٹرویو میں کہا کہ لیگ یا تو حکومت سے الگ ہو جائے یا قرارداد کراچی میں تبدیلیاں کرے۔ صورت حال انتہائی خطرناک ہوتی جا رہی تھی اور حکومت برطانیہ خود کوئی فیصلہ کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ فرقہ وارانہ کشیدگی انتہا تک پہنچ گئی تھی۔

---

[1] : دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن صفحہ ۳۳۶

حکومت برطانیہ کو بڑے نازک حالات کا سامنا تھا۔ کیبنٹ مشن کا منصوبہ کام
ر چکا تھا اور دستور ساز اسمبلی مسلم لیگی نمائندوں کی عدم شرکت کے سبب کوئی فیصلہ
کر پائی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرقہ وارانہ صورتِ حال بھی بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ مینن
، جو ایک اعلیٰ سول افسر تھے، اس سلسلے میں لکھا ہے "مزید فرقہ وارانہ ہنگاموں کی صورت
ں فوج اور سرکاری ملازمین کی وفاداری مشکوک تھی"[1]۔ ان حالات کے پیشِ نظر حکومتِ
طانیہ یہ سوچنے لگی تھی کہ ہندوستان میں اقتدار و اختیارات کی منتقلی کے متعلق ایک
یخ مقرر کر دی جاتے تاکہ لیگ کانگرس مفاہمت کے عدم وجود کی صورت میں کوئی
سلہ کرنے کی ذمہ داری سے دامن بچایا جا سکے۔ یہ محسوس کیا جا رہا تھا کہ اس سلسلے
کوئی فیصلہ ہونے کے بعد دونوں بڑی جماعتیں اپنے رویے میں تبدیلی کریں گی
پاکستان اور ہندوستان میں نظم و نسق کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے قطعیت
ساتھ سوچیں گی۔

وزیر اعظم لارڈ اٹیلی نے ۲۰ فروری کو اعلان کیا کہ یہ افسوسناک امر ہے کہ
دں جماعتوں کے درمیان وسیع اختلافات موجود ہیں اور ان اختلافات کے سبب
ر ساز اسمبلی کی نمائندہ حیثیت پر اثر پڑا ہے۔ انھوں نے کہا "موجودہ غیر یقینی
ت حال خطرناک ہے اور اس صورتِ حال کو زیادہ عرصہ جاری رہنے نہیں دیا
سکتا۔ حکومتِ برطانیہ یہ واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ہم قطعی طور پر اقتدار اہل ہند کو
نپنا چاہتے ہیں اور جون ۱۹۴۸ء سے قبل ہی ذمہ دار ہندوستانی باشندوں کو
ر سپرد کرنے کے لیے ضروری اقدام کرنا چاہتے ہیں۔" انھوں نے آخر میں یہ بھی
اس سلسلے میں تیاریاں شروع ہو جانی چاہئیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا ذکر

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا صفحہ ۳۲۸

کرتے ہوئے جس کے تحت ہندوستان میں حکومت قائم تھی۔ انھوں نے کہا تھا: یہ ایکٹ ختم کر دیا جائے گا۔ اور اس لیے "اقتدار کی قطعی منتقلی کے لیے مناسب وقت میں ایک مسودہ قانون پیش کیا جائے گا۔ اقتدار کی منتقلی سے جو مسائل پیدا ہوں گے حکومت برطانیہ اُن پر اتفاق رائے اور سمجھوتہ کرانے کے لیے ان لوگوں کے نمائندوں سے مذاکرات کرے گی جنھیں وہ اقتدار سونپنا چاہتی ہے۔" وزیر اعظم نے کہا "برطانوی عوام کی جانب سے ہم اہل ہند کے لیے خیر سگالی کے جذبات اور بہترین تمناؤں کا اظہار کرتے ہیں اور ہماری خواہش ہے کہ وہ حکومت خود مختاری کے حصول کے آخری مرحلے میں کامیاب و کامران ہوں۔"

ایٹلی نے بیان کے آخر میں لارڈ ویول کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ انھیں دوران جنگ ہندوستان کا وائسرائے مقرر کیا گیا تھا مگر "لارڈ ویول ان مشکل حالات میں انتہائی فرض شناسی کے ساتھ اس بھاری ذمہ داری سے عہدہ برا ہوئے۔ لارڈ ویول کو اب سبکدوش کیا جا رہا ہے۔ اور ملک معظم کو لارڈ ویول کے جانشین کے طور پر ایڈمرل وائیکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن کے تقرر کی منظوری دیتے ہوئے خوشی ہے جو برطانوی ہند کی حکومت کی ذمہ داری اہل ہند کے سپرد کریں گے اور اس مقصد کے لیے ایسا طریقہ کار اختیار کریں گے جس سے ہندوستان مستقبل میں خوش حال رہ سکے۔ ایڈمرل وائیکاؤنٹ ماؤنٹ بیٹن مارچ میں لارڈ ویول سے چارج لیں گے۔ ایوان کو اس امر سے خوشی ہوگی کہ ملک معظم نے وائیکاؤنٹ ویول کے لیے ارل کا خطاب منظور کیا ہے۔"

ایٹلی کے بیان پر دارالعوام میں پورے دو دن بحث ہوئی۔ سر اسٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ برطانوی حکومت یا تو ہندوستان پر اپنی گرفت سخت کرے یا پھر ایک قطعی تاریخ مقرر کر دے اور ہندوستانی لیڈروں پر واضح کر دے کہ حکومت برطانیہ مقررہ تاریخ

کے بعد ہندوستان پر اپنا اقتدار رکھنا نہیں چاہتی۔ موخر الذکر امر دور اندیشی پر مبنی تھا
اور کابینہ اس کی منظوری دے چکی تھی۔ بحث میں حصہ لیتے ہوئے ونسٹن چرچل نے
دستور ساز اسمبلی پر نکتہ چینی کی جس کا انتخاب "ناکافی اور غیر نمائندہ رائے دہی کی بنیاد
پر ہوا تھا۔ انھوں نے کہا ایسے سیاست دانوں کو جن کی حیثیت غیر نمائندہ ہو، اقتدار
سونپنا انتہائی خطرناک ہے۔ چرچل نے متنبہ کیا "ایسے نام نہاد سیاسی طبقوں کو حکومت
سونپ کر ہم درحقیقت ایسے کاغذی افراد کو اقتدار منتقل کر رہے ہیں جن کا چند سال بعد
ی نام ونشان باقی نہ رہے گا" چرچل کے اندازے غلط نکلے۔ اٹیلی نے بحث ختم
رتے ہوئے کہا "تاخیر والتوا میں بھی اتنا ہی خطرہ ہے جس قدر آگے بڑھنے میں"
اگلے روز لارڈ ویول نے لیاقت علی خاں اور نہرو سے الگ الگ ملاقات کی۔
یاقت علی خاں نے وزیر خزانہ کی حیثیت سے وائسرائے کو مطلع کیا کہ عوام کا روپیہ
اب ایسی دستور ساز اسمبلی پر خرچ کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے جو کیبنٹ مشن کی تجویز
ردہ اسمبلی سے بالکل مختلف ہے۔ لیاقت علی خاں اس موضوع پر قائد اعظم سے
لاح مشورہ کر چکے تھے اور مسلم لیگ نے ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کے متعلق
لی کے بیان کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی
ض سے ٹھوس اور پختہ ردِ عمل اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اخباری نمائندوں
ے پارلیمنٹ میں اٹیلی کے اعلان پر قائد اعظم سے تبصرہ کرنے کو کہا تو انھوں نے فرمایا
سلم لیگ نے تہیہ کر رکھا ہے کہ وہ قیام پاکستان کے مطالبے سے ایک انچ پیچھے
ہیں ہٹے گی۔

ہندوستان میں انتقا[illegible]ت کی منتقلی کے متعلق برطانیہ کے فیصلے کے بعد خضر حیات
پنجاب میں آئندہ حالات [illegible]نیت کا اندازہ ہوگیا تھا اس لیے انھوں نے ۲ مارچ
۱۹۴۷ء کو وزیر اعلیٰ پنجاب کی حیثیت سے گورنر کو استعفا پیش کر دیا۔ پنجاب کے گورنر

سر ایوان جینکنس نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ وہ پنجاب میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۲ کے تحت گورنر راج نافذ کر دیں مگر لارڈ ویول نے فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ پارٹی کے لیڈر نواب ممدوٹ کو وزارت بنانے کی دعوت دی جائے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ پارٹی سے تعاون کرنے یا مخلوط حکومت بنانے سے انکار کر دیا اور آخر کار پنجاب میں دفعہ ۹۳ کے تحت گورنر راج نافذ کر دیا گیا۔

ایک طرف تو پنجاب میں کانگرس، ہندوؤں اور سکھوں کی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں غیر نمائندہ یونینسٹ پارٹی سے مسلم لیگ کو اقتدار کی منتقلی رک گئی تھی اور دوسری طرف انتہا پسند ہندوؤں نے پنجاب کے ہندوؤں اور سکھوں میں فرقہ وارانہ منافرت اور اشتعال پھیلانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ لاہور کی سڑکوں پر قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زدگی کی وارداتیں ہونے لگیں۔ لاہور سے یہ شعلے بڑھتے بڑھتے ملتان، راولپنڈی، امرتسر اور لدھیانہ میں دیہات تک پھیل گئے۔ ہر طرف قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا صوبے میں حالات کو اور پیچیدہ بنانے کے لیے نچلے درجے کے سرکاری ملازموں نے جو یونینسٹ پارٹی کی حکومت کے دوران بھی تنخواہوں میں اضافے کی کوشش کرتے رہے تھے، پورے صوبے میں ہڑتال کی دھمکی دے دی۔ ہندوستان میں سیاسی جذبات پرستی، فرقہ وارانہ بے چینی، اقتصادی بدحالی اور بے اطمینانی کی لہر آئی ہوئی تھی۔ ادھر غذائی صورت حال بھی ابتر ہونے لگی۔ ملک میں افراط زر سے بھی سنگین اقتصادی بحران کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کارخانوں کے مزدور اور دفتروں کے ملازم غیر مطمئن تھے۔ قیمتوں میں اضافے ان کی برداشت سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ سیدھے سادے کاشت کاروں نے بھی اپنے جائز حقوق منوانے کے لیے، جن سے انھیں مدتوں محروم رکھا گیا تھا، جان ہتھیلی پر رکھ لی تھی۔

اس وقت کانگرسی لیڈر پاکستان کے قیام کو روکنے کے لیے جو ایڑی چوٹی
زور لگا رہے تھے، سردار پٹیل کے ایک خط سے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ سردار پٹیل
۔۴ مارچ کو بمبئی میں اپنے ایک دوست کانجی دوارکا داس کو لکھا: "اگر لیگ پاکستان
ے قیام پر اصرار کرتی ہے تو اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں کہ پنجاب اور بنگال
قسیم کر دیا جائے۔ مسلم لیگ کو پورا پنجاب یا بنگال نہیں مل سکتا۔ میں نہیں سمجھتا کہ
ومت برطانیہ تقسیم پر تیار ہو جائے گی۔ آخر کار اُسے یہ فیصلہ کرنا پڑے گا کہ مستحکم ترین
عت کو اقتدار سونپنے ہی میں دانش مندی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو مرکزی حکومت جس
تحت مشرقی بنگال اور پنجاب کے ایک حصے، سندھ اور بلوچستان کے سوا تمام ہندوستان
ا۔ اتنی مضبوط ہو گی کہ باقی علاقے انجام کار خود بخود اس میں شامل ہو جائیں گے۔"[1]

۵ مارچ کو کانگرس کی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں ملک کی صورتِ حال کا جائزہ
ا اور اُسے یہ یقین ہو گیا کہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی سے
ان کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ اجلاس میں ایک قرارداد کے ذریعے پنجاب میں فرقہ وارا
ت کی مذمت بھی کی گئی اور تقسیم پنجاب و بنگال کا مطالبہ بھی کیا گیا۔ اسی روز کانگرس
ہدر نہرو نے ایک بیان میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے بارے میں کانگرس کے موقف
ئز ٹھہرایا اور کہا کہ ان صوبوں میں فرقہ وارانہ مسئلے کے مستقل حل کا واحد طریقہ تقسیم
۔ نہرو نے اس بیان میں یہ بھی کہا کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم سے دونوں صوبوں
سلمان غیر مسلموں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہو جائیں گے اور اس طرح وہاں فرقہ وارانہ
دات نہیں ہوں گے۔

مہاتما گاندھی ۔۔ دی لاسٹ فیز ۔ جلد دوم ۔ صفحہ ۸۳ ۔ ۱۹۵۶ء
۔ پارے لال ۔

لیکن کانجی دوارکا داس کے نام سردار پٹیل کے محولہ بالا مکتوب سے معلوم ہوتا ہے کہ کانگرس کے حقیقی عزائم کیا تھے۔ نہرو نے گاندھی جی کے نام ایک مکتوب میں کہا کہ جہاں تک پنجاب کی تقسیم کے متعلق ہماری تجویز کا تعلق ہے۔ درحقیقت یہ ہمارے گذشتہ فیصلوں کے عین مطابق ہے۔ مجھے یقین ہے اور ورکنگ کمیٹی کے بیشتر اراکین میرے ہم خیال ہیں کہ ہمیں اس تقسیم پر اصرار کرنا چاہیے تاکہ حقیقت بے نقاب ہو جائے درحقیقت یہی اس تقسیم کا واحد جواب ہے جس کا مسٹر جناح مطالبہ کر رہے ہیں"۔ کئی سال بعد ہینڈریل مون نے تقسیم پنجاب و بنگال کے بارے میں نہرو کے موقف پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ایسا نظر آتا ہے کہ نہرو اور اُن کے ساتھی کسی خلفشار میں مبتلا تھے، انتہائی مایوسی اور دل شکستگی کی حالت میں نہرو اور اُن کے دوستوں نے ایسی کارروائیاں کیں جن کے نتائج اُن کی توقعات کے بالکل برعکس برآمد ہوئے۔ وہ ہندوستان کا اتحاد برقرار رکھنے کے خواہاں تھے مگر اُن کی کارروائیوں سے تقسیم یقینی ہو گئی[1]

مارچ میں لیاقت علی خاں وزیر خزانہ کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی میں اپنا پہلا بجٹ پیش کر رہے تھے۔ نئے ٹیکسوں کی تجاویز کے تحت لیاقت علی خاں نے ایک لاکھ سے زیادہ آمدنی پر کاروباری منافع کا ٹیکس بشرح ۲۵ فیصد تجویز کیا تھا۔ مجوزہ ٹیکس کے خلاف بڑے بڑے ہندو بنیوں نے جو کانگریس کی اقتصادی پالیسیوں کو مؤثر طور پر کنٹرول کرتے تھے، شور و غوغا برپا کر دیا۔ بجٹ کو فرقہ وارانہ رنگ دیا گیا اور الزام لگایا گیا کہ اس ٹیکس کا مقصد ہندو مہاجنوں کو نقصان پہنچانا ہے کیونکہ بڑے پیمانے پر گنتی کے چند مسلمان ہی تجارت کرتے ہیں۔ تعجب کی بات ہے کہ ہندو جیسے تنگ نظر اور متعصب لوگوں نے اس سوشلسٹ نظریے کی دھوم مچی ہوئی تھی لیاقت علی خان

---

[1] دوا تہذا ہند گونت - ہینڈریل مون

کے سوشلسٹ بجٹ کے مخالفوں کی حمایت کی۔ نہرو نے لارڈ ویول سے ملاقات
لی اور اُن سے درخواست کی کہ وہ اس معاملے میں مداخلت کریں اور وزیر خزانہ
ر ہ ٹیکس واپس لینے پر مجبور کریں۔ مارچ کی آخری تاریخوں میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن
، بجٹ کی آخری منظوری سے چند روز پہلے اس تعطل کو دور کیا۔ ایلن کیمپبل جانسن
قم طراز ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے تین گھنٹے تک نہرو سے مذاکرات کیے اور پھر
یاقت علی خاں سے دو گھنٹے تک گفتگو کی جن کے بجٹ نے "کانگرس کو بڑی مشکل صورتِ حال
ے دوچار کر دیا تھا۔ کانگرس کو ترقی پسند نظریات کے باوجود اپنے حامی مہاجنوں کے
ماد کا تحفظ کرنے اور انھیں اس ٹیکس سے نجات دلانے پر مجبور ہونا پڑا۔ لیونارڈ
سلے نے لیاقت علی خاں کے بجٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "لیاقت علی خاں
بجٹ سے کانگرس کے کروڑپتی حامیوں پر کاری ضرب پڑتی تھی، اور اس سے یہ
اہر ہو گیا کہ سوشلسٹ ہونے کے متعلق کانگرس کا دعویٰ محض ایک ڈھونگ ہے"
متحدہ ہندوستان اور پاکستان کے مسئلے کی وجہ سے سرکاری ملازموں کی وفاداری
بیم ہو کر رہ گئی تھی۔ بڑے شہروں میں جب بھی کانگرس یا مسلم لیگ کے عہدہ دار عام
سوں سے خطاب کرتے، ہزاروں سرکاری ملازم ان جلسوں میں شریک ہوتے۔
نظامیہ کی غیر جانبداری جو استحکام اور امن و امان کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتی
ہے، متزلزل ہو گئی تھی۔ مینن نے اس سلسلے میں لکھا ہے: "حد تو یہ ہے کہ افواج کے
اراکین دکھ انکے اعلیٰ افسران، نے بھی اپنی روایتی وفاداری اور غیر جانبداری ترک

ے مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن۔ صفحہ ۴۳ مطبوعہ 1951 رابرٹ ہیل
لمیٹڈ لندن

ے وی لاسٹ ڈیز آف دی برٹش راج۔ لیونارڈ موسلے

کردی تھی۔ اور اس سیاسی چپقلش میں کھل کر کسی ایک جماعت کا ساتھ دے رہے تھے
آغا خاں نے اس دور کی سیاسیاتِ ہند کے رجحان کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:" یکجہتی کا وہ احساس جس نے میری نوجوانی اور اس سے پہلے کے زمانے میں، ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی بنیادیں استوار کی تھیں، جس سے اُن کے اخلاقی نظام کا تانا بانا بنا تھا۔ اور جو اُن کی قومی زندگی میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا تھا، اب مفقود ہو چکا تھا۔"[1] ——— برطانوی ہند کی دشواریوں میں اضافہ کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ سول نظم و نسق میں انگریز افسروں کی تعداد تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ انگریزوں نے نوشتۂ تقدیر پڑھ لیا تھا، اور انھیں احساس ہو چلا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی سلطنت کچھ دنوں کی مہمان ہے۔ انگریزوں کی خاص پریشانی ہندوستان سے واپسی تھی۔ سوال صرف یہ تھا کہ واپسی فوراً شروع ہو جائے یا چند روز کے بعد۔ ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کے اس آخری مرحلے میں انڈین سول سروس میں تقریباً دو ہزار انگریز افسر تھے۔ اتنی محدود و مختصر قوت سے چالیس کروڑ باشندوں کی قوم کو زیادہ عرصے تک سیاسی اعتبار سے محکوم رکھنا آسان نہ تھا۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے لگی تھیں۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لارڈ ویول سے وائسرائے ہند کے عہدے کا چارج لیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو یہ ذمہ داری سونپی گئی تھی کہ وہ جون ۱۹۴۸ء تک اہلِ ہند کو اقتدار منتقل کر دیں۔ حلف اٹھانے کے موقع پر انھوں نے کہا: "مجھے اپنے فرائض کی مشکلات کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں ہے"

---

[1] دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ دی پی مینن صفحہ ۳۴۸

[2] دی میموائرز آف آغا خاں۔ صفحہ ۲۰۸

وائسرائے کی حیثیت سے انھوں نے سب سے پہلے جناح صاحب اور گاندھی جی سے بے تکلفانہ اور آزادانہ مذاکرات کیے۔ ماؤنٹ بیٹن کی کوششوں کے نتیجے میں دونوں لیڈروں نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام ایک مشترکہ اپیل پر دستخط کیے جس میں کہا گیا تھا کہ فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ بند ہو جانا چاہیئے کیونکہ اس سے ہندوستان کی تاریخ داغدار ہو گئی ہے۔ مشترکہ اپیل میں سیاسی اور آئینی ایجی ٹیشن کے بجائے تشدد سے کام لینے کی بھی مذمت کی گئی تھی۔ بدقسمتی سے لوگ اتنے مغلوب الغضب ہو چکے تھے کہ اس اپیل کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔

وائسرائے کا عہدہ سنبھالنے کے کچھ عرصہ بعد ہی لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے محسوس کیا کہ وحدانی طرز حکومت کے ذریعے ہندوستان کو متحد نہیں رکھا جا سکتا، اور چونکہ یہ انتظام تصنع آمیز ہوگا بنابریں حالات اور حقائق کے دباؤ سے یہ درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ لہٰذا انھوں نے ایک متبادل منصوبہ تیار کیا جس کے تحت صوبوں یا صوبوں کے فیڈریشن کو اختیارات منتقل کرنے مقصود تھے بشرطیکہ صوبے کوئی فیڈریشن بنا سکیں۔ تاہم پنجاب اور بنگال کی اسمبلیوں کے دو حصّے کیے گئے تھے یعنی مسلم حصّہ اور غیر مسلم حصّہ اور اگر دونوں حصّوں نے یہ طے کیا کہ ان صوبوں کی تقسیم ہونی چاہیئے تو اُسے صوبے کی خواہش کے طور پر قبول کر لیا جائے گا۔ اگر بنگال کی تقسیم کی گئی تو آسام میں مسلم اکثریت کے ضلع سلہٹ کو پاکستان سے شمولیت کا حق دیا جائے گا (بشرطیکہ سلہٹ اس ضمن میں فیصلہ کرے) شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے وہاں رائے شماری کرائی جائے گی۔ وائسرائے نے صوبائی گورنروں کے ایک اجلاس میں نئے منصوبے کی وضاحت کی۔ پنجاب اور بنگال کے گورنروں نے اپنے اپنے صوبوں کی تقسیم کے معاملے پر ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار کیا مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو تو فکر اس بات کی تھی کہ مسلم لیگ اور کانگرس کی رضامندی سے آخر اقتدار کی منتقلی ہو تو کیسے ہو، خاص طور

سے اس صورت میں جب کہ انھیں ذاتی طور پر معلوم تھا کہ جناح صاحب ایسے کسی منصوبہ کو ہرگز قبول نہ کریں گے جس میں ہندوستان کو دو حصوں "پاکستان اور ہندوستان" میں تقسیم کرنے کا اصول تسلیم نہ کیا گیا ہو۔

۲۶ مارچ کو ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو مذاکرات کے لیے مدعو کیا۔ کیمپبل جانسن نے اس ملاقات کے بارے میں لکھا ہے "اُن کا (پٹیل) موقف بالکل واضح اور قطعی تھا۔ ہندوستان کو مسلم لیگ سے نجات ملنی چاہیے۔" کانگرس کے مردِ آہن پٹیل مسلم لیگ سے نجات حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔ اور فرقہ پرست ہندوؤں کے انتہا پسند عناصر دس کروڑ مسلمانانِ ہند کو موت کے گھاٹ اتارنے کے درپے تھے۔ یہ تھا اس وقت لیگ کے مخالفین کا رویہ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ قائداعظم کی قیادت میں مسلم لیگ اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ مخالفین کو اس کی قوت ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔

بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے متعلق کانگرس کی تحریک ناکام کرنے کے لیے قائداعظم نے ایک بیان میں فرمایا کہ یہ "تحریک بغض و عناد اور کینہ پروری پر مبنی ہے" انھوں نے کہا کہ ان دو صوبوں کی قطع و برید کا اصول اگر تسلیم کر لیا گیا تو دیگر صوبوں کے سلسلے میں بھی یہی طریقہ کار اختیار کرنا ہوگا۔ بیان کے آخر میں قائداعظم نے اصرار کیا کہ دفاعی افواج، ورسٹو، پاکستان اور ہندوستان کے درمیان منصفانہ طور پر تقسیم کیے جائیں تاکہ دونوں نو آزاد ملکوں میں کوئی اختلاف یا کشیدگی باقی نہ رہے۔ بابو راجندر پرشاد جیسے کانگرسی لیڈروں نے اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کی کہ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی تقسیم کا اصول تسلیم کیا گیا ہے اور یہ وہی قرارداد ہے جس پر مطالبہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ ادھر سکھ بھی جیسے خوابِ غفلت سے بیدار ہو گئے اور انھوں

لے۔ مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن صفحہ ۴۶

نے پنجاب میں اپنے لیے علیحدہ وطن "سکھستان" کا مطالبہ پیش کر دیا۔ جواباً یوپی اور بمبئی کے مسلمانوں نے دونوں صوبوں میں بعض علاقوں کو مسلمانوں کے علاقے قرار دینے کا مطالبہ کیا۔

سرحد میں، جہاں وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نے مسلم لیگ کے سینکڑوں لیڈروں اور کارکنوں کو قید کر رکھا تھا، مسلم لیگ کی مقبولیت میں بے پناہ اضافہ ہو رہا تھا۔ گرفتاریوں اور ظلم و ستم کے باوجود سرحد کے غیور و بہادر مسلمان کانگرسی وزارت کی شدید مخالفت کرتے رہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے سرحد کے گورنر سر اولیف کاروے اور ڈاکٹر خان صاحب کو صلاح مشورے کے لیے دہلی طلب کیا۔ اس بات چیت کے نتیجے میں یہ طے ہوا کہ صوبہ سرحد کی حکومت ایسے تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کر دے گی جو تشدد کی کارروائیوں کے تحت ماخوذ نہیں ہیں۔ مگر لیگ کے کارکنوں نے رہا ہونے سے انکار کر دیا اور مطالبہ کیا کہ پہلے کانگرسی وزارت، جو سرحد کے عوام کی نمائندہ نہیں ہے، "مستعفی ہو۔" اس پر وائسرائے کو خود سرحدی صوبے کا دورہ کرنا پڑا کیونکہ قبائلی علاقوں میں ہنگامے ہونے لگے تھے اور صورتِ حال انتہائی خطرناک ہوتی جا رہی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کی کوششوں کے باوجود مسلم لیگ نے پوری قوت کے ساتھ اپنا ایجی ٹیشن جاری رکھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ہندوستان کے سیاسی لیڈروں سے برابر مذاکرات کر رہے تھے تاکہ اقتدار پُرامن طور پر جلد از جلد منتقل کیا جا سکے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ۵ اپریل کو قائد اعظم سے ملاقات کی۔

کیمپبل جانسن نے اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ جناح صاحب کے رخصت ہونے کے بعد ماؤنٹ بیٹن کا ردِ عمل یہ تھا کہ "میرے اللہ! وہ تو بہت سرد مہر ہیں۔ بیشتر وقت تو انھیں نرم کرتے ہی میں صرف

ہو گیا ہے[1] وائسرائے کے متعلق قائداعظم کی رائے بھی کچھ اسی طرح کی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن سے بات چیت کے بعد انھوں نے اپنے سیکرٹری سے کہا" وائسرائے کچھ نہیں سمجھتے[2]" دوسرے دن شام کو وائسرائے نے قائداعظم اور ان کی بہن مس فاطمہ جناح کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ کیمپبل جانسن نے اس دعوت کے متعلق لکھا ہے کہ قائداعظم نے انتہائی وضاحت کے ساتھ وائسرائے کو پاکستان کے بارے میں مسلمانوں کے موقف سے آگاہ کیا۔ انھوں نے اس بات پر احتجاج کیا کہ" کانگریس کوئی چیز چھوڑنا نہیں چاہتی۔ وہ مجھے پاکستان سے محروم کرنے کے لیے ڈومینین کی حیثیت قبول کر لینے کو بھی آمادہ ہو جائے گی[3]"

ملک کی مجموعی صورت حال خاص طور سے سرحد کے حالات سے مایوس ہو کر ۲ مئی کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لارڈ اسمے اور جارج ایبل کے ذریعے اپنی تجاویز لندن بھیجیں ان ایلچیوں نے لارڈ لسٹوول سے جو لارڈ پیتھک لارنس کی جگہ وزیر ہند مقرر ہوئے تھے، ملاقات کی اور انھیں یہ تجاویز پیش کیں۔ وائسرائے نے درخواست کی تھی کہ ۱۰ مئی تک ان تجاویز کی منظوری دے دی جائے تاکہ میں ایک ہفتے کے بعد تمام لیڈروں کا اجلاس طلب کر کے اُن سے یہ تجاویز منظور کرانے کی کوشش کروں لیکن اس اجلاس میں اگر اتفاق رائے نہ ہو سکے تو حکومت برطانیہ خود یہ فیصلہ کرے گی کہ اختیارات کی منتقلی کے لیے کیا طریقہ کار اختیار کیا جائے؟ ایک طرف تو وائسرائے

۱: مشن وِد ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن صفحہ ۵۶

۲: جواہر لال نہرو۔ فرینک موریس۔ صفحہ ۲۲۲ مطبوعہ ۱۹۵۶ء۔ دی میکملن کمپنی نیویارک

۳: مشن وِد ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل۔ صفحات ۵۷۔۵۸

لے ایلچی خفیہ مشن پر لندن گئے ہوئے تھے۔ دوسری طرف وائسرائے کی دعوت
نہرو اور کرشنا مینن ۸ مئی کو وائسرائے کے مہمان کی حیثیت سے شملہ پہنچے۔ وی پی
مینن نے لکھا ہے کہ میں نے نہرو سے بات کی تھی جو "ڈومینین کی حیثیت سے اختیارات
منتقلی کی تجاویز کے مخالف نہ تھے" اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستانی سیاسیات
لے اس دور میں بھی نہرو قیام پاکستان کو روکنے کے لیے مکمل آزادی سے دستبردار
نے کو تیار تھے۔ مینن رقمطراز ہیں: "میں نے نہرو کو بتایا کہ ڈومینین کی بنیاد پر اگر
تدار منتقل کیا گیا تو کانگرس ایک مضبوط و مستحکم مرکزی حکومت قائم کر سکے گی اور
س طرح پاکستان قائم نہ ہو سکے گا۔"[۱]

اتفاقاً اسی روز لارڈ اسمے لندن سے واپس آ گئے۔ وہ وائسرائے کے لیے
طانوی کابینہ کی جانب سے آخری تجاویز لے کر آئے تھے۔ وائسرائے نے فوراً
ئداعظم، لیاقت علی خاں، نہرو، پٹیل اور بلدیو سنگھ کو ۱۷ تاریخ کو دہلی میں ملاقات
ی دعوت دی۔ انھوں نے قائداعظم کو ان تجاویز کے متن سے بے خبر رکھا، مگر
تاریخ کی شب کو انھوں نے نہرو کو لندن سے موصول ہونے والی تجاویز دکھا دیں۔[۲]
ہرو نے یہ تجاویز مسترد کر دیں اور کہا کہ کانگرس انھیں قبول نہیں کرے گی۔ لارڈ اسمے
تجاویز لے کر آئے تھے۔ ان کے مطابق ہندوستان کو کئی یونٹوں میں تقسیم کیا جانا
تھا۔ ان تجاویز میں متحدہ ہندوستان کا نظریہ مسترد کر دیا گیا تھا اور مجوزہ یونٹوں کو دو یا
ائد خود مختار مملکتوں کے ساتھ اتحاد کا اختیار دیا گیا تھا۔ اس بات کی امید کم ہی تھی
قائداعظم یہ تجاویز قبول کر لیں گے۔ اس مرحلے پر ہندوستان کی سول سروس کے

---

۱ : دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن۔ صفحات ۲۵۹-۲۶۰

۲ : دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا وی پی مینن صفحہ ۲۶۱

ایک سینئر افسر وی پی مینن نے جو وائسرائے کے ذاتی عملے میں شامل تھے، وائسرائے پر زور دیا کہ وہ متبادل طریقہ کار کے طور پر اُن کی ڈومینین اسکیم قبول کرلیں کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ ملک میں خانہ جنگی سے بہتر یہ ہے کہ ملک کی تقسیم کردی جائے[1] مینن نے جو سکیم تیار کی تھی اُس کے آٹھ حصّے تھے کیمپبل جانسن کے الفاظ میں "یہ اُن لیڈروں کی مشکلات کو حل کرنے کی ایک جرأت مندانہ کوشش تھی جو ایک غیر مقبول فیصلے کی ذمہ داری لینے سے گریزاں تھے[2] اس خاکے کے مطابق عبوری انتظام کے طور پر ملک کو ڈومینین کی حیثیت دے دی جاتی اور اس کے بعد ایک یا دو خود مختار مملکتوں کو اختیارات منتقل کر دیئے جاتے۔ ان خود مختار مملکتوں یا مملکت کے قیام کا فیصلہ "عوام کی رائے معلوم کرنے کے بعد کیا جاتا کہ آیا وہ ہندوستان کی تقسیم کے خواہاں ہیں کہ نہیں" اگر دو خود مختار مملکتیں قائم ہوتیں تو دونوں مملکتوں کا ایک ہی گورنر جنرل ہوتا لیکن تقسیم کی صورت میں سرحدوں کی حد بندی کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا جاتا۔ اس تجویز کی ایک شق کے مطابق ہندوستان کی موجودہ مسلح افواج کو علاقائی بھرتی کی بنیاد پر تقسیم کرکے دونوں حکومتوں کے سپرد کیا جانا تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے مذاکرات کے لیے قائد اعظم کو پھر مدعو کیا اور انتہائی نرم لہجے میں دھمکی دی کہ اگر مسلم لیگ نے تجاویز قبول نہ کیں تو برطانیہ کو مجبوراً ڈومینین درجے کی عبوری حکومت کو اختیارات منتقل کرنے پڑیں گے۔ قائد اعظم اپنے اس مطالبے پر قائم رہے کہ ملک میں دو آزاد اور خود مختار مملکتیں قائم ہونی چاہییں۔ کیمپبل جانسن کے الفاظ میں قائد اعظم نے انتہائی دانش مندی کا ثبوت دیا تھا حالات

---

1. دی ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ وی پی مینن صفحہ ۳۵۸

2. مشن ود ماؤنٹ بیٹن ایلن کیمپبل جانسن ۹۲

ے مدو جزر سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ جناح کے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔
ؤنٹ بیٹن کے خیال میں جناح کو بخوبی علم ہے کہ وہ ایک ایسے شہید کا مرتبہ رکھتے
ہں جسے انگریزوں کے ہاتھوں کانگریس کی قربان گاہ پر قتل کیا گیا ہے[۱]"

حکومتِ برطانیہ کی تجاویز کی بابت لیگ اور کانگریس کے لیڈروں کے خیالات
حلوم کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن ۱۸ تاریخ کو لندن روانہ ہو گئے" تاکہ برطانوی
بینہ سے ہندوستان کی صورتِ حال کے متعلق ذاتی طور پر تبادلہ خیال کر سکیں اور ایسی
جاویز پیش کریں جو اس تعطل کو دور کرنے کے لیے اُن کی نظر میں بہترین تجاویز
ی حیثیت رکھتی ہیں۔ وہ وی پی مینن کو اپنے ہمراہ لے گئے تھے۔ ایلن کیمپبل جانسن
نے اس پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا ہے "شملہ میں اپنی نمایاں خدمات کے سبب
ی پی (مینن) کا ستارہ عروج پر ہے اور انھیں ماؤنٹ بیٹن کا پورا اعتماد حاصل ہے[۲]۔"
ن واقعات کے کئی سال بعد مینن نے اپنی کتاب میں انکشاف کیا" میں ولبھ بھائی پٹیل
شملے کے واقعات کی اطلاع دے رہا تھا اور انھیں حالات و واقعات کے اس
مداز سے خوشی تھی۔ انھوں نے مجھے یقین دلایا کہ کانگریس کسی دشواری کے بغیر ڈومینین
حیثیت تسلیم کرے گی" اور یہ حضرت جو کانگریسی لیڈروں کو تمام باتوں کی خبر دیتے رہتے
، حکومتِ برطانیہ اور کانگریس کے درمیان مذاکرات کے اس اہم اور نازک مرحلے پر
نسرائے کے مشیر کی حیثیت سے ان کے ساتھ لندن جا رہے تھے

لندن میں ماؤنٹ بیٹن نے جو مذاکرات کیے اُن کی بابت وہ دہلی میں اپنے
لچیوں کے ذریعے قائدِ اعظم اور نہرو کو باخبر رکھ رہے تھے۔ دونوں لیڈروں کو
تانا مقصود تھا کہ ان اہم مذاکرات میں آخری تجاویز کس طرح مرتب کی جا رہی ہیں۔

۱، ۲ : مشن وِد ماؤنٹ بیٹن ایلن کیمپبل جانسن صفحہ ۹۴

اس موقع پر قائداعظم نے ۲۲ مئی کو رائٹر کے نامہ نگار کو ایک انٹرویو دیا۔ قائداعظم نے مطالبہ کیا کہ پاکستان کے مجوزہ، دونوں بازوؤں یعنی مشرقی اور مغربی پاکستان کو ملانے کے لیے ہندوستان کی سرزمین پر ایک گزرگاہ (کوریڈار) دی جائے۔ اس ضمن میں کیمبل جانسن نے لکھا ہے: "معلوم ہوتا ہے کہ یہ گزرگاہ حاصل کرنے کے لیے اسٹالن کی تکنیک استعمال کی گئی ہے"۔[1]

گزرگاہ کے مطالبے پر کانگریس اور ہندوؤں کے اخباروں میں بڑی لے دے ہوئی۔ نہرو نے اسے ایک "عجیب و غریب اور بیہودہ مطالبہ" قرار دیا اور ہندوستان ٹائمز نے لکھا: "اگر پاکستان کی بقا کا دارومدار گزرگاہ پر ہے تو یہ پاکستان، ہرگز قائم نہیں ہوگا۔" راجندر پرشاد نے کہا "جناح کا مطالبہ ایسا ہے کہ کوئی شخص اس پر ایک لمحہ بھی غور نہیں کریگا" مسلم لیگ کے ترجمان "ڈان" نے ایک اداریے میں لکھا کہ دونوں بازوؤں کو ملانے کے لیے راستے کا مطالبہ نیا نہیں ہے" قائداعظم محمد علی جناح ماضی میں کئی مرتبہ یہ نکتہ پیش کر چکے ہیں جو پاکستان کے سلسلے میں انتہائی حقیقی، ٹھوس اور مضبوط ہے۔ اگر پاکستان کا مطالبہ حقیقی، ٹھوس اور واضح شکل رکھتا ہے تو اس کے مشرقی اور شمالی علاقوں کو ملانے کے لیے راستا دینا بھی ناگزیر ہے۔ اگر مسلمان پاکستان حاصل کر سکتے ہیں، جو انھوں نے حاصل کر لیا ہے، تو وہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کو ملانے کے لیے کہیں نہ کہیں راستا بھی بنا ہی لیں گے"۔[2]

دریں اثنا حکومت برطانیہ سے وائسرائے کی بات چیت مکمل ہو گئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن ۳۱ مئی کو ہندوستان واپس آئے۔ انھوں نے مسلم لیگ اور کانگرس سے درخواست

---

[1] : مشن ود ماؤنٹ بیٹن - ایلن کیمبل جانسن صفحہ ۹۴

[2] مشن ود ماؤنٹ بیٹن - ایلن کیمبل جانسن صفحہ ۹۶

کہ ۲ جون کو وائسرائے ہاؤس نئی دہلی میں اپنے تین تین نمائندے بھیجیں۔
ئسرائے نے اس کانفرنس میں سکھوں کے نمائندے کی حیثیت سے سردار بلدیو سنگھ
بھی مدعو کیا۔ مسلم لیگ کی نمائندگی قائد اعظم، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرب نشتر نے
ر کانگریس کی جانب سے نہرو، پٹیل اور کانگریس کے صدر اچاریہ کرپلانی کانفرنس میں
ریک ہوتے۔ وائسرائے کے ساتھ یہ ساتوں افراد ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کرنے
غرض سے سر جوڑ کر بیٹھے۔ وائسرائے نے اعتراف کیا کہ اتحادِ فکر و عمل پیدا کرنا خاصا
شکل ہے۔ خاص طور پر ایسی صورت میں جب کہ کانگریس تقسیم ہند کی مخالف ہے اگرچہ
ہ اس بات پر رضامند ہو چکی ہے کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کو ان کی مرضی کے خلاف
صلہ کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا، اور جناح تقسیم ہند پر مصر ہیں مگر صوبوں کی
سیم پر تیار نہیں ہیں۔ وائسرائے نے ان لیڈروں کو بتایا کہ کانفرنس میں جو تجاویز
ں کی جا رہی ہیں، نہ صرف برطانوی حکومت بلکہ ونسٹن چرچل سمیت پارلیمنٹ کے
م مخالف اراکین بھی انھیں منظور کر چکے ہیں۔ حکومتِ برطانیہ کی منظور کردہ تجاویز
ں تقسیم کا اصول منظور کر لیا گیا ہے، اور اس کی تفصیلات لیگ اور کانگریس کے
لاح مشورے سے طے کی جائیں گی۔ دونوں مملکتوں کو اختیارات منتقل کیے جائیں
گے۔ انھیں مکمل ڈومینین کی حیثیت دی جائے گی۔ اور انھیں دولتِ مشترکہ سے علیحدہ
نے کا حق حاصل ہوگا۔ ہندوستان کے حالیہ واقعات کے پیش نظر یہ طے کیا گیا ہے
اختیارات جون ۱۹۴۸ء کے بجائے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو منتقل کر دیے جائیں
لک کے باشندوں سے یہ معلوم نہیں کیا جائے گا کہ وہ پاکستان میں شامل ہونا چاہتے
یں یا ہندوستان میں۔ کلکتہ ہندوستان کا شہر ہوگا۔ انڈیا آفس ختم کر دیا جائے گا
نگال اور پنجاب اسمبلیوں میں مسلم اکثریت کے ضلعوں کے نمائندے خود یہ فیصلہ کریں
گے کہ آیا موجودہ دستور ساز اسمبلی آئین بنائے یا اس مقصد کے لیے نئی دستور ساز اسمبلی

کی تشکیل کی جائے۔ ان اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم ممبروں کے علیحدہ اجلاس ہوں گے اور یہ طے کیا جائے گا کہ آیا صوبے کو تقسیم کیا جائے یا نہیں۔ سندھ اسمبلی بھی اس سوال پر خود فیصلہ کرے گی۔ سرحد میں اس معاملے کا فیصلہ کرنے کے لیے ریفرنڈم ہوگا اور برطانوی بلوچستان کے لیے گورنر جنرل تجاویز مرتب کریں گے۔ اگر تقسیم کا فیصلہ کیا گیا تو آسام کے ضلع سلہٹ میں ریفرنڈم ہوگا تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سلہٹ کے باشندے پاکستان یا ہندوستان میں سے کس مملکت میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔ اگر متذکرہ بالا طریقۂ کار کے مطابق یہ طے ہوا کہ ہندوستان کی تقسیم ہونی چاہیے، اور بنگال اور پنجاب کو بھی تقسیم کیا جائے تو اس مقصد کے لیے سرحدوں کی حد بندی کرنے کی غرض سے ایک کمیشن مقرر کیا جائے گا، تاکہ پاکستان اور ہندوستان کی جغرافیائی شکل کا قطعی تعین کیا جا سکے۔ جہاں تک ہندوستان کی ریاستوں کا تعلق ہے "کیبنٹ مشن کی یادداشت مورخہ ۱۲ مئی ۱۹۴۶ء میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی ہے" ان تجاویز کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی منسلک تھا جس میں ہندوستان کی ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب اور بنگال کے مسلم اکثریت کے ضلعوں کے نام دیے گئے تھے۔ آخر میں وائسرائے نے کہا کہ اگرچہ میں کانفرنس میں موجود ممتاز لیڈروں پر اعتبار کرتا ہوں، تاہم میری خواہش ہے کہ آپ حضرات اپنی اپنی پارٹیوں کی ورکنگ کمیٹیوں سے مشورہ کرنے کے بعد آج رات بارہ بجے تک مجھے اپنے قطعی فیصلے سے باخبر کر دیں۔ قائداعظم نے فرمایا کہ مجھے توقع ہے کہ لیگ ورکنگ کمیٹی اس کے حق میں فیصلہ دے گی مگر میں پہلے سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ بہرحال میں اپنے آقاؤں یعنی "عوام" کی رائے معلوم کروں گا اور اس مقصد کے لیے مجھے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل سے مشورہ کرنا ہوگا۔ نہرو نے کہا کہ میں کانگرس کے خیالات سے آپ کو آدھی رات تک باخبر کر دوں گا۔

قائداعظم نے مسلمانوں کی جانب سے وائسرائے سے جس عمدگی اور دانشمندی کے ساتھ مذاکرات کیے تھے، آغا خان نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے: "۱۹۴۷ء

ہندوستان کی قسمت کے فیصلے کا سال تھا۔ جناح نے حالات کا جائزہ لیا اور یقین
کامل اور جرأت مندی کے ساتھ میدان میں آ گئے۔ انھوں نے برطانوی سکیم مشروط طور پر قبول
کر لینے کا اعلان کر دیا۔ انھوں نے بجا طور پر انتہائی ذہانت تدبر اور بے مثالی سیاسی دور اندیشی
کے ساتھ یہ فیصلہ کیا۔ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے میرا یہ دعویٰ ثابت کر دیا کہ میں جتنے عظیم مدبروں
کو جانتا ہوں وہ سب میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں اس فیصلے نے انھیں بسمارک کا ہم پلہ بنا دیا۔"[1]

ماؤنٹ بیٹن نے ان لیڈروں کو مطلع کیا کہ میں دہلی ریڈیو سٹیشن سے ایک تقریر کروں
گا جو لندن اور نیویارک سے بھی ریلے ہو گی۔ انھوں نے قائداعظم اور نہرو سے درخواست کی کہ وہ
بھی اہل ہند سے خطاب کریں اور انھیں یقین دلائیں کہ انھوں نے ذاتی طور پر تجاویز منظور
کر لی ہیں اور یہ کہ وہ ان تجاویز کو اپنی جماعتوں سے منظور کرانے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔
دونوں لیڈروں نے وائسرائے کی درخواست منظور کر لی۔

اسی دن کانگرس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں یہ تجاویز منظور کر لی گئیں اور کانگرس کے
صدر کرپلانی نے وائسرائے کو ایک مکتوب کے ذریعے فیصلے سے مطلع کر دیا لیکن کانگرس نے
تجاویز مشروط طور پر قبول کی تھیں اور شرط یہ تھی کہ "مسلم لیگ بھی یہ تجاویز منظور کرے اور واضح
طور پر یقین دلائے کہ وہ مزید مطالبے نہیں کریں گے۔

لیگ ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں حکومتِ برطانیہ کے اعلان پر جیسا کہ وائسرائے نے
لیگ کے نمائندوں کو بتایا تھا، غور کیا گیا۔ ورکنگ کمیٹی نے سکیم پر تفصیلی غور و خوض کے بعد فیصلہ
کیا کہ کراچی مملکت پاکستان کا دارالحکومت ہو گا۔ اس فیصلے سے ظاہر ہوتا تھا کہ لیگ کونسل
سے سکیم کی منظوری اب صرف رسماً لی جانی تھی۔

اسی رات قائداعظم نے وائسرائے سے ملاقات کی اور اُن کو بتایا کہ مسلم لیگ ورکنگ
کمیٹی کو امید ہے کہ لیگ کونسل یہ سکیم منظور کر لے گی لیکن ورکنگ کمیٹی کونسل کی جانب

---

[1] : دی میموائرز آف آغا خان صفحات : ۲۹۸، ۲۹۹

سے کوئی قطعی فیصلہ نہیں کر سکتی۔ فیصلے کا اختیار صرف کونسل کو ہے۔ میں ایک ہفتے کے اندر اندر کونسل کا اجلاس طلب کر رہا ہوں اور آپ کو کونسل کے فیصلے سے باخبر کر دوں گا۔ ماؤنٹ بیٹن اس پر رضامند نہ ہوتے۔ انھیں اندیشہ تھا کہ ممکن ہے ایک ہفتے کی تاخیر سے سکیم قطعی طور پر منظور نہ ہو سکے۔ مصالحت کے طور پر وائسرائے نے تجویز پیش کی کہ اگلے روز جو اجلاس ہوگا اس میں میں لیڈروں سے کہوں گا کہ میں مسٹر جناح کی یقین دہانی سے مطمئن ہوں آپ اثبات میں سر ہلا دیں۔ قائداعظم رضامند ہو گئے۔

تین جون کی صبح کو وائسرائے نے ساتوں لیڈروں کی کانفرنس بلائی۔ وائسرائے نے کانفرنس کو بتایا کہ کانگریس اور سکھوں نے تحریری طور پر تجاویز قبول کر لی ہیں اور یہ کہ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کی جانب سے زبانی طور پر تجاویز قبول کر لی ہیں۔ اس مرحلے پر وائسرائے نے مڑ کر قائداعظم کی طرف دیکھا اور کیمپبل جانسن کے الفاظ میں "جناح نے خاموشی اور سر کے اشارے سے اس کی تصدیق کی"۔[1] کانفرنس کے اختتام پر ماؤنٹ بیٹن نے اعلان کیا کہ تجاویز کی منظوری کے متعلق میں، اور دونوں لیڈر مسٹر جناح اور نہرو آج شام ریڈیو پر اعلان کریں گے۔

ماؤنٹ بیٹن نے وزیر ہند کو مطلع کیا تھا کہ وہ ہندوستانی لیڈروں سے مذاکرات سے مطمئن ہیں اور یہ کہ لیگ اور کانگریس تجاویز منظور کر لیں گی۔ اٹیلی نے ۳ جون ۱۹۴۷ء کو ہندوستان میں اختیارات کی منتقلی کے متعلق دارالعوام میں حکومت برطانیہ کی تجاویز کا اعلان کیا اور اسی سبب سے اس سکیم کو ۳ جون کا منصوبہ کہا جاتا ہے۔ اسی شب اٹیلی نے قوم کے نام ایک تقریر نشر کی اور کہا "چونکہ ہندوستانی لیڈروں میں متحدہ ہندوستان کے بارے میں کیبنٹ مشن کی تجاویز پر اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ اس لیے تقسیم ناگزیر ہو گئی ہے، اور اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں"۔ قائداعظم نے جس فراست سے کانگریس اور حکومت برطانیہ سے گفت و شنید کی تھی، یہ اس پر بالواسطہ مگر زندہ جاوید خراج تحسین تھا۔ اگر وہ پیچھے ہٹ جاتے یا جھک کر کوئی شرط قبول کر لیتے تو مسلمانوں پر متحدہ ہندوستان مسلط ہو جاتا اور مطالبہ پاکستان ختم ہو جاتا۔

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل صفحہ ۱۰۳

اس روز آل انڈیا ریڈیو کا دہلی سٹیشن، لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن حکومتِ برطانیہ کی جانب سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خاتمے کا اعلان کرنے والے تھے۔ انھوں نے بڑے متین اور پُر وقار لہجے میں تقریر کی اور پورے ملک میں ہزاروں سامعین نے یہ جان لیا کہ آزادی کی طویل جدوجہد کا اختتام فتح و نصرت کے ساتھ ہونے والا ہے۔ انھیں جب ماؤنٹ بیٹن کی زبان سے یہ معلوم ہوا کہ انگریز دونوں خود مختار مملکتوں کو اختیارات منتقل کر دیں گے تو انھیں یک گونہ اطمینان ہوا۔ وائسرائے نے اپنی تقریر ان الفاظ پر ختم کی "مجھے ہندوستان کے مستقبل پر پورا اعتماد ہے اور مجھے فخر ہے کہ اس مبارک وقت پر میں آپ ہی کے درمیان ہوں۔ خدا کرے آپ دور اندیشی اور دانشمندی کے ساتھ فیصلے کریں اور خوش دلی اور جذبے کے ساتھ ان پر عمل کریں" اُن کے بعد نہرو نے بڑی سنجیدگی سے یہ اعلان کیا کہ کانگرس نے وائسرائے کے اعلان کے مطابق ہندوستان کی آزادی کا منصوبہ قبول کر لیا ہے۔ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کا ذکر کرتے ہوئے نہرو نے کہا "ہم جیسے کم حیثیت افراد نے ایک عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کی۔ مگر یہ مقصد چونکہ عظیم ہے اس لیے ہم بھی اس کی کچھ عظمت کے حق دار ہو گئے ہیں" نہرو نے کہا کہ میں اور میرے ساتھی یہ پسند نہیں کرتے کہ ہندوستان کی کاٹ چھانٹ کی جائے۔ مگر آخر کار ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ہندوستان میں کشت و خون کی روک تھام کے لیے یہ تقسیم ہی بہتر ہے۔ نہرو کے بعد قائد اعظم نے مسلمان قوم سے خطاب کیا۔ اس تاریخی موقع پر اُن کا پہلا جملہ یہ تھا: "مجھے خوشی ہے کہ مجھے دہلی سے براہِ راست ریڈیو پر آپ کو خطاب کرنے کا موقع دیا گیا ہے"۔ اہل ہند کو اختیارات منتقل کرنے کی سکیم کے متعلق انھوں نے کہا ہمیں یادگار فیصلے کرنے ہیں اور انتہائی نازک مسئلوں سے نمٹنا ہے۔ "لہٰذا ہمیں اپنی تمام تر توانائی اور صلاحیت سے کام لینا ہوگا اور اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اختیارات کی منتقلی پر امن طریقے سے اور نظم و ضبط کے ساتھ وقوع پذیر ہو" اس موقع پر اُن کی آواز خلوص اور عاجزی میں ڈوبی ہوئی تھی "میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس نازک

مرحلے پر وہ ہماری رہنمائی کرنے اور ہمیں دانش مندی اور تدبر کے ساتھ ذمہ داری سنبھالنے کی توفیق عطا فرمائے" منصوبہ کا تذکرہ کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا کہ بعض اہم پہلوؤں سے یہ منصوبہ مسلم لیگ کے موقف پر پورا نہیں اترتا۔ اور اس لیے میں یہ نہیں کہوں گا کہ میں اس سے مطمئن ہوں۔ میں نے ۹ر تاریخ کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا ہے اور اجلاس سے پہلے میں اس موضوع پر مزید رائے زنی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد انھوں نے وائسرائے کو خراج تحسین پیش کیا " جنھوں نے مختلف قوتوں کے خلاف انتہائی بہادری سے جدوجہد کی اور میرے ذہن پر انھوں نے جو نقش مرتب کیا وہ یہ ہے کہ وہ انتہائی منصف مزاج اور غیر جانبدار رہیں"۔ قائداعظم اس موقع پر ان لوگوں کو بھی نہیں بھولے جنھوں نے پاکستان کے لیے مصائب اٹھائے، اور قربانیاں دی تھیں "ہر طبقے کے مسلمانوں نے جو مصائب برداشت کیں اور قربانیاں دی ہیں اس کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں"۔ سرحد کی خواتین کی تعریف میں انھوں نے فرمایا: "سرحد کی خواتین نے ہماری شہری آزادیوں کی جدوجہد کے سلسلے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ قابلِ تعریف ہے ۔۔"
قائداعظم نے پاکستان کی جدوجہد میں جانی و مالی نقصان اٹھانے والوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: "میں ان تمام لوگوں سے انتہائی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں جنھوں نے اپنی جان قربان کر دی یا جن کی املاک کو نقصان پہنچا" انھوں نے اس تاریخی موقع پر قوم مسلم کے نام جو تقریر نشر کی تھی وہ ختم ہوگئی تو مسودہ ہاتھ میں لے کر چند ثانیے خاموش رہے اور پھر ان کی کی آواز ہوا کی لہروں پر لہراتی ہوئی برصغیر کے مسلمانوں تک پہنچی۔ یہ دو لفظ تھے جو گزشتہ کئی سال سے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ایک سحر انگیز اثر رکھتے تھے۔ یہ ان کی جنگ آزادی کا نشان اور نعرہ بن چکے تھے۔ جن سے مسلمان ہر دکھ اور ہر غم۔ حتیٰ کہ موت کی بھی تکلیف بھول جاتے تھے۔

قائداعظم نے اپنی یادگار تقریر انھی دو لفظوں پر ختم کی۔ "پاکستان زندہ باد"

ایک قوم کی ولادت

"تینوں لیڈروں کی نشری تقریر کے دوسرے روز ماؤنٹ بیٹن نے ایک اخباری کانفرنس سے خطاب کیا۔ اس کانفرنس میں گاندھی جی کے بیٹے دیوداس گاندھی کے ایک سوال سے یہ ظاہر ہو گیا کہ باوجودیکہ کانگریس کے دوسرے لیڈروں نے تقسیم کا اصول تسلیم کر لیا ہے، گاندھی جی اس کے حق میں نہیں ہیں۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو بلایا اور دونوں نے ایک خود مختار مملکت کی حیثیت سے پاکستان کے قیام پر گفتگو کی۔ اسی روز شام کو گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا میں فرمایا۔ برطانوی حکومت تقسیم کی ذمہ دار نہیں ہے۔ اس میں وائسرائے کا ہاتھ نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بھی کانگریس کی طرح تقسیم کے خلاف ہیں لیکن ہم یعنی ہندو اور مسلمان ——— اگر کسی اور بات پر متفق نہیں ہو سکتے تو وائسرائے کے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے"

لیکن دہلی کی فضا پاکستان کے خلاف تھی۔ ہندوؤں کا ایک طبقہ پاکستان کی تشکیل سے پہلے ہی اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تلا ہوا تھا۔ اس سلسلے میں کیمبیل رقمطراز ہے:

اس منصوبے کو خاہر ہوئے اب دو گھنٹے ہو گئے ہیں۔ لیکن اس سے دہلی میں لیڈروں کے درمیان کسی قسم کا برادرانہ جذبہ پیدا نہیں ہوا ہے۔ یہاں حالات انتہائی کشیدہ ہیں اور یہ نظر آتا ہے کہ معمولی سا واقعہ بڑھ کر کہیں کسی بڑے تعطل کی شکل اختیار نہ کرے۔"

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمبیل جانسن۔ صفحہ ۱۱۳

قائداعظم نے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس طلب کیا تاکہ ۳ جون کے منصوبے کے متعلق مسلم لیگ کا موقف طے کیا جا سکے۔ کونسل کا اجلاس ۹ جون کو امپیریل ہوٹل دہلی کے بال روم میں ہوا۔ یہ ایک تاریخی اجلاس تھا۔ تاریخی اس لیے کہ مسلم لیگ کی ۴۰ سالہ سیاسی زندگی میں لیگ کونسل کا ہندوستان میں یہ آخری اجلاس تھا۔ قائداعظم نے کونسل کے دیگر اجلاسوں کی طرح اس اجلاس کی بھی صدارت کی۔ وہ نہ صرف کونسل کے صدر بلکہ حقیقی معنوں میں اس کے دوست اور رہنما بھی تھے۔ جب قائداعظم موضوع زیر بحث پر روشنی ڈال چکے اور ۳ جون کے منصوبے کے متعلق ورکنگ کمیٹی کی قرارداد کی وضاحت کر چکے تو کونسل نے منصوبے کے متعلق اس قرارداد کی توثیق کر دی جو ورکنگ کمیٹی نے تیار کی تھی۔ کونسل نے اس امر پر اظہار اطمینان کیا کہ بالآخر کیبنٹ مشن پلان ترک کر دیا گیا ہے۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے بارے میں کونسل نے کسی قطعی رائے کا اظہار نہیں کیا تاہم یہ کہا کہ کونسل اختیارات کی منتقلی کے بارے میں ۳ جون کے منصوبے پر من حیث المجموع غور کرے گی۔ قرارداد کے ذریعے سے ہی قائداعظم کو مکمل اختیار دیا گیا تھا کہ وہ مصالحت کے طور پر منصوبے کے بنیادی اصولوں کو قبول کر لیں۔

اجلاس ختم ہونے ہی والا تھا کہ ہال کے باہر مسلم لیگ اور جناح صاحب کے خلاف نعروں کا شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ اس ہنگامے کا سبب معلوم کرنے کے لیے باہر نکلے میں بھی ان میں شامل تھا۔ باہر آ کر ہم نے دیکھا کہ عنایت اللہ مشرقی کی تنظیم کے کچھ بیلچہ بردار خاکسار امپیریل ہوٹل پر دھاوا بول رہے ہیں۔ یہ خاکسار سیڑھیوں پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مسلم لیگ کے رضاکار بمشکل انہیں روک رہے تھے۔ اس موقع پر آزادانہ گھونسوں، لاٹھیوں اور بیلچوں سے کام لیا گیا۔ زینے اور برآمدوں میں نعرے اور جوابی نعرے سنائی دے رہے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میدان کارزار گرم ہے۔ فوراً پولیس پہنچ گئی اور اس نے آنسو گیس پھینکی۔ اس پر یہ شرپسند خاکسار بھاگ نکلے۔ اس تمام عرصے میں قائداعظم اطمینان اور

دن کے ساتھ ڈائس پر بیٹھے رہے کیمپبل جانسن نے اس واقعے کا اپنے روزنامچے میں یوں کیا ہے "جناح نے انتہائی ضبط و تحمل کا مظاہرہ کیا۔ بعد میں ڈیلی ایکسپریس کے سٹڈفی ڈ نے ان سے ملاقات کی اور مجھے بتایا کہ جناح کو یقین ہے کہ انھیں قتل کرنے کی کوشش ی تھی۔ اس سے پہلے بھی ایک خاکسار نے انھیں ۱۹۴۲ء میں بمبئی میں قتل کرنا چاہا تھا۔"

کانگریس نے فیصلہ کیا کہ ۱۵ اگست کے بعد بھی ماؤنٹ بیٹن ہی گورنر جنرل رہیں۔ ا اعظم کی خواہش تھی کہ تین گورنر جنرل مقرر کیے جائیں۔ ایک ہندوستان کے لیے، دوسرا تان کے لیے اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن ثالث اعلیٰ ہوں تاکہ دونوں ملکوں میں اثاثوں کی یم کے سوال پر اگر کوئی تنازعہ ہو تو اسے طے کرا سکیں۔ مگر حکومت برطانیہ کو قائداعظم کی تجویز پسند آئی۔

اب پاکستان ایک طے شدہ اور یقینی امر تھا۔ نہرو اور ان کے کانگرسی بھائی بندوں نے بوری حکومت سے مسلم لیگ کے نامزد اراکین کو نکالنے کی سازش کی۔ قائداعظم نے سرائے سے بات چیت کی اور دھمکی دی کہ ماؤنٹ بیٹن اگر کانگریس کے دباؤ میں آگئے تو ۳ جون کے منصوبے کو قبول کرنے سے انکار کر دے گی۔ وائسرائے نے عبوری حکومت ، کانگرسی ممبروں کی رائے کے خلاف مصالحت کے طور پر طے کیا کہ عبوری دور میں تمام ملاقی معاملات جوں کے توں رہنے دیے جائیں۔ لیکن کانگریس کی سازشیں ختم نہ ہوئیں کانگریس ، گاندھی جی کو آگے بڑھایا اور انھوں نے ۱۰ جون کو وائسرائے کو لکھا: "جس قدر جلد آپ گرسی حکومت بنائیں گے اتنا ہی بہتر ہوگا ـــــ تمام جماعتوں کو خوش رکھنے کی کوشش ، آپ کو ناکامی اور نقصان کے سوا کچھ نہ ملے گا۔" قائداعظم نے تن تنہا گاندھی، نہرو، ٹیل وغیرہ کی سازشوں کا مقابلہ کیا اور جب ان کانگرسی لیڈروں کو اپنے مقاصد میں ناکامی

---

۵ مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن۔ صفحہ ۱۱۹

ہوئی تو ۲۸ جون کو گاندھی جی نے وائسرائے کو پھر لکھا: "آپ کہتے ہیں کہ قائداعظم جناح اور مسلم لیگ کے ممبروں کو بھی کانگرسی ممبروں ہی جتنا حق حاصل ہے اور شاید قائداعظم جناح کا حق زیادہ ہے۔ میرا خیال ہے یہ ممکن نہیں ہے۔" وائسرائے نے گاندھی جی کو لکھا تھا کہ قائداعظم نے واضح کر دیا ہے کہ اگر وائسرائے نے کانگریس کا مطالبہ تسلیم کر لیا تو مسلم لیگ ۳ جون کے منصوبے کو مسترد کر دے گی اور اس طرح ۱۵ اگست کو اختیارات کی منتقلی ناممکن ہو جائے گی۔ گاندھی جی نے اس کا حوالہ دیتے ہوئے تحریر کیا: "مجھے اس بات سے بڑا تعجب ہوا ہے ——— آپ نے یہ کہہ کر بھی مجھے تعجب میں ڈال دیا ہے کہ اگر برطانوی اقتدار کے دوران میں تقسیم نہ ہو سکی تو اکثریت کے بل بوتے پر ہندو تقسیم نہیں ہونے دیں گے اور مسلمانوں کو طاقت کے ذریعے اپنا محکوم بنا لیں گے۔ میں نے آپ کو بتا دیا ہے کہ اس طرح سوچنا بہت بڑی غلطی ہے۔"[1] گاندھی جی یہ کہہ کر تقسیم ہندوستان کی مذمت کرتے رہے کہ یہ ایک سنگین غلطی ہے۔ کانگریس نے بظاہر ۳ جون کا منصوبہ تسلیم کر لیا تھا مگر پس پردہ اس کا رہنما، فلسفی اور مہاتما، نظریۂ پاکستان کو نیست و نابود کرنے کی ہر نوع کوشش کر رہا تھا۔

جون کے آخری ہفتے میں کانگریس نے مسلم لیگ کو عبوری حکومت سے نکالنے کی کوششیں تیز کر دیں اور اس سلسلے میں وائسرائے کو کانگرسی ممبروں کے استعفے کی دھمکی تک دے دی۔ تقریباً اسی وقت مسلم لیگ نے فیصلہ کیا کہ قائداعظم پاکستان کے پہلے گورنر جنرل ہوں گے۔ اس پر ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم کو مطلع کیا کہ اب میں عبوری حکومت کی ازسرنو تشکیل کے معاملے میں آزاد ہوں۔ قائداعظم اس سے مرعوب نہ ہوئے اور انھوں نے واضح کر دیا کہ یہ اقدام مسلم لیگ کے خلاف کارروائی سمجھا جائے گا۔ انھوں نے حکومت کی ازسرنو

---

[1] مہاتما گاندھی، دی لاسٹ فیز، جلد دوم، صفحہ ۲۹۰

تشکیل کے بارے میں وائسرائے کے فیصلے پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ یہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بھی منافی ہوگا۔ قائداعظم نے جو اعتراض اٹھایا تھا وائسرائے نے اس پر لندن سے قانونی مشورہ مانگا۔ قائداعظم کا اعتراض مدلل تھا اس لیے وائسرائے عبوری حکومت کی از سرِ نو تشکیل نہیں کر سکے۔ پیارے لال رقم طراز ہیں: "اس پر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اطمینان کی سانس لی مگر کانگرس ہائی کمان کا بُرا حال تھا۔"[1]

جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ ۱۵ اگست تک ۳ جون کے منصوبے کی بنیاد پر ہندوستان کی تقسیم عمل میں آجائے گی تو برطانوی حکومت نے پارلیمنٹ کی منظوری کے لیے آزادیٔ ہند کا بل (انڈین انڈیپنڈنس بل) تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس بل میں بیس دفعات اور تین شیڈول تھے اور مسلم لیگ اور کانگرس کے لیڈروں کو اس کا مسودہ دکھایا گیا تھا۔ بل کے مسودے کا جائزہ لینے کے بعد قائداعظم نے کچھ ترمیمیں اور تجویزیں وائسرائے کو پیش کیں۔ اور یہ کانگرس کی پیش کردہ تجویزوں کے ساتھ یہ ترمیمیں اور تجویزیں لندن بھیجی گئیں۔ بل ۴ جولائی کو دارالعوام میں پیش کیا گیا جس کے مطابق دونوں ڈومینیوں کی مجالس قانون ساز کو مکمل آزادی دی گئی تھی۔ یہ مجالس قانون ساز درحقیقت دونوں ملکوں کی مجالس دستور ساز تھیں۔ اور جب تک کسی ڈومینین کی دستور ساز اسمبلی آئین تیار نہیں کرتی، مناسب ردّ و بدل کے بعد، گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء ہی وہاں نافذ رہتا۔ ۱۵ جولائی کو دارالعوام نے بل کی منظوری دے دی۔ ۱۶ جولائی کو دارالامرا نے اور ۱۸ جولائی کو تاجِ برطانیہ نے بھی یہ بل منظور کر لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ جون کی درمیانی تاریخوں میں گاندھی جی اور نہرو نے ریاست کشمیر کی شمولیت کے معاملے پر ماؤنٹ بیٹن سے نجی مذاکرات کیے تھے۔ کیمپبل جانسن نے لکھا ہے:

---

[1] مہاتما گاندھی — دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال صفحہ ۲۹۱

نہرو جو کشمیری برہمن تھے، ریاست کا دورہ کرنے پر اصرار کر رہے تھے ـــــ گاندھی کا خیال
تھا کہ انھیں نہرو کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہیئے[1] لیکن مہاراجہ کشمیر نے صاف صاف
کہہ دیا کہ میں گاندھی یا نہرو کو کشمیر آنے نہیں دوں گا۔ جون کے تیسرے ہفتے میں لارڈ
ماؤنٹ بیٹن مہاراجہ سے ملاقات کرنے خود کشمیر پہنچ گئے۔ بعد میں جو حالات پیش آئے
ان کے پیش نظر یہ دورہ انتہائی اہم ثابت ہوا۔ کیمبل جانسن نے اس دورے کا تذکرہ ان
الفاظ میں کیا ہے۔ "ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ اور وزیر اعظم کشمیر پنڈت کاک پر زور دیا
کہ وہ آزادی کا اعلان نہ کریں بلکہ جلد از جلد کسی نہ کسی طرح کشمیریوں کی خواہش معلوم کریں
اور کسی ایک ملک کی دستور ساز اسمبلی میں کشمیریوں کے نمائندے بھیجنے کے لیے ۱۴ اگست
تک کشمیریوں کی مرضی کا اعلان کر دیں"[2]۔ اس سلسلے میں کشمیریوں سے کوئی مشورہ نہیں لیا گیا
اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشمیریوں کے لیے ناقابل بیان مصائب کا دروازہ کھل گیا اور ریاست
میں ہر طرف ہنگامے شروع ہو گئے۔

تقسیم کے مسئلے سے منسلک مختلف اہم اور ناگزیر سوالوں پر فوری فیصلہ کرنے
کی ضرورت تھی۔ ان مسائل سے نمٹنے کے لیے ایک پارٹیشن کمیٹی بنائی گئی اور اس میں
قائد اعظم اور عبوری حکومت کے اراکین کو شامل کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کی صدارت میں ۱۰ جون
کو اس کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا۔ پہلے یہ تجویز پیش کی گئی کہ سرحد کی حد بندی کا کام اقوام
متحدہ کے سپرد کر دیا جائے لیکن اس تجویز کی بڑی سخت مخالفت کی گئی کہ اس سے حد بندی
کے کام میں خاصی دیر ہو گی۔ نہرو نے تجویز کیا کہ قانون آزادی ہند مجریہ ۱۹۴۷ء کی دفعہ
سات کے مطابق حد بندی کے لیے ایک باؤنڈری کمیشن مقرر کیا جائے جو اس بات کا
جائزہ لے کہ مسلمانوں کے کون کون سے علاقے پاکستان سے اور ہندوؤں کے کون سے

۱۔ مشن ود ماؤنٹ بیٹن، ایلن کیمبل جانسن صفحہ ۱۲۰ ۔۔۔ ۲۔ محولہ بالا

علاقے ہندوستان سے ملے ہوئے ہیں اور اس سلسلے میں کمیشن دوسرے پہلوؤں کا بھی جائزہ لے۔ یہ تجویز منظور کر لی گئی۔ کیمپبل جانسن نے اس سلسلے میں لکھا ہے "اس (پارٹیشن کمیٹی) نے حیرت انگیز عجلت اور اتفاق رائے سے مسٹر جناح کی یہ تجویز منظور کر لی کہ سر سائیرل ریڈکلف کو پنجاب اور بنگال کے بونڈری کمیشنوں کا چیئرمین بنایا جائے اور انھیں دونوں کمیشنوں میں فیصلہ کن ووٹ (کاسٹنگ ووٹ) کا حق دیا جائے۔"[1] مسلم لیگ اور کانگریس کو اپنے نمائندوں کی حیثیت سے بونڈری کمیشنوں میں ہائی کورٹ کے دو دو ججوں کو نامزد کرنا تھا۔ اس طرح مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کے ان کمیشنوں میں دو دو ووٹ تھے اور آخری فیصلہ (اگر کسی معاملے پر اتفاق رائے نہ ہوا تو) سائیرل ریڈکلف کو کرنا تھا۔ جیسا کہ کمیشنوں کی رپورٹوں سے ثابت ہو گیا، یہ مسلمانوں کے مفاد کے منافی تھا۔

مسلم لیگ نے بنگال بونڈری کمیشن کے لیے جسٹس ابو صالح محمد اکرم اور جسٹس ایس اے رحمان اور پنجاب کمیشن کے لیے جسٹس دین محمد اور جسٹس محمد منیر کو نامزد کیا۔

سر سائیرل ریڈکلف نے پنجاب کمیشن کی رپورٹ ۱۲ اگست کو وائسرائے کو پیش کی۔ رپورٹ میں بتایا کہ کمیشن کے ممبر اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ اور اس حیثیت سے کمیشن کے ممبروں نے یہ قبول کر لیا کہ میں خود اس معاملے کا فیصلہ کروں۔ لہٰذا اب میں خود فیصلہ کرتا ہوں۔" اس کے بعد ریڈکلف نے متنازعہ علاقوں کے بارے میں فریقین کے دعاوی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا "میں ان اہم علاقوں کے بارے میں کافی عرصے متذبذب رہا ہوں جو دریائے ستلج کے مشرق اور بیاس اور ستلج کے گوشے میں واقع ہیں اور جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے لیکن مجموعی غور کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کسی بھی حالت کے لیے سود مند نہیں ہوگا کہ مغربی پنجاب کا علاقہ

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن، ایلن کیمپبل جانسن صفحہ ۱۲۴

بڑھا کر دریائے ستلج کے دوسرے کنارے تک کر دیا جائے تو ایوارڈ کے ساتھ ایک ضمیمہ بھی
شامل تھا۔ اس ایوارڈ سے جو ریڈکلف ایوارڈ کے نام سے موسوم ہے، پاکستان کو
پنجاب سے مندرجہ ذیل علاقوں سے جہاں مسلم اکثریت تھی محروم ہونا پڑا ——— ضلع
گورداسپور، ضلع امرتسر کی تحصیل اجنالہ، تحصیل ہوشیارپور، تحصیل دسوہہ، تحصیل نکودر
تحصیل جالندھر، تحصیل فیروزپور، تحصیل زیرہ اور ضلع لاہور میں قصور کا کچھ حصہ۔ یہ
تمام علاقے بونڈری کمیشن کے ہندو اور سکھ ممبروں کی جھولی میں پڑ گئے۔ ریڈکلف نے ممبروں
کی شدید نکتہ چینی کے اختلاف کے پیش نظر اپنی رپورٹ کے آخر میں اعتراف کیا تھا: "اس
بات کا احساس ہے کہ ایوارڈ سے کسی فریق کا اطمینان نہیں ہوگا۔ دونوں اس بارے
میں متضاد نقطہ نظر رکھتے ہیں۔ اگر فریقین کے اطمینان اور ان کی تسکین مقصود ہے تو
میرا خیال ہے اس کے لیے سیاسی انتظامات کافی ہیں جن سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے
اور نہ وہ بحث کے دائرہ میں شامل ہیں۔"

ریڈکلف کے فیصلے میں بدنیتی کارفرما تھی۔ بعد کے حالات سے اس پر سے
پردہ اٹھ گیا۔ پنجاب کی تقسیم سے پیدا ہونے والے حالات کے بارے میں ایک انگریز
مصنف پینڈرل مون نے ۱۹۴۲ء ہی میں پیش گوئی کر دی تھی۔ اس نے لکھا تھا اگر
پاکستان کا قیام مقصود ہی ہے تو یہ ضروری ہے کہ سکھوں کو اس میں شامل کیا جائے۔ سکھوں
کو پاکستان میں شامل نہ کرنے کا مطلب پنجاب کے وسط میں کسی جگہ پاکستان اور باقی
ہندوستان کے درمیان سرحدی خط کھینچنا ہوگا جو ناممکن نظر آتا ہے۔ جغرافیائی، اقتصادی،
نسلی اور لسانی اعتبار سے دیکھیں تو پنجاب ایک وحدت ہے۔ کوئی ایسی سرحد جو اسے
درمیان سے تقسیم کر دے قطعی غیر فطری اور مصنوعی ہوگی۔ اس سے ایک مربوط معاشرے
کا شیرازہ منتشر ہو جائے گا۔ سڑکوں، ریلوے اور نہروں کا نظام انتہائی نامناسب
انداز میں دو حصوں میں بٹ جائے گا۔ یہ بونڈری ایک وفاقی مملکت کے یونٹوں کے درمیان

ط تقسیم تو بن سکتی ہے لیکن دو آزاد قومی مملکتوں کے مابین سرحد نہیں بن سکتی"[1]

اسی طرح اتفاق رائے کے فقدان کو بہانہ بنا کر، ریڈکلف نے بنگال اور سلہٹ
ے بارے میں خود فیصلہ دیا اور اپنا ایوارڈ ۱۲ راگست کو وائسرائے کو پیش کر دیا۔ اس
ے ساتھ ایک ضمیمہ بھی منسلک تھا۔ ایوارڈ کے مطابق مسلمانوں کو کلکتہ کے اہم شہر سے محروم
رد یا گیا تھا جس کے بارے میں مسلمانوں کا دعویٰ حق بجانب اور جائز تھا۔

دریں اثنا پارٹیشن کونسل کے اجلاس جاری تھے اور کونسل نے مصالحت کے طور پر
س امر سے اتفاق کر لیا تھا کہ مسلح افواج کے جن یونٹوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہ
ا کستان کو اور غیر مسلموں کی اکثریت کے یونٹوں کو ہندوستان کو منتقل کر دیا جائے گا۔ اس
رھی اتفاق رائے ہو گیا کہ مسلح افواج اس وقت تک فیلڈ مارشل آکنلیک کے تحت رہیں گی
ب تک فوجوں کی تقسیم اور دیگر امور مکمل نہ ہو جائیں۔ ایک مشترکہ دفاعی کونسل بنائی
ائے گی جس میں دونوں مملکتوں کے گورنر جنرل اور وزرائے دفاع شامل ہوں گے اور
یلڈ مارشل آکنلیک دفاعی کونسل کی زیر نگرانی سپریم کمانڈر کے فرائض انجام دیں گے۔
دونوں ڈومینیوں کے اپنے اپنے کمانڈر انچیف مقرر کرنا بھی طے ہوا۔

۳ رجون کے منصوبے کے مطابق کئی اہم معاملوں پر فیصلہ ضروری تھا۔ ان میں
ی ڈومینین میں شمولیت کے بارے میں) صوبوں کا فیصلہ، جمہوری دور کے لیے قانون ساز
سلح افواج اور فوجی ساز و سامان کی تقسیم، دونوں ڈومینیوں کے لیے مساوی بنیاد پر
تحدہ ہندوستان کے سرمائے کی تقسیم، متنازعہ علاقوں میں حد بندی وغیرہ شامل تھی۔
اور یہ سب کچھ قائد اعظم اور دوسرے لیڈروں کی نشری تقاریر اور اقتدار کی منتقلی کے
آخری دن یعنی ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کے درمیان ہونا تھا۔ ۲۰ رجون کو بنگال کی مجلس

[1] دی خیوچر آف انڈیا۔ پینڈرل مون مطبوعہ ۱۹۴۲ء، صفحہ ۳۰۔ پائلٹ پریس لندن۔

قانون ساز کا اجلاس ہوا جس میں ۹۰ کے مقابلے میں ۱۲۶ ووٹوں سے نئی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کا فیصلہ کیا گیا۔ اس کے بعد مجلس قانون ساز کے غیر مسلم اکثریت کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے ممبروں کے اجلاس میں ۲۱ کے مقابلے میں ۵۸ ووٹوں سے یہ طے کیا گیا کہ بنگال کی تقسیم کر دی جائے اور یہ کہ مغربی بنگال کے نمائندوں کو موجودہ دستور ساز اسمبلی سے تعاون کرنا چاہیئے۔ اسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں سے "قانون ساز اسمبلی کے ممبروں کے اجلاس میں ۳۵ کے مقابلے میں ۱۰۶ ووٹوں سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور یہ کہ مشرقی بنگال نئی دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ آسام کا ضلع سلہٹ جو مسلم اکثریت کا علاقہ ہے اور مشرقی بنگال سے ملا ہوا ہے، مشرقی بنگال کے نئے صوبے میں شامل کیا جائے۔

فرقہ وارانہ فسادات کے سبب صوبے میں جو سنگین حالات پائے جاتے تھے، ان کے پیش نظر پنجاب اسمبلی کا اجلاس پولس کے زبردست پہرے اور سخت حفاظتی انتظامات کے تحت منعقد ہوا۔ پنجاب اسمبلی نے ۷۷ کے مقابلے میں ۹۱ ووٹوں سے طے کیا کہ پنجاب نئی دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجے۔ اس کے بعد پنجاب اسمبلی کے مسلمان ممبروں کے جلسے میں ۲۷ کے مقابلے میں ۶۹ ووٹوں سے فیصلہ کیا گیا کہ پنجاب کو متحد رہنے دیا جائے اور تقسیم پنجاب کی تجویز مسترد کر دی جائے۔ اس کے برعکس جب پنجاب اسمبلی کے غیر مسلم ممبروں کا جلسہ ہوا تو انھوں نے ۲۲ کے مقابلے میں ۵۰ ووٹوں سے پنجاب کو تقسیم کرنے اور مشرقی پنجاب کے موجودہ دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ دونوں نقطہ ہائے نظر کے حامیوں نے اپنے اپنے جلسوں میں ان قطعی مگر متضاد فیصلوں کا خیر مقدم کیا اور انھیں سراہا۔

سندھ میں مسلم لیگ پارٹی کو بھی اکثریت حاصل تھی۔ اس لیے جب ۲۶ جون کو سندھ کی مجلس قانون ساز کا اجلاس ہوا تو اسمبلی نے ۲۰ کے مقابلے میں ۳۰ ووٹوں سے

نئی دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح شاہی جرگے اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ممبروں پر مشتمل جو ادارہ بلوچستان کے بارے میں فیصلے کے لیے تشکیل کیا گیا تھا، اس نے ایک خاص اجلاس میں اتفاق رائے سے نئی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کا فیصلہ کیا۔ کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر مسلم ممبر دیدہ و دانستہ اجلاس میں شریک نہ ہوئے اور اس طرح انھوں نے یہ ممکن بنا دیا کہ اس معاملے پر اتفاق رائے سے کوئی فیصلہ ہو سکے۔

ضلع سلہٹ کے عوام کی خواہش معلوم کرنے کے طریقۂ کار کے بارے میں مسلم لیگ اور کانگرس میں اختلاف تھا۔ طویل مذاکرات کے بعد جن میں متبادل انتظامات پر غور و خوض کیا گیا، آخر کار یہ طے ہوا کہ ضلع سلہٹ کے مسلمانوں، دوسرے باشندوں اور مستعین کے انتخابی حلقوں پر مشتمل ایک انتخابی ادارہ بنایا جائے جو یہ فیصلہ کرے کہ سلہٹ کے عوام مشرقی بنگال میں شامل ہونا چاہتے ہیں کہ نہیں۔ قائد اعظم کی قیادت میں آسام اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مسلمان لیڈروں اور ورکروں نے دن رات ایک کر دیے۔ وہ جگہ جگہ جا کر مسلمان ووٹروں کو رائے شماری کے نتیجے کی اہمیت سے باخبر کرتے۔ مسلمان خسارے میں تھے کیونکہ انتخابی فہرستوں میں مسلم آبادی کے تناسب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا تھا۔ ان فہرستوں میں مسلمان ووٹروں کی تعداد کا تناسب ۵۴ اعشاریہ ۲۷ فی صد تھا جب کہ مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۶۰ اعشاریہ ۷۰ فی صد تھا۔ بایں ہمہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے حق میں فیصلہ دیا۔ رائے شماری سے ظاہر ہوا کہ ۲۳۹۶۱۹ باشندوں نے آسام سے علیحدگی اور مشرقی بنگال میں شمولیت کے حق میں اور ۱۸۴۰۴۱ نے حالات جوں کے توں رہنے دینے کا فیصلہ دیا۔

شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کی رائے معلوم کرنے کے لیے ریفرنڈم کا فیصلہ کیا گیا تھا اور یہ طے ہوا تھا کہ صوبائی اسمبلی کے تمام انتخابی حلقوں کے ووٹر یہ

طے کریں گے کہ آیا سرحدی صوبے کو نئی دستور ساز اسمبلی میں نمائندے بھیجنے یا نہیں انڈین یونین میں شامل ہونا چاہیئے۔ صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی حکومت برسراقتدار تھی تاہم صوبے کے مسلمان باشندوں نے انتھک اور مسلسل کام کرنے والے کے ذریعے سے اپنی وابستگی کا ثبوت دیا۔ سرحد کے مسلمان باشندے تحریک پاکستان اور قائداعظم کے انتہائی پرجوش حامی بن گئے تھے۔ خان عبدالغفار خان نے ہوا کا رخ دیکھ کر ریفرنڈم کے طریقہ کار پر احتجاج کیا۔ انھوں نے وائسرائے کے نام ایک خط میں کہا کہ ریفرنڈم کے ذریعے ووٹروں کو یہ طے کرنے کا بھی موقع دیا جائے کہ آیا وہ آزاد پختونستان کا قیام چاہتے ہیں۔ افغانستان تہ دل سے خان عبدالغفار خان سے موقف کا حامی تھا۔ قائداعظم نے خان برادران کے طرز عمل پر اظہار ناپسندیدگی کیا۔ اُنھوں نے آزاد پختونستان کے مطالبے کی مذمت کی اور اسے پُرفریب اور مصنوعی قرار دیا لارڈ لسٹوویل نے، جو اس وقت وزیر ہند تھے، افغانستان کو سخت تنبیہ کی کہ وہ دوسرے مُلک کے داخلی معاملوں میں مداخلت کر رہا ہے۔ لارڈ لسٹوویل نے لندن میں اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہُوئے کہا "افغانستان کو شمال مغربی سرحدی صوبے کے عوام کے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں ہے۔ پٹھان عرصے سے برضا ورغبت شمال مغربی سرحدی صوبے میں شامل ہیں اور وہ اسی صوبے میں رہنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم نے شمال مغربی سرحدی صوبے کو توڑنے کی کسی تحریک کی اجازت دی تو اس سے گوناگوں مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔"[1] ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ چونکہ کانگرس اور مسلم لیگ کے درمیان اس بارے میں کوئی معاہدہ موجود نہیں ہے۔ اس لیے اس معاملے پر رائے شماری نہیں کرائی جائے گی۔

---

[1] ٹرانسفر آف پاور ان انڈیا۔ مینن صفحہ ۳۸۹

گاندھی جی نے خان عبدالغفار خاں کے موقف کی حمایت کی اور ۶ جون کو وائسرائے سے ملاقات کرکے ان سے کہا کہ وہ جناح صاحب پر زور دیں کہ وہ سرحد میں ریفرنڈم کرانے پر اصرار نہ کریں بلکہ سرحد جا کر لوگوں کو سمجھائیں کہ پاکستان سے انھیں کیا فائدہ پہنچے گا۔ اس طرح آپ (جناح صاحب) سرحد کے عوام کو پاکستان میں ایک صوبے کی حیثیت سے شامل ہونے پر آمادہ کرلیں گے ——— اگر آپ (جناح صاحب) یہ تجویز قبول کرلیں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ خان برادران، ایک دوست کی طرح آپ کا خیر مقدم کریں گے اور آپ کے نقطۂ نظر کو توجہ سے سنیں گے۔" قائداعظم نے یہ تجویز قبول کرلی مگر اس شرط کے ساتھ کہ کانگریس یہ وعدہ کرے کہ وہ سرحد کے عوام کے معاملے میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کرے گی۔" گاندھی جی اور کانگریس نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ پیارے لال رقم طراز ہیں: "کانگریس کے لیے ایسی کسی تجویز کو قبول کرلینا، سیاسی خودکشی کے مترادف تھا۔" سردار پٹیل نے اس تجویز کے سلسلے میں گاندھی جی سے ملاقات کی اور گاندھی جی نے ۸ تاریخ کو نہرو کو ایک مکتوب لکھا کہ "ان کا (سردار پٹیل) خیال ہے کہ بادشاہ خان (غفار خان) کا اثر ورسوخ کم ہوتا جارہا ہے۔ بادشاہ خان نے مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی ———
میرا خیال بھی یہی ہے کہ بادشاہ خان کے بغیر ڈاکٹر خان صاحب اور ان کے ساتھیوں کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی۔ جہاں تک کانگریس کے اثر ورسوخ کا تعلق ہے اس کے لیے بادشاہ خان ہی سب کچھ ہیں۔"

۱۸ جون کو خان عبدالغفار خان نے قائداعظم کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات کی اور قائداعظم کے سامنے کچھ شرائط رکھیں جن کے منظور ہونے کے بعد ہی سرحد، پاکستان

مہاتما گاندھی ——— دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال۔ صفحہ ۲۶۶ — بحوالہ متذکرہ بالا صفحہ ۲۶۶

بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۲۶۷

میں شامل ہو سکتا تھا۔ خان عبدالغفار خان کا رویہ کچھ ایسا تھا جیسے صرف وہی صو
کے واحد نمائندہ ہیں۔ ان کی شرائط اس قدر لغو تھیں کہ قائداعظم کے لیے ان کو
دیکھنے کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ سرحد کے ریفرنڈم میں رخنہ اندازی کی تمام
ناکام ہو گئیں اور سرکاری حکام نے غیر جانبدارانہ اور پرامن ریفرنڈم کے انتظا
زور شور سے شروع کر دیے۔

قائداعظم سے ملاقات کے بعد غفار خان پشاور واپس چلے گئے۔ ۲۱ جون کو
انہوں نے بنوں میں ایک جلسے سے خطاب کیا جس میں سرحد کانگریس کمیٹی، کانگریس پارلیمان
کے ممبروں، خدائی خدمتگاروں اور زلمائی پختونوں (دی ینگ پٹھان لیگ) نے شرکت
جلسے میں اتفاق رائے سے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ تمام پختونوں پر مشتمل پٹھانوں کی
آزاد مملکت قائم کی جائے۔ اس مملکت کے دستور کی بنیاد جمہوریت، مساوات اور
انصاف کے اسلامی اصولوں پر ہو گی۔ یہ جلسہ تمام پٹھانوں سے اپیل کرتا ہے کہ وہ
مقصد کے حصول کے لیے متحد ہو جائیں اور غیر پختون اقتدار کے آگے سر نہ جھکائیں۔[1]

خان عبدالغفار خان کو یقین تھا کہ سرحد کے عوام ان کے نقطہ نظر کی حمایت
کریں گے لہذا انہوں نے اپنی پارٹی کے کارکنوں یعنی خدائی خدمتگاروں اور ا
حامیوں پر زور دیا کہ رائے شماری کا بائیکاٹ کیا جائے۔ بریگیڈیئر جے بی بُوتھ کو
کمشنر مقرر کیا گیا تھا۔ ان کی مدد کے لیے ہندوستانی فوج کے انگریز افسر موجود تھے۔
میں مسلم لیگ کو زبردست کامیابی ہوئی۔ دو لاکھ نواسی ہزار (۲۸۹۲۴۴) دو سو چوالیس افراد نے
دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کے حق میں اور دو ہزار آٹھ سو (۲۸۷۴) چوہتر نے اس کی مخ
میں ووٹ دیے۔

---

[1] مہاتما گاندھی ——— دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال۔ صفحہ ۲۷۵

قیام پاکستان کے بعد بھی سرحدی صوبے میں ڈاکٹر خان صاحب کی کانگرسی حکومت
رار رہی۔ ۲۱ اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِاعظم نے گورنر جنرل پاکستان کی حیثیت سے اس
برطرف کیا۔ پاکستان قائم ہو گیا تھا لیکن غفار خان، پختونستان کے قیام کے لیے
ساں تھے۔ اپنے بھائی کی وزارت کی برطرفی کے ایک مہینے بعد انھوں نے
ب میں اپنی حامی سیاسی تنظیموں کا جلسہ بلایا اور پختونستان کے قیام کا مطالبہ
جلسے میں طے کیا گیا کہ پختونستان میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے چھ طے شدہ
آس پاس کے ایسے دوسرے پٹھان علاقے شامل ہوں گے جو پختونستان میں شامل
آمادہ ہوں "یہ مملکت دفاع، امورِ خارجہ اور مواصلات کے شعبوں میں پاکستان
سے سمجھوتہ کرے گی" جلسے کے آخر میں غفار خان نے اعلان کیا "پختونستان کے
لیے میں زندگی بھر جدوجہد کرتا رہا ہوں ——— میں ۱۹۲۰ء میں جن اصولوں
تھا آج بھی ان پر عمل پیرا ہوں ——— اس لیے میرا استہ قطعی صاف ہے
راستے سے نہیں ہٹوں گا خواہ دنیا میں تنہا ہی کیوں نہ رہ جاؤں"[1]

سلہٹ اور سرحد کے ریفرنڈم کے بارے میں قائدِاعظم کو یقین تھا کہ دونوں جگہ
کے حق میں بھاری اکثریت سے ووٹ پڑیں گے۔ اس کا اظہار اس انٹرویو سے
جو انھوں نے جون ۱۹۴۷ء میں دہلی میں ممتاز ہندوستانی صحافی ڈی ایف کراکا
ا۔ اس انٹرویو میں قائدِاعظم نے فرمایا تھا کہ کانگرسی اراکین میں رواداری
ے۔ انھیں کچھ دو اور کچھ لو کے اصول کے مطابق زندگی بسر کرنا آتا ہی نہیں۔ انھوں
"کانگرسیوں کا کہنا ہے کہ میں نے اپنے نام و نمود کی خاطر پاکستان کے لیے جدوجہد
مجھ میں ایسا کوئی خود آرائی کا جذبہ نہیں ہے۔ میں تو نہایت مسکین اور منکسر المزاج

---

[1] گاندھی ——— دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال صفحہ ۲۰۳

لوگوں میں سے ہوں"۔ کرا کا نے قائدِ اعظم کو بتایا کہ انھوں نے مولانا آزاد سے ملاقات کی تھی اور مولانا آزاد کو یقین ہے کہ سلہٹ میں رائے شماری کا نتیجہ کانگریس کے حق میں ہوگا۔ تاہم سرحد کے باب میں وہ وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ قائدِ اعظم نے برجستہ پوچھا۔ اگر آپ مسلمان ہوتے تو کس کو ووٹ دیتے؟ کرا کا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ لکھتے ہیں: "انھوں (قائدِ اعظم) نے اپنے سر کو جنبش دی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ زبانِ بے زبانی سے کہہ رہے ہوں کہ بوڑھے مولانا (آزاد) کی نیت تو نیک ہے لیکن وہ احمق ہیں"۔[ٹ]

سرحد اور سلہٹ کی رائے شماری کے نتائج سے ظاہر ہو گیا کہ قائدِ اعظم کی بات درست تھی۔ مولانا آزاد اور کانگرس کے دوسرے لیڈر خوش فہمی کا شکار تھے۔

۳ جون کے منصوبے سے مسلم لیگ اور کانگرس کو باخبر کرنے کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے ریاستوں کی نظارت کمیٹی (نگوسی ایشن کمیٹی) کا اجلاس طلب کیا۔ یہ کمیٹی ایک طرح سے ایوانِ والیانِ ریاست کی ایگزیکٹو کمیٹی تھی۔ طویل مباحث ہوئے جن میں مختلف النوع خیالات پیش کیے گئے۔ کچھ ممبروں کی رائے تھی کہ اختیارات کی منتقلی سے قبل اقتدارِ اعلیٰ ختم کر دیا جائے تاکہ ریاستیں آزادی کے ساتھ اپنی حیثیت کا فیصلہ کر سکیں لیکن بعض اراکین اس سے متفق نہ تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کا خیال تھا کہ جب اقتدارِ اعلیٰ ختم کیا جائے گا تو ریاستیں یہ فیصلہ پوری آزادی سے کر سکیں گی کہ انھیں کس دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہیے لیکن انھوں نے کہا کہ پاکستان کے مقابلے میں ہندوستان میں دستور کا واضح خاکہ موجود ہوگا کیونکہ ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی پہلے ہی سے موجود ہے۔ وی پی مینن نے لکھا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے راجواڑوں کو بتایا۔ میرا خیال ہے جناح صاحب ایک دستور سے اہم نکات

ٹ [illegible]، صفحہ ۱۰، اشاعت ۱۹۵۰ء، وکٹر گولانز لمیٹڈ لندن

ب کر رہے ہیں مگر اقتدار اعلیٰ ختم ہونے سے پہلے کوئی ٹھوس چیز سامنے نہیں آسکے گی؛[1]
رمیں وائسرائے نے کہا کہ وہ سرکاری حیثیت سے یہ رائے نہیں دے سکیں گے کہ کسی
ست کو کس دستور ساز اسمبلی میں شامل ہونا چاہیئے یا یہ کہ ریاستوں کو ایسا قدم اٹھانا
ہیئے یا نہیں۔ تاہم راجواڑے ذاتی طور پران سے صلاح مشورہ کر سکتے ہیں۔
اجلاس کے بعد نواب بھوپال نے جو ایوان والیانِ ریاست کے چانسلر تھے، وائسرائے
اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ انھوں نے اپنے مکتوب میں تحریر کیا کہ اقتدار اعلیٰ ختم ہوتے ہی
است بھوپال آزاد ریاست بن جائے گی۔"

اقتدار اعلیٰ کے خاتمے کی تاریخ کے بارے میں مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات
ے تھا اور یہ بھی طے نہ ہو پایا تھا کہ اقتدار اعلیٰ ختم ہونے پر صورت حال کیا ہو گی؟ ۱۳؍
ن کو ماؤنٹ بیٹن نے اس پریشان کن سوال پر بات چیت کے لیے مسلم لیگ اور کانگریس
لیڈروں کو طلب کیا۔ مسلم لیگ کی نمائندگی قائد اعظم، لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر نے
۔ قائد اعظم نے اظہار خیال کیا کہ ریاستوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دونوں میں سے کسی
ی دستور ساز اسمبلی میں شریک نہ ہوں کیونکہ اقتدار اعلیٰ کے خاتمے پر ریاستیں
د مختار اور آزاد ہوں گی۔ انھوں نے فرمایا کہ ریاستوں کو کسی ایک اسمبلی میں شرکت پر
بور کرنا قانون اور دستور کے منافی ہوگا اور یہ کیبنٹ مشن کی منشا کے بھی خلاف ہوگا۔ اس
ے برعکس نہرو کی اور ہی رائے تھی۔ وائسرائے نے مدعوئین کو "حالات جوں کے توں رہنے
ینے کے سمجھوتے" (دی اسٹینڈ سٹل ایگریمنٹ) کے مسودے کی نقول دیں جس پر غور و خوض
ملتوی کر دیا گیا کیونکہ مسلم لیگ اور کانگریس کے لیڈر اس کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ اس

---

[1] دی اسٹوری آف دی انٹگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۸۲۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء
اورینٹ لونگ مینس لمیٹڈ بمبئی۔

کانفرنس کے نتیجے میں ریاستوں کے معاملوں سے نمٹنے کے لیے ریاستوں کا محکمہ قائم کیا۔ جسے ہندوستان اور پاکستان کے لیے دو شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ مسلم لیگ نے ریاستوں محکمے کے لیے سردار نشتر کو اور کانگرس نے سردار پٹیل کو نمائندہ نامزد کیا۔

اس دن ٹراونکور نے اعلان کیا کہ ریاست کو آزاد اور خود مختار تصور کیا جائے دوسرے دن حیدرآباد نے بھی ایسے ہی فیصلے کا اعلان کر دیا۔ ایک ہفتے بعد قائد اعظم نے بیان میں فرمایا کہ ہر ریاست کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اگر چاہے تو اقتدار اعلیٰ ختم پر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دے۔ قائد اعظم کے اس بیان کے بعد ٹراونکور کے وزیر اعظم نے ایک بیان میں کہا کہ میری ریاست پاکستان میں اپنا ٹریڈ کمشنر مقرر کرے گی۔

جولائی کی آخری تاریخوں میں قائد اعظم نے مہاراجہ جودھپور اور مہاراجہ جیسلمیر سے تفصیلی گفتگو کی۔ ان دونوں ریاستوں اور ریاست بیکانیر کی سرحدیں پاکستان سے ملتی تھیں مینن رقم طراز ہیں: مجھے بتایا گیا کہ جناح نے ایک سادہ کاغذ پر دستخط کر کے وہ کاغذ اور اپنا قلم (جودھپور کے) مہاراجہ جسونت سنگھ کے سامنے رکھ دیا اور فرمایا اس پر آپ اپنی شرائط تحریر کر سکتے ہیں۔ جودھپور پاکستان میں شمولیت پر آمادہ تھا لیکن مہاراجہ جیسلمیر آڑے آ رہے تھے۔ مہاراجہ جسونت سنگھ نے قائد اعظم سے کچھ مہلت مانگی اور کہا کہ وہ ریاست واپس جا کر اپنے دوستوں اور مشیروں سے مشورے کے بعد ان کو (غالباً شمولیت کے بارے میں) اگلے روز کوئی جواب دے سکیں گے۔ لیکن مہاراجہ کے دوست اور مشیر پاکستان میں شمولیت کے خلاف تھے اور یہ سارا معاملہ طشت از بام ہو گیا۔ کانگرس کو اس کی بھنک لگی تو سردار پٹیل کے ذریعے وی پی مینن کو یہ معاملہ سونپا گیا۔ مینن نے لکھا ہے "تین روز بعد جب وہ (مہاراجہ جودھپور) دہلی واپس آئے تو مجھ سے کہا گیا کہ مہاراجہ کو راہ راست پر لایا جائے ورنہ ممکن ہے وہ پاکستان سے الحاق کر لے۔ مینن مہاراجہ سے ملنے امپیریل ہوٹل گئے اور ان سے کہا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن آپ سے فوراً ملنا چاہتے ہیں۔ جب

ات ہوئی تو ماؤنٹ بیٹن نے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ قانونی طور پر اگرچہ وہ پاکستان
الحاق کر سکتے ہیں تاہم یہ اقدام تقسیم ہند یعنی مسلم اور ہندو علاقوں کے اصول کے خلاف
۔ مہاراجہ نے ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ میں ہندوستان سے الحاق نہیں کروں گا ۔ مینن
ہیں " کافی طویل گفتگو کے بعد میں نے مہاراجہ کو ایک خط دیا جس میں ان کے کچھ مطالبات
م کر لیے گئے تھے ۔ اس کے بعد مہاراجہ نے ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط
یے ۔ اس کے چند منٹ بعد ماؤنٹ بیٹن کمرے سے باہر چلے گئے تو مہاراجہ نے ریوالور
لیا اور کہنے لگے کہ میں تمہارے دباؤ میں نہیں آؤں گا ـــــ اس پر میں نے کہا کہ
جیسی حرکت نہ کیجیے۔" مہاراجہ جودھپور نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا مگر وہ ریاست
ار پٹیل کی نذر کر چکے تھے ۔

اسی طرح نواب بھوپال نے بھی الحاق کے کاغذات پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا
ا کہ میں ہندوستان اور پاکستان دونوں کے ساتھ موجودہ حالات برقرار رکھنے کا سمجھوتہ کرنا
اہوں ۔ اس وقت چودھری ظفر اللہ خاں نواب بھوپال کے قانونی مشیر تھے ۔ مینن
از میں " نواب بھوپال اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن میں پرانی دوستی تھی اور اسی دوستی کے
ہ نواب بھوپال ہندوستان سے الحاق پر رضامند ہو گئے۔" تمام ہندو ریاستوں کے
ہوں نے ۱۵ اگست سے پہلے ہی ہندوستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط کر دیے۔
ست ہے کہ چند مہاراجوں نے کسی قدر تذبذب سے کام لیا مگر انھوں نے بھی بالآخر
وستان سے الحاق کر لیا ۔

نظام حیدر آباد نے ابھی تک خود کو ان کارروائیوں سے الگ تھلگ رکھا تھا اور
اؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کے صلاح مشورے سے نظام کو مزید دو مہینے کی مہلت دے

دی انٹیگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس ۔ صفحات ۱۱۶/۱۱۷ ۔ وی پی مینن ۔

دی تھی۔ اس مرحلے میں انھیں ہندوستان سے ریاست کے الحاق کے بارے میں فیصلہ کرنا تھا۔

مہاراجہ کشمیر کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکے تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جولائی ۱۹۴۷ء میں ریاست کا دورہ کیا اور مہاراجہ سے، جو ان کے دوست تھے، ریاست کشمیر کی آئندہ حیثیت کے بارے میں تفصیلی گفتگو کی۔

کاٹھیاواڑ کی ایک اہم ریاست جوناگڈھ کے نواب مسلمان تھے۔ انھوں نے ہندوستان سے الحاق یا اسٹینڈ سٹل ایگریمنٹ پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ نواب مناودر اور شیخ مانگرول نے بھی یہی کیا۔ نواب جوناگڈھ پاکستان سے الحاق چاہتے تھے اور کانگرس اس میں مزاحم ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود نواب جوناگڈھ نے اپنے وزیر اعظم سر شاہنواز بھٹو کے مشورہ پر، جو خان بہادر عبدالقادر کی جگہ وزیر اعظم بنے تھے، ۱۵ اگست کو ایک سرکاری اعلان میں پاکستان سے الحاق کا اعلان کر دیا۔ اعلان میں کہا گیا تھا کہ "ریاستی حکومت تمام حالات کا بغائر مطالعہ کرنے کے بعد پاکستان سے الحاق کے فیصلے کا اعلان کرتی ہے۔" ۲۱ اگست کو حکومت ہند نے ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر کے نام ایک مکتوب میں نواب جوناگڈھ کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا جو الحاق کے بارے میں عوام کی رائے معلوم کیے بغیر کیا گیا تھا۔ ریاست کے عوام نے نواب کے فیصلے کے خلاف کسی ناپسندیدگی اور ناراضی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے ریاست میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر بھی کوئی اثر نہیں پڑا تھا۔ سرور حسن رقم طراز ہیں: "اس کے باوجود نواب کے فیصلے کے بعد ہندوستان نے جوناگڈھ کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی۔ مواصلات کے سلسلے کاٹ دیے گئے دہشت انگیزی کی مہم شروع کر دی گئی اور ہندوستانی فوجوں نے ریاست کا محاصرہ کر لیا۔"[1]

---

[1] پاکستان اینڈ دی یونائیٹڈ نیشنز۔ سرور حسن، صفحہ ۸۳۔

ستمبر کی درمیانی تاریخوں میں ہندوستان کی کابینہ نے جوناگڑھ پر دباؤ ڈالنے کی غرض سے وی پی مینن کو اپنے نمائندے کی حیثیت سے جوناگڑھ بھیجا۔ نواب جوناگڑھ علیل تھے اس لیے مینن سے ان کی ملاقات نہ ہو سکی۔ مینن نے ریاست جوناگڑھ کے دیوان سر شاہنواز بھٹو سے گفتگو کی اور کہا کہ ایسا کوئی اہم قدم اٹھانے سے پہلے عوام کی رائے معلوم کی جانی چاہیے تھی۔ مینن نے دھمکی دی کہ الحاق کے سوال پر اگر جوناگڑھ میں رائے شماری نہیں کرائی گئی تو سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔ انھوں نے کہا کہ عوام کو بھیڑ بکریوں کی طرح اس ملک کی طرف یا اس ملک کی جانب ہانکا نہیں جا سکتا۔ انھیں اپنے مستقبل کا خود فیصلہ کرنا چاہیے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہندوستان نے خود اپنایہ اصول کہ ایسے مسئلوں کا فیصلہ صرف عوام کی مرضی کے مطابق کیا جانا چاہیے، کشمیر، حیدرآباد اور گوا میں نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد ہندوستان کے نمائندے مینن نے اپنی توجہ نواب مانا ودر اور شیخ مانگرول کی جانب مبذول کی۔ مانا ودر اور مانگرول بھی پاکستان سے الحاق کے کاغذات پر دستخط کر چکے تھے۔

۲۵ ستمبر کو ہندوستان کی سٹیٹ منسٹری نے اعلان میں کہا کہ ہندوستان کاٹھیاواڑ کی ریاستوں کے تحفظ کے لیے اقدامات کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوستان نے جوناگڑھ مانا ودر اور مانگرول کو دھمکانے کے لیے فوج کا ایک بریگیڈ کاٹھیاواڑ بھیج دیا۔ حکومت پاکستان نے ہندوستان کو اسی دن ایک احتجاجی تار بھیجا لیکن اسے نظر انداز کر دیا گیا اور ہندوستان دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے "پولس ایکشن" کی آڑ لے کر فوجی کارروائیوں میں مصروف رہا۔ بریگیڈیئر گوردیال سنگھ کی کمان میں ہندوستانی فوج کی مدد کے لیے نواں نگر، بھاؤ نگر اور پوربندر کی مسلح افواج بھی موجود تھیں اور یہ تمام فوجی قوت جوناگڑھ، مانگرول اور مانا ودر کی مزاحمت ختم کرنے کے لیے جمع کی گئی تھی۔ اس سلسلے میں مینن نے لکھا ہے "لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے کسی ایسی کارروائی سے بچنے پر زور

دیا جس سے ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑنے کا امکان ہو۔ ایسی کسی جنگ سے پاکستان کا وجود ختم ہونے کا امکان تھا مگر اس سے ہندوستان کا وجود بھی کم از کم ایک نسل کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ سکتا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کوئی غلط قدم اٹھا کر اپنی بین الاقوامی حیثیت کی عظمت سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔[1]

حکومت ہند فوجی کارروائی سے بھی مطمئن نہ ہوئی۔ ۲۵۔ دسمبر کو بمبئی میں ایک عام جلسے کا بندوبست کیا گیا جس میں جوناگڈھ کی عبوری حکومت قائم کی گئی، سامل داس گاندھی کو اس عبوری حکومت کا صدر مقرر کیا گیا اور انھیں وہ تمام اختیارات سونپے گئے جو ۱۵ ستمبر ۱۹۴۷ء سے پہلے نواب جوناگڈھ کو حاصل تھے۔ یہ ایک غیر آئینی حکومت کا ایک غیر قانونی فرمان تھی۔ سر چمن لال سیتل واد نے ۲ نومبر کو ٹائمز آف انڈیا کے نام ایک مراسلے میں جوناگڈھ کی عبوری حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا "سب جانتے ہیں کہ جوناگڈھ کی نام نہاد عبوری حکومت بمبئی میں قائم کی گئی تھی۔ کئی دن تک یہ حکومت جوناگڈھ کی آئینی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے ریاست پر مارچ کرنے کے اعلان کرتی رہی۔ عبوری حکومت کے لیڈروں نے کھلے بندوں رضاکار بھرتی کیے اور رضاکاروں کی اس فوج نے جوناگڈھ کے علاقے میں کئی دیہات پر قبضہ کر لیا۔ عبوری حکومت نے راجکوٹ میں جوناگڈھ ہاؤس پر زبردستی قبضہ جما لیا اور ریاست راجکوٹ (جو ہندوستان سے الحاق کر چکی ہے) اور خود حکومت ہند خاموش تماشائی کی طرح ایک ایسی ریاست کے خلاف یہ تمام غیر دوستانہ سرگرمیاں دیکھتی رہی جس کا رویہ ہندوستان کے ساتھ پُرامن تھا۔"

۴ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو حکومت ہند کے ایک اعلامیہ میں پھر کہا گیا کہ حکومت ہند نیک نیتی

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس۔ وی۔ پی مینن۔ صفحہ ۱۳۰

سے یہ سمجھتی ہے کہ الحاق جیسے معاملوں کا فیصلہ رائے شماری کے ذریعے خود عوام کریں اور ہندوستان کے نزدیک یہ طریقہ ہی جمہوری، پُرامن اور منصفانہ ہے۔ کشمیر کو زبردستی ہندوستان میں شامل کرنے اور کشمیر میں رائے شماری کے متعلق پاکستان کے اصرار کی روشنی میں ہندوستان کا یہ دعویٰ اور یہ استدلال کس قدر بھونڈا اور مضحکہ خیز نظر آتا ہے۔

۲۲ تاریخ کو ہندوستانی فوج ریاست مانا ودر میں داخل ہوگئی اور اس نے اس چھوٹی سی ریاست پر قبضہ جما لیا۔ ہندوستان نے یکم نومبر کو مانگرول میں بھی اسی مسلح جارحیت کا ارتکاب کیا۔

نواب جونا گڑھ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اکتوبر کے آخر میں ہوائی جہاز سے کراچی چلے گئے اور ۸ نومبر کو سر شاہنواز بھٹو بھی کراچی آگئے۔ اب ہندوستانی فوج کا کوئی مزاحم نہ رہا تھا۔ ہندوستانی فوج اور نام نہاد عبوری حکومت کے نمائندے، سامل داس گاندھی اور ڈھیبر (جو بعد میں کانگریس کے صدر بنے) کی قیادت میں جونا گڑھ میں داخل ہوئے اور انھوں نے ریاست کا نظم و نسق سنبھال لیا۔ سرکاری عمارتوں اور نواب کے محلات پر ہندوستانی ترنگا لہرانے لگا۔ ریاست کی پیدل اور گھڑ سوار فوج اور پولس سے ہتھیار رکھوا لیے گئے اور سرکاری خزانے اور سٹور پر تالے ڈال دیے گئے۔ نام نہاد عبوری حکومت کی ہندو ملیشیا کے اراکین سڑکوں پر پریڈ کرتے اور اپنی کامیابی کے نشے میں سرشار و بدمست نظر آتے تھے۔ مسلم آبادی، حالات کا رُخ دیکھ کر اور مستقبل سے خوفزدہ ہو کر گھروں میں محصور ہو کر بیٹھ گئی۔

قائدِ اعظم ان ریاستوں کے بارے میں پاکستان اور ہندوستان کے تنازعے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی جد و جہد میں مصروف تھا۔ بایں ہمہ پاکستان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اپنے علاقوں کے حصول کے لیے ہندوستان کے خلاف اعلانِ جنگ کر سکے۔ پاکستان کے موقف کے جواز کے لیے صرف قانونی اور آئینی اقدامات

لیے جا سکتے تھے۔ چنانچہ قائدِ اعظم کے صلاح مشورے سے نواب زادہ لیاقت علی خاں وزیرِ اعظم پاکستان نے ۱۱ نومبر کو حکومتِ ہندوستان کے نام ایک تار بھیج کر اس کے جوناگڑھ پر زبردستی قبضے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ لیاقت علی خاں نے ہندوستان کی اس کارروائی کو بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا۔ انھوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستانی فوجیں فوراً جوناگڑھ خالی کر دیں اور ریاستی حکومت نواب کے سپرد کی جائے جو ریاست کے آئینی حکمران ہیں۔ اس احتجاج کے جواب میں نہرو نے کہا کہ ہندوستان کی کارروائی سراسر جائز ہے اور ہندوستان نے تو صرف جوناگڑھ کے عوام کی مدد کی ہے جو اپنے بنیادی حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

کوئی ہوش مند اور باشعور شخص جوناگڑھ، ماناودر اور مانگرول کے متعلق ہندوستان کے جواز کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کی یہ کارروائی سراسر مداخلت بے جا اور کھلی جارحیت تھی۔ حکومتِ پاکستان نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ تینوں ریاستیں ہندوستان کا جُزو ہیں۔ آئینی اعتبار سے یہ ریاستیں اب بھی پاکستان کا حصہ ہیں۔

۳ جون کے منصوبے کے اعلان کے بعد نظام حیدرآباد نے ایک فرمان جاری کیا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان کسی بھی ملک کی دستور ساز اسمبلی میں اپنے نمائندے نہیں بھیجیں گے۔ نظام کا کہنا تھا کہ اقتدارِ اعلیٰ کے خاتمے کے بعد اور انگریزوں سے پرانے معاہدات کے پیشِ نظر انھیں آئینی طور پر حیدرآباد کی آزادی اور خود مختاری کا اعلان کرنے کا حق حاصل ہے۔ جولائی کے اوائل ہی سے نظام کے نمائندے ریاست کے لیے خصوصی مراعات کے بارے میں حکومتِ ہند سے بات چیت کے لیے برابر دہلی آ جا رہے تھے۔ نظام کے نمائندوں سے ہمیشہ لمبے چوڑے مطالبے کیے جاتے جن کا مطلب ریاست کا ہندوستان سے الحاق تھا مگر نظام سختی سے الحاق کی مخالفت کرتے۔ حد یہ ہے کہ ہندوستان انھیں طرح طرح کی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ نظام نے تمام معاملات کا انتہائی دقتِ نظری

سے جائزہ لینے کے بعد ۸ راگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ حیدرآباد ہندوستان یا پاکستان کسی بھی ملک سے الحاق نہیں کرے گا۔ اس پر حکومت ہند چراغ پا ہو گئی اور ہندوستان کے مرد آہنی سردار پٹیل جو ریاستوں کو ہڑپ کرنے کا مقدس فرض انجام دے رہے تھے جوڑ توڑ میں مصروف ہو گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ۱۵ راگست کو ہندوستان کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کیا۔ اس موقع پر انھوں نے کہا کہ تمام ریاستیں ہندوستان سے الحاق کر چکی ہیں لیکن ریاست حیدرآباد نے ابھی تک الحاق نہیں کیا ہے۔ نظام حیدرآباد کے خلاف اشتعال انگیز پروپیگنڈا کرنے والے ہندوؤں اور ہندو اخباروں کو مطمئن کرنے کے لیے ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ ہندوستان کو توقع ہے کہ اس مسئلے کا تسلی بخش تصفیہ ہو جائے گا۔ لیکن مینن رقم طراز ہیں کہ سردار پٹیل نے انتہائی سخت رویہ اختیار کر رکھا تھا۔ انھوں نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ میرے خیال میں نظام کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کرنے کے سوا چارہ نہیں ہے[1]۔ حکومت ہند کی دھمکیوں اور دباؤ کے باوجود نظام حیدرآباد کو آزاد اور خود مختار ریاست بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ آزاد اور خود مختار حیدرآباد کے ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں سے دوستانہ تعلقات رہیں۔ ۲۷ راگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے نظام کو لکھا کہ ریاست میں رائے شماری کرائی جائے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ آیا ریاست کے عوام ریاست کے ہندوستان سے الحاق کے حق میں ہیں۔ اس کے جواب میں نظام نے لکھا حیدرآباد کے مسئلے کی نوعیت اور آئینی پوزیشن کچھ ایسی ہے کہ رائے شماری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سردار پٹیل نے ، جو ان معاملوں میں حکومت ہند کے ترجمان بنے ہوئے تھے ، ریاست حیدرآباد کو ہڑپ کرنے اور ہندوستان میں شامل کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ انھیں نظام

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس ۔ وی پی مینن ۔ صفحہ ۳۲۲

کے پیش کردہ آئینی اور قانونی نکات کی پروانہ تھی۔ ۲۶ ستمبر کو نظام نے پھر ماؤنٹ بیٹن کو لکھا کہ اگر ہیں نے ہندوستان سے ریاست کے الحاق کا اعلان کر دیا تو ریاست میں خانہ جنگی کی آگ بھڑک اٹھے گی۔ بنابریں مجھے اپنے اس آئینی حق کو استعمال کرنے دیا جائے کہ حیدرآباد آزاد رہے گا۔ اپنے مکتوب کے آخر میں انھوں نے حکومت ہند سے کہا تھا کہ حیدرآباد سے ہندوستانی فوجیں واپس بلالی جائیں۔ مینن اس وقت ہندوستان کی ریاستوں کی وزارت کے سکریٹری تھے۔ وہ فوجوں کی واپسی کے معاملے پر رقم طراز ہیں۔ "مذاکرات کے دوران میں حیدرآباد کے وفد نے ایک دو بار اس نکتہ پر اصرار کیا لیکن میں نے کوئی یقینی جواب نہیں دیا۔ نظام نے ایک بار پھر یہ سوال اُٹھایا مگر حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ مذاکرات کے اختتام تک اس مسئلے پر کوئی کارروائی نہ کی جائے"[۱]

حکومت ہند جب نظام کو ہندوستان سے مکمل الحاق کے لیے ڈرانے دھمکانے میں ناکام ہوگئی تو اس نے یہ کوشش کی کہ الحاق نہ سہی کچھ نہ کچھ تو حاصل ہو ہی جائے۔ اس سلسلے میں مینن رقم طراز ہیں "حکومت ہند خسارے میں تو رہتی مگر یہ طے کیا گیا کہ حیدرآباد کو پاکستان سے بھی الحاق نہ کرنے دیا جائے"۔ ہر نئی صبح حیدرآباد کے مسلم عوام پر ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے ظلم وستم کی لہرے کر آتی۔ ان ہندوؤں کو مدراس اور بمبئی سے باقاعدہ تربیت کے بعد اور بخوبی مسلح کر کے حیدرآباد بھیجا جا رہا تھا۔ مسلمانوں کے لیے صبر آزما حالات پیدا ہو گئے تھے اس لیے مسلمانوں کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے سید قاسم رضوی کی قیادت میں جماعت اتحاد المسلمین میدان میں آگئی۔ اس تنظیم کا قیام بڑی حد تک خطیب اعظم بہادر یار جنگ کا مرہون منت تھا جن کی قائداعظم بہت عزت کرتے تھے۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء تک اتحاد المسلمین ریاست میں انتہائی مقبول ہو گئی تھی۔ قاسم رضوی کا اثر و رسوخ برابر بڑھ رہا تھا

---

[۱] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۲۵

تھا اور اب حیدر آباد کے بارے میں وہ یا ان کی جماعت الگ تھلگ نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اتحاد المسلمین ہندوستان سے الحاق کے خلاف تھی اور وہ چاہتی تھی کہ حیدر آباد ایک آزاد ریاست کے طور پر قائم رہے۔

اکتوبر کے آخر میں نظام نے ریاست کی طرف سے ایک وفد حکومت ہند کے ساتھ مکمل الحاق کے بجائے ایک مصالحتی قرار ہونے پر گفت و شنید کے لیے بھیجا۔ اس وفد میں نواب معین نواز جنگ، عبدالرحیم اور پنگل ریڈی شامل تھے۔ وفد نے درخواست کی کہ حکومت ہند اگر الحاق کے سمجھوتے کو تبدیل کرنے پر رضامند نہیں ہے تو کم از کم مساوی حیثیت کے بارے میں اپنا موقف کچھ نرم کر دے۔ اس معمولی سی درخواست کو بھی مسترد کر دیا گیا۔ مینن کے کہنے کے مطابق سردار پٹیل کا خیال تھا کہ "ہمارے (ہندوستان) لیے واحد شریفانہ طریقہ یہ ہے کہ وفد کو اسی جہاز سے واپس کر دیا جائے جس سے وہ دہلی پہنچا تھا۔"[1] لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وفد سے کہا کہ نظام تک یہ پیغام پہنچا دیا جائے کہ اگر انھوں نے سمجھوتے پر دستخط نہیں کیے "تو ممکن ہے حیدر آباد کو تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑے۔" اسی سلسلے میں مینن آگے چل کر لکھتے ہیں "حکومت ہند سے جو مذاکرات ہو رہے تھے، ان کے متعلق نظام نے جناح صاحب سے بھی مشورہ کیا تھا۔"[2]

نومبر ۱۹۴۷ء کے اوائل میں میر لائق علی حیدر آباد کے موقف کے بارے میں قائداعظم سے مشورہ کرنے کے لیے لاہور پہنچے۔ میر لائق علی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، حیدر آباد کے بارے میں قائداعظم واضح اور ٹھوس خیالات رکھتے تھے ــــــ انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچا کہ حیدر آباد کے لیے پاکستان سے الحاق ضروری یا موزوں تھا۔ ان کے نزدیک اس کا کوئی جواز نہیں تھا کہ الحاق حیدر آباد کے سلسلے میں ہندوستان زیادتی

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۳۰ [2] حوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۳۳۳

پر کوئی دباؤ ڈالے ـــــــ انھیں اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ حیدرآباد اور ہندوستان کے درمیان اچھے تعلقات کا قیام بہت اہم اور ضروری تھا اور انھوں نے تاکیداً فرمایا کہ صرف "سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ" پر جلد دستخط کر دیے جائیں بلکہ اس سمجھوتے پر بخوبی عملدرآمد بھی کیا جائے۔ قائداعظم نے خیال ظاہر فرمایا کہ دونوں فریق اگر اس ایگریمنٹ کے ایک سال کے عرصے کو صحیح طور پر استعمال کریں تو اس طرح اپنے اختلافات دوستانہ طور پر طے کر لیں گے اور تمام باہمی شبہات دور ہو جائیں گے۔[1]

اس پر میر لائق علی نے قائداعظم سے دریافت کیا کہ آیا ان کے خیال میں ہندوستان حیدرآباد کو الحاق پر مجبور کرنے کے لیے طاقت استعمال کر سکتا ہے؟ قائداعظم نے فرمایا کہ میں پیش گوئی کرنا نہیں چاہتا مگر میرا خیال ہے کہ اس بات کا بہت کم امکان ہے۔ قانونِ آزادیٔ ہند کے تحت آئینی پوزیشن سے قطع نظر میرے خیال میں اگر ہندوستان نے حیدرآباد کے معاملات میں مسلح مداخلت کی تو عالمی رائے عامہ ہندوستان کے خلاف ہو جائے گی۔ آخر میں انھوں نے فرمایا کہ میں حیدرآباد کو ہندوستان سے باعزت اور پائیدار تعلقات قائم کرنے میں اور خود حیدرآباد کے لیے باعثِ فخر سیاسی مقام حاصل کرنے میں مقدور بھر مدد دوں گا۔[2]

حیدرآباد سے جو وفد ہندوستان گیا تھا وہ کسی مصالحتی فارمولے کے بغیر واپس آگیا اور کسی معاملے پر کوئی اتفاق رائے نہ ہوا تھا تاہم وفد کو سردار پٹیل کی بے شمار دھمکیوں سے باخبر ہونے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے بعد سید قاسم رضوی دہلی گئے۔ انھیں امید تھی کہ جن معاملوں میں وفد ناکام ہو گیا ہے، شاید وہ کامیاب ہو جائیں مگر ان کا مشن

---

[1] ٹریجڈی آف حیدرآباد۔ میر لائق علی۔ صفحہ ۱۱/۱۲ مطبوعہ ۱۹۶۲ء۔ پاکستان کواپریٹو بک سوسائٹی لمیٹڈ کراچی۔

[2] ٹریجڈی آف حیدرآباد۔ میر لائق علی۔ صفحہ ۱۱/۱۲

بھی ناکام رہا۔ دہلی میں قاسم رضوی کی کوششوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مینن نے لکھا ہے۔
"میں نے انھیں (قاسم رضوی کو) بتا دیا کہ ایسے غیر ذمہ دارانہ رویے کا انجام ان کی اور نظام کی تباہی کے سوا کچھ نہ ہو گا"[1] یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ قاسم رضوی اور ان کی تنظیم اتحاد المسلمین حکومتِ ہند کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔

وریں اثنا ریاست حیدرآباد میں ہندوستانیوں کا داخلہ برابر جاری تھا اور سرحد کے قریب ان علاقوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں تھے، مسلمانوں کی املاک کو نذرِ آتش کرنے اور لوٹ مار کے واقعات روزمرہ کا معمول بن چکے تھے۔ ان حالات میں نظام ہندوستان کے ساتھ عبوری طور پر سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ کرنے پر مجبور ہو گئے اور ۲۹ نومبر کو اس سمجھوتے پر دستخط ہو گئے۔ سمجھوتے کی مدت صرف ایک سال تھی۔ سمجھوتے کے تحت ہندوستان نے کے ایم منشی کو حیدرآباد میں اپنا ایجنٹ جنرل مقرر کیا اور اسی روز سے حکومت حیدرآباد کی داخلی مشکلات میں روزافزوں اضافہ ہوتا گیا۔ مسلمانوں کے خلاف ریاست میں جو مہم شروع کی گئی تھی وہ اب قتلِ عام میں تبدیل ہو گئی تھی۔ حکومت حیدرآباد نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ریاست میں ہندوستان کے ایجنٹ جنرل سے، جس کی تمام ہمدردیاں ہندوستان کے ساتھ تھیں اور جس کی مدد کے لیے ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہندوستانی فوج بھی موجود تھی، کسی امداد کی توقع بے کار ہے اور حالات خطرناک صورت اختیار کر رہے ہیں۔ سمجھوتے کی شرائط کے مطابق نظام نے ہندوستان سے کہا کہ ہندوستانی فوجوں کو فوراً واپس بلا لیا جائے۔ حیدرآباد میں مقیم ہندوستانی فوج ریاست کے لیے پانچویں کالم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ہندو طرح طرح سے ریاست کی اقتصادیات کو تباہ کرنے کے درپے تھے۔ نظام کی حکومت نے کچھ آرڈیننس جاری کیے جن کے مطابق ہندوستانی کرنسی کا

---

[1] دی انٹیگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۳۴

لین دین ختم کر دیا گیا اور تمام قیمتی دھاتوں کی برآمد پر مکمل پابندی لگادی گئی۔ حیدرآباد کے پاس حکومت ہند کی جو ہنڈیاں موجود تھیں ان میں سے کچھ ہنڈیاں پاکستان منتقل کر دی گئیں۔ ہندوستانی اخبار تو پہلے ہی سے ریاست کے خلاف ہرزہ سرائی میں مصروف تھے، انھوں نے اپنی مہم اور تیز کر دی۔

جہاں تک ہندوستانی ریاستوں کے الحاق، بالفاظ دیگر خاتمے، کا تعلق تھا سردار پٹیل سے زیادہ چالاک، معاملہ فہم اور بدطینت کوئی دوسرا شخص نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ اپنی ظالمانہ پالیسی کے علی الرغم (جسے ان کے دوست "معاملہ فہمی" کا نام دیتے تھے) حیدرآباد سے "سٹینڈ سٹل اگریمنٹ" کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ کراکا نے اس کی یوں وضاحت کی ہے "سردار پٹیل کو تو بس اس بات سے مطلب تھا کہ (نظام کے) اس نظریاتی تصور خودمختاری کو کس طرح باوقار انداز میں اور پُرامن طور پر ملیامیٹ کر دیا جائے"[۱]

میر لائق علی جنھیں نظام نے ریاست کی انتظامی کونسل کا صدر مقرر کیا تھا جنوری ۱۹۴۸ء کے اواخر میں دہلی گئے اور انھوں نے یہ یقین دہانی حاصل کرنے کے لیے سردار پٹیل سے کئی بار ملاقات کی کہ حکومت ہند حیدرآباد کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرے گی اور عبوری سمجھوتے کی سختی سے پابندی کرے گی۔ سردار پٹیل نے انتہائی درشت لہجے میں میر لائق علی کو تنبیہ کی کہ ریاست کے داخلی حالات بہتر بنائے جائیں اور ہندوؤں کی جان و مال کا مناسب تحفظ کیا جائے۔ ابھی یہ مذاکرات جاری تھے کہ ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کی شام کو گاندھی جی کے وحشیانہ قتل سے ہندوستان پر رنج و غم کے بادل چھا گئے۔ گاندھی جی حسب معمول اپنی پرارتھنا میں مصروف تھے کہ ناتھو رام گوڈسے نے انھیں قتل کر دیا۔

۲۱ فروری کو حیدرآباد کی صورت حال پر غور کرنے کے لیے ریاستوں کی وزارت

---

[۱] بیٹریل ان انڈیا۔ ڈی ایف کراکا۔ صفحہ ۱۶۲۔ مطبوعہ ۱۹۵۰ء۔ وکٹر گولانز۔ لندن

اور بمبئی اور مدراس کے وزرائے داخلہ میں مذاکرات ہوئے۔ حیدر آباد کے آلام و مصائب کے سرچشمہ منشی بھی خصوصی دعوت پر اجلاس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس کی روداد بیان کرتے ہوئے مینن نے لکھا ہے "بمبئی کے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ بمبئی کی سرحد پر سرگرم عمل کچھ سوشلسٹ اور کانگریسی ارکان آتشیں اسلحہ استعمال کر رہے ہیں ——— مدراس کے وزیر اعلیٰ نے ڈھکڑا رویا کہ صوبے میں کمیونسٹوں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ یہ کمیونسٹ آندھرا اور حیدر آباد کے سرحدی ضلعوں میں چھپے ہوئے ہیں اور اپنی کمین گاہوں سے نکل کر لوٹ مار کرتے رہتے ہیں[1]" اور اس کے باوجود حکومت ہند دنیا بھر میں یہ ڈھونگ رچاتے ذرا نہ شرماتی تھی کہ حیدر آباد میں تمام ہنگاموں کا سبب اتحاد المسلمین ہے۔

۲/ مارچ کو میر لائق کو پھر دہلی طلب کیا گیا اور ماؤنٹ بیٹن نے اصرار کیا کہ اتحاد المسلمین کو فوراً خلاف قانون قرار دے دیا جائے۔ میر لائق علی نے جواب دیا کہ اس تنظیم کے قیام کا اصل سبب حیدر آباد کے مسلمانوں کا یہ اندیشہ ہے کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے[2]۔" ماؤنٹ بیٹن نے میر لائق علی سے یہ بھی کہا کہ حکومت پاکستان سے کہا جائے کہ اس کے پاس حیدر آباد کی جو ہنڈیاں موجود ہیں انھیں حیدر آباد کے ساتھ سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ کے دوران میں بھنایا نہ جائے۔ "اگر ایسا ہوا تو ہندوستان اور حیدر آباد کے تعلقات میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گا[3]۔"

میر لائق علی قائد اعظم سے ذاتی طور پر قانونی اور سیاسی مشورہ لینے کے لیے دہلی سے کراچی پہنچے۔ جہاں انھوں نے پاکستان کے کچھ وزیروں سے ملاقات کی۔ اس ملاقات کے بارے میں میر لائق علی رقم طراز ہیں کہ جب میں نے یہ سوال اٹھایا کہ ہنڈیوں کو

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۴۲ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۳۴۴

[3] ٹریجیڈی آف حیدر آباد۔ میر لائق علی۔ صفحات ۱۵۳-۱۵۴

فی الحال نہ بھنایا جائے تو ان پاکستانی وزیروں نے اس بات کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھا۔" لیکن جب میں نے ان ہنڈیوں کے بارے میں ہندوستان کے ساتھ حیدرآباد کی مشکلات کی قائدِ اعظم کے سامنے وضاحت کی تو انھوں (قائدِ اعظم) نے کسی تذبذب کے بغیر فرمایا کہ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پائیدار اور اطمینان بخش تعلقات قائم رہنے کے سلسلے میں جو کچھ بھی کیا جا سکتا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ میں نے قائدِ اعظم کو بتایا کہ آپ کے کچھ وزیر اس طرح محسوس نہیں کرتے اور ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان کو ان ہنڈیوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی رقم کی اشد ضرورت ہے۔ انھوں نے اپنے مخصوص پُرسکون انداز میں انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ حیدرآباد کے مفاد کے منافی کوئی بات نہیں ہوگی۔"[1]

قائدِ اعظم کی اس فراخ حوصلگی کا میر لائق علی پر گہرا اثر پڑا۔ انھوں نے لکھا ہے "خیال تو کیجیے کہ ایک نیا ملک جس کی بنیادی انتظامی تنظیم تشکیل کے مراحل میں تھی اور جسے اپنی فوری ضرورتوں کے لیے سرمائے کی اشد ضرورت تھی حیدرآباد کی مدد کے لیے کسی حیل و حجت کے بغیر اتنی بڑی قربانی دینے پر آمادہ ہو گیا اور ادھر ہندوستان میں ہر شخص یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح حیدرآباد کا نام و نشان تک مٹ جائے۔"[2] میر لائق علی کراچی سے حیدرآباد واپس پہنچے تو ان کو حکومتِ ہند نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ دوسری طرف حیدرآباد میں انڈین کانگرس کی شاخ انھیں طرح طرح سے تنگ کر رہی تھی۔ لیکن حیدرآباد کو آلام و مصائب کے طوفان سے بخیر و خوبی نکال لے جانے کی خواہش کے سبب انھوں نے حالات کو کچھ اس طرح اپنی گرفت میں لے رکھا تھا کہ ہندوؤں یا حکومتِ ہندوستان کو منہ کی کھانی پڑی۔ لیکن حکومتِ ہند نے ریاست کو

---

[1] ٹریجڈی آف حیدرآباد، میر لائق علی، صفحہ ۱۵۶۔ [2] بحوالہ متذکرہ بالا، صفحہ ۱۵۰۔

بہر قیمت ہندوستان میں شامل کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ چنانچہ مینن نے ۲۲ر مارچ کو حکومت ہند کی طرف سے میر لائق علی کے نام ایک مکتوب میں چند نا قابل عمل اور غیر معمولی مطالبات پیش کیے۔ کے ایم منشی نے ذاتی طور پر میر لائق علی کو یہ خط پیش کیا۔ اس سلسلے میں مینن رقم طراز ہیں "کے ایم منشی نے بعد میں مجھے بتایا کہ پہلے تو میر لائق علی کچھ پریشان سے نظر آئے (اگرچہ وہ ہماری طرف سے کسی نہ کسی کارروائی کے لیے پوری طرح تیار تھے) تاہم انھوں نے خود کو سنبھال لیا اور انتہائی وقار کے ساتھ کہا کہ نظام ایک شہید کی موت مرنے کو ترجیح دیں گے اور لاکھوں مسلمان اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے"[1]

تاہم میر لائق علی نے ۵ر اپریل کو خط کے جواب میں لکھا کہ میری حکومت سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ کے تحت پورے خلوص کے ساتھ اپنی جملہ ذمہ داریاں پوری کرنا چاہتی ہے، لیکن اس دوران میں حیدرآباد کی اقتصادی ناکہ بندی روز بروز سخت ہوتی جا رہی ہے ——— ہمیں تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلا ہے کہ حیدرآباد کے آس پاس ہندوستانی علاقوں میں زبردست فوجی اجتماع ہو رہا ہے اور ہندوستان کے فوجیوں کو سادہ لباس میں حیدرآباد کے علاقے میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا ہے۔ اس کے باوجود ہم اس قضیے کا دوستانہ تصفیہ چاہتے ہیں۔ مکتوب کے آخر میں درخواست کی گئی تھی کہ حکومت ہند تمام بڑے بڑے جھگڑوں کے تصفیہ کے لیے ثالثی پر آمادہ ہو جائے۔ ۲ تاریخ کو نظام کی انتظامی کونسل کے ایک رکن سر والٹر مانکٹن نے دہلی میں پنڈت نہرو سے ملاقات کی۔ پنڈت نہرو نے انھیں یقین دلایا کہ حکومت ہند حیدرآباد پر حملہ کرنا یا ریاست کی ناکہ بندی کرنا نہیں چاہتی، لیکن سر مانکٹن کو بتایا گیا کہ قاسم رضوی نے حیدرآباد میں

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن صفحہ ۳۴۸

ایک تقریر کی تھی جس پر حکومت ہند کو سخت اعتراض ہے اور یہ کہ قاسم رضوی کو گرفتار کر لیا جائے۔ دہلی سے حیدرآباد واپس پہنچنے پر سر مانکٹن نے نظام اور انتظامی کونسل کو نہرو کے ساتھ گفت وشنید کی روداد پیش کی۔ چھان بین سے پتہ چلا کہ جس تقریر کا حوالہ دیا گیا تھا وہ سراسر حکومت ہند کی اپنی اختراع تھی اور قاسم رضوی نے ایسی کوئی تقریر کی ہی نہ تھی۔ اس معاملے پر مینن نے یوں صفائی پیش کی ہے "قاسم رضوی نے ایسی کوئی تقریر کی یا نہیں —— یہ بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ تو ایسی کئی تقریریں کر چکے تھے جو اس سے بھی زیادہ قابل اعتراض تھیں[1]"

ہندوستان کے ایجنٹ جنرل کے ایم منشی کی سرگرمیوں میں روز افزوں اضافہ ہو رہا تھا اور حالات انتہائی خطرناک صورت اختیار کر چکے تھے۔ کے ایم منشی ریاست میں ایک فاتح کی شان سے گھومتے پھرتے۔ ۱۰ مئی کو حکومتِ ہند نے یہ فیصلہ کیا کہ ماؤنٹ بیٹن کے پریس اتاشی ایلن کیمپبل جانسن کو وائسرائے کی طرف سے نظام کے لیے ایک مراسلہ لے کر حیدرآباد جانا چاہیے۔ اس مکتوب میں نظام کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ دہلی آ کر ہندوستان کے ساتھ ناقابل تنسیخ الحاق کے سمجھوتے پر دستخط کریں۔ کیمپبل جانسن رقم طراز ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن نے نہرو سے یہ یقین دہانی حاصل کی کہ "نظام اگر الحاق پر تیار ہو گئے تو حکومت ہند ان کی ہر طرح سے حفاظت کرے گی[2]" دہلی کے اعلیٰ حلقوں میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ نظام کی زندگی خطرے میں ہے۔ کیمپبل جانسن ۱۵ مئی کو حیدرآباد پہنچے۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب نظام سے ان کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے محسوس کیا کہ نظام نے انتہائی جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ میر لائق علی نے شکایت کی کہ ریاست کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی گئی ہے۔ حتیٰ کہ کلورین بھی بمبئی میں روک لی گئی ہے جو حیدرآباد کے

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۵۳۔ [2] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ صفحہ ۳۲۵

شہریوں کو سپلائی کیے جانے والے پانی کو صاف کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ حکومت حیدرآباد نے ٹرانسپورٹ سروس کے لیے جو بسیں منگائی تھیں، اُن کے پرزے نکال لیے گئے اور گدّے کاٹ دیے گئے ہیں اور یہ بسیں بمبئی کی گودی پر کھڑی ہیں۔ کیمپبل جانسن نے اپنے تاثرات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "نظام ایک باعزت تصفیے کے لیے بے چین ہیں"۔ کیمپبل جانسن دہلی واپس پہنچے اور انھوں نے ریاستوں کے امور کی وزارت کے سیکرٹری مینن کو اپنے دورے کی رپورٹ دی۔ وہ اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں: "میری غیر موجودگی میں حیدرآباد کے بارے میں ان (مینن) کا رویہ اور سخت ہو گیا تھا لیکن میں نے انھیں اس پر آمادہ کر لیا کہ کل زین کی واپسی تک وہ اپنے فیصلے پر کوئی عمل نہ کریں۔ وی پی مینن آخری شرائط" کا ذکر کرنے لگے"[1]

مینن اور سردار پٹیل میں صلاح مشورے ہوئے۔ مینن نے ان مذاکرات پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے "سردار پٹیل نے کہا کہ اب وقت ضائع کرنا بے سود ہے"[2]۔ ۱۷ر جون کو نہرو نے ایک اخباری کانفرنس میں کہا کہ ہندوستان گول مول باتیں برداشت نہیں کرے گا۔ ہندوستان کی لشکرکشی کے بارے میں اب کوئی شک نہیں رہا تھا، صرف مناسب وقت کا انتظار تھا۔ ۲۱ر جون کو ماؤنٹ بیٹن ہندوستان سے چلے گئے، اور ان کی جگہ راج گوپال اچاریہ ہندوستان کے گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

حیدرآباد میں ہندوستانی فوجی اپنی سرگرمیوں میں مصروف تھے جن کا سلسلہ آخر کار ریاست کی تسخیر پر ختم ہوا۔ میر لائق علی نے ریاست کو خطرات میں گھرا دیکھ کر ۲ر اگست کو حکومتِ ہند کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ حکومتِ ہند کے ساتھ ریاست کے تنازعے کو حکومتِ حیدرآباد اقوامِ متحدہ میں پیش کر رہی ہے۔ ہندوستان نے اس پر احتجاج

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۳۳۶ [2] دی انٹگریشن آف دی انڈین اسٹیٹس۔ وی پی مینن، صفحہ ۳۶۱

کیا کہ حیدر آباد کا مسئلہ چونکہ ہندوستان کا داخلی معاملہ ہے۔ بنابریں اقوام متحدہ اس پر غور کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ حکومت ہند نے حیدر آباد کے وفد کو اقوام متحدہ جانے کے لیے سہولتیں فراہم کرنے سے انکار کر دیا۔ بہر حال وفد اگست کے اواخر میں کراچی روانہ ہوا اور حیدر آباد کا معاملہ اقوام متحدہ میں پیش کرنے کے لیے نواب معین نواز جنگ کی رہنمائی میں نیویارک روانہ ہو گیا۔

ریاستوں کے معاملوں کی وزارت، اور ہندوستان کی وزارتِ دفاع کے درمیان گہرا تال میل موجود تھا اور یہ امر واضح تھا کہ ہندوستان حیدر آباد پر لشکر کشی کا ارادہ رکھتا ہے۔ ان سرگرمیوں کے نتیجے میں "ہمارا (ہندوستان کا) فوجی اندازہ یہ تھا کہ حیدر آباد کی افواج تربیت یافتہ اور کیل کانٹے سے لیس ہندوستانی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گی اور مسئلہ بس یہ تھا کہ مزاحمت کو جلد از جلد کس طرح ختم کیا جائے"[۱]۔ ۹ ستمبر کو ہندوستان نے حق و انصاف کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر حیدر آباد پر جارحانہ حملہ کر دیا۔ پوری دنیا خاص طور سے مسلمانان پاکستان اس بے اصولے پن کی توقع نہیں رکھتے تھے سلامتی کونسل میں ارجنٹائن کے نمائندے ڈاکٹر جوز آرس نے حیدر آباد پر ہندوستان کی فوجی لشکر کشی کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا۔ "حیدر آباد کے دارالحکومت پر ہندوستانی فوجوں کی لشکر کشی سے مجھے حبشہ کے دارالحکومت پر اطالوی (مسولینی) کی فوجوں کی پیش قدمی یاد آتی ہے"۔ فتح کے نشے میں سرشار ہندوستانی فوجوں کی کمان میجر جنرل جے ایس چودھری کر رہے تھے اور ہندوستان کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں اس کارروائی کو "اپریشن پولو" کا نام دیا گیا تھا۔ حیدر آباد کی افواج نے مقدور بھر دفاع کیا مگر یہ دفاعی دیوار جلد ہی ٹوٹ گئی۔ حیدر آباد کے ایک ہزار سے زیادہ فوجی اور غیر فوجی باشندے کام آئے اور اب

---

[۱] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن صفحہ ۳۷۵۔

ہندوستان کے سامنے کوئی مزاحمت نہ تھی۔ حیدرآباد کی افواج نے ۱۷ ستمبر کو ہتھیار ڈال دیے اور یوں حیدرآباد پر ہندوستان کا تسلط مکمل ہو گیا۔ اسی روز میر لائق علی نے اپنا استعفا پیش کر دیا اور میر لائق علی، ان کی کابینہ کے اراکین اور سید قاسم رضوی کو ان کے مکانوں میں نظر بند کر دیا گیا۔ میجر جنرل چودھری کو ریاست حیدرآباد کا فوجی گورنر مقرر کیا گیا اور ریاست میں ہندوستان کا ترنگا لہرانے لگا۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کا سر اس پر فخر و غرور سے بلند ہونا ہی چاہیے تھا۔[1]

حیدرآباد میں اپنی کارروائی کا جواز ثابت کرنے کے لیے حکومتِ ہند ساری دنیا کو یہ یقین دلاتی پھر رہی تھی کہ یہ کارروائی تو ریاست کے بگڑتے ہوئے حالات پر قابو پانے کے لیے محض ایک پولیس ایکشن تھی۔ کراکا نے حکومتِ ہند کی اس وضاحت پر یوں تبصرہ کیا ہے: "ہندوستان کے کسی باشندے کے لیے اپنے وزیرِ اعظم سے یہ دریافت کرنا مناسب نہیں ہے کہ محض پولیس ایکشن کے لیے ایک لفٹننٹ جنرل، تین میجر جنرل اور پورا ایک بکتر بند ڈویژن کیوں بھیجا گیا۔ برطانوی راج میں ایک پولیس کمشنر اور چند لاٹھی بردار سپاہی پولیس ایکشن کے لیے کافی ہوتے۔ حقیقت یہ ہے ——— اور ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کر لینا چاہیے ——— کہ ہماری حکومت بیرونی دنیا پر یہ ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان نے، جو اقوامِ متحدہ کا رکن ہے، حیدرآباد کے تنازعے کے تصفیے کے لیے فوجی کارروائی کی ہے۔ علاوہ ازیں ابھی گاندھی جی کے پیروؤں کا ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو عدم تشدد پر یقین رکھتا ہے اور جسے مطمئن کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم یہ کہہ دیتے کہ ہم حیدرآباد پر بزورِ شمشیر قبضہ کر رہے ہیں کیونکہ ہمارے لیے اور کوئی طریقۂ کار نہیں ہے تو یہ حقائق کا دیانتدارانہ اظہار ہوتا۔"[2]

---

[1] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۰۹۔ [2] بیٹریل ان انڈیا۔ ڈی ایف کراکا۔ صفحات ۱۶۴/۱۶۵

۳ جون کے منصوبے کا اعلان ہوتے ہی ریاست کشمیر کے مسئلے نے اہمیت اختیار کر لی تھی اور پاکستان، اور ہندوستان کے درمیان تقسیم کے وقت ہی سے اس سلسلے میں تعلقات کشیدہ ہو گئے تھے۔ قبل ازیں کشمیر کی موجودہ حیثیت پر بحث کی جائے ضروری ہے کہ کشمیر کے ماضی پر چھلپتی ہوئی سی نگاہ ڈال لی جائے۔ چودھویں صدی میں کشمیر پر ایک مسلم خاندان کی حکومت تھی اور سولھویں صدی کے اواخر میں اکبر نے ریاست کو مغل حکومت کا باجگذار بنا لیا تھا۔ کشمیر میں جگہ جگہ مغلوں کی یادگاریں موجود ہیں اور یہ ریاست مغلوں کی گرمائی تفریح گاہ تھی۔ ریاست کی قدرتی دلکشی اور خوب صورتی میں مغلوں نے اپنے حسن ذوق سے کام لے کر چار چاند لگا دیے۔ مشہور عالم باغ شالیمار، باغ نشاط اور ہری پربت فورٹ میں مغلوں کے ذوق کی جھلکیاں موجود ہیں۔ اٹھارہویں صدی کے وسط میں تخت دہلی کی قوت کم ہونے اور انجام کار مغل حکومت کے زوال پر احمد شاہ ابدالی نے ریاست کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مگر مہاراجہ رنجیت سنگھ (سکھوں کی حکومت کا بانی) کے اقتدار کے ساتھ ۱۸۱۹ء میں کشمیر بھی سکھوں کے زیر اقتدار آ گیا۔ سکھوں کے قبضے سے پہلے وادی جموں پر ہندو ڈوگرا حکمران کا اقتدار تھا۔ اس ہندو ڈوگرا خاندان کے آباؤ اجداد ایک جنگجو راجپوت قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کشمیر پر سکھوں کے قبضے کے بعد آپس کی لڑائیوں اور شورشوں کے سبب جموں کے ڈوگرا حکمرانوں کی قوت پارہ پارہ ہو گئی اور کشمیر کے سکھ حکمرانوں نے بآسانی جموں پر بھی قبضہ کر لیا۔ ڈوگرا سردار گلاب سنگھ نے رنجیت سنگھ کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔ رنجیت سنگھ گلاب سنگھ کی جرأت، فرض شناسی اور قابلیت کا انتہائی معترف تھا اور اس کے اظہار کے طور پر اس نے گلاب سنگھ کو راجہ کا خطاب دے کر جموں کا حکمران بنا دیا۔

رنجیت سنگھ کے انتقال کے بعد لاہور میں سکھوں کی مرکزی حکومت کو زوال آ گیا اور انیسویں صدی کے وسط میں ہندوستان میں ایک نئی قوت ابھرنے لگی۔ یہ انگریز تھے

گلاب سنگھ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لاہور کے سکھ مہاراجہ اور طوفان کی طرح بڑھتے ہوئے انگریزوں کے درمیان رابطہ کا کام کیا۔ گلاب سنگھ کی کوششوں سے طے ہوا کہ دربار لاہور خراج کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک کروڑ روپیہ ادا کرے گا۔ گلاب سنگھ کو بخوبی علم تھا کہ سکھ راجہ اتنی بڑی رقم ادا نہیں کر سکتا۔ سکھ راجہ یہ رقم ادا نہ کر سکا اور اس نے اس کے بدلے جموں اور کشمیر کے علاقے انگریزوں کے سپرد کر دینے کی پیشکش کی۔ انگریز اس پر رضامند ہو گئے لیکن ان کا خیال تھا کہ انگریز فوجیں اتنے دور دراز علاقے کا انتظام نہیں سنبھال سکتیں۔ گلاب سنگھ نے یہ سوچتے ہوئے کہ جو علاقے انگریزوں کو دیے گئے ہیں ان میں اس کا علاقہ بھی شامل ہے، تجویز پیش کی کہ اگر اسے جموں اور کشمیر کا حکمران مقرر کر دیا جائے تو وہ مطلوبہ رقم ادا کر دے گا۔ انگریزوں کو یہ تجویز پسند آگئی اور انھوں نے لاہول اور کولو کے فوجی اہمیت کے علاقوں پر اپنے کنٹرول کے عوض گلاب سنگھ کو ۲۵ لاکھ روپے کی معافی دے دی۔ غرض کہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء کو معاہدہ امرتسر پر دستخط ہوئے جس کے مطابق اس لین دین کو قانونی حیثیت دے دی گئی اور بھاری مسلم اکثریت کا علاقہ اس طرح ایک ہندو خاندان کے زیرِ اقتدار آگیا جسے انگریزوں کی ہر قسم کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس معاہدہ کی پہلی شق میں کہا گیا کہ برطانوی حکومت کو معاہدہ امرتسر کے تحت جو علاقے لاہور دربار سے ملے ہیں، لاہول کے سوا وہ تمام علاقے مہاراجہ گلاب سنگھ اور ان کے نرینہ وارثوں کے نام منتقل کیے جاتے ہیں اور انھیں اس کا دائمی بلا شرکت غیرے مختار بنایا جاتا ہے۔" اس سودے کے مطابق ۵۰ لاکھ روپے فوراً ہی اور باقی ۲۵ لاکھ روپے یکم اکتوبر ۱۸۴۶ء سے قبل ادا کرنا طے ہوا تھا۔ معاہدہ کی شق نمبر دس کے تحت گلاب سنگھ نے انگریزوں کے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کر لیا اور اس کے اظہار کے طور پر انگریزوں کو ہر سال "ایک گھوڑا، عمدہ نسل کی بارہ بکریاں (چھ بکرے اور چھ بکریاں) اور تین جوڑے کشمیری شالیں پیش کرنے کا وعدہ کیا۔"

کا اب سنگھ کے اقتدار کے ساتھ ، برطانیہ کی سرپرستی میں ، ایک ہندوستانی ریاست کی حیثیت سے جموں اور کشمیر کی "تاریخ" کا آغاز ہوتا ہے ۔ ۱۹۲۵ء میں مہاراجہ پرتاپ سنگھ کا انتقال ہوا اور چونکہ اس کا کوئی وارث نہ تھا بنا بریں اس کا بھتیجا لفٹننٹ جنرل مہاراجہ سر ہری سنگھ ریاست کی گدی پر بیٹھا ۔ ۳ جون کا منصوبہ نافذ ہوا تو یہی ہری سنگھ ریاست کا حکمران تھا ۔ تین جون کے منصوبے کے تحت یہ فیصلہ ہونا تھا کہ کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہوگا یا ہندوستان سے ۔ ہری سنگھ کے بارے میں لارڈ برڈ ووڈ نے لکھا ہے کہ اسے اپنے ۲۲ سالہ دور اقتدار میں کبھی بھی ریاست کے عوام کی فلاح و بہبود سے دلچسپی نہ ہوئی ـــــــ اس نے اپنے پیشروؤں کی طرح ٹیکسوں اور مالگذاری کا اتنا بوجھ لاد دیا تھا کہ کشمیری مسلمان اس کے تلے دب کر رہ گئے تھے۔[۱] کشمیر کی کوئی سرحد ہندوستان سے نہیں ملتی لیکن ریڈ کلف ایوارڈ کے مطابق جو ناانصافیاں کی گئیں انھوں نے ہندوستان کو الحاق کے سلسلے کی کچھ کڑیاں فراہم کردیں یعنی ہندوستان کو کچھ ایسے علاقے بخش دیئے گئے جن کے سبب کشمیر کی سرحد ہندوستان سے مل گئی۔ مینن کے الفاظ ملاحظہ فرمایئے۔ "ریڈ کلف ایوارڈ سے ریاست کا سڑک کے راستے ہندوستان سے رابطہ قائم ہوگیا۔"[۲]

تقسیم کے چند مہینے بعد میر لائق علی قائداعظم سے ملاقات کرنے لاہور آئے تھے گفتگو کے دوران میں قائداعظم نے ریڈ کلف ایوارڈ کی بابت اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ میر لائق علی نے اپنی کتاب میں قائداعظم کے یہ خیالات تحریر کیے ہیں ۔ انھوں (قائد اعظم) نے تقسیم کے بعد کے افسوسناک واقعات پر روشنی ڈالی اور (ریڈ کلف ایوارڈ) کے

---

[۱] ٹوئیلنٹس : ان کشمیر ۔ لارڈ برڈ ووڈ ۔ صفحہ ۳۱ ۔ مطبوعہ ۱۹۵۶ء ۔ رابرٹ ہیل لمیٹڈ لندن ۔

[۲] دی انٹیگریشن آف دی انڈین سٹیٹس ۔ وی پی مینن ۔ صفحہ ۳۹۵ ۔

بعد پیش آنے والے حالات بالخصوص پنجاب اور بنگال کے ضمن میں ناانصافیوں کا ذکر کیا اور بتایا کہ ایوارڈ کے مطابق پاکستان کے ساتھ کتنی ناانصافی کی گئی ہے[1]۔"

ہندوستان میں اقتدار کی منتقلی کے وقت ۱۹۴۱ء کی مردم شماری کے مطابق جموں اور کشمیر میں مسلمانوں کی آبادی ۳۱ لاکھ ایک ہزار دو سو سینتالیس اور غیر مسلموں کی آبادی ۸ لاکھ بیس ہزار تین سو اُنہتر تھی۔ حکومتِ ہند نے تقسیم سے فائدہ اٹھا کر آبادی کے تناسب میں رد و بدل کرنے کی کوشش کی اور ہم مینن ہی کے الفاظ میں اپنی اس دلیل کو اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ "تقسیم کے بعد مسلمانوں کے ترکِ وطن کر کے پاکستان چلے جانے اور وہاں سے ہندوؤں کے ہندوستان آنے کے سبب خاص طور سے جموں میں آبادی کے اس تناسب میں ایک حد تک فرق پڑا[2]۔" اگرچہ جموں اور کشمیر مسلم اکثریت کی ریاست تھی تاہم ریاست کے ہندو حکمرانوں نے ہمیشہ یہ خیال رکھا تھا کہ ریاست کی پولیس، فوج اور سرکاری ملازمتوں پر ہندوؤں کا غلبہ رہے جن کی مسلم دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ حالات کے دباؤ سے مجبور ہو کر مسلمانوں نے اپنی سیاسی تنظیم کی اور ۱۹۳۲ء میں آل جموں کشمیر مسلم کانفرنس وجود میں آئی۔ مسلم کانفرنس کے سب سے بڑے حامی اور ترجمان اعلیٰ شیخ عبداللہ تھے جو ایک زمانے میں ریاست کے کسی سکول میں مدرس تھے۔

مہاراجہ ان سیاسی جماعتوں کا جانی دشمن تھا جو عوام کے کسی حق کا مطالبہ کرتی ہوں۔ اس کے نزدیک سب کچھ اس کی ہی ذات تھی اور لوگوں کا فرض تھا کہ وہ بے چون و چرا اس کی فرمانبرداری کریں۔ مسلم کانفرنس ریاست کے مسلمانوں میں مقبول ہونی شروع ہوئی تو شیخ عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ ریاست میں مارشل لا لگا دیا گیا اور مسلمانوں پر بہیمانہ مظالم کیے

---

[1] ٹریجیڈی آف حیدرآباد۔ میر لائق علی۔ صفحات ۱۰/۱۱

[2] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحہ ۳۹۲

سکے۔ کئی سال بعد سلامتی کونسل میں کشمیر کے تنازعے پر بحث کے دوران میں چودھری ظفر اللہ خاں نے پاکستان کی طرف سے تقریر کرتے ہوئے کشمیر کی تاریخ کے اس دور پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا "اگرچہ وہ (کشمیری) احتجاج کرتے تو ڈوگرہ فوجیوں کی گولیاں ان کی صدائے احتجاج خاموش کر دیتیں ——— اس کے باوجود کشمیری احتجاج کرتے رہے اور سینوں پر گولیاں کھاتے رہتے" [1]

بعد میں شیخ عبداللہ مسلم کانفرنس سے علیحدہ ہو گئے اور انھوں نے آل جموں اور کشمیر نیشنل کانفرنس کے نام سے نئی تنظیم بنائی۔ دریں اثنا مسلم کانفرنس مسلم لیگ میں اور نیشنل کانفرنس آل انڈیا کانگرس ہی میں ضم ہو گئیں۔ ۱۹۴۴ء میں قائد اعظم نے کشمیر کا دورہ کیا اور مسلم کانفرنس کے وقار اور مقبولیت میں اضافے کی غرض سے کانفرنس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی۔

ہندو انتہا پسندوں نے یہ اندازہ کر لیا تھا کہ ۱۹۴۷ء کے وسط میں ہندوستان کے حالات کیا ہوں گے اور آزادی کے بعد کشمیر کا مستقبل کیا ہو گا۔ تین جون کے منصوبے کے اعلان کے بعد ان انتہا پسند ہندوؤں کے لیڈر ایچ ایس شرما نے مہاراجہ کشمیر کو لکھا کہ ہم ریاستی عوام کی شورش کچلنے کے لیے آپ کو جوانوں اور ہتھیاروں کی امداد دینے کو تیار ہیں۔ مہاراجہ نے اس کے جواب میں لکھا "آپ کے مکتوب کے بعد مسٹر نہرو کشمیر آئے اور واپس چلے گئے۔ آپ نے ضرورت پڑنے پر ہماری مدد کے لیے رضاکار بھیجنے کی جو پیشکش کی ہے اس کے لیے ہم آپ کے شکر گزار ہیں ——— اگر ضرورت ہوئی تو میں آپ کی اس پیشکش سے پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔" [2]

چند ہفتے پہلے ریاست کشمیر کی سرحد پر کوہالا میں مسٹر نہرو کو یہ حکم ملا تھا کہ وہ ریاست

---

[1] سیکورٹی کونسل آفیشل ریکارڈ۔ صفحہ ۶۵۔ جاری کردہ ۱۶ جنوری ۱۹۴۸ء

[2] مہاتما گاندھی ——— دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال۔ صفحہ ۳۴۸

میں داخل نہ ہوں۔ ۴ جولائی کو انھوں نے مہاراجہ کے نام ایک مکتوب میں تحریر کیا۔ "مجھے ماضی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ میں تو مستقبل سے دلچسپی رکھتا ہوں اور میں آپ کے اور دیگر متعلقہ حضرات کے دوستانہ تعاون سے اس مستقبل پر غور کرنا چاہتا ہوں۔"[1] اس کے ساتھ ہی گاندھی جی اور مسٹر نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی کہ مہاراجہ کو اس بات پر مجبور کیا جائے کہ ان دونوں کو کشمیر کا دورہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اس کے جواب میں مہاراجہ نے کہا کہ اس دورے کی میں صرف اسی صورت میں اجازت دوں گا کہ مسٹر جناح بھی ایسی ہی درخواست کریں۔ ماؤنٹ بیٹن نے سر توڑ کوشش کی کہ گاندھی جی اور نہرو کشمیر کے دورے کا ارادہ ترک کر دیں مگر وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ آخر ماؤنٹ بیٹن نے جولائی کے اوائل میں مہاراجہ کو لکھا کہ میں نے مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو سے گفتگو کی ہے اور دونوں حضرات کشمیر کا دورہ کرنے پر مصر ہیں۔ میں نے انھیں بتا دیا ہے کہ کسی بڑے کانگرسی لیڈر کے دورے کے نتیجے میں، جس میں تقریریں بھی شامل ہوں گی، مسلم لیگ بھی مسٹر جناح کے پائے کے کسی لیڈر کو پروپیگنڈے کا توڑ کرنے کے لیے لازمی طور پر کشمیر بھیجے گی۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال سے ایک انتخابی مہم ظہور میں آجائے گی جسے آپ پسند نہیں کرتے کیونکہ جیسا کہ آپ نے تحریر کیا ہے ریاست میں ابھی تک امن و امان ہے اور اگر کوئی اشتعال انگیز سیاسی تقریر کی گئی تو وہاں کشت و خون ہونے لگے گا۔"[2] ۸ جولائی کو مہاراجہ کشمیر نے اس کے جواب میں لکھا "میں سمجھتا ہوں کہ مہاتما گاندھی کے لیے یہ مناسب ہو گا کہ وہ اس سال کشمیر کا دورہ منسوخ کر دیں ــــ ہم سب کی بہترین خواہشات کے باوجود ممکن ہے کہ ایک ہلکی سی چنگاری ہی ایسی آگ بھڑکا دے جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔"[3] لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے گاندھی جی کے نام ایک مکتوب میں ان سے التجا کی کہ وہ کشمیر نہ جائیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس خط میں لکھا: "جیسا کہ میں آپ کو بتا چکا ہوں، مہاراجہ کسی صورت میں یہ پسند نہیں کرتے کہ مسلم لیگ کا کوئی لیڈر کشمیر آئے اور میں نے مسٹر جناح سے کہا ہے کہ وہ نہ تو خود کشمیر جائیں اور نہ

---

[1] مہاتما گاندھی ـــ دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال۔ صفحہ ۲۵۰ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۲۵۱

[3] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحات ۲۵۲/۲۵۱

کسی کو وہاں نہیں بھیجیں"۔ قائدِ اعظم کو معلوم تھا کہ حالات کس قدر سنگین ہیں۔ انھوں نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز مان لی۔ مگر نہرو کسی بھی معقول دلیل کو سننا نہیں چاہتے تھے۔ وہ جو فیصلہ کر چکے تھے اس پر اڑے ہوئے تھے۔ نہرو کے کہنے پر ۱۶ تاریخ کو گاندھی جی نے وائسرائے کو لکھا کہ "میں نے کشمیر کے بارے میں پنڈت جی سے تفصیلی گفتگو کی ہے۔ ان کی قطعی اور آخری رائے ہے کہ مجھے ہر حال میں کشمیر جانا چاہیے خواہ میرے دورے کے بعد جناح صاحب یا ان کا کوئی نمائندہ کشمیر کا کیوں نہ دورہ کرے۔" نہرو نے کشمیر کو محاذ جنگ میں تبدیل کرنے کا پختہ ارادہ کر رکھا تھا۔ آخر مہاراجہ پور ا: کے سامنے جھکنا ہی پڑا اور وہ اس بات پر رضامند ہو گیا کہ گاندھی جی ریاست کا دورہ کریں مگر مسٹر نہرو کشمیر نہ آئیں۔ اس پر نہرو تب پا غ پا ہوئے اور ۲۸ جولائی کو انھوں نے گاندھی جی کو لکھا "میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر عمل کروں کا کشمیر کے دورے (جہاں میرے محبوب عوام میرے منتظر ہیں) اور وزیر اعظم کے عہدے میں میرے لیے قابل ترجیح کشمیر کا دورہ ہے۔"[1] جو لوگ کشمیر کے تنازعے سے دلچسپی رکھتے ہیں اور نہرو کی شخصیت سے بھی واقف ہیں ان کے لیے یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں تھی۔ ان کا خیال ہے کہ ہندوستان نے کشمیر کے بارے میں سخت رویہ اس لیے اختیار کیا کہ نہرو کے نزدیک یہ مسئلہ ذاتی نوعیت رکھتا تھا۔ اس سلسلے میں کراکا کے خیالات ملاحظہ فرمائیے "کشمیر کے پورے مسئلے پر ایک جذباتی نشتر غالب ہے اور وہ یہ کہ ہندوستان کے وزیر اعظم جواہر لال نہرو کے آباؤ اجداد کا تعلق کشمیر سے تھا اس لیے جواہر لال نہرو کشمیر کے مسئلے پر غیر جذباتی انداز میں غور نہیں کر سکتے۔ کشمیر کی کوئی فوجی اہمیت ہو نہ ہو، جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ اس کے وقار کا سوال ہے۔ ہندوستان کے ٹیکس دہندگان کا کثیر روپیہ کشمیر کی جنگ پر صرف ہو رہا ہے۔ بے شمار لاتعداد بہادر جوانوں نے اپنی جان کی قربانی دی ہے۔ لہٰذا ہندوستان بڑی بے چینی سے اہل کشمیر کے فیصلے کا منتظر ہے۔"[2]

گاندھی جی کشمیر پہنچے اور انھوں نے یکم اگست کو سری نگر میں مہاراجہ کشمیر اور وزیر اعظم سے علیحدہ علیحدہ تفصیلی گفتگو کی۔ ۳ اگست کو جموں میں کشمیریوں کے ایک وفد نے گاندھی جی سے ملاقات کی اور دریافت

---

[1] مہاتما گاندھی — دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال صفحہ ۳۵۴ [2] میٹر آن انڈیا۔ ڈی ایف کراکا۔ صفحہ ۱۷۹

کیا کہ ۱۵ اگست کو ہندوستان تو آزاد ہو جائے گا لیکن کشمیر کا کیا بنے گا؟" گاندھی جی نے جواب دیا "اس کا انحصار کشمیری عوام پر ہے۔ وفد کے اراکین جاننا چاہتے تھے کہ کشمیر ہندوستان میں شامل ہوگا یا پاکستان میں۔ گاندھی جی نے جواب دیا "اس کا فیصلہ بھی کشمیریوں کی مرضی سے کیا جائے گا۔"[1]

اس نامناسب وقت پر گاندھی جی کے دورۂ کشمیر کے بارے میں لارڈ برڈ ووڈ نے لکھا ہے کہ "اگرچہ گاندھی جی کے پبلک اعلانات درست تھے تاہم ان کے دورے سے صورت حال ناگزیر حد تک پیچیدہ ہو گئی"[2] کشمیر سے واپسی پر گاندھی جی نے ۶ اگست کو نہرو کے نام ایک خط تحریر کیا اور ان سے کہا کہ وہ یہ خط سردار پٹیل کو دکھا دیں۔ اس مکتوب میں گاندھی جی نے لکھا تھا "دونوں (مہاراجہ کشمیر اور وزیر اعظم) نے یہ تسلیم کر لیا ہے کہ برطانیہ کا اقتدار اعلیٰ ختم ہونے پر حقیقی معنوں میں کشمیری عوام کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہوگا۔ ہندوستان سے الحاق کی بابت ان کی ذاتی خواہش کے باوجود وہ یہ فیصلہ کشمیری عوام کی مرضی کے مطابق کریں گے۔"[3] اسی مکتوب میں گاندھی جی نے ریاست کشمیر کے متعلق "عینی تجزیہ" بھی کیا تھا وہ لکھتے ہیں "میں نے معاہدۂ امرتسر کا مطالعہ کیا ہے جسے "بیع نامہ" کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میرا خیال ہے یہ معاہدہ اس مہینے کی پندرہ تاریخ کو ختم ہو رہا ہے۔ ریاست کی باگ ڈور کسے سونپی جائے؟ کیا اس پر عوام کا حق نہیں ہے؟"[4]

بعد میں جو حالات اور واقعات رونما ہوئے ان سے یہ ثابت ہو گیا کہ دہلی کے حکمرانوں کے ورغلانے پر مہاراجہ نے ریاست کے الحاق کے بارے میں عوام کی رائے کو پس پشت ڈال کر بہت بڑی غلطی کی اور اس سے جموں اور کشمیر میں ایک خطرناک صورت حال پیدا ہو گئی۔ جب بھی کسی علاقے کے عوام کو من مانے طریقے پر ان کے جائز اور پیدائشی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے (جس طرح کشمیر کے باب میں ہوا) تو نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

تقسیم کے تقریباً دو ہفتے بعد ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ سے گفت و شنید کے لیے کشمیر کا دورہ

---

[1] مہاتما گاندھی — دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال صفحہ ۳۵۵۔ [2] ٹو نیشنز اینڈ کشمیر۔ لارڈ برڈ ووڈ۔ صفحہ ۴۳

[3] مہاتما گاندھی — دی لاسٹ فیز۔ پیارے لال۔ صفحہ ۳۵۷۔ [4] بحوالہ مذکرہ بالا۔ صفحہ ۳۵۸

کیا۔ انھوں نے مہاراجہ کو بتایا کہ آبادی کے تناسب کے پیش نظر یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ عوام کی مرضی معلوم کی جائے[1]۔ لیکن مہاراجہ اپنے طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکے۔ مینن اس وقت پٹیل کی وزارت کے سیکرٹری تھے اور کشمیر کے سوال پر ہندوستان کی بساط سیاست کے اہم مہرے بنے ہوئے تھے وہ رقم طراز ہیں: "حق و انصاف کے پیش نظر یہ کتنا ضروری ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ جس پوزیشن میں تھے اس کے سبب ان کے لیے کوئی فیصلہ کرنا آسان نہ تھا ــــــ مگر فیصلے کے لیے ان کے پاس کافی وقت تھا اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ وہ جموں اور کشمیر کے عوام کے نمائندوں کی کانفرنس طلب کر سکتے تھے اور ان نمائندوں سے اس سوال پر گفتگو کر سکتے تھے[2]۔ ہری سنگھ مہاراجہ تھا اس کا یقین تھا کہ اسے عوام کے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا کلی اختیار ہے۔ خواہ یہ فیصلہ عوام کے لیے قابل قبول ہو یا نہ ہو۔

اقتدار کی منتقلی کی تاریخ سر پر آ رہی تھی۔ اس تاریخ سے دو چار روز پہلے کشمیر نے پاکستان اور ہندوستان کو مطلع کیا کہ ریاست دونوں ڈومینیوں سے حالات کو جوں کا توں رکھنے کا معاہدہ (سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ) کرنے کو تیار ہے۔ ہندوستان کو یہ بات ایک آنکھ نہ بھائی کہ پاکستان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ کیا جائے بنا بریں ہندوستان نے کوئی فوری کارروائی نہ کی۔ مینن اس کی یوں وضاحت کرتے ہیں: "ہم پورے معاملے کا جائزہ لینا چاہتے تھے ــــــ آبادی کے تناسب کے علاوہ دیگر مختلف النوع ریاستی مسائل بھی تھے۔ علاوہ ازیں ہماری اپنی مصروفیات پہلے ہی کچھ کم نہ تھیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ کشمیر کے معاملے پر غور کرنے کے لیے میرے پاس وقت ہی نہ تھا[3]۔"

شیخ عبداللہ نے ۵ نومبر ۱۹۵۱ء کو جموں اور کشمیر کی دستور ساز اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان ۱۹۴۷ء میں یہ کہہ کر سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ پر دستخط کرنے سے گریز کرتا رہا کہ عوام کے نمائندوں کی منظوری کے بغیر ایسا سمجھوتہ جائز نہ ہوگا۔ مگر دو مہینے بعد ہی جب مہاراجہ نے ہندوستان کے ساتھ

---

[1] مہاتما گاندھی دی لاسٹ فیز پیارے لال۔ صفحہ ۳۹۴ [2] دی انٹگریشن آف دی انڈین سٹیٹس۔ وی پی مینن۔ صفحات ۳۹۴ ۳۹۵ [3] بحوالہ مذکورہ بالا۔ صفحہ ۳۹۵

الحاق کی دستاویز پر دستخط کیے تو حکومتِ ہندوستان نے کسی حیل و حجت کے بغیر اسے قبول کر لیا اگرچہ
یہ الحاق عوام کی رائے معلوم کیے بغیر ہوا تھا۔ اس کے برعکس جب مہاراجہ نے سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ
کی تجویز پیش کی تو قائدِ اعظم نے فوراً ایگریمنٹ پر دستخط کر دیے۔ ہندوستان کی پس پردہ سرگرمیاں
جاری تھیں اور اس سلسلے میں اسے ریاست کے نئے ہندو نواز وزیرِ اعظم مہر چند مہاجن کا پورا
عاون حاصل تھا۔ بعد میں ہندوستان نے انھیں اس تعاون کے صلے میں ہندوستان کے
پریم کورٹ کا جج بنا دیا اور وہ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے عہدے تک پہنچے۔ ہندوستان
لیے ایما پر مہر چند مہاجن نے ۱۸ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو گورنر جنرل پاکستان قائدِ اعظم کو ایک خط لکھا۔ اس
خط میں پاکستان پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ کشمیر جانے والے کچھ سامان کو روک رہا ہے اور سٹینڈ
سٹل ایگریمنٹ کی خلاف ورزیاں کر رہا ہے۔ ۲۰ اکتوبر کو قائدِ اعظم نے حکومتِ کشمیر کو خود جواب دیا۔
انھوں نے پاکستان کے موقف کی وضاحت کی اور حکومتِ کشمیر کے تمام الزامات اور دروغ بافیوں
کی تردید کی۔ قائدِ اعظم نے حکومتِ کشمیر کے مکتوب کے لب و لہجے پر اعتراض کیا اور کہا کہ اس
میں غیر ضروری طور پر حکومتِ پاکستان کے خلاف توہین آمیز رویہ اختیار کیا گیا ہے۔ حکومتِ
کشمیر کے مراسلے سے بخوبی ظاہر ہوتا تھا کہ مہاراجہ کس نہج پر سوچ رہے ہیں۔

اکتوبر کے آخر تک یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ مہاراجہ ہندوستان کی طرف جھک رہے ہیں۔
۱۷ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو ٹائمز لندن نے لکھا: "ایسا نظر آتا ہے کہ کشمیر کے ہندو مہاراجہ سر ہری سنگھ
مسٹر گاندھی کے دلائل کا گہرا اثر ہے جنھوں نے تین مہینے پہلے کشمیر کا دورہ کیا تھا۔ مہاراجہ
دوسرے کانگرسی لیڈروں کے خیالات سے بھی کافی متاثر نظر آتے ہیں۔" پاکستان کے عوام بخوبی
سمجھتے تھے کہ مہاراجہ کشمیر اور حکومتِ ہند کے درمیان اس ناپاک سازش کا مقصد ہندوستان
سے ریاست کے الحاق کے سوا اور کچھ نہیں۔

پونچھ ریاست کشمیر کا ایک باجگذار علاقہ تھا۔ پونچھ میں مسلمانوں کی بھاری اکثریت
تھی مگر راجہ ہندو تھا۔ مہاراجہ کشمیر پونچھ کے راجہ کے آئینی اختیارات میں مداخلت کرتا رہتا

تھا اور اس نے پونچھ کے عوام پر ہر قسم کی پابندیاں عائد کر رکھی تھیں جن کے خلاف علاقے
کے عوام کی مزاحمت جاری تھی۔ مہاراجہ کشمیر نے ظلم و ستم اور دہشت انگیزی میں کوئی کسر نہ
اٹھا رکھی تھی مگر اپنے جائز اور آئینی حقوق کے حصول کے لیے پونچھ کے عوام انتہائی جرأت
اور جواں مردی سے جدوجہد کر رہے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں کشمیری فوجی پونچھ گئے اور
بہت سے مسلمان کشمیری فوجی فوج سے علیحدہ ہو کر پونچھ کے باشندوں سے جا ملے۔ اس طرح
سردار محمد ابراہیم کی سرکردگی میں آزاد کشمیر حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ مہاراجہ کشمیر اور اس
کی ڈوگرہ فوجوں کے خلاف بغاوت دور دور تک پھیل گئی اور جلد ہی آزاد حکومت کے
پاس تقریباً تیس ہزار کی تعداد میں فوج جمع ہو گئی۔ حکومت کشمیر نے مسلمانوں کو نیست و نابود
کرنے کا عزم کر رکھا تھا اور اس مقصد سے اگست ۴۷ء سے ریاستی مسلمانوں کے خلاف
مظالم کی ایک سوچی سمجھی سکیم پر عمل شروع کر دیا گیا تھا۔ ریاستی حکام نے ہندوؤں میں تقریباً
سات ہزار پرانی توڑے دار بندوقیں تقسیم کیں اور پندرہ اگست کو جبکہ کشمیری مسلمان یوم
پاکستان منانے کی تیاریاں کر رہے تھے، قتل و غارت گری کا بازار گرم کر دیا۔ سٹیٹسمین کلکتہ
نے ۴ فروری ۱۹۴۸ء کو رچرڈ سائمنڈز کا ایک مضمون شائع کیا جس میں اس بربریت کا چشم دید
حال شائع کیا گیا تھا۔ سائمنڈز نے اس مضمون میں لکھا تھا "اگست ۱۹۴۷ء کے اوائل میں
جب کہ تقسیم ہندوستان کا وقت قریب آ رہا تھا، پونچھ میں کشمیر کے پاکستان سے الحاق کے
حق میں کئی جلسے اور مظاہرے ہوئے۔ مارشل لا لگا دیا گیا اور جلسوں کو فائرنگ کے ذریعے
منتشر کر دیا گیا۔ ۲۰ تاریخ کو ریاستی فوجوں اور پولیس نے پونچھ میں باغ کے مقام پر بلا کر
مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ اس دن کے بعد سے مسلمانوں پر مظالم اور مصائب کے دروازے
کھل گئے اور ہزاروں مسلمانوں کو بے دردی کے ساتھ ذبح کیا جاتا رہا۔ سرحد کے اس پار دریائے
جہلم کے کناروں پر رہنے والے پاکستانی باشندے ان واقعات پر انتہائی مشتعل تھے اور
انھوں نے ڈوگرا فوجوں کی گولیوں کی بوچھاڑ کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے ہم مذہب بھائیوں

کی مدد کے لیے پونچھ کی طرف پیش قدمی شروع کردی۔

۱۵ اکتوبر کو مہاراجہ کشمیر نے حکومتِ پاکستان کے نام ایک تار میں کشمیری علاقے میں ناجائز طور پر پاکستانی باشندوں کے داخلے کے خلاف احتجاج کیا۔ اس تار میں حکومت پاکستان کو متنبہ کیا گیا تھا کہ "حکومت کشمیر اپنی سرحد پر پاکستانی باشندوں کی جارحانہ اور غیر دوستانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے باہر سے امداد طلب کرنے پر مجبور ہوگی"۔ پاکستانی حکام بخوبی سمجھتے تھے کہ مہاراجہ کشمیر کسی نہ کسی بہانے ہندوستان سے فوجی دستے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ قائداعظم کشمیر کے مسئلے سے ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ تار میں جو لب و لہجہ اختیار کیا گیا تھا اس پر وہ ضرور پریشان ہوئے ہوں گے۔ حکومت پاکستان نے اس احتجاجی تار کے جواب میں مہاراجہ کی دھمکی پر سخت اعتراض کیا لیکن تجویز پیش کی کہ دونوں حکومتوں کے نمائندے مل جل کر اس سوال پر غور کریں۔ ۲۰ تاریخ کو مہاراجہ نے پھر ایک تار بھیجا جس میں حکومت پاکستان کے مصالحتی رویے کو نظرانداز کردیا گیا اور پھر یہ کہا گیا تھا کہ میں حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے باہر سے امداد لوں گا۔

قائداعظم نے یہ دیکھ کر کہ کشمیر کا مسئلہ سنگین نوعیت اختیار کر رہا ہے انتہائی سخت انداز میں مہاراجہ کے احتجاج کا جواب دیا جس میں منجملہ دیگر امور کے یہ بھی کہا گیا تھا کہ "بیرونی امداد کی دھمکی سے بخوبی ظاہر ہو جاتا ہے کہ آپ کی حکومت ہندوستان سے الحاق کے لیے موقع تلاش کر رہی ہے۔ اس سے آپ کے عوام میں ناراضی اور اندیشے پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ ریاست کے عوام میں ۸۵ فی صد مسلمان ہیں۔ میری حکومت نے آپ کے نمائندوں کے ساتھ گفت و شنید کی جو تجویز پیش کی تھی اب وہ انتہائی اہم ہوگئی ہے[1]"۔ پاکستان نے اس مراسلے میں اپنی یہ تجویز دہرائی کہ اس معاملے کی پاکستان اور کشمیر کے نمائندوں کے ذریعے غیر جانبدارانہ تحقیقات کرائی جائے۔ لیکن یہ قتل و غارت گری

---

[1] ڈینجران کشمیر۔ جے کوربیل۔ صفحہ ۶۹/۶۸

بدستور جاری رہی اور پورے اکتوبر کے دوران راشٹریہ سیوک سنگھ، اکالی سکھوں اور آزاد ہند فوج کے جتھے صوبہ جموں پہنچتے رہے۔ اور اس کا انجام یہ ہوا کہ مسلمانوں کے دو قافلوں کو بحفاظت پاکستان پہنچانے کے بہانے ان انتہا پسندوں کے ہاتھوں تہ تیغ کرا دیا گیا۔[1] ان مظالم سے مجبور ہو کر پانچ لاکھ سے زیادہ مسلمان آزاد کشمیر اور پاکستان آ گئے۔ لارڈ برڈ ووڈ آگے چل کر لکھتے ہیں: "اس پر یقین کرنے کے تمام اسباب و شواہد موجود ہیں کہ ریاست کے مغربی علاقوں کے مسلمان باشندے اپنی بقا کے لیے سر سے کفن باندھ کر میدان میں آ گئے۔ ریاست کشمیر کی حکومت جس مقصد سے اس سکیم پر عمل کر رہی تھی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ظاہر تھا کہ مسلمان قوت اور مقبولیت حاصل کرنے کے بعد اس حکومت کا وجود باقی نہ رہنے دیتے۔"[2]

آزاد کشمیر اور پاکستان پہنچنے والے کشمیریوں نے بربریت کی جو داستانیں سنائیں ان کے مقابلے میں پونچھ، میرپور اور بلاکوٹ کے مظالم کچھ حیثیت نہ رکھتے تھے اور یہ مسلم قبائل کے غیظ و غضب کو بھڑکانے کے لیے کافی تھے۔

حکومت ہند کشمیر کے ہندوؤں کو طرح طرح سے ورغلا رہی تھی اور ان کے ذریعے مہاراجہ کو ہندوستان سے الحاق پر مجبور کر رہی تھی۔ اگرچہ ریاست کے مسلمان جو بھاری اکثریت میں تھے اس کے سراسر مخالف تھے اور پاکستان سے الحاق چاہتے تھے۔ ہندوستان کی اس سازش کے سلسلے میں وی پی مینن ۲۵ اکتوبر کو سرینگر پہنچے۔ انھوں نے مہاراجہ کو سمجھایا کہ اپنی اور اپنے خاندان کی حفاظت کے لیے آپ ہندوستان سے فوراً فوجی امداد کی درخواست کیجیے لیکن اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنا اصل مقصد بھی طلب کیا یعنی کشمیر ہندوستان سے الحاق کرے۔ مہاراجہ کشمیر مدت سے اس سوال پر غور کر رہا تھا اور اب اس کے

---

[1] ٹو نیشنز اینڈ کشمیر۔ لارڈ برڈ ووڈ۔ صفحہ ۱۰۵۔ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۱۰۵

ہندوستان نواز وزیر اعظم اور مشیروں کی بھی یہی رائے تھی کہ یہ پیشکش قبول کرلی جائے ۔ مینن سرینگر میں کامیاب بات چیت کے بعد دہلی واپس آئے اور اگلے دن ہی دوبارہ کشمیر روانہ ہو گئے ۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ کاغذات لائے تھے اور کمزور اور خوفزدہ مہاراجہ کو دستخط کرنے پر مجبور ہونا پڑا ۔ مہاراجہ نے ۲۶ ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الحاق کے جس مکتوب پر دستخط کیے تھے اور جو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے نام تھا اس میں کہا گیا تھا کہ کشمیر کی سرحدیں ہندوستان اور پاکستان دونوں سے ملی ہوئی ہیں لیکن ریاست نے ابھی تک کسی ملک سے الحاق نہیں کیا ہے ۔ اس مکتوب میں سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ کے بارے میں دونوں ملکوں سے مہاراجہ کشمیر کے مذاکرات کا تذکرہ کیا گیا تھا ۔ "حکومت پاکستان نے سمجھوتہ قبول کر لیا ہے اور حکومت ہندوستان اس معاملے پر میری حکومت کے نمائندوں سے مزید گفت و شنید چاہتی ہے ۔" مہاراجہ نے ہندوستان سے فوجی امداد طلب کی تھی اور اس امداد کے سلسلے میں انھوں نے تحریر کیا تھا "میں الحاق کے کاغذات منسلک کر رہا ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ اسے منظور کر لیا جائے ۔" مہاراجہ نے اس مکتوب میں فوری امداد کی درخواست کرتے ہوئے لکھا تھا ۔ "مسٹر وی پی مینن کو بخوبی علم ہے کہ حالات کس قدر سنگین ہیں ۔ وہ یہ تمام باتیں آپ کو وضاحت کے ساتھ بتائیں گے ۔"

ہندوستان کی سازش کامیاب رہی تھی اور مینن جب یہ مکتوب لے کر نئی دہلی واپس پہنچے تو اس پر ہر طرف سے اظہار مسرت کیا گیا ۔

ہندوستان نے حیدر آباد کے سلسلے میں جو موقف اختیار کیا تھا ، کشمیر کے بارے میں اس کا موقف اس کے سراسر متضاد تھا ۔ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کے اس پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے سرور حسین رقم طراز ہیں ۔ "اقتدار کی منتقلی کے بعد ، اس مقصد سے کہ ریاست کے امن و امان میں کوئی خلل نہ پڑے مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ سٹینڈ سٹل ایگریمنٹ کر لیا ۔ اس سمجھوتے کے مطابق کشمیر کے سلسلے میں پاکستان پر وہی ذمہ داریاں تھیں جو اس سے پہلے غیر منقسم ہندوستان میں حکومت ہندوستان پر تھیں ۔ حیدر آباد نے بھی ہندوستان کے ساتھ سٹینڈ

سٹل اگریمنٹ کر رکھا تھا جس کے بعد ہندوستان نے دعویٰ کیا کہ حیدر آباد پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ (ا) ہندوستان کے سوا کسی دوسرے ملک سے تعلقات نہ رکھے اور یہ کہ (ب) حیدر آباد ہندوستان سے الحاق کرے۔ حاصل کلام یہ کہ کشمیر اور پاکستان میں سٹینڈ سٹل اگریمنٹ کے مطابق کشمیر (ا) پاکستان کے سوا کسی دوسرے ملک سے تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا اور یہ کہ (ب) کشمیر کا پاکستان سے الحاق ہونا چاہیئے تھا۔ اس طرح ہندوستان سے کشمیر کا الحاق ناجائز ثابت ہو جاتا ہے[1]

۲۷ اکتوبر کو لارڈ ماونٹ بیٹن نے مہاراجہ کشمیر کو حکومت ہند کی طرف سے الحاق کی منظوری کی اطلاع دی۔ یہ مراسلہ دو مختصر پیراگراف پر مشتمل تھا۔ ان میں سے پہلا پیراگراف خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جس میں کہا گیا تھا کہ مسٹر وی پی مینن نے یور ہائی نیس کا مکتوب مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۷ء مجھ تک پہنچایا۔ یور ہائی نیس نے جو خاص حالات بیان کیے ہیں ان کے پیش نظر میری حکومت نے ہندوستان سے کشمیر کا الحاق منظور کر لیا ہے۔ میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ ایسی کسی ریاست کے الحاق کا معاملہ جہاں اس سوال پر اختلاف رائے موجود ہو ریاست کے عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جانا چاہیئے۔ میری حکومت کی خواہش ہے کہ جوں ہی کشمیر میں امن امان بحال ہو اور ناجائز طور پر ریاست میں داخل ہونے والے افراد کو نکال باہر کر دیا جائے، ریاست کے الحاق کا مسئلہ عوام کی پسند کے مطابق طے کیا جائے۔"[2]

دوسرا پیراگراف اس جملے سے شروع ہوتا تھا "دریں اثنا یور ہائی نیس نے فوجی امداد کی جو درخواست کی ہے اس کے مطابق کشمیر کا دفاع کرنے اور کشمیری عوام کے جان و مال اور آبرو کے تحفظ کی غرض سے کشمیری افواج کی مدد کے لیے آج ہی ہندوستان کے فوجی دستے روانہ کیے جا رہے ہیں۔" یہ پیراگراف ان الفاظ پر ختم ہوتا تھا "میری حکومت اور میں اس امر کو استحسان کی نظر سے دیکھتے ہیں کہ آپ نے شیخ عبداللہ کو عبوری حکومت

---

[1] پاکستان اینڈ دی یونائیٹڈ نیشنز۔ کے سرور حسین۔ صفحہ ۹۳۔ مطبوعہ ۱۹۶۰ء۔ مین ہٹن پبلشنگ کمپنی نیویارک۔ [2] ٹونیشنز اینڈ کشمیر۔ لارڈ برڈوڈ۔ صفحہ ۲۱

بنانے کی دعوت دی ہے۔[1]"

مہاراجہ کشمیر کے نام ماؤنٹ بیٹن کے مکتوب سے ظاہر ہوتا تھا کہ "ہندوستان کے ساتھ ریاست کے الحاق کا سوال عوام کی مرضی کے مطابق طے کیا جائے گا" لیکن ہندوستان نے اپنے فائدے کی خاطر یہ عہد فراموش کر دیا۔ ہندوستان سے کشمیر کے نام نہاد الحاق" کے بارے ہندوستان نے جس مکاری اور دغا بازی کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مذمت میں بہت کچھ لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ لارڈ برڈوڈ رقم طراز ہیں "میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ اس وقت لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ذہن میں ریاست کے حالات، امن کے "دن رکھنے اور اس کے بعد ایک سال کے اندر اندر رائے شماری کرانے کے سوا کوئی بات موجود تھی۔ انھوں نے مہاراجہ کو بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری پر آمادہ کرنے اور بعد میں بین الاقوامی اداروں کی نگرانی میں رائے شماری کی حمایت میں جو باتیں کہی تھیں ان سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ کشمیر کے عوام خود ہی یہ معاملہ طے کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حکومت ہندوستان نے اس قضیے کو فی الحال ملتوی کرنے ہی میں عافیت سمجھی اور اس کے بعد سے ہندوستان برابر ٹال مٹول کر رہا ہے۔[2]"

قائداعظم کو ہندوستان سے کشمیر کے الحاق کی خبر سے بڑا تعجب ہوا۔ وہ اس وقت سرکاری دورے پر لاہور گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے فوراً پاکستان کی بری فوج کے کمانڈر انچیف جنرل گریسی کو صلاح مشورے کے لیے راولپنڈی طلب کیا۔ قائداعظم کی تجویز پر طے ہوا کہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور مسٹر نہرو پاکستان کے گورنر جنرل اور وزیراعظم سے مسئلہ کشمیر پر گفتگو کے لیے ۲۸ اکتوبر کو لاہور آئیں گے۔ لیکن اس فیصلے کی توثیق کے لیے جب ہندوستان کی کابینہ کا اجلاس ہوا تو لاہور کانفرنس کی مخالفت کی گئی۔ ہندوستانی کابینہ کے اجلاس کے بعد پُراسرار طور پر اعلان کیا گیا کہ مسٹر نہرو بیمار ہو گئے ہیں اور وہ لاہور نہیں جا سکتے۔ اس

---

[1] ٹو نیشنز اینڈ کشمیر۔ لارڈ برڈوڈ۔ صفحہ ۱۰۴ ۔ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۵۹/۵۸

پر ماؤنٹ بیٹن یکم نومبر کو تنہا لاہور پہنچے۔ اس سے ایک دن پہلے حکومت پاکستان نے ایک بیان جاری کیا جس میں مہاراجہ کشمیر کے ہندوستان کے ساتھ الحاق کے سمجھوتے پر دستخط کرنے کی کارروائی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا گیا اور اسے یک طرفہ کارروائی قرار دیا گیا تھا۔ قائد اعظم نے ماؤنٹ بیٹن کے سامنے تجویز پیش کی کہ دونوں ملکوں کے گورنر جنرل دونوں طرف ۴۸ گھنٹے کے اندر اندر لڑائی ختم کر دینے کے بارے میں مشترکہ اپیل کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو دونوں گورنر جنرل مشترکہ طور پر کشمیر کا نظم و نسق سنبھال لیں اور اس صورت میں وہ دونوں کشمیر کے الحاق کے سوال پر رائے شماری کرانے کے ذمہ دار ہوں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے مسئلہ کشمیر کے اس منصفانہ تصفیے سے پہلو بچانا چاہا اور یہ کہہ کر مہلت مانگی کہ میں اس سلسلے میں اپنی کابینہ سے مشورہ کروں گا۔

ایلن کیمبل جانسن اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں کہ جب لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور قائد اعظم کی ملاقات ہوئی تو قائد اعظم نے الزام لگایا کہ کشمیر میں جو سنگین حالات پیدا ہو گئے ہیں ان کی ذمہ داری حکومت ہندوستان پر ہے اور ماؤنٹ بیٹن نے یہی الزام پاکستان پر لگایا۔ کیمبل جانسن آگے چل کر لکھتے ہیں "جناح کے چہرے سے آزردگی کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ برابر یہ کہتے رہے کہ انھوں نے جس ملک کی بنیاد رکھی ہے، ہندوستان وحشیانہ طور پر اسے ختم کرنے پر تلا ہوا ہے[1]"

ماؤنٹ بیٹن نے ایلن کیمبل جانسن کو قائد اعظم کے بارے میں جو تاثرات بتائے تھے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ رقم طراز ہیں "جناح اب خود کو اپنی مملکت کی سیاست کے لیے پوری طرح وقف کر چکے ہیں[2]" قائد اعظم کی تجویز کا اثر زائل کرنے کی کوشش میں نہرو نے ۲ نومبر کو دہلی سے ایک نشری تقریر میں کہا "ہم کشمیر میں امن و امان قائم ہو جانے کے بعد بین الاقوامی نگرانی میں رائے شماری کرانے کو تیار ہیں۔"

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ صفحہ ۲۳۱۔ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۲۳۰۔

یکم جنوری ۱۹۴۸ء کو ہندوستان نے اقوام متحدہ کے منشور کی دفعہ ۳۵ کے تحت مسئلہ کشمیر سلامتی کونسل میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۵ر جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل میں اس پر بحث شروع ہوئی۔ ہندوستان کی طرف سے سرگوپال سوامی آئینگر اور پاکستان کے ترجمان کی حیثیت سے سر ظفر اللہ خاں کونسل کے روبرو پیش ہوئے۔ سر ظفر اللہ خاں نے پانچ گھنٹے تک انتہائی مؤثر اور مدلل انداز میں پاکستان کا موقف پیش کیا۔ ۲۰ر جنوری کو کونسل نے فیصلہ کیا کہ تین ممبروں کا ایک کمیشن کشمیر بھیجا جائے۔ جوزف کوربیل رقم طراز ہیں کہ "کمیشن فوراً ہی روانہ نہیں کیا گیا" اور اس فروگذاشت کے سلسلے میں اقوام متحدہ کی دستاویزوں میں کوئی وضاحت موجود نہیں ہے۔ فوراً ہی اس مسئلے پر پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ گرما گرم بحث شروع ہو گئی۔[1] بہرحال ۵ر جولائی ۱۹۴۸ء کو یہ کمیشن کراچی روانہ ہوا اور جب کمیشن پاکستان پہنچا تو قائد اعظم زیارت میں صاحب فراش تھے۔ ان کی صحت روز بروز تشویشناک ہوتی جارہی تھی۔

۱۹۴۸ء اور ۱۹۶۵ء کے درمیان کشمیر کے سوال پر سلامتی کونسل میں اکثر بیشتر بحث ہوتی رہی ہے۔ پاکستان ہمیشہ مدلل انداز میں یہ کہتا رہا ہے کہ کشمیر میں جلد از جلد غیر جانبدارانہ رائے شماری کرائی جائے۔ جنرل اسمبلی میں پاکستان کے نمائندوں نے دوسرے ملکوں کے نمائندوں کو کشمیر کی خطرناک صورت حال پر اکثر توجہ دلائی ہے لیکن ہندوستان نے بدستور کشمیر پر قبضہ جما کر فوجی تسلط قائم کر رکھا ہے اور اس تسلط کی بنیاد کے طور پر وہ ایک فرد کے اس الحاق کو پیش کرتا رہتا ہے جو مکر و فریب کے سہارے کیا گیا تھا۔ بہادر کشمیری مسلمان طرح طرح کے ظلم و ستم برداشت کر رہے ہیں۔ ایک طرف ہندوستانی فوجیوں کی سنگینوں کی نوکیں ہیں اور دوسری جانب ایک ایسی حکومت جسے ان سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں اور جو ان کے پیدائشی حق یعنی حق خود اختیاری کے بارے میں ایک حرف سننے کو تیار نہیں ہے۔

مہاراجہ کشمیر کو جس کے مسلم دشمن رویے کے سبب ریاست کے باشندوں پر آلام و مصائب

---

[1] ڈینجران کشمیر۔ جوزف کوربیل۔ صفحہ ۱۰۴

کے دروازے کھلے، ہندوستان سے الحاق کے سمجھوتے پر دستخط کرنے کے دو سال ہی بعد وہ حیثیت اور مقام کا گیا جس کا وہ مستحق تھا۔ ۲۰ جون ۱۹۴۹ء کو اسے ریاست کی گدی چھوڑ کر بمبئی چلے جانے پر مجبور ہونا پڑا۔ ایک شخص نے بھی اس سے ہمدردی کا اظہار نہیں کیا اور اس کی بدنصیبی اور محرومی پر کسی کی آنکھ سے ایک آنسو تک نہیں ٹپکا۔ لارڈ برڈ ووڈ رقم طراز ہیں "ہندوستان کو آئینی کارروائیاں پوری کرنے کے لیے ریاست کے حکمران کے تعاون کی ضرورت تھی اور جب یہ مقصد حاصل ہو گیا تو ہندوستان کو اس سے کوئی دلچسپی نہ رہی لیکن اس کی روانگی سے الحاقِ کشمیر کی حیثیت کچھ مشتبہ سی ہو جاتی ہے[1]۔"

قیام پاکستان کے وقت ہی سے اسے گوناگوں سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا ـــــ یہ مسائل اتنے سنگین تھے کہ ان سے پاکستان کی سلامتی بلکہ اس کے وجود کو خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ پاکستان کے دشمن، جنھوں نے پاکستان کے قیام کو کبھی بھی دل سے قبول نہیں کیا تھا، پاکستان کو ختم کر دینے کی سازشوں میں مصروف تھے۔ پاکستان کی خوش نصیبی تھی کہ قائداعظم کی ذات اس کا سہارا تھی اور وہ ملک کو ہر طوفان سے بحفاظت نکال کر کامرانی اور کامیابی کے ساحل تک پہنچا دینے کے لیے کافی تھی۔ قائداعظم مشکلات، خطرات اور مزاحمتوں کے سامنے ہار ماننے والے شخص نہ تھے، وہ مشکلات کا انتہائی پامردی سے مقابلہ کرتے اور مشکلات ان کے سمندِ شوق کے لیے تازیانے کا کام کرتیں۔ ضعیف العمری اور علالت کے باوجود پاکستان کے قیام کے ابتدائی دور میں انھوں نے اس نئے ملک کی تعمیر میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان کی ذات اس نئے ملک کے لیے روشنی کا مینار تھی۔

---

[1] ٹو نیشنز اینڈ کشمیر۔ لارڈ برڈ ووڈ۔ صفحہ ۶۲

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

کسی مقصد کے حصول کے لیے جہاں تک عزم کا تعلق تھا، قدرت نے انھیں بہت قوت عطا کی تھی لیکن جسمانی اعتبار سے ان کی صحت روز افزوں مصروفیات کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھی۔ ایک طرف تو ان کی صحت عظیم اور گرانبار سیاسی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی اجازت نہیں دیتی تھی دوسری طرف ان کے عزم، خلوص اور فرض شناسی کا اعلیٰ ترین جذبہ راستے کی ہر مزاحمت کو دور پھینک دینا چاہتا تھا تاکہ وہ عوام کو منزل مقصود پر پہنچا سکیں۔

قائد اعظم کی زندگی کے آخری دس برس میں ان کی سیاسی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں میں بے پناہ اضافہ ہو گیا تھا اور یہ وہ دور تھا جب انھیں آرام کی شدید ضرورت تھی۔ ڈاکٹروں کے مشورے کے باوجود انھوں نے آرام کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک محنت اور انتھک محنت ہی سب کچھ تھی۔ انھوں نے اپنی صحت کی پروا نہ کی اور زندگی کی تمام تر توانائیوں کو اپنے مقصد کے لیے وقف کر دیا۔

لاہور میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قرارداد پاکستان منظور ہونے کے بعد جہاں ان کی سیاسی مصروفیات میں بے پناہ اضافہ ہوا وہاں ان کی صحت بھی رفتہ رفتہ جواب دینے لگی۔ خرابی صحت کے باوجود انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ مطالبۂ پاکستان کو تاریخ نسل انسانی کا ایک روشن باب بنا کر دم لیں گے۔ انھیں اپنے طویل دوروں، رات دن کی مصروفیت اور نوع بنوع پریشانیوں کی مہنگی قیمت ادا کرنی پڑ رہی تھی۔ لیکن وہ بڑی خندہ پیشانی سے

سب کچھ برداشت کر رہے تھے۔ وہ بخوبی جانتے تھے کہ سیاسی جد و جہد کے دوران میں عوامی رہنما کو ان حالات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ ان کا وزن جو کبھی ۱۱۲ پونڈ تھا اب تیزی سے کم ہو رہا تھا لیکن انھوں نے اپنے ذاتی مسائل پر کبھی توجہ ہی نہ دی۔ ان کے ڈاکٹروں نے بہت زور دیا کہ وہ اپنی صحت کی طرف کچھ تو توجہ دیں مگر ان کے سمند شوق کی رفتار میں کوئی کمی نہ آئی، وہ تمام مزاحمتوں اور رکاوٹوں کو راستے سے ہٹاتا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔

۱۹۴۱ء میں قائدِ اعظم کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی تھی اور غالباً یہ اس بیماری کا آغاز تھا جس نے آخر کار انھیں اس قوم اور ملک سے چھین لیا۔ اگر وہ احتیاط کرتے تو شاید یہ شکایت طول نہ پکڑتی مگر ان کے معمولات میں اب بھی کوئی تغیر رونما نہ ہوا۔ وہ اسی طرح دن رات مصروف رہتے اور موسم کی پروا کیے بغیر برِ صغیر کے مختلف علاقوں کے دورے کرتے رہتے۔

وہ تن تنہا ان تمام مسئلوں کو سلجھاتے رہے جن سے نمٹنا کسی فردِ واحد کے لیے ممکن نہیں وہ اپنے ساتھیوں میں سب سے ممتاز تھے۔ تاریخ کے عظیم فرزندوں کی طرح انھیں بھی تنہائی مرغوب تھی مگر عوام کے درمیان ان کی جادو اثر شخصیت کچھ اور ہی کام کرتی۔ ان کے دل کی دھڑکن عوام کے دل کی دھڑکن بن جاتی، وہ اپنے نصب العین سے بخوبی واقف تھے۔ تقدیر انھیں منزل سے قریب تر کر رہی تھی کہ ان کی صحت جواب دینے لگی، دس کروڑ عوام کا رہنما تاریخ کے اس نازک موڑ پر کس طرح انھیں چھوڑ کر آرام کر سکتا تھا، انھیں سوتے جاگتے ہر وقت عوام اور ان کے گوناگوں مسائل کی فکر رہتی، نئے نئے مسائل ان کے سامنے ہوتے اور ہر وقت بیسیوں درخواستوں اور خطوط کا تانتا بندھا رہتا۔ ان کے قویٰ جواب دے رہے تھے مگر ان کا عزم جوان تھا۔ خرابیِ صحت کے باوجود ان کے مشاغل اور مصروفیات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ مسلسل کئی سال تک وہ اسی طرح کام کرتے رہے۔

قائد اعظم گورنر جنرل کے عہدے کا حلف اٹھاتے ہوئے

پاکستان اور ہندوستان کی آزادی و خود مختاری کی تاریخ جوں جوں قریب آرہی تھی دہلی میں سرگرمیاں بڑھتی جارہی تھیں، ۵ اگست ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قائدِ اعظم سے نجی ملاقات کی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو سراغرسانی کے محکمے نے اطلاع دی کہ قائدِ اعظم کو قتل کرنے کے منصوبے بنائے جارہے ہیں، اس ملاقات میں ماؤنٹ بیٹن نے پنجاب کے محکمہ خفیہ پولیس کے ایک افسر سے قائدِ اعظم کو متعارف کرایا۔ کیمپبل جانسن رقمطراز ہیں۔ اس پولیس افسر نے ہنگاموں میں گرفتار ہونے والے شورش پسندوں کے بیانات سے قائدِ اعظم کو باخبر کیا۔ پولیس نے ان لوگوں سے جو پوچھ گچھ کی تھی اور محکمے کو مختلف علاقوں سے جو خفیہ اطلاعات موصول ہوئی تھیں ان سے معلوم ہوا کہ ان منصوبوں میں سکھ لیڈروں کا ہاتھ ہے۔ ان میں سے ایک منصوبہ یہ تھا کہ اگلے ہفتے کراچی میں قائدِ اعظم آزادی کی تقریبات میں شرکت کے لیے تشریف لائیں تو ان پر قاتلانہ حملہ کیا جائے[1] یہ سب کچھ سننے کے باوجود قائدِ اعظم کے اطمینان اور سکون میں فرق نہ آیا اور انھوں نے فرمایا کہ یوم آزادی کا جلوس پروگرام کے مطابق نکلے گا۔ کیونکہ یہ دن سرکاری تقریبات میں سب سے اہم اور مبارک ہے۔

دو روز بعد قائدِ اعظم ہوائی جہاز میں دہلی سے کراچی روانہ ہو گئے تاکہ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے فرائض سنبھال سکیں۔ یہ وہی شہر تھا جہاں وہ ۷۱ برس قبل پیدا ہوئے تھے، جب وہ ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہوئے تو راستے کے دونوں طرف کھڑے ہوئے ہزارہا لوگوں نے قوم کے اس نجات دہندہ کا فلک شگاف نعروں سے استقبال کیا۔ لوگ ان کی ایک جھلک دیکھنے کو بے تاب تھے۔ یہ وہ شخص تھا جس نے غلامی کی برسوں پرانی بیڑیاں توڑ کر مسلمانوں کو آزادی سے ہمکنار کیا تھا۔ وہ کامیابی کے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے تھے۔ پاکستان جس کے لیے انھوں نے برس ہا برس تک انتھک جدوجہد کی

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن۔ صفحہ ۱۴۹۔ مطبوعہ ۱۹۵۱ء

تھی ایک حقیقت بن چکا تھا اور وہ اس ملک کے گورنر جنرل تھے۔ ان کے نزدیک یہ شخصی کامیابی یا نصب العین کا حصول، بے جا فخر و غرور کی بات نہ تھی۔ یومِ آزادی پر جن دلوں نے قائدِ اعظم کو دیکھا ہے انھیں بابائے قوم کی آنکھوں میں عجز و انکسار کی جھلک دکھائی دی۔ ان کے تاثرات سے بخوبی ظاہر تھا کہ انھیں اپنی گراں بار ذمہ داریوں کا کتنا احساس ہے۔

دو روز بعد سر غلام حسین ہدایت اللہ نے قائدِ اعظم کے اعزاز میں کراچی کلب میں ڈنر دیا۔ ڈنر سے پہلے جب وہ صوفے پر بیٹھے تو میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے سے تھکن ظاہر ہو رہی ہے۔ ڈنر کے بعد وہ میزبان کے سپاس نامے کا جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے۔ انھوں نے فرمایا۔ "یہ ایک حقیقت ہے کہ میں کراچی میں پیدا ہوا۔ میں نے اسی شہر میں اپنا بچپن گزارا اور یہیں تعلیم کا آغاز کیا۔" انھوں نے اپنی ابتدائی زندگی اور لندن میں زمانۂ قیام کے اہم واقعات کا ذکر کیا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کراچی کے بجائے بمبئی میں پریکٹس شروع کرنے کا فیصلہ کیوں کیا اور پھر مجھے کن حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے اپنی سیاسی مصروفیات پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ خارزارِ سیاست میں مختلف النوع مسائل اور مشکلات کے بعد آج پھر میں کراچی میں ہوں ــــ پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے ــــ۔ اپنی تقریر کے آخر میں انھوں نے اپنی بہن کو ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا "مس فاطمہ جناح نے برابر میری امداد اور حوصلہ افزائی کی ہے۔ ان دنوں جب یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ برطانوی حکومت مجھے گرفتار کرے گی، میری بہن ہی نے میرا حوصلہ بڑھایا اور جب میں حالات سے مایوس ہوتا جا رہا تھا تو انھوں نے میرے دل میں امید کی شمع روشن کی۔ وہ خصوصاً میری صحت کے بارے میں بڑی فکرمند رہتی آئیں۔"

۱۱ تاریخ کو کراچی میں پاکستان کی مجلسِ دستور ساز کا پہلا اجلاس ہوا۔ ایوان میں تقدس کی فضا تھی اور اجلاس کا آغاز تلاوتِ کلام پاک سے ہوا۔ گیلری میں موجود افراد

اور تمام ممبر یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایک نئے آزاد ملک پاکستان کی تاریخ کے پہلے صفحے پر ابتدائی الفاظ رقم کیے جا رہے ہیں۔

دستور ساز اسمبلی نے سب سے پہلے قائدِ اعظم کو اتفاق رائے سے اپنا صدر منتخب کیا۔ اس پر اسمبلی کا ایوان تالیوں سے گونج اٹھا۔ اس موقع پر ایک عجیب بات ہوئی۔ ہم لوگوں نے جو گیلری میں تھے، پارلیمانی روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے خود بھی بڑے جوش و خروش کے ساتھ کھڑے ہو کر تالیاں بجائیں۔ قائدِ اعظم خطبۂ صدارت پڑھنے اٹھے تو ایوان میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ انھوں نے ممبروں کا شکریہ ادا کرنے کے بعد فرمایا کہ دستور ساز اسمبلی کے سامنے دو اہم کام ہیں۔ ایک یہ کہ اسے پاکستان کا آئندہ دستور مرتب کرنا ہے اور دوسرا یہ کہ یہ اسمبلی پاکستان کی وفاقی مقننہ کی حیثیت سے ایک مکمل خود مختار ادارہ ہوگی۔" پاکستان کی تشکیل کے متعلق حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔" اب سے پہلے دنیا کی تاریخ میں ایسا کوئی انقلاب رونما نہیں ہوا ہے۔" انھوں نے رشوت ستانی اور بدعنوانی کی مذمت کی جس کی وجہ سے ہندوستان کو نقصان اٹھانا پڑا تھا اور فرمایا۔ " رشوت ستانی درحقیقت ایک لعنت ہے ہمیں اس لعنت کو سختی سے ختم کرنا ہے ——— ایک اور لعنت چور بازاری ہے۔" انھوں نے اقربا پروری اور خویش نوازی کو قابلِ نفرت قرار دیا اور فرمایا۔ اس قابلِ نفرت شے کے وجود کو تباہ کر دینا ضروری ہے ——— میں کسی قسم کی اقربا پروری، فرقہ واریت یا کسی دباؤ کو برداشت نہیں کروں گا۔" مذہبی رواداری کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا۔" آپ سب آزاد ہیں۔ آپ کو مملکت پاکستان میں اپنے مذہبی عقائد پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہے۔" انھوں نے خلوصِ دل کے ساتھ وعدہ کیا کہ وہ کسی کے خلاف کوئی کدورت نہیں رکھیں گے اور نہ کسی کے ساتھ جانبداری برتیں گے۔ انھوں نے کہا" میں ہمیشہ حق و انصاف کے اصولوں کے مطابق اپنا فرض انجام دوں گا۔"

اس کے بعد نواب زادہ لیاقت علی خان کھڑے ہوئے انھوں نے ایک قرار داد

پیش کی کہ جناح صاحب کی قومی خدمات پر اظہار شکر گزاری کے لیے اور عوام کی خواہش کے مطابق دستور ساز اسمبلی انھیں "قائداعظم" کا خطاب دے، یہ وہ خطاب تھا جو انھوں نے اپنے خلوص اور خدمت کے صلے میں تقسیم سے قبل حاصل کیا تھا۔ لیاقت علی خاں نے ایوان پر زور دیا کہ اس قرارداد کو منظور کر لیا جائے۔ انھوں نے جناح صاحب کو "مملکتِ پاکستان کا اتاترک اور سٹالن" قرار دیا۔ قرارداد اتفاق رائے سے منظور کر لی گئی۔ مسلم لیگ کا جھنڈا سبز تھا اور اس کے وسط میں ہلال تھا۔ دستور ساز اسمبلی نے فیصلہ کیا کہ اس سیاسی تنظیم نے جو زبردست سیاسی جنگ لڑی ہے اس کے اعتراف کے طور پر تنظیم کے پرچم کو مملکتِ پاکستان کے پرچم کی حیثیت سے قبول کر لیا جائے اور پاکستان کی اقلیتوں کی نشان دہی کے لیے اس میں کنارے پر سفید پٹی لگائی جائے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن مملکتِ پاکستان کی افتتاحی تقریبات میں شرکت کے لیے ۱۳ اگست کو دہلی سے کراچی آئے۔ برطانوی ہند کے وائسرائے کی حیثیت سے یہ ان کا آخری دورہ بھی تھا۔ اس رات قائدِاعظم نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اعزاز میں سرکاری ضیافت دی۔ قائدِاعظم نے شاہِ برطانیہ کی صحت کا جام تجویز کرتے ہوئے فرمایا۔ "آج ہم ایک ایسے یادگار موقع پر یہاں جمع ہوئے ہیں، جب اہلِ ہند کو اختیارات مکمل طور پر منتقل کیے جا رہے ہیں اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو، دو آزاد اور خود مختار ملک یعنی پاکستان اور ہندوستان عالم وجود میں آجائیں گے ...... تاریخ میں ایک قوم کی طرف سے دوسری قوم کو رضاکارانہ طور پر اختیارات اور حکومت کی منتقلی کی، ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔" پاکستان اور ہندوستان کو اختیارات منتقل کرنے کے سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن نے جو کردار ادا کیا تھا اس پر قائدِاعظم نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ "ماؤنٹ بیٹن نے اپنا فرض انتہائی شاندار طور پر انجام دیا۔" جمعرات ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو قائدِاعظم مس فاطمہ جناح کے ہمراہ جلوس کی شکل میں اسمبلی کی طرف روانہ ہوئے جہاں لارڈ ماؤنٹ بیٹن تاریخی اعلان کرنے والے تھے۔ اسمبلی کی عمارت

کے احاطے میں تِل دھرنے کی جگہ نہ تھی، یہی حال ان سڑکوں کا تھا جہاں سے جلوس گزرنے والا تھا۔ راستہ کے دونوں طرف مشتاقانِ دید کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر تھا۔ درختوں تک پر لوگ چڑھے ہوئے تھے۔ اس تاریخی موقع کی مناسبت سے نہایت پُرشکوہ سرکاری تقریبات ہوئیں جن کے بعد قائدِ اعظم اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن شاہی بگھی میں گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہوئے جن لوگوں کو اس بات کا علم تھا کہ قائدِ اعظم پر قاتلانہ حملے کی سازش کی گئی ہے ان کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ قائدِ اعظم جانتے تھے کہ اس طرح کھلی گاڑی میں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن انھوں نے سرکاری پروگرام کے اس جزو پر عمل نہ کرنے کا مشورہ مسترد کر دیا۔ جُوں جوں جلوس آگے بڑھ رہا تھا، لوگوں کی تشویش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اب شاہی بگھی گورنر جنرل ہاؤس کے دروازے میں داخل ہو چکی تھی۔ راستے میں کوئی ناگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ کیمپبل جانسن اپنے روزنامچے میں رقم طراز ہیں کہ قائدِ اعظم نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا "خدا کا شکر ہے کہ آپ میرے ساتھ زندہ سلامت واپس آ گئے۔"[1]

پاکستانیوں کے لیے وہ یومِ آزادی تھا اور حصولِ مقصد کی ایک مبارک ساعت۔

قافلہ اپنی منزل تک پہنچ گیا تھا مگر جد و جہد ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ نئی مملکت کو بے شمار مسائل درپیش تھے اور ملک کو بحفاظت سلامتی کی منزل تک پہنچانے کا بار قائدِ اعظم کے ناتوان کاندھوں پر تھا۔ انھی کی ولولہ انگیز قیادت میں قوم نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ سربلندی اس کا مقدر ہے۔ راستے کی تمام بڑی بڑی رکاوٹیں قوم کے عزمِ صمیم کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئیں اور اس کی کامیابیوں کو قومی تعمیر کے باب میں معجزہ قرار دیا گیا۔ جیمز اے میچنر نے قیامِ پاکستان کے ابتدائی برسوں میں پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد تحریر کیا، میں نے حکومتِ پاکستان سے زیادہ جفاکش انتظامیہ کہیں نہیں دیکھی۔ حقیقت یہ

---

[1] مشن ود ماؤنٹ بیٹن۔ ایلن کیمپبل جانسن۔ صفحہ ۱۵۶۔

ہے کہ پاکستان کی انتظامیہ اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا رہی ہے۔[1]

قائدِ اعظم نے ان مشکل ایام میں پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے جس بے لوث جذبے کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیے، ان کے پرائیویٹ سیکرٹری ایس ایم یوسف نے ڈان میں ایک مضمون میں اس کی کچھ جھلکیاں پیش کی ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان کے محکمۂ قانون میں ایسے تربیت یافتہ افراد کی کمی تھی جو قوانین کے مسودے تیار کر سکیں اور "کچھ بلوں اور آرڈی نینسوں کے مسودے بڑی عجلت میں تیار کیے گئے تھے" قائدِ اعظم اصولی طور پر اس وقت تک کسی قانون کو منظور نہیں کرتے تھے جب تک وہ ہر لفظ اور ہر سطر سے خود مطمئن نہ ہو جائیں۔ وہ کسی دستاویز پر اس کا مطلب اور مفہوم سمجھے بغیر دستخط کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ قائدِ اعظم چاہتے تھے کہ انتظامیہ مستعد اور چوکس رہے۔ وہ فرماتے تھے۔ "حکام کو مجھ سے یہ توقع نہ رکھنی چاہیئے کہ انھوں نے کسی مناسب عذر کے بغیر کسی معاملے میں تاخیر سے کام لیا تو میں ان کا ساتھ دوں گا" ایس ایم یوسف نے مضمون میں آگے چل کر لکھا ہے کہ "ایک صوبائی حکومت نے صوبائی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس سے چند روز قبل ایک آرڈی نینس کے نفاذ کی منظوری کی درخواست کی۔ قائدِ اعظم نے آرڈی نینس کی منظوری نہیں دی کیونکہ اس طرح قانون ساز اسمبلی کی بالادستی پر حرف آتا تھا۔ ان کی فرض شناسی کے بارے میں ایس ایم یوسف رقم طراز ہیں: "علالت اور خرابیٔ صحت انھیں اپنے فرائض کی ادائیگی سے باز نہیں رکھ سکی۔ وہ آخر دم تک مملکت کے اہم اُمور سے عُہدہ برآ ہوتے رہے۔" ان کے سیکرٹریٹ ہی کے ایک اور اہم رکن فرخ امین نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ "گورنر جنرل بننے کے بعد قائدِ اعظم نے کبھی آرام نہیں کیا۔ درحقیقت وہ اپنے انتقال کے وقت تک امورِ مملکت سرانجام دیتے رہے۔"

---

[1] دی ڈانس آف انڈیا۔ جیز اے میچنر۔ صفحہ ۲۹۲۔ بینٹم بکس۔ نیویارک

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کو گزٹ آف پاکستان کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور یوں پاکستان باضابطہ طور پر ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی حیثیت سے صفحۂ عالم پر نمودار ہو گیا۔ گزٹ میں کہا گیا تھا "ہر گاہ کہ ملک معظم نے قائداعظم محمد علی جناح کو پاکستان کا گورنر جنرل مقرر کیا ہے، متذکرہ تقرر کا اعلان کیا جاتا ہے اور مشتہر کیا جاتا ہے کہ پاکستان کے گورنر جنرل نے آج اپنے اختیارات سنبھال لیے" مشرقی بنگال، مغربی پنجاب، سندھ، شمال مغربی سرحدی صوبے کی حکومتوں اور بلوچستان کے چیف کمشنر کو اس تقرر کا اعلان کرنے کی ہدایت کی گئی اور کہا گیا کہ "یہ حکم مختلف چھاؤنیوں میں فوجی یونٹوں اور تمام بڑے بڑے بحری، فوجی اور فضائی سٹیشنوں پر پڑھ کر سنایا جائے" اور یہ کہ اس کی ایک نقل حکومت پاکستان کی تمام وزارتوں کو ارسال کی جائے۔ اسی گزٹ میں ایک اور اطلاع یہ تھی "ہز ایکسیلینسی گورنر جنرل نے مسٹر لیاقت علی خان، مسٹر آئی آئی چندریگر، مسٹر غلام محمد، سردار عبدالرب نشتر، مسٹر غضنفر علی خان، مسٹر جوگندر ناتھ منڈل، اور مسٹر فضل الرحمٰن کو وزیر مقرر کیا ہے۔" اسی دن ایک اور حکم جاری کیا گیا جس کے مطابق گورنر جنرل نے ان ساتوں وزیروں کے عہدوں کی تقسیم کی تھی۔

یہ بات وثوق کے ساتھ کہنا مشکل ہے کہ پاکستان کے قیام کے وقت اسے جن مشکلات کا سامنا تھا، آیا تاریخ میں کوئی دوسری قوم بھی ان مسائل سے دوچار ہوئی۔ سات کروڑ عوام کے ملک کے معاملات کی نگرانی کے لیے راتوں رات کراچی میں جو حکومت بنی اس کے سیکرٹریٹ کے لیے موزوں عمارت تک نہ تھی۔ تمام وزارتوں اور سرکاری محکموں کو عارضی طور پر بیرک نما دفتروں میں کام شروع کرنا پڑا۔ حد تو یہ ہے کہ کرسیوں، میزوں، ٹائپ رائیٹروں، سٹیشنری وغیرہ جیسی ضروری چیزوں کی بھی شدید قلت تھی۔ اس کے علاوہ کراچی میں مکانوں کی کمی بھی ایک سنگین مسئلہ بنتی جا رہی تھی۔ لوگوں کو جہاں جگہ ملی انھوں نے سر چھپانے کے لیے جھگی بنالی۔ جیمز لے میسیئرنے ان دنوں کے کراچی کی حالت بیان کرتے

ہوئے لکھا ہے: "پاکستان ایشیا کے ہیجان خیز ملکوں میں سے ہے۔ یہ ملک ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے عالم وجود میں آیا ہے۔ کراچی جو کبھی دو لاکھ کی آبادی کا ایک گمنام سا شہر تھا راتوں رات ۱۵ لاکھ نفوس پر مشتمل قومی دارالحکومت بن گیا۔"[1]

ہیجینیز نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ کراچی ایشیا کے ان چند شہروں میں سے ہے جہاں ——— ایسے دُھن کے پکے اور با حوصلہ افراد موجود ہیں جو ایک نئے معاشرے کی داغ بیل ڈال رہے ہیں۔[2] اس بیان سے نہ صرف کراچی بلکہ پورے ملک کے باشندوں کے عزم و حوصلے پر روشنی پڑتی ہے۔

یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ کسی جوان ہمت شخص کے لیے مکمل کامیابی، مکمل ناکامی سے زیادہ مہلک ہوتی ہے۔ قائد اعظم جس مقصد کے حصول کے لیے کوشاں تھے اس میں انھیں کامیابی ہوئی تھی مگر ان کے عزم اور ان کے ذوق و شوق میں کوئی کمی نہ ہوئی تھی۔ وہ اسی قدر پختہ ارادے کے ساتھ اس ملک کی خدمت کرنا چاہتے تھے۔ جسمانی اعتبار سے وہ توانا اور تندرست نہ تھے مگر ان کی قوتِ ارادی بہت مستحکم تھی۔ آزادی کے بعد ملک کو جن مصائب اور مسائل کا سامنا کرنا پڑا وہ انھیں حل کرنا چاہتے تھے۔ وہ خلوصِ مقصد اور لگن سے سرشار تھے اور اسی جذبے سے عوام کی حتی المقدور خدمت کر رہے تھے۔ اس زمانے میں ان کا یہی جذبہ اور لگن پاکستان کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب دنیا اس نئے ملک کی جانب دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

ہندو اس نئے ملک کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کرنے کے لیے ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے۔ پاکستان جن علاقوں پر مشتمل تھا وہاں تجارت اور صنعت کی باگ ڈور ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور نے ۶ مئی ۱۹۴۷ء کو لکھا تھا کہ

---

[1] دی ڈانس آف ایشیا۔ جیمز اے میچینیز صفحہ ۲۱۲ [2] بحوالہ متذکرہ بالا۔ صفحہ ۲۱۲

پنجاب نیشنل بینک نے اپنا رہیڈ دفتر لاہور سے دہلی منتقل کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دو اور بنک اور دو بڑی بیمہ کمپنیاں پنجاب سے اپنے دفتر منتقل کرنے پر غور کر رہی ہیں۔ ان بنکوں اور بیمہ کمپنیوں کا کل سرمایہ ڈھائی ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔" اخبار نے ایک ہندو بینکر کے یہ الفاظ بھی نقل کیے تھے "آپ مرے، جگ پرلے۔ ہم پاکستان کو اقتصادی اعتبار سے تباہ کر کے جا رہے ہیں۔" اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو، جو قیام پاکستان کے بعد ہزاروں کی تعداد میں اس ملک سے چلے گئے، اس کے بارے میں کس نہج پر سوچ رہے تھے۔

تقسیم کے ساتھ ہی پورے ہندوستان خصوصاً مشرقی پنجاب، دہلی، کلکتہ، حیدر آباد اور کشمیر میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جانے لگی۔ پاکستان کے کٹر مخالف مولانا آزاد نے بھی اپنی کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ آزادی کے دوسرے دن ہی ہندوستان کی کابینہ کو یہ تعجب خیز اطلاعات موصول ہوئیں کہ مشرقی پنجاب میں ہندو اور سکھ غنڈوں نے مسلمانوں کے دیہات پر حملہ کر دیا ہے۔ وہ گھروں کو آگ لگا رہے ہیں اور بے گناہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو تہہ تیغ کر رہے ہیں۔" آزاد نے لکھا ہے کہ مشرقی پنجاب کے وزرا بھاگم بھاگ دہلی آ رہے تھے۔ "ہم (حکومت ہندوستان) نے ان سے دریافت کیا کہ آپ نے فوج طلب کیوں نہ کی؟ انھوں نے مایوسانہ لہجے میں جواب دیا کہ پنجاب میں تعینات فوجوں پر سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور ان سے کسی خاص امداد کی توقع نہیں کی جا سکتی۔" مولانا آزاد ہندوستان کے دارالحکومت دہلی میں مسلمانوں کی حالت کا تذکرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں۔ "شہر (دہلی) میں قتل و غارت کا بازار گرم تھا ——— کچھ سکھوں نے دہلی میں قتل و غارت گری کے اس کھیل میں نمایاں حصہ لیا۔" مشرقی پنجاب کی طرح دہلی میں بھی ہندوستانی فوج نے بے گناہ مسلمانوں کی حفاظت کرنے سے انکار کر دیا۔ مولانا آزاد نے اس کا تذکرہ یوں کیا ہے "فوج کا رویہ بڑا تشویشناک تھا ——— دہلی میں موجود فوجیوں کی اکثریت سکھوں اور ہندوؤں پر مشتمل تھی۔" دہلی کے علاوہ نواحی علاقے قرول باغ، لودھی کالونی، سبزی منڈی اور صدر بازار

بھی فرقہ وارانہ فسادات کی لپیٹ میں آچکے تھے۔ "ان علاقوں میں مسلمانوں کی جان ومال کو زبردست خطرہ تھا ـــــ ایک مرحلے پر حالات اتنے بگڑ گئے کہ مسلمان رات کو سوتے تو انھیں یہ یقین نہیں ہوتا تھا کہ صبح کو وہ زندہ اٹھیں گے۔" مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میں فوجی افسروں کے ساتھ مسلمانوں کے دو علاقوں میں گیا۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان بالکل جی چھوڑ چکے ہیں اور بڑی بے چارگی کے عالم میں ہیں۔" دہلی میں امن وامان برقرار رکھنے کے لیے کئی مجسٹریٹوں کا تقرر کیا گیا۔ ان کے بارے میں مولانا آزاد نے تحریر کیا ہے "کہ مجھے یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ یہ انتخاب درست نہ تھا اور ان میں سے کئی مجسٹریٹ اپنے فرائض بجا طور پر انجام نہ دے سکے۔ بالآخر حکومت ہند نے فیصلہ کیا کہ دہلی کے مسلمانوں کو کیمپوں میں منتقل کر دیا جائے اور فوج کو ان کیمپوں کی حفاظت کا کام سونپا جائے۔ ان کیمپوں میں سے ایک کیمپ پرانے قلعے میں تھا۔ ہزاروں مسلمان قلعے میں پناہ گزیں تھے اور انھیں کم وبیش تمام جاڑے وہیں رہنا پڑا۔"[1]

۲۱ اگست کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن کراچی سے دہلی روانہ ہوئے تو ان کے ہمراہ ایلن کیمبل جانسن بھی تھے۔ اس سلسلے میں کیمبل جانسن نے لکھا ہے "جب ہم پنجاب کے سرحدی علاقوں پر سے گزرے تو ہم نے میلوں تک آگ اور دھوئیں کی صورت میں بدبختی کے بادل دیکھے۔"[2]

آزادی کے دو روز بعد دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم لیاقت علی خاں اور جواہر لال نہرو انبالہ اور امرت سر روانہ ہوئے۔ فرینک موریس اس دورے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ افسوسناک حالات دیکھ کر نہرو کو بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے کھل کر سکھوں کو برا بھلا کہا۔"[3]

---

[1] یہ حوالے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب انڈیا ونز فریڈم صفحات ۲۰۹ تا ۲۱۶ سے ماخوذ ہیں۔

[2] مشن ود ماؤنٹ بیٹن، صفحہ ۱۵۲

[3] جواہر لال نہرو۔ فرینک موریس، صفحہ ۴۲۱

۹ ستمبر کو گاندھی جی دہلی پہنچے اور انھوں نے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھی۔ فرینک موریس نے لکھا ہے کہ "شہر کے افسوسناک حالات دیکھ کر گاندھی جی بے چین ہو گئے۔"[1] اسی روز رات کو نہرو نے اہلِ ہند کے نام ایک نشری تقریر میں مذہبی جنونیوں سے کہا۔"گزشتہ چند روز میں میں نے پنجاب اور دہلی میں جو کچھ دیکھا ہے مجھے اس سے شدید اذیت پہنچی ہے ــــــ میں جس جگہ بھی گیا وہاں مجھے خوفناک ہتھیاروں سے لیس ہجوم نظر آئے جنھوں نے مجھے دیکھ کر گاندھی جی کی جے کے نعرے لگائے۔ میں ان لوگوں کی زبان سے یہ نعرے سُن کر شرم سے گڑ گیا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو قتل کر رہے ہیں، لوٹ مار کرتے پھر رہے ہیں اور آگ لگا رہے ہیں ــــــ اور یہ سب کچھ مہاتما گاندھی کے نام پر ہو رہا ہے۔" اسی رات گاندھی جی نے اپنی پرارتھنا میں کہا کہ میں مسلم پناہ گزینوں کے ایک کیمپ میں گیا تو پھٹے ہوئے کپڑوں میں ایک ضعیف مسلمان مرد اور اس کی بیوی میرے پاس آئے۔ دونوں کے ہاتھوں اور چہروں پر چاقو کے گہرے زخم تھے۔" انھیں دیکھ کر میں نے شرم سے سر جھکا لیا۔"

دہلی کے مسلمانوں کے مصائب کی یہ خبریں جب کراچی پہنچیں تو لوگوں کے دل ہل گئے۔ قائدِ اعظم، جن پر پاکستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے پہلے ہی بھاری ذمہ داریاں تھیں، یہ واقعات سُن کر تڑپ اُٹھے۔ کراچی کی خواتین میدان میں آگئیں۔ مس فاطمہ جناح ان کی قیادت کر رہی تھیں۔ ان خواتین نے دہلی کے کیمپوں میں ناگفتہ بہ حالت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے لیے کمبل اور گرم کپڑے جمع کیے۔ آن کی آن میں کپڑوں اور کمبلوں کے ڈھیر لگ گئے۔ دہلی سے پہنچنے والی اطلاعات کے مطابق ان لوگوں کو خوراک تک نصیب نہ تھی۔ مسلمانوں کے لیے کراچی سے کپڑے اور کھانا ہوائی جہازوں سے ہر روز دہلی پہنچنے لگا۔

---

[1] جواہر لال نہرو، فرینک موریس، صفحہ ۳۴۲

آزادی کا سورج طلوع ہوتے ہی جموں اور کشمیر کے مسلمانوں کے مصائب میں اضافہ ہو گیا۔
ستمبر کے اوائل میں مہاراجہ کشمیر نے مسلح افواج کے خصوصی اختیارات کا آرڈی نینس نافذ کیا۔
جس کے تحت فوج کو قانون شکنی کرنے اور بدامنی پھیلانے والوں کو موقع ہی پر گولی مارنے
کا اختیار دے دیا گیا۔ فوج کو یہ اختیار بھی تھا کہ اگر وہ کسی شخص کے متعلق سمجھے کہ وہ
بدامنی پھیلانے والا ہے تو اسے بھی گولی ماری جا سکتی ہے۔ یہ دراصل ریاست کے مسلمانوں
کی نسل کشی شروع کرنے کا ایک بہانہ تھا۔ اس آرڈی نینس کی آڑ میں فوج کے پانچ
بٹالین قتل و غارت گری اور مسلمانوں کو طرح طرح سے ایذا پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔
مجبور اور بے کس کشمیری مسلمانوں کے مصائب میں، مشرقی پنجاب سے کشمیر پہنچنے والے ہزاروں
انتہا پسند سکھوں اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے رضاکاروں کے ہاتھوں اور اضافہ ہوا۔
۲۰ ستمبر کو لدھیانہ اور امرت سر کے درمیان سکھوں کے جتھوں نے محکمہ دفاع کے عملے
اور ان کے خاندانوں کی دو سپیشل ٹرینوں پر حملہ کیا۔ جب یہ ٹرینیں لاہور پہنچیں تو اُن
میں ۲۵۹ آدمیوں کی لاشیں تھیں جن میں ۵۰ بچے اور ۲۹ عورتیں بھی شامل تھیں۔ دو
روز بعد بندوقوں اور ریوالوروں سے لیس پانچ ہزار سکھوں کے ایک جتھے نے امرت سر
کے مغرب میں تقریباً تین میل دُور، خالصہ کالج کے قریب پاکستان آنے والے مہاجرین
کی ایک گاڑی پر حملہ کیا۔ نہتے مسلمان کہاں تک مقابلہ کرتے۔ لاشوں کے انبار لگ گئے
شمار کرنے پر معلوم ہوا کہ دو ہزار مہاجرین ہلاک اور زخمی ہوئے۔ ۱۹ ستمبر سے ۲۲ ستمبر
تک دہلی اور لاہور کے درمیان پاکستان آنے والے مہاجرین کی چھ ٹرینوں پر حملہ کیا گیا اور
ہزاروں مسلمانوں کو تہ تیغ کر دیا گیا۔

ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے وحشیانہ اور بزدلانہ قتل عام اور مسلم خواتین کی
بے حرمتی کی خبروں سے پاکستان میں اشتعال پھیل رہا تھا اور پاکستان کے کچھ علاقوں میں
ہندوؤں کے خلاف بلوے شروع ہو گئے تھے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ سرحد کے دونوں طرف

آگ اور خون کے اس کھیل میں کتنے آدمی کام آئے تاہم ایک محتاط اندازے کے مطابق تقریباً دو لاکھ افراد مارے گئے۔ پاکستان آنے اور پاکستان سے جانے والے قافلے حفظ و امان کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے، فرینک موریس نے اس نقل مکانی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :۔ اسرائیلیوں کی نقلِ وطن کے بعد تاریخ نے نسلِ انسانی کو اتنے بڑے پیمانے پر نقل مکانی کرتے نہیں دیکھا جس پیمانے پر لوگوں نے جون ۱۹۴۷ء سے ۱۹۴۸ء کے اواخر تک پنجاب میں کی۔"[۱]

ہزاروں تباہ حال مہاجر کھوکھرا پار کے راستے پاکستان میں داخل ہو رہے تھے۔ اگرچہ قائدِ اعظم کی صحت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی تاہم ان کی خواہش تھی کہ مہاجر کیمپوں کے انتظامات کا جائزہ لینے کے لیے خود لاہور جائیں۔ انھیں یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ اپنے فرض کی ادائیگی سے کوتاہی برتیں جو انھیں تمام چیزوں سے زیادہ عزیز تھا یا اپنی صحت کی فکر کریں۔ انھوں نے ڈاکٹروں کا مشورہ نظر انداز کر دیا اور فرض کی ادائیگی کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے فردی کی حیثیت سے اپنے تمام حقوق قوم کے سپرد کر دیے تھے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں یعنی کراچی پہنچنے کے تقریباً ایک مہینے بعد، وہ کراچی سے لاہور روانہ ہوئے۔ وزیرِ اعظم حیدر آباد، میر لائق علی، قائدِ اعظم سے ملاقات کرنے دہلی سے لاہور آئے تھے۔ وہ لکھتے ہیں، مجھے معلوم ہوا کہ قائدِ اعظم کے ڈاکٹروں نے انھیں صرف چند لوگوں سے ملنے اور روزانہ ایک گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ میر لائق علی کو دن کے گیارہ بجے سے بارہ بجے تک ملاقات کا وقت ملا تھا اور اس کی بھی ڈاکٹروں نے اس صورت میں اجازت دی تھی کہ اس روز قائدِ اعظم اور کوئی کام نہیں کریں گے۔ یہ ملاقات جس میں حیدر آباد اور کشمیر کے سنگین مسئلوں پر غور کیا گیا، تین گھنٹے جاری رہی۔

---

[۱] جواہر لال نہرو۔ فرینک موریس۔ صفحہ ۳۲۷

قائدِ اعظم ایک بجے کھانا کھاتے تھے لیکن کھانے کا وقت گزرے ایک گھنٹہ ہو چکا تھا۔ لائق علی رقم طراز ہیں : بعد میں مجھے معلوم ہُوا کہ مجھ سے تین گھنٹے تک گفتگو کے بعد قائدِ اعظم بُری طرح نڈھال ہو گئے اور انھیں حرارت ہو گئی ۔ ان کا مزاج کئی روز تک ناساز رہا۔"

لاہور میں چند روز قیام کے بعد قائدِ اعظم کراچی واپس آ گئے اور کراچی میں تین ہفتے ٹھہرنے کے بعد اکتوبر کے آخر میں وہ پھر لاہور تشریف لے گئے ۔ پاکستان کا قیام ان کے نزدیک ان کی زندگی اور ان کے کام کے ایک مرحلے کی تکمیل اور دوسرے مرحلے کا آغاز تھا ۔ یہ مرحلہ پاکستان کو مضبوط اور مستحکم بنانا تھا ۔ ملک جس دَور سے گزر رہا تھا اس میں وہ اپنے فرائض سے کس طرح کوتاہی برتتے ۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی زندگی کی آخری سانس تک ملک کی خدمت کرتے رہے ۔

پاکستان میں یاس و ناامیدی پائی جاتی تھی اور وہ اسے مسرت و شادمانی میں تبدیل کرنے کے خواہاں تھے ۔ ۳۰ر اکتوبر ۱۹۴۷ء کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں ایک زبردست اجتماع سے خطاب کرتے ہُوئے قائدِ اعظم نے فرمایا "ممکن ہے کچھ لوگ یہ سوچتے ہوں کہ مسلم لیگ نے تین جون کا منصوبہ منظور کر کے غلطی کی ہے ۔ میں ان لوگوں کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ کسی دیگر متبادل تجویز کے نتائج قیاس سے بھی زیادہ تباہ کن ہوتے ——— تاریخ اور وقت ثابت کر دے گا کہ مسلم لیگ نے درست اقدام کیا یا نہیں ۔ تاریخ ان لوگوں کے بارے میں بھی فیصلہ کرے گی جن کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کے نتیجے میں برِّصغیر میں بدامنی اور انتشار پھیلا ، ہزاروں لوگوں کو طرح طرح کے مصائب کا سامنا کرنا پڑا اور انھیں اپنے گھر بار ، اپنی املاک غرض کہ ہر چیز کو خیر باد کہنا پڑا ۔ نہتے عوام کو جس منظم طریقے سے قتل کیا جا رہا ہے اسے دیکھ کر ہلاکو اور چنگیز کی روحیں بھی شرما رہی ہیں ۔

---

۵ تریبندی آف حیدرآباد ، میر لائق علی صفحہ ۱۰ ، مطبوعہ ۱۹۶۲ء پاکستان کوآپریٹو بک سوسائٹی لمیٹڈ کراچی

ہم ایک سوچی سمجھی اور منظم سازش کا شکار ہوئے ہیں اور اس سازش کو تیار کرتے وقت دیانت داری، جرأت و بہادری اور احترام کے ابتدائی اصولوں کو بھی نظر انداز کر دیا گیا۔ ہم خدا کے حضور سربسجود ہیں کہ اس نے ہمیں ان مصائب کا مقابلہ کرنے کی ہمت عطا فرمائی۔ اگر ہم قرآن پاک کو رہنما بنائیں تو یقین کیجیے کہ آخری فتح ہماری ہی ہوگی۔"

قائدِ اعظم جس وقت تقریر کر رہے تھے، شدتِ جذبات سے ان کی زبان سے پورے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ انھوں نے کسی جلسۂ عام میں موت کا ذکر کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ "اپنا حوصلہ بلند رکھیے، موت سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ہمارے مذہب نے ہمیں بتایا ہے کہ ہم سفرِ آخرت کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ ہمیں حوصلے اور جرأت کے ساتھ موت کا سامنا کرنا چاہیے تاکہ پاکستان اور اسلام کے ناموس کی حفاظت کی جا سکے۔ مسلمان کے لیے شہادت سے بڑھ کر کوئی رتبہ نہیں ——— اپنا فرض انجام دیجیے اور خدا پر کامل اعتقاد رکھیے۔ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کا وجود ختم نہیں کر سکتی۔ پاکستان ہمیشہ قائم رہے گا۔"

وہ سربراہِ مملکت کی حیثیت سے بے خانماں مہاجرین کے لیے جو کچھ کر سکتے تھے انھوں نے اس سے دریغ نہیں کیا اور پوری طرح مطمئن ہونے کے بعد وہ کراچی واپس تشریف لائے۔ ان حالات سے نہ صرف ان کی روح کو شدید اذیت پہنچی تھی بلکہ ان کی جسمانی صحت بھی متاثر ہوئی۔ ایک بار پھر وہ علیل ہو گئے۔ تکان اور بخار نے انھیں مکمل آرام کرنے پر مجبور کر دیا۔ دریں اثنا اس نئے ملک کی حکومت کے جملہ امور اور کاروبار میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا۔ فائلوں کے انبار لگتے جا رہے تھے۔ وزیر اور سیکرٹری ان سے مشورہ لینے حاضر ہوتے اور انھیں آرام اور سکون کا کوئی لمحہ میسر نہ آتا۔

کئی ہفتے تک مسلسل محنت کرنے کے بعد انھیں ڈاکٹروں کی التجا پر چند روز آرام کرنا ہی پڑتا۔ انھوں نے سرحدی صوبے کے عوام سے وعدہ کیا تھا کہ وہ صوبے کے

عوام کا ذاتی طور پر شکریہ ادا کرنے خود پشاور آئیں گے کہ انھوں نے رائے شماری میں اپنا حق ادا کر دیا تھا۔ قائداعظم سرحد کے عوام کو مایوس کرنا نہیں چاہتے تھے اور اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے اپریل ۱۹۴۸ء میں پشاور گئے اور ۱۲/اپریل کو اسلامیہ کالج کے طلباء سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے اس کا احساس ہے کہ حصولِ پاکستان کی تحریک کے سلسلے میں طلبہ بالخصوص اس صوبے کے طلبہ نے انتہائی اہم کردار انجام دیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پچھلے سال اس صوبے کے عوام نے رائے شماری میں پاکستان سے الحاق کا جو فیصلہ کیا تھا وہ طلبہ کی پُرخلوص کوششوں کے بغیر شاید مکمل نہ ہوتا۔ مجھے خاص طور سے اس بات پر فخر ہے کہ اس صوبے کے عوام کبھی بھی اور کسی طرح بھی، جدوجہد آزادی اور حصولِ پاکستان کی کوششوں میں دوسروں سے پیچھے نہیں رہے۔"

دوسرے دن وہ رسالپور روانہ ہوئے جہاں انھیں رائل پاکستان ائیر فورس کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرنا تھا۔ تقسیم کے وقت جو فوجی سامان پاکستان کے حصے میں آیا تھا اسے ہندوستان نے روک رکھا تھا اور ہماری فضائیہ کے پاس مناسب ہوائی جہاز اور دیگر ساز و سامان موجود نہ تھا۔ قائداعظم نے فضائیہ کے افسروں اور جوانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "مجھے یہ بھی علم ہے کہ آپ کے پاس ہوائی جہاز اور فوجی سامان نہیں ہے لیکن ضروری سامان خریدنے کی کوشش کی جا رہی ہے اور جدید طرز کے ہوائی جہازوں کے لیے آرڈر دے دیا گیا ہے۔ لیکن اگر فضائیہ میں مل جل کر کام کرنے اور نظم و ضبط کا فقدان ہو تو ہوائی جہازوں کی تعداد اور کثیر عملے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یاد رکھیے کہ صرف نظم و ضبط اور خود اعتمادی ہی کے ذریعے رائل پاکستان ائیر فورس، پاکستان کے لیے موجبِ فخر بن سکتی ہے۔"

۱۴/اپریل کو انھوں نے گورنمنٹ ہاؤس پشاور میں سول افسروں کا ایک اجلاس طلب کیا۔ انھوں نے کئی افسروں سے ملاقات کی اور ان سے بے تکلفی سے بات چیت کی۔

فسروں سے باتیں کرتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا "پہلی بات جو میں آپ سب کو بتا دینا
اہتا ہوں یہ ہے کہ آپ کسی سیاسی پارٹی یا کسی فرد کے سیاسی دباؤ میں نہ آئیں۔ اگر آپ
کستان کے وقار اور عظمت میں اضافے کے خواہاں ہیں تو کسی دباؤ کو قبول نہ کیجیے بلکہ عوام
ر مملکت کے خادموں کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کرتے رہیئے —— بے خوفی اور دیانت داری
ہ ساتھ۔ سول سروس مملکت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ حکومتیں بنتی بگڑتی رہتی ہیں، وزرائے
عظم اور وزرا آتے جاتے رہتے ہیں لیکن آپ اپنی جگہ پر موجود رہتے ہیں اور بنا بریں آپ
کے کاندھوں پر عظیم ذمہ داریاں ہیں۔ آپ کو سیاسی دھڑے بندیوں سے بالکل الگ رہنا
اہیئے۔ آپ کسی سیاسی لیڈر کے کہنے میں نہ آئیں —— آئین کے مطابق جو حکومت بنے
ر جو وزیراعظم یا وزیر برسراقتدار آئیں آپ کا فرض ہے کہ نہ صرف اس کے وفادار رہیں
ہ بے خوف ہو کر اپنی شہرت، وقار، عزت اور اپنی سروس کی دیانت کے اصولوں کے مطابق
پنا فرض انجام دیں۔ اگر آپ اس عزم کے ساتھ کام کرتے رہیں گے تو اس طرح پاکستان کو
ارے تصور کے مطابق عظیم تر اور مستحکم تر بنانے میں مدد ملے گی اور ہمارا یہ خواب مکمل
و جائے گا کہ اس ملک کو ایک شاندار ملک اور دنیا کی عظیم قوموں کے ہم رتبہ بنایا جائے۔
پ کو یہ تمام باتیں بتاتے وقت میں اس ملک کے لیڈروں اور سیاستدانوں پر بھی واضح
دینا چاہتا ہوں کہ انھوں نے اگر کبھی آپ کے فرائض میں مداخلت کرنے یا آپ پر دباؤ
لنے کی کوشش کی تو اس سے ملک کو نقصان پہنچے گا کیونکہ اس سے بدعنوانی، رشوت ستانی
ر اقربا پروری جیسی لعنتیں فروغ پائیں گی —— جو نہ صرف آپ کے صوبے بلکہ دوسرے
وبوں کو بھی نقصان پہنچا رہی ہیں —— ممکن ہے آپ میں سے کچھ لوگ، وزرا کی
اہشات پوری نہ کرنے پر ان کے عتاب کا شکار ہو جائیں —— خدا کرے ایسا نہ ہو
یکن پھر بھی یہ امکان ہے کہ آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑے، اس لیے نہیں کہ آپ
ئی غلط کام کر رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ آپ اپنے فرائض دیانت داری سے انجام دے

رہے ہیں۔"

چند روز بعد انھوں نے ایڈورڈز کالج پشاور کے طلبہ سے خطاب کیا۔ انھوں نے اس زمانے کا ذکر کیا جب ۱۹۳۷ء میں ان کے لیے اس صوبے میں کوئی جگہ نہ رہی تھی انھوں نے صوبہ سرحد میں مسلم لیگ کی شکست کا ذکر کیا اور پھر گزشتہ دو تین برسوں میں تبدیل ہونے والے حالات بیان کیے۔

انھوں نے بہادر پٹھانوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے بھاری اکثریت سے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا تھا۔ انھوں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ آپ ایک آزاد اور خود مختار ملک کے باشندوں کی حیثیت سے سربلند رہیں۔ اگر آپ کی حکومت اچھے کام کرتی ہے تو اس کی تعریف کیجیے اور اگر آپ کو اس سے شکایت ہے تو بے خوف ہو کر اس پر نکتہ چینی کیجیے ——— میں صحیح کہتا ہوں کہ اگر حکومت کوئی غلطی کرے تو اس پر کسی ڈر اور خوف کے بغیر نکتہ چینی کیجیے۔ میں نکتہ چینی کا خیر مقدم کرتا ہوں ——— اس طرح آپ اپنے ملک کے عوام کے حالات بہتر بنانے میں مدد دیں گے۔"

قائداعظم ایک جلسۂ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ بادل چھا گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بوندا باندی ہونے لگی ——— بارش تیز ہو گئی مگر حاضرین میں سے ایک شخص نے بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کی۔ خود قائداعظم بھی شرابور ہو گئے تھے وہ بھی اپنی نشست پر بیٹھے رہے۔

"تکان اور کثرتِ کار کے سبب قائداعظم ڈاکٹروں کے کہنے پر جون میں کراچی سے کوئٹہ روانہ ہو گئے تاکہ کچھ روز آرام کر سکیں۔ اگرچہ وہ آرام کرنے گئے تھے تاہم انھوں نے حکم دے رکھا تھا کہ ضروری فائل ان تک پہنچتے رہیں۔

اکثر وہ کوئٹہ کے مختلف طبقوں کی طرف سے استقبالیہ دعوتوں میں شرکت قبول کر لیتے۔ مقصد یہ ہوتا کہ اس طرح ملک کو درپیش مسائل کے بارے میں وہ اپنی رائے کا

اظہار کر سکیں۔ کوئٹہ کے پارسی فرقے کی ایک دعوت میں سپاسنامے کا جواب دیتے ہوئے قائداعظم نے فرمایا۔ اس وقت جو حالات ہیں ان کے مطابق پاکستان کے نئے آئین کی ترتیب و تشکیل میں ڈیڑھ دو سال کا وقت لگے گا۔ ــــــــــ انھوں نے پاکستان میں اقلیتوں کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ اور فرمایا۔ "آپ جانتے ہیں کہ میری حکومت اور خود میری پالیسی یہ ہے کہ رنگ یا نسل کے کسی امتیاز کے بغیر ہر فرقے کی جان، مال اور آبرو کا تحفظ کیا جائے اور یہ کہ پاکستان میں امن رہے اور ہر قیمت پر امن و امان برقرار رکھا جائے۔"

اگلے دن انھوں نے سٹاف کالج کوئٹہ کے عملے سے خطاب کیا اور پُرزور الفاظ میں کہا۔ "ایک بات اور یاد رکھیے۔ میں یہ کہنے پر مجبور ہوں، کیونکہ کچھ اعلیٰ افسروں سے بات چیت کے دوران میں نے محسوس کیا کہ ہماری فوجیں جو حلف اُٹھاتی ہیں وہ اس کے معنی و مفہوم سے باخبر نہیں ہوتیں۔ اس میں شک نہیں کہ یہ حلف ایک ضابطے کی کارروائی ہے لیکن اہم بات حقیقی جذبہ اور دل ہے۔ اس موقع پر میں خود پڑھ کر آپ کو یہ حلف یاد دلاتا ہوں۔ میں صدقِ دل سے عہد کرتا ہوں اور خدا کو گواہ بناتا ہوں کہ میں پاکستان کے آئین اور پاکستان کا وفادار رہوں گا (آئین اور مملکتِ پاکستان کی حکومت سے کے الفاظ پر غور کیجیے) اور یہ عہد کرتا ہوں کہ میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے دوران پوری دیانت کے ساتھ پاکستان ڈومینین کی افواج میں خدمات انجام دوں گا اور اپنے فرض کی ادائیگی کے لیے ہوائی جہاز، خشکی کے راستے یا سمندری جہاز سے ہر جگہ جانے کو تیار ہوں گا اور یہ کہ میں اپنے افسر کے تمام احکامات پر پوری طرح عمل کروں گا ــــــــــ جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے اصل چیز جذبہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ ملک کے موجودہ آئین کا مطالعہ کریں اور یہ کہتے وقت کہ آپ مملکت کے آئین کے وفادار رہیں گے۔ آئین کی تمام پیچیدگیوں کو مدِّنظر رکھیں۔"

۱۵ تاریخ کو کوئٹہ میونسپلٹی کی ایک استقبالیہ دعوت میں سپاسنامے کے جواب میں قائداعظم نے فرمایا، "مجھے یہ دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے کہ پاکستانیوں میں صوبائی عصبیت کا زہر موجود ہے۔ انھوں نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ یہ بھول جائیں کہ وہ بلوچی، پٹھان، سندھی، پنجابی اور بنگالی ہیں بلکہ خود کو اوّل و آخر صرف پاکستانی سمجھیں۔ آخر میں انھوں نے کہا، "اس میں شک نہیں کہ نمائندہ حکومت اور نمائندہ ادارے بڑی اچھی چیزیں ہیں لیکن لوگ ان چیزوں کو اگر ذاتی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنالیں تو نہ صرف ان اداروں کی حیثیت پر حرف آتا ہے بلکہ یہ امر باعث رُسوائی بھی ہے۔ ہمیں اس سے گریز کرنا چاہیئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب (جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے) ہم اپنے ہر فعل کو اچھی طرح کسوٹی پر پرکھ کر یہ دیکھیں کہ ہمارا یہ فعل ذاتی یا کسی طبقے کے فائدے کے لیے نہیں بلکہ ملک کے مجموعی فائدے کے لیے ہے۔"

قائداعظم نے یکم جولائی ۱۹۴۸ء کو کراچی میں اسٹیٹ بنک آف پاکستان کا افتتاح کرنے کی دعوت قبول کر لی تھی، اگرچہ ان کی صحت اس بات کی اجازت نہ دیتی تھی تاہم اس موقع پر ان کی تقریر کے پہلے جملے ہی سے واضح ہو گیا کہ انھوں نے کن اسباب کی بنا پر اس تقریب میں شرکت کی۔ انھوں نے فرمایا، "سٹیٹ بنک آف پاکستان کے افتتاح سے مالی امور میں ہماری مملکت کی خودمختاری کا باب شروع ہوتا ہے۔۔۔ ــــ

شہرگو، نہ جیسا کہ آپ نے فرمایا ہے غیر منقسم ہندوستان میں غیر مسلموں نے بنکاری کو اپنی اجارہ داری بنا رکھا تھا اور مغربی پاکستان سے ان کے ترکِ وطن کرنے کے بعد ہماری نئی مملکت کی اقتصادی زندگی کافی متاثر ہوتی ہے۔ تجارت و صنعت کی اطمینان بخش ترقی کے لیے یہ ضروری ہے کہ غیر مسلموں کے ترکِ وطن سے پیدا ہونے والے خلا کو ایک لمحہ ضائع کیے بغیر پر کیا جائے۔ قیمتوں میں اضافے سے غریبوں پر کافی اثر پڑا ہے۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کی آمدنی محدود ہے اور ملک میں اس وقت جو بے چینی پائی

جاتی ہے ۔ بڑی حد تک اس کا سبب قیمتوں میں اضافہ ہے ۔ حکومتِ پاکستان کی پالیسی یہ ہے کہ قیمتوں کو اس حد تک متوازن رکھا جائے کہ کارخانے داروں کو مناسب منافع مل سکے اور صارفین پر بھی بوجھ نہ پڑے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "

ہم میں سے جن لوگوں نے قائدِ اعظم کی یہ تقریر سنی انھوں نے بخوبی محسوس کیا کہ قائدِ اعظم کی طبیعت ناساز ہے ۔ ان کی آواز بمشکل سنائی دیتی تھی ۔ تقریر کے دوران میں وہ بار بار کھانس رہے تھے اور اکثر انھیں سانس لینے کے لیے رُکنا پڑتا تھا لیکن جسمانی کمزوری کے باوجود ان کے عزم و استقلال میں کوئی فرق نہ آیا تھا ۔

کراچی میں انھیں چند انتہائی اہم کاغذات دیکھنے تھے ۔ پانچ روزہ قیام کے بعد وہ پھر کراچی سے کوئٹہ تشریف لے گئے ۔ لیکن کوئٹہ میں بھی چین سے نہ بیٹھے ۔ مختلف اداروں کی طرف سے دعوت نامے چلے آرہے تھے اور بہت سے افراد اور لیڈران سے ملاقات کے خواہاں تھے ۔ انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ صحت خراب ہونے کی وجہ سے لوگوں کو مایوس ہونا پڑتا ہے ۔

دریں اثنا حیدرآباد پر ہندوستان کے حملے کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا اور میر لائق علی یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہندوستان نے اگر ریاست پر حملہ کیا تو حکومت پاکستان کا رویہ کیا ہوگا ؟ وہ اپنی جان خطرے میں ڈال کر کراچی پہنچے ۔ انھوں نے اپنی پرواز کے بارے میں لکھا ہے کہ راستے میں ان کے جہاز پر اِکا دُکا ہوائی جہازوں نے حملہ کیا مگر وہ بچتے بچاتے کراچی پہنچ گئے تاکہ کوئٹہ جا کر قائدِ اعظم سے گفتگو کر سکیں ۔ قائدِ اعظم کی طبیعت بہت خراب تھی ۔ میر لائق علی رقم طراز ہیں " میں گیارہ بجے (دن) سے ذرا پہلے کوئٹہ پہنچا ۔ مجھ پر ایک ایک لمحہ قیامت تھا ۔ ایک بجے میں نے کھانا کھایا ۔ میں بیشتر اوقات مس فاطمہ جناح سے گفتگو کرتا رہا تھا اور مجھے امید تھی کہ قائدِ اعظم کی طبیعت جلد ہی سنبھل جائے گی اور مجھے چند لمحے ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل سکے گا ۔ مس جناح

بار باران کے کمرے میں تشریف لے جاتیں اور ہر بار ان کا جواب یہی ہوتا کہ قائدِ اعظم کی طبیعت بدستور خراب ہے۔ آخر کار انھوں نے قائدِ اعظم کو اطلاع دی کہ میں کوئٹہ آیا ہوں اور بڑی دیر سے حاضر ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ مس جناح نے مجھے بتایا کہ اس پر قائدِ اعظم نے بمشکل ہاتھ کے اشارے سے مس جناح کو بتایا کہ انھیں شدید تکلیف ہے۔" قائدِ اعظم سے ملاقات کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجبوراً میر لائق علی کراچی واپس آئے اور لیاقت علی خاں، ظفر اللہ خان اور غلام محمد سے ملاقات کی۔ میں نے انھیں بتایا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح کس قدر علیل ہیں۔ وہ سب متعجب نظر آتے تھے۔ میں زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتا تھا کہ انھیں سنگین اور تشویشناک حالات سے باخبر کر دوں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ تار دے کر لندن سے کسی ماہر خصوصی کو بلایا جائے۔[۱] قائدِ اعظم کی حالت سنگین صورت اختیار کر گئی تھی اور ان کے معالج پریشان تھے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ قائدِ اعظم کو کوئٹہ سے چند میل دور زیارت منتقل کر دیا جائے جو نسبتاً زیادہ سرد مقام تھا اور جہاں ان کو زیادہ آرام و سکون مل سکتا تھا۔ زیارت میں قائدِ اعظم کا قیام ریزیڈنسی میں تھا۔ یہ پرانے طرز کی ایک خوب صورت دو منزلہ عمارت تھی اور ایک پہاڑی پر کسی سنتری کی طرح سینہ تانے کھڑی تھی۔ عمارت کے احاطے میں کشادہ سبزہ زار اور پائیں باغ تھا اور ساری عمارت پھولوں کے پودوں اور پھل دار درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ قائدِ اعظم کے ایک اے ڈی سی لفٹننٹ مظہر احمد نے لکھا ہے "یہاں نہ تو کراچی کی جھلسا دینے والی گرمی تھی اور نہ گورنر جنرل ہاؤس کے ضابطے۔ یہاں گورنر جنرل محض قائدِ اعظم تھے اور قائدِ اعظم تعطیلات میں مصروف ایک عام شخص۔ نشست کے کمرے میں لطیفے اور قصے کہانیاں ہوتیں۔ مباحثوں کی محفل گرم ہوتی اور اے ڈی سی

---

[۱] ٹریجڈی آف حیدرآباد۔ میر لائق علی۔ صفحہ ۲۵۸۔ مطبوعہ ۱۹۶۲ء

بھی گفتگو میں شریک ہوتے۔"

لفٹننٹ مظہر احمد کے بیان کے مطابق زیارت میں قیام کے ابتدائی دنوں میں قائداعظم بڑے خوش وخرم تھے۔ "وہ (قائداعظم) بڑے بذلہ سنج تھے اور کسی موقع پر نہ چوکتے۔ ایک مرتبہ وہ جگہوں شملہ کے دورے کا حال بتا رہے تھے۔ انھوں نے بندروں کا ذکر کیا جو اس علاقے میں ہر طرف پائے جاتے ہیں۔ قائداعظم نے ایک طرف کچھ مونگ پھلیاں پھینکیں لیکن انھیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ایک بھی بندر اس طرف متوجہ نہیں ہوا۔ اتنے میں ایک درخت سے ایک موٹا تازہ بندر اترا جسے دیکھ کر تمام بندر راستے سے ہٹ گئے اور ایک قطار میں خاموش کھڑے ہو گئے۔ یہ موٹا تازہ بندر، ان بندروں کا لیڈر تھا اور دوسرے بندر اس کا اتنا ادب اور احترام کرتے تھے کہ اس کی موجودگی میں نظم وضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیتے ——— بندروں تک میں نظم وضبط موجود ہے۔"

ایک روز لفٹننٹ احمد سے باتیں کرتے ہوئے قائداعظم نے ہندوستان میں مسلمان مردوں، عورتوں اور بچوں کے قتل عام پر گہری تشویش ظاہر کی۔ انھوں نے فرمایا "مسلمانوں کے خلاف یہ وحشیانہ طرزِ عمل جنگ سے کم نہیں ——— یہ جنگ کسی اعلان کے بغیر بھرپور طریقے پر ہم پر مسلط کی گئی ہے ——— میں یہ تو سمجھتا ہوں کہ ہندو مجھے قتل کرنا کیوں چاہتے تھے؟ یہی نا کہ میں ان کے لیے پاکستان تھا اگر میں ختم ہو جاتا تو پاکستان ختم ہو جاتا ——— لیکن ایک ایسے کنویں میں زہر ڈال دینے کا مقصد سمجھ میں نہیں آتا جس سے اس اسپتال کو پانی سپلائی کیا جاتا ہے جہاں وحشیانہ اور ظالمانہ طرزِ عمل کے شکار بچوں اور عورتوں کا علاج ہو رہا ہے ——— یہ انسانیت نہیں، یہ حرکتیں تو درندوں کو بھی زیب نہیں دیتیں۔"[1]

---

[1] مندرجہ بالا اقتباسات "ڈان" کراچی سے ماخوذ ہیں۔

زیارت میں قائدِ اعظم کے ذاتی عملے کے ایک اور رکن فرخ امین نے "ڈان" میں لکھا تھا کہ "ان دنوں میں قائدِ اعظم کو اکثر و بیشتر رات سے گئے تک کمرے میں ٹہلتا ہوا دیکھتا۔" زیارت میں جو لوگ قائدِ اعظم سے قریب تھے انھیں اس کا احساس تھا کہ ان کی صحت خراب ہوتی جا رہی ہے۔ لفٹننٹ احمد اس سلسلے میں رقم طراز ہیں، مس فاطمہ جناح جو برسوں سے قائدِ اعظم کی واحد رفیق و غمگسار تھیں اور پاکستانی عوام کی طرح جنھیں قائدِ اعظم سے غیر معمولی انس تھا، ان کی علالت کے ایام میں جس طرح ان کی تیمارداری اور خدمت کر رہی تھیں وہ ایک بہن ہی کا حصّہ ہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ وہ قائدِ اعظم کی دیکھ بھال میں یا ان سے باتیں کرتے اور انھیں کچھ پڑھ کر سناتے ہوئے کئی کئی راتیں جاگ کر گزار دیتیں۔ قائدِ اعظم کو اپنی بہن سے جس قدر محبت تھی، بہن نے بھی اس کا حق ادا کر دیا۔" مس فاطمہ جناح قائدِ اعظم کو پیار سے "جن" کہتیں لیکن وہ انھیں فاطمہ ہی کہا کرتے۔" لفٹننٹ احمد آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "آخری دنوں میں قائدِ اعظم نے غیر ملکی کپڑا خریدنا ترک کر دیا تھا۔ اب وہ ملکی کپڑا خریدتے، اگرچہ یہ اتنا عمدہ نہ تھا۔ مس جناح بھی کوئٹہ کے ہینڈلوم کے کارخانوں میں جایا کرتی تھیں۔"

قائدِ اعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری ایس ایم یوسف کو، جو ایامِ علالت میں ان کے پاس تھے بخوبی معلوم تھا کہ یہ علالت کس قدر تشویشناک ہے "لیکن علالت اور خرابیِ صحت قائدِ اعظم کے فرائض کی ادائیگی میں حارج نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ آخر دم تک اپنا فرض ادا کرتے رہے اور انتقال کے وقت تک مملکت کے اہم امور کی انجام دہی میں مصروف رہے۔[1]"

صالح محمد زیارت ریزیڈنسی کا مالی تھا۔ ہر روز صبح کے وقت وہ گلدانوں کے لیے پھول لے کر قائدِ اعظم کے کمرے میں حاضر ہوتا۔ صالح محمد نے زیارت میں قائدِ اعظم کے قیام کے

---

[1] ماخوذ از ڈان کراچی

بارے میں یونس ایم سعید کو بتایا کہ قائدِاعظم کو کارنیشن اور گلاب سے عشق تھا" لیکن انھوں نے کبھی اپنے کوٹ کے کالر میں کوئی پھول نہیں لگایا" زیارت میں قائدِاعظم کے معمولات کے بارے میں صالح محمد نے بتایا "روزانہ ان کے لیے لان میں میز اور کرسی لگائی جاتی اور وہ وہاں بیٹھ کر کام کرتے، روانگی سے صرف چند روز پہلے ان کے اس معمول میں فرق آیا۔ وہ ریزیڈنسی کی عمارت سے پیراکی کے تالاب تک دو فرلانگ لمبے راستے پر چہل قدمی کیا کرتے تھے اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے، انھیں صنوبر کے درخت اور جنگلی پھول بہت پسند تھے۔ پیراکی کے تالاب پر وہ تھوڑی دیر آرام کرتے اور واپس آجاتے۔ صبح ہو یا شام، کافی دنوں تک ان کا یہی معمول رہا۔ اس موقع پر میں ان کی خدمت میں حاضر رہتا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک قدرتی اور ناقابلِ فراموش تبسم ہوتا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی انھیں مسکراتے نہ دیکھا ہو۔ ان دنوں میں بھی ان کے چہرے پر میں نے یہ تبسم دیکھا ہے جب وہ شدید علیل تھے ـــــ ان دنوں وہ بے حد کمزور ہوگئے تھے لیکن وہ ایک بہادر شخص تھے اور شدید علالت کے دنوں میں بھی وہ ایک لمحے کے لیے مایوس نہ ہوتے" پھر جس روز قائدِاعظم کوئٹہ روانہ ہو رہے تھے، میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ انھیں سلام بھی کرلوں اور جی بھر کے دیکھ بھی لوں۔ انھوں نے مجھے دیکھا تو فرمایا کہ صالح محمد تم میرے ساتھ کوئٹہ چلو، وہاں سے واپس آجانا۔"

قائدِاعظم کی علالت زیادہ تشویشناک ہوئی تو ممتاز معالج کرنل الٰہی بخش کو جولائی کے آخر میں زیارت طلب کیا گیا۔ جسمانی کمزوری کے باوجود قائدِاعظم چاق و چوبند تھے۔ ان کی طبیعت کی جولانی میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کئی معرکے سر کیے تھے اور اب پورے اعتماد کے ساتھ صحت کی خرابی کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اس سلسلے میں فرخ امین نے ڈان میں لکھا تھا کہ ہم نے قائدِاعظم کو کئی بار علالت کا مقابلہ کرتے اور بالآخر صحتیاب ہوتے دیکھا تھا۔ وہ زبردست قوتِ ارادی کے مالک تھے اور یہی سبب تھا کہ محض اپنے ارادے

کے سبب وہ علالت پر قابو پا لیتے۔" انھوں نے تمام عمر ایک اعلیٰ و ارفع نصب العین کے حصول کی جد وجہد کی تھی اور وہ اس جد وجہد کے انجام کو شکست کی صورت میں قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ وہ بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر وقت اور خرابیِ صحت مانع تھی۔ بہرحال انھوں نے ایک چراغ روشن کر دیا تھا اور ان کی خواہش تھی کہ دن کا اجالا پھیلنے تک یہ چراغ یوں ہی روشن رہے۔

کرنل الٰہی بخش نے اپنے مریض کا معائنہ کیا، جس کی صحت اور زندگی انتہائی قیمتی تھی۔ ان کے خون کا معاینہ بھی کیا جانا تھا۔ اگلے روز کوئٹہ کے سول سرجن ڈاکٹر صدیقی اور پیتھالوجسٹ ڈاکٹر محمود ضروری سامان لے کر کوئٹہ سے زیارت پہنچے۔ تفصیلی معاینے سے معلوم ہوا کہ قائدِ اعظم کے پھیپھڑوں پر ورم ہے اور وہ تقریباً دو سال سے اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ اس پر قائدِ اعظم نے تعجب کا اظہار کیا کیونکہ وہ گزشتہ تیس برس سے روزانہ بارہ گھنٹے کام کرتے رہے تھے اور کبھی کوئی شدید تکلیف محسوس نہ کی تھی۔ یہ اور بات تھی کہ ڈاکٹروں کی ہدایت کے باوجود انھوں نے کبھی آرام نہیں کیا۔

ڈاکٹروں کے سخت اصرار پر بالآخر انھیں یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ وہ گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی فی الحال ملتوی کر دیں گے۔ ان کو امید تھی کہ جلد ہی وہ صحت یاب ہو جائیں گے اور پاکستان کی تاریخ کے اس دشوار مرحلے میں اس ملک کے مسائل سے عہدہ برآ ہو سکیں گے۔ کسی ملاقاتی کو ان کے کمرے میں داخل ہونے کی اجازت نہ تھی لیکن واشنگٹن میں پاکستان کے سفیر اور قائدِ اعظم کے رفیق ایم، اے، ایچ اصفہانی زیارت ریزیڈنسی پہنچے تو انھیں قائدِ اعظم سے ملاقات کی اجازت دے دی گئی۔ اصفہانی صاحب تقریباً آدھے گھنٹے تک قائدِ اعظم سے گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے محسوس کیا کہ یہ عظیم رہنما جس کی ذات برصغیر کے مسلمانوں کے لیے طمانیت کا باعث ہے، حقیقتاً شدید علیل ہے۔ انھوں نے عرض کیا اگر ضرورت ہو تو امریکہ سے کوئی معالج خصوصی یا کوئی دوا

بھیج دی جائے ـــــ اور بوجھل قدموں کے ساتھ اصفہانی صاحب، قائدِ اعظم کے کمرے سے باہر آگئے۔

دریں اثنا ڈاکٹر الٰہی بخش کی درخواست پر ڈاکٹر ریاض علی شاہ، ایکسرے سپشلسٹ ڈاکٹر عالم اور ریڈیالوجسٹ ڈاکٹر غلام محمد ایکس رے کا سامان لے کر لاہور سے زیارت پہنچے۔ مزید معاینے سے ڈاکٹر الٰہی بخش کی تشخیص کی تصدیق ہو گئی۔

جولائی کے آخر میں لیاقت علی خاں اور کابینہ کے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی زیارت گئے۔ قائدِ اعظم کو اطلاع دی گئی تو انھوں نے وزیرِ اعظم کو فوراً طلب فرمایا۔

پاکستان کی آزادی کی پہلی سالگرہ (۱۴ اگست ۱۹۴۸ء) قریب آ رہی تھی اور ڈاکٹروں کی ہدایت کے برعکس قائدِ اعظم قوم کے نام پیغام کی تیاری میں مصروف تھے۔ یومِ آزادی پر یہ پیغام جاری کیا گیا۔ قائدِ اعظم نے اس پیغام میں فرمایا تھا "یاد رکھیے، پاکستان کا قیام ایک ایسی حقیقت ہے جس کی دنیا کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے ـــــ مجھے اپنے عوام پر پورا اعتماد ہے ـــــ ہمارے دشمن اس ملک کی تخلیق کے وقت ہی سے اس کا نام و نشان مٹا دینے کے درپے ہیں اور اپنی کوششوں میں ناکام ہونے کے بعد اب وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری اقتصادی مشکلات سے ان کی تمنا پوری ہو جائے گی۔ ہمارے بدطینت دشمن ہانگ ڈہل یہ کہتے پھرتے کہ پاکستان دیوالیہ ہو جائے گا اور پاکستان کی اقتصادی بدحالی سے ان کے دل کی کلی کھل اُٹھے گی۔ لیکن دشمنوں کی یہ تمنا پوری نہ ہو سکی۔ ہمارا پہلا بجٹ، بچت کا بجٹ تھا۔ تجارت میں خوشگوار توازن موجود ہے اور اقتصادی شعبے میں حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔"

چند روز بعد ڈاکٹروں کو پتہ چلا کہ قائدِ اعظم کا بلڈ پریشر خاصا گر گیا ہے اور ان کے پاؤں پر ورم ہے۔ ڈاکٹروں نے آپس میں صلاح مشورے کیے اور طے کیا گیا کہ اس حالت میں زیارت کی آب و ہوا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔ قائدِ اعظم نے ڈاکٹروں

کی تجویز سے تو اتفاق کیا تاہم خواہش ظاہر کی کہ ۱۳ اگست کے بعد انھیں کوئٹہ پہنچا دیا جائے۔ ڈاکٹر اس وقت انتظار نہیں کر سکتے تھے لہٰذا قائدِ اعظم ۱۳ اگست کو زیارت سے کوئٹہ روانہ ہو گئے۔

جھٹکوں سے بچنے کے لیے کار بہت آہستہ چلائی جا رہی تھی اس لیے کوئی چار گھنٹے میں قائدِ اعظم کوئٹہ پہنچے۔ کوئٹہ ریزیڈنسی پہنچتے ہی ڈاکٹروں نے پھر ان کا معاینہ کیا اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ سفر سے ان پر کوئی ناگوار اثر نہیں پڑا ہے۔

کوئٹہ میں ان کی طبیعت سنبھلنے لگی تھی۔ ڈاکٹر الٰہی بخش نے کہا کہ وہ روزانہ ایک گھنٹہ فائل دیکھ سکتے ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ اس ہلکے پھلکے کام سے ان کی طبیعت بہلی رہے گی۔

اُس سال ۲۷ اگست کو عید الفطر تھی اور قائدِ اعظم عید کے پیغام کی تیاری میں مصروف تھے۔ قوم کے نام اس پیغام میں انھوں نے فرمایا "متحد کوششوں اور اپنے نصب العین پر یقینِ کامل ہی سے ہم پاکستان کے خواب کو ایک حقیقت میں تبدیل کر سکیں گے —— پچھلے سال عید الفطر سے کچھ عرصہ پہلے پاکستان وجود میں آیا تھا لیکن ہماری خوشیوں پر مشرقی پنجاب کے خونچکاں واقعات کے سبب گہرے رنج و غم کے بادل چھائے ہوئے تھے —— پچھلے سال کی خونریزی اور اس کے بعد کے واقعات —— یعنی لاکھوں مسلمانوں کی ہجرت —— ایک غیر معمولی بات تھی۔ ان لاکھوں مسلمانوں کو سر چھپانے کی جگہ فراہم کرنے میں ہم نے کسی کوشش اور خرچ سے پہلو تہی نہ کی۔ اس دشوار کام کو ہم نے بطریقِ احسن انجام دیا مگر اس پر اتنی بھاری رقم صرف ہوئی کہ ہمارے وسیلے جواب دینے لگے۔ بارہ مہینے کے قلیل عرصے میں تمام مہاجرین کو کام پر لگانا آسان نہ تھا۔ بیشتر مہاجرین کو آباد کیا جا چکا ہے مگر اب بھی ان کی خاصی تعداد کی آبادکاری نہیں ہو سکی ہے۔ ہم اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے جب تک ان میں سے ہر شخص اپنے قدموں

پر نکھڑا ہو جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی عید تک یہ زبردست اور اہم مسئلہ حل ہو جائے گا اور تمام مہاجرین، معاشرہ کے مفید ارکان کی حیثیت سے ملک کی معیشت میں جذب ہو جائیں گے۔" آگے چل کر انھوں نے فرمایا۔ دیگر اسلامی ملکوں کے لیے میرا عید کا پیغام یہ ہے کہ ہم ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں اور خیر سگالی کا اظہار کرتے ہیں۔ ہم سب خشکل دور سے گزر رہے ہیں۔ فلسطین، انڈونیشیا اور کشمیر کی سیاسی چپقلش سے ہمیں سبق لینا چاہیے۔ ہم متحد ہو کر ہی دنیا تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں۔ لہذا میں آپ سے اپیل کرتا ہوں —— آپ یہ بات کسی طرح بھی کہہ لیں۔ —— میرا مقصد صرف یہ ہے کہ —— ہر مسلمان کو پوری دیانت و خلوص کے ساتھ پاکستان کی خدمت کرنی چاہیئے۔"

یہ قائد اعظم کے آخری الفاظ ثابت ہوئے۔

۲۰ر جنوری ۱۹۴۸ء کو سلامتی کونسل نے ایک قرارداد کے ذریعے اقوام متحدہ کمیشن برائے ہندو پاکستان مقرر کیا جسے عام طور پر یو۔ این۔ سی۔ آئی۔ پی کہا جاتا ہے۔ اس کمیشن کی غرض و غایت یہ تھی کہ وہ کشمیر میں رائے شماری کی تجاویز مرتب کرے اور دیگر متعلقہ معاملوں کے بارے میں رپورٹ پیش کرے۔ جولائی ۱۹۴۸ء کے پہلے ہفتے میں کمیشن کے ممبر دونوں ملکوں کی حکومتوں سے گفت و شنید کے لیے پاکستان اور ہندوستان کے دورے پر آئے۔ پاکستان کے نقطۂ نظر سے کشمیر کے حالات سنگین ہو گئے تھے کیونکہ پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ ہندوستان کی فوجی تیاریوں نے جن کا آغاز فروری ۱۹۴۸ء میں ہوا تھا، خطرناک صورت اختیار کر لی ہے۔ کمانڈر انچیف نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ ہندوستان جلد ہی بڑے پیمانے پر حملے کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ کمانڈر انچیف نے تجویز پیش کی تھی کہ اگر پاکستان، ۲ لاکھ ۵۰ ہزار مہاجرین کے ایک اور مسئلے سے بچنا چاہتا ہے، اگر ہندوستان کو پاکستان کی سرحد پر فوجیں جمع کرنے اور مناسب موزوں وقت پر پاکستان میں پیش قدمی کرنے سے روکنا، عام باشندوں اور فوجیوں کے ضبط و تحمل

کو آزمائش سے بچانا اور پاکستان میں تخریبی سیاسی قوتوں کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ دینا مقصود ہے تو یہ اشد ضروری ہے کہ ہندوستان کو اٹری، پونچھ، نوشہرہ کے سرحدی خط سے آگے پیش قدمی نہ کرنے دی جائے۔"[1] سلامتی کونسل میں کشمیر کے جھگڑے پر غور ہو رہا تھا اور حکومت پاکستان کو اہم فیصلے کرنے تھے۔ قائدِ اعظم کو زیارت سے کوئٹہ منتقل کر دیا گیا تھا اور حکومت کو کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کے موقف کے بارے میں ان کے مشورے کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں قائدِ اعظم نے ۹ ستمبر کو چودھری محمد علی کو کوئٹہ طلب کیا۔ چودھری محمد علی نے اس موقع پر قائدِ اعظم سے اپنی گفتگو کا یوں تذکرہ کیا ہے: "وہ کشمیر کے تازہ ترین حالات معلوم کرنے کے لیے بے چین تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی طبیعت خراب ہے۔ انھیں سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی اور ان کا چہرہ زرد تھا۔ وہ بری طرح نڈھال تھے۔ لیکن اپنی علالت اور شدید نقاہت کے باوجود ان کا ذہن حسبِ معمول بجلی کی طرح کام کر رہا تھا۔"[2]

ستمبر کے اوائل میں قائدِ اعظم کے ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ ان کے صحت یاب ہونے کا امکان کم ہوتا جا رہا ہے۔ کوئٹہ کی آب و ہوا سے ان کی صحت پر مضر اثر پڑ رہا تھا۔ انھیں سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور اکثر آکسیجن دینی پڑتی۔ جو لوگ ان سے قریب تھے وہ مایوس ہوتے جا رہے تھے۔ دن رات وہ قائدِ اعظم کی صحت یابی کی دعائیں کرتے۔ ان لوگوں نے راتوں کی نیند اور دن کا چین خود پر حرام کر لیا تھا۔ ان کی زندگی کی ساعتیں ایسے وقت کم ہو رہی تھیں جب قوم کو ان کی اشد ضرورت تھی۔ شدید علالت کے باوجود ان کا ذہن مملکت کے پیچیدہ امور کے تانے بانے سلجھانے میں مصروف تھا۔

---

[1] بحوالہ "پاکستان اینڈ دی یونائیٹڈ نیشنز" از کے سرور حسن۔ صفحہ ۱۳۶ مطبوعہ ۱۹۶۰ء مین ہٹنگ پبلشنگ کمپنی۔ نیویارک۔

[2] چودھری محمد علی نے مصنف کو یہ واقعات بتائے۔

نئی مملکت کے مسائل ہر وقت ان کے سامنے رہتے اور اکثر عالمِ خواب میں ان کی زبان سے کشمیر، مہاجرین، آئین اور پاکستان کے الفاظ سنائی دیتے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لاشعور میں کیا خواہشیں موجود تھیں۔ ڈاکٹروں کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ اب یہ طے کیا گیا کہ کوئٹہ سے قائدِ اعظم کو کراچی منتقل کر دیا جائے۔ قائدِ اعظم کو بتایا گیا کہ ان کے لیے فوراً کراچی منتقل ہونا انتہائی ضروری ہے۔

فوراً ہی گورنر جنرل کے وائکنگ کو کوئٹہ طلب کیا گیا اور ڈاکٹروں نے فیصلہ کیا کہ ۱۱ ستمبر کو دن کے دو بجے جہاز کراچی روانہ ہو جائے گا۔ جس وقت قائدِ اعظم کو اسٹریچر پر جہاز میں لے جایا جا رہا تھا، جہاز کے عملے نے صف آرا ہو کر انھیں سلامی دی۔ انھوں نے بمشکل تمام ہاتھ کے اشارے سے سلامی قبول کی۔

جہاز کی نشستوں کو آرام دہ بستر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ قائدِ اعظم کو اس پر لٹا دیا گیا۔ کیبن میں ان کے ساتھ مس فاطمہ جناح اور نرس سسٹر ڈن ہم موجود تھیں۔ ہوابازوں نے ڈاکٹروں کو آگاہ کر دیا تھا کہ جہاز کچھ دیر کے لیے زیادہ بلندی پر پرواز کرے گا اور بلوچستان کے پہاڑوں کو عبور کرنے کے بعد ہی نیچی پرواز ممکن ہو سکے گی۔ آکسیجن کے سلنڈر اور گیس ماسک موجود تھے اور جب تک جہاز زیادہ بلندی پر پرواز کرتا رہا انھیں آکسیجن دی جاتی رہی۔

تقریباً دو گھنٹے کی پرواز کے بعد سوا چار بجے، سہ پہر کے وقت، گورنر جنرل کا وائکنگ ماری پور پر اترا۔ ایک سال پہلے بھی قائدِ اعظم اس ہوائی اڈے پر اپنے جہاز سے اترے تھے اور اس وقت ان کا استقبال کرنے کے لیے ہوائی اڈے پر ہزاروں آدمی موجود تھے جن میں کابینہ کے وزیر اور سفارتی نمائندے بھی شامل تھے۔ لیکن آج ہدایات کے مطابق، گورنر جنرل کے ملٹری سیکرٹری کرنل جیوفری نولز، کے سوا کوئی اور شخص ہوائی اڈے پر موجود نہ تھا۔ قائدِ اعظم کو اسٹریچر پر لٹا کر ایک فوجی ایمبولینس میں

سے جایا گیا اور مس فاطمہ جناح اور مسٹر ڈن ہیم کے ساتھ وہ گورنر جنرل ہاؤس روانہ ہوئے۔ پارٹی کے دوسرے افراد پہلے ہی کاروں میں روانہ ہو چکے تھے۔ ایمبولینس آہستہ آہستہ روانہ ہوئی۔ ایمبولینس کے پیچھے ایک کیڈلک کار میں ڈاکٹر اور ملٹری سیکرٹری تھے۔
تقریباً چار میل ہی کا فاصلہ طے ہوا تھا کہ ایمبولینس کے انجن میں کچھ خرابی ہو گئی، اور گاڑی رک گئی۔ ڈرائیور نے بہت کوشش کی لیکن انجن کسی طرح اسٹارٹ نہ ہو سکا۔ اب کیا کیا جائے؟

کراچی میں عام طور پر سمندری ہوا کے تیز جھونکے چلتے رہتے ہیں جس سے درجۂ حرارت اعتدال پر رہتا ہے۔ لیکن اس روز ہوا بند تھی اور گرمی ناقابلِ برداشت تھی۔ ڈاکٹروں اور ملٹری سیکرٹری کو دوسری ایمبولینس کا انتظار تھا اور ہر لمحہ اضطراب میں گزر رہا تھا۔ انھیں کیڈلک میں منتقل نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس میں اسٹریچر کے لیے جگہ نہیں تھی۔ اس لیے دوسری ایمبولینس کے انتظار کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
قریب ہی مہاجرین کی سینکڑوں جھونپڑیاں تھیں۔ وہ لوگ اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ انھیں کیا خبر تھی کہ ان کا قائد، جس نے اپنے وعدے کے مطابق انھیں ایک وطن دلایا، اس وقت ایک ایمبولینس میں لیٹا ہوا ہے۔ آتی جاتی ہوئی کاریں ہارن بجاتی گزر جاتیں، بسیں اور ٹرک آ جا رہے تھے لیکن قائد اعظم بے لبسی کے عالم میں ایمبولینس میں لیٹے ہوئے تھے ایک قیمتی زندگی کا انجام قریب تر آ رہا تھا۔ ہر سانس کے ساتھ زندگی گھٹتی جا رہی تھی۔

انھیں انتظار کرتے ہوئے ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا اور یہ وقت جس طرح گزرا اس کا احساس صرف ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو کسی اہم ذمہ داری کی ادائیگی میں کسی مشکل کا شکار ہوں۔ آخر خدا خدا کر کے دوسری ایمبولینس آئی اور قائد اعظم کو اسٹریچر پر لٹا کر دوسری ایمبولینس میں منتقل کیا گیا۔ اس طرح یہ قافلہ چھ بجے شام کے

بعد گورنر جنرل ہاؤس پہنچا۔ قائداعظم کو آرام سے بستر پر لٹا دیا گیا۔ ماری پور کے ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس تک پہنچنے میں دو گھنٹے صرف ہوئے۔ دو گھنٹے کوئٹہ سے کراچی کے سفر میں اور دو گھنٹے ہوائی اڈے سے گورنر جنرل ہاؤس تک۔ یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے؟

رات کے تقریباً ساڑھے نو بجے قائداعظم نے شدید تکلیف کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر ان کے کمرے ہی میں موجود تھے۔ انھوں نے معاینہ کیا۔ نو بج کر ۵۰ منٹ پر ڈاکٹر الٰہی بخش نے جھک کر سرگوشی میں کہا۔ جناب عالی، ہم نے آپ کے طاقت کا انجکشن لگایا ہے جلد ہی آپ اس کا اثر محسوس کریں گے۔ انشاء اللہ آپ زندہ رہیں گے۔ قائداعظم نے اپنے سر کو جنبش دی اور کمزور آواز میں گویا ہوئے "نہیں، میں زندہ نہیں رہ سکوں گا"۔ یہ ان کے ہونٹوں سے ادا ہونے والا آخری کلمہ تھا۔[1] چند منٹ بعد جب وہ محوِ خواب تھے تو انھوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

کمرے میں ایک مقدس سکوت طاری تھا۔

ان کے انتقال کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ گورنر جنرل ہاؤس کے دیو پیکر آہنی دروازے جہاں سخت حفاظتی انتظامات کے سبب کوئی غیر متعلق شخص قدم نہیں رکھ سکتا تھا، کھول دیے گئے۔ جوان اور ضعیف، مرد اور عورتیں ہزاروں کی تعداد میں چلے آ رہے تھے۔ ہر آنکھ اشک بار تھی۔

یہ منحوس خبر سن کر جو لوگ سب سے پہلے گورنر جنرل ہاؤس پہنچے ان میں میں بھی شامل تھا۔ میں بوجھل قدموں سے اس کمرے میں داخل ہوا جہاں قائداعظم ابدی نیند سو رہے تھے۔ وہاں مجھے مولانا شبیر احمد عثمانی، وزارتِ خارجہ کے سیکرٹری اکرام اللہ،

---

[1] "جناح" ہیکٹر بولائیتھو۔ صفحہ ۲۲۵

یوسف ہارون، ایم اے رنگون والا اور اے ایم قریشی نظر آئے ۔ میں نے بستر کی جانب دیکھا۔ ان کی میّت پر سفید چادر پڑی ہوئی تھی جس نے مجھے سب کچھ سمجھا دیا۔ میری گویائی سلب ہو چکی تھی اور آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ میرا ملک، جس کی عمر صرف ایک سال تھی، یتیم ہو گیا ہے۔

ایک ضعیف خاتون ہچکیاں لیتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور رنج والم میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولیں۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ۰

BIBLIOGRAPHY

I wish to express my grateful acknowledgements particularly to the following books, reports, magazines and newspapers, which have been consulted and from which extracts are quoted in this Biography.

1. Aga Khan. — *India In Transition.* 1918. Bennet, Coleman & Co. Ltd., Bombay.

2. Aga Khan. — *The Memoirs Of Aga Khan.* 1954. Cassell & Co. Ltd., London.

3 Agarwal, Ratish Mohan — *The Hindu Muslim Riots* 1943. The International Social Literature Publishing Co ,Lucknow Branch, Lucknow.

4 Ahmed, M. B — *A History of the Freedom Movement* 1707-1831. Published by Pakistan Historical Society. 30, New Karachi Housing Society, Karachi. 1957.

5. Alva, Joachim. — *Leaders of India.* 1943. Thacker & Co. Ltd., Bombay.

6 Ambedkar, B R — *Pakistan or Partition of India.* Thacker & Co., Bombay.

7. Archer, Bishop. — *Memoirs.*

8. Archer, William. — *India And The Future.*

9. Azad, Maulana Abul Kalam. — *India Wins Freedom.* 1959. Orient Longmans, Bombay.

10. Aziz, A. — *Discovery Of Pakistan.* 1964. Sh. Ghulam Ali & Sons, Lahore.

11. Banerjee, A. C — *Indian Constitutional Documents.* 1948.

12. Birdwood, Lord. — *Two Nations And Kashmir* 1956. Robert Hale Ltd., London.

13. Bolitho, Hector. — *Jinnah.* 1954. John Murray, London.

14. Bombay Chronicle, The, Bombay.

15. Bonnerjee, W. C. — *An Introduction To Indian Politics* 1898.

16. Bright, Jagat S. — *Subhas Bose And His Ideas.* 1946. Indian Printing Works, Lahore.

17. Campbell-Johnson, Alan. *Mission With Mountbatten.* 1951. Robert Hale Ltd., London.

18. Chintamani And Masani. *India's Constitution At Work.*

19. Chirol, Sir Valentine. *India Old And New.* 1921. MacMillan & Co. Ltd., London.

20. Civil And Military Gazette, The, Lahore.

21. Coupland, R. *The Cripps Mission.* 1942. Oxford University Press, Bombay.

22. Dawn, The, Delhi.

23. Dawn, The, Karachi.

24. Dunbar, Sir George. *India And The Passing Of Empire.* 1951. Nicholson & Watson, London.

25. Dutt, Romesh. *The Economic History Of British India.* 1757-1937. 1906.

26. Dwarkadas, Kanji. *Gandhiji.*

27. Eastern Herald, The. *Sylhet, December* 1963.

28. Edib, Halide. *Inside India.* 1937. George Allen & Unwin Ltd., London.

29. Fischer, Louis. *The Life Of Mahatma Gandhi.* 1951. Hindustan Cellucose & Paper Co. Ltd., Bombay.

30. Gandhi, M. K. *Autobiography.*

31. Gandhi, M. K. *Young India.* (A Weekly.) 1921.

32. Gunther, John. *Inside Asia.*

33. Harrington, Henry. *A Pamphlet.* 1958.

34. Hasan, K. Sarwar. *Pakistan And The United Nations.* 1960. Manhattan Publishing Co., New York.

35. Holfes. *History Of The Sepoy Wars.*

36. Horniman, B. G. *Amritsar And Our Duty To India.* 1920. T. Fisher Unwin, Ltd., London.

37. Hunter, Sir W. W. *A Brief History Of The Indian Peoples.* 1903. Oxford. At The Clarendon.

38. Hunter, Sir W. W. *Our Indian Mussalmans.*

39. Iqbal, Afzal. *Writings And Speeches Of Maulana Muhammad Ali.* 1944. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

40. Iqbal, Allama Mohammad. *Letters Of Iqbal To Jinnah.*
1963. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

41. Jamiluddin Ahmed. *Muslim Political Movement.*
1963.

42. Jamiluddin Ahmed. *Final Phase Of Struggle For Pakistan.*
1964. Published by the Author, Karachi.

43. Jamiluddin Ahmed. *Speeches And Writings Of Mr. Jinnah.*
1960. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

44. Kailash Chandra. *Tragedy Of Jinnah.*
1941. Sharma Publishers, Lahore.

45. Karaka, D. F. *Betrayal In India.*
1950. Gollancz, London.

46. Kaye And Malleson. *History Of The Indian Mutiny.*

47. Korbel, Josef. *Danger In Kashmir.*

48. Lacey, Patrick. *Fascist India.*
1946. Nicholson & Watson. London.

49. Laik Ali, Mir. *Tragedy Of Hyderabad.*
1962. Pakistan Co-operative Book Society Ltd., Karachi.

50. Lambrick. *Sir Charles Napier And Sind.*

51. Latif, Dr. Sayyid Abdul. *The Muslim Problem In India.*

52. Latif, Dr. Sayyid Abdul. *The Pakistan Issue.*
1943. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

53. Lohia, Ram Manohar. *The Mystery Of Sir Stafford Cripps.*

54. Mehtar, M. A. *Whys Of The Great Indian Conflict.*
1947.

55. Menon, V. P. *The Transfer Of Power In India.*
1957. Orient Longmans, Bombay.

56. Menon, V. P. *The Story Of The Integration Of The Indian States.*
1956. Orient Longmans Ltd., Bombay.

57. Michener, James A. *The Voice Of Asia.*
Bantam Books. NewYork.

58. Minutes Of Evidence Given Before The Joint Committee Of Indian Constitution Reforms.

59. Miyake, Dr. Yujiro. *The Future Of Asia.*

60. Montague. *Mr. Montague's Diary.*

61. Moraes, Frank. *Jawaharlal Nehru.*
1956. MacMillan & Co., New York.

62. Mosley, Leonard. *The Last Days Of The British Raj.*

63. Munshi, K. M. *I Follow The Mahatma.* 1940. Allied Publishers, Bombay.

64. Munto, Saadat Hasan. *Ganje Firishte.* (Urdu). 1955. Muktaba-e-Jadid, Lahore.

65. Naidu, Sarojini. *Mohammad Ali Jinnah: An Ambassador Of Unity.* 1918. Ganesh & Co., Madras.

66. Nehru, Jawaharlal. *Autobiography.*

67. Nichols, Beverley. *Verdict On India.* 1946. Thacker & Co., Bombay.

68. Nicholson, Harold. *King George V: His Life And Reign.*

69. Noman, Mohammad. *Muslim India.*

70. Notes And Queries. *Oxford University Press, London.*

71. Pakistan Times, The, Lahore.

72. Pioneer, The, Allahabad.

73. Prasad, Babu Rajendra. *India Divided.* 1947. Hind Kitabs, Ltd., Bombay.

74. Pyarelal. *Mahatma Gandhi: The Last Phase.* 1956. Navajivan Publishing House, Ahmedabad.

75. Qureshi, Dr. I. H. *History Of The Freedom Movement.* 1957. Pakistan Historical Society, Karachi.

76. Rahmat Ali, Choudhari. *Now Or Never.* 1933. Foister And Jagg, Cambridge.

77. Rahmat Ali, Choudhari. *Pakistan — The Fatherland Of the Pak Nation.* 1947. Foister & Jagg, Cambridge.

78. Rahmat Ali, Choudhari. *The Millat Of Islam And The Menace Of Indianism.*

79. Rajput, A. B. *Muslim League: Yesterday And Today.* 1948. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

80. Ravoof, A. A. *Meet Mr. Jinnah.* 1955. Sh. Muhammad Ashraf, Lahore.

81. Ray, Sir P. C. *Life And Times Of C. R. Das.*

82. Report Of The Socialist International, Stockholm, 1917.

83. Report Of The Round Table Conferences.

84. Resolutions Of The All-India Muslim League.

85. Saiyid, Matlub Hasan. *Mohammad Ali Jinnah.* 1945. Sh. Mohammad Ashraf, Lahore

86. Securitsy Council, Official Report.

87. Setalvad, Chimanlal. *Recollections And Reflections.* 1946. Padma Publications Ltd., Bombay.

88. Singh, Durlab. *Formation And Growth Of I.N.A.* 1946. Hero Publications, Lahore

89. Sinha, Lord. *Speeches And Writings.* 1919.

90. Sitaramayya, Dr. Pattabhi *The History Of The Congress.* 1935. The Working Committee Of The Congress.

91. Statesman, The, Calcutta.

92. Stephen, Ian. *Pakistan: Old Country/New Nation.* 1946. Penguin Books, Harmondsworth.

93. Symonds, Richard. *The Making Of Pakistan.* [illegible]46. [illegible]r, London.

94. Times Of India, T[illegible] Bombay.

95. The Times, Londo[illegible]

96. Tuker, Lt.-Gen. [illegible]

97. Woodroffe, Sir John. *Is Ind[illegible] Civilized?* 1918. Ganesh & Co. Publishers, Madras.

98. Wrench, Sir Evelyn. *The Immortal Years.* 1945. Hutchinson, London.

99. Yajnik, Indulal K. *Gandhi As I Know Him.* 1943. Danish-Mahal, Faizgunj, Delhi.

100. Younghusband, Sir Francis. *Dawn In India.* 1930. John Murray, London.

101. Zaheer, Sajjad. *A Case For Congress-League Unity.* 1944. Peoples' Publishing House, Bombay.